اِسلام کا سیاسی نظام

پروفیسر چودھری غلام رسول چیمہ



اسلام کا سیاسی نظام

اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا (مائدہ ۵:۳)

ترجمہ: آج میں نے تمہارا دین تمھارے لیے کامل کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور دین اسلام تمھارے لیے پسند کیا۔

اسلام کا سیاسی نظام

تعارفی و تقابلی مُطالعہ

پروفیسر چودھری غلام رسول چیمہ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی

علم و عرفان پبلشرز
34- اُردو بازار، لاہور

نام کتاب	....	اسلام کا سیاسی نظام
مصنف	....	پروفیسر چودھری غلام رسول چیمہ ایم۔ اے۔ ایل ایل بی
ناشر	....	گل فراز احمد، علم و عرفان پبلشرز، لاہور
کمپوزنگ	....	رفاقت علی
مطبع	....	جوہر رحمانیہ پرنٹرز، لاہور
سن اشاعت	....	جولائی 2004ء
قیمت	....	-/300روپے

☆...... ملنے کے پتے ......☆

علم و عرفان پبلشرز
34- اُردو بازار، لاہور فون: 7352332

مشتاق بک کارنر
الکریم مارکیٹ اُردو بازار، لاہور

کتاب گھر
کمیٹی چوک، راولپنڈی فون: 5552929

اشرف بک ایجنسی
کمیٹی چوک، راولپنڈی فون: 5531610

رحمٰن بک ہاؤس
اُردو بازار، کراچی

استدعا

پروردگار عالم کے فضل، کرم اور مہربانی سے، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ، طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری پوری احتیاط کی گئی ہے۔
بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی نظر آئے یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہ کرم مطلع فرما دیں۔ ان شاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائے گا۔ نشاندہی کے لیے ہم آپ کے بے حد مشکور ہوں گے۔ (ناشر)

انتساب!

اپنی پیاری بہن زبیدہ مرحومہ کے نام یہ کتاب انتساب کرتا ہوں جن کی نوازشات کا زیرِ بارگراں ہوں۔ اللہ تعالیٰ مرحومہ کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے۔

تقدیم

اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ جس نے اپنے فضل و کرم سے کتاب ''اسلام کا سیاسی نظام'' لکھنے کی توفیق دی۔ اس کے بعد اپنے ایک عالم اور عمرانی تحریکات کا وسیع علم رکھنے والے دوست مرزا محمد حسین صاحب بی کام مرحوم کا شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے ''جدید سیاسی نظریات'' سے متعلق قیمتی مواد مہیا کیا۔ اگر مجھے وہ مواد میسر نہ آتا تو میں ''جدید سیاسی نظریات'' پر بحث کرنے کا حق ادا نہ کرسکتا۔

گذشتہ اور موجودہ دور میں ریاست اور اس سے متعلقہ امور پر بڑے بڑے فلاسفہ نے بحثیں کی ہیں اور وہ اصول وضع کرنے کی کوشش کی ہے جن پر انسانی فلاح کا دار و مدار ہوسکتا ہے۔

اسلام انسان کی مادی' روحانی ضروریات کا کفیل اور کامل ترین دستورِ حیات ہونے کا دعویدار ہے اور وہ تمام بنیادی اصول بیان کرتا ہے۔ جو ہر دور کے مسائل کو حل کرنے کے لیے مشعل راہ ہیں۔ اس کتاب میں اسلام کے نظام حکومت پر جدید سیاسی نظریات کے ساتھ موازنہ کر کے بحث کی گئی ہے۔ دلائل و براہین سے واضح کیا گیا ہے کہ اسلام کے ہی وضع کردہ اصول' وہ اصول ہیں جن پر ایک فلاحی ریاست کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے اور تمام مسائل کا حل انہی اصولوں میں مضمر ہے۔

غلام رسول

۲۹ دسمبر ۱۹۷۵ء

ترمیم شدہ ایڈیشن

ایک عرصہ تک طالع نے یہ کتاب شائع نہیں کی تھی۔ بعض حضرات نے کتاب کے دست یاب نہ ہونے کا گلا کیا تو اب ترمیم شدہ ایڈیشن قارئین کے سامنے پیش کیا جا رہا ہے۔ افادیت کے لحاظ سے کوئی کتاب مکمل نہیں ہوسکتی جب تک ناقدین، فاضل اساتذہ اور قارئین کے ہاتھ میں نہیں جاتی ان کی دقیق اور ناقدانہ نظر ہی کتاب کی افادیت کو بڑھاتی ہے۔ میں ناقدین اور فاضل اساتذہ کی خدمت میں درخواست کروں گا کہ کتاب میں جہاں خامی یا کمی محسوس کریں تو ادارہ یا مصنف کو آگاہ کریں۔

غلام رسول مئی ۲۰۰۴ء

پیش لفظ

از پروفیسر امان اللہ خاں صاحب ایم۔ اے شعبہ علوم اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی لاہور

مجھے میرے محترم فاضل دوست چودھری غلام رسول صاحب ایم۔ اے نے اپنی نئی تصنیف کا پیش لفظ لکھنے کو کہا۔ میرے لیے یہ باعث مسرت ہے کہ میں ایک دینی اور علمی کتاب کے متعلق چند سطور لکھ رہا ہوں اس لیے میں نے مسودے کے جستہ جستہ حصوں کا مطالعہ کیا ہے۔ مصنف نے بڑی محنت عرقریزی، جانفشانی سے اسلام کے نظام سیاست پر مختلف اور مفید مصادر سے معلومات کا ذخیرہ فراہم کر کے اس کتاب کو مرتب کیا ہے۔ چودھری صاحب کی یہ پرخلوص سعی قابل تحسین ہے کہ انھوں نے دورِ حاضر میں انسانیت کے تمام دکھوں کا مداوا اور انسانی نسل کے تمام مسائل کا حل اسلام ہی قرار دیا ہے۔

برادرم پروفیسر چودھری غلام رسول صاحب علوم اسلامیہ میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں اور اپنی اس دلچسپی کا اظہار مختلف اسلامی موضوعات پر متعدد کتب لکھ کر چکے ہیں۔ جو دینی اور علمی حلقوں میں عموماً اور طلباء میں خصوصاً پسندیدہ نگاہ سے دیکھی جاتی ہیں۔ اب انھوں نے اپنے علمی ذوق کا اظہار زیرِنظر تصنیف کو پیش کر کے کیا ہے۔ یہ کتاب عین وقت کی آواز ہے۔ اس دور میں اس موضوع پر جتنی کتب لکھی جائیں وہ کم ہیں کیونکہ نظریاتی جنگ زوروں پر ہے۔ مسلمان مادی نظریات کی رو میں بہہ کر اسلام سے دوری اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ اس وجہ سے مادی نظریات سے متاثر حضرات کو اسلام کے حسین چہرے سے واقف کرانا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ پروفیسر صاحب نے مادی نظریات پر اسلام کی برتری ثابت کر کے ایک نہایت ہی اہم دینی فریضہ سرانجام دیا ہے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب علمی اور دینی حلقوں اور طلباء میں پسندیدہ نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ میں طلباء سے خاص طور پر کہوں گا کہ وہ کتاب کا مطالعہ کریں۔

امان اللہ

فہرست مضامین

اسلام کا سیاسی نظام

باب سوم

باب ہشتم

باب اوّل

مملکت

مملکت کیا ہے؟

وہ ارفع معاشرتی ادارہ جو انسان کے تمدنی امور کو قانون کی رو سے سرانجام دینے کے لیے وجود میں آتا ہے۔

انگریزی میں ریاست کے لیے لفظ اسٹیٹ (State) استعمال کرتے ہیں جو اسٹیٹس (Status) سے ماخوذ ہے۔ قدیم ماہرین سیاسیات نے مملکت کی تعریف مختلف الفاظ میں کی ہے۔ ارسطو کہتا ہے۔

"مملکت خاندان اور دیہاتوں کی اس تنظیم کا نام ہے جس کا مقصد مکمل اور آزاد زندگی کی سہولتیں بہم پہنچانا ہے۔"

بلنشلی (Bluntshli) یہ تعریف کرتا ہے:

"مملکت لوگوں کی وہ سیاسی منظم جماعت ہے جو کسی مقام پر رہتی ہو۔"

ڈاکٹر وڈرو ولسن (Woodrow Wilson) کے قول کے مطابق:

"ریاست سے مراد افراد کا کسی مخصوص علاقہ کے اندر قانون کی خاطر منظم ہونا ہے۔"

برجس کہتا ہے:

"مملکت انسانوں کی اس جماعت کو کہتے ہیں جس میں سیاسی تنظیم موجود ہو۔"

ہالینڈ کہتا ہے:

"مملکت انسانوں کے اس وسیع جماعت کو کہتے ہیں جو عموماً ایک خاص حصہ پر آباد ہوں اور جن میں اکثریت کی رائے مخالف طبقہ کی رائے پر فوقیت رکھے۔"

گارنر نے زیادہ وضاحت کے ساتھ تعریف کی ہے۔

مملکت کم یا زیادہ افراد کی وہ سیاسی جماعت ہے جو دائمی طور پر کسی خاص خطہ زمین پر قابض اور تمام خارجی اثرات سے آزاد ہو۔ جس کی ایک منظم حکومت ہو اور جس کی لوگ اطاعت کرتے ہیں۔

گلکر انسٹ کہتا ہے:

''ریاست علم سیاست کی ایک تخیل اور اخلاقی حقیقت ہے جس کا وجود ایسی جگہ پایا جاتا ہے جہاں اشخاص کی ایک تعداد جو معین قطعہ ارض میں رہتی ہو۔ ایک ایسی حکومت کے تحت متحد ہو جو داخلی معاملات میں ان کے اقتدار اعلیٰ کے ظہور کا ذریعہ ہو اور خارجی معاملات میں دوسری حکومتوں سے آزاد ہو۔''

لاسکی کہتا ہے:

''ایک علاقائی معاشرہ جو حکومت اور رعایا میں بٹا ہوا ہو اور اپنے طبعی مخصوص رقبہ کے اندر تمام دوسرے اداروں پر برتری کا دعویٰ دار ہو۔''

اسلامی نقطہ نگاہ سے مملکت کی تعریف یہ ہے:

مملکت (State) وہ بلند ترین معاشرتی ادارہ جو انسانوں کے دینی اور دنیاوی معاملات کو قانون کی رو سے سرانجام دینے کے لیے وجود میں آتا ہے۔

مملکت کے کم از کم اجزائے ترکیبی حسب ذیل ہیں:

۱۔	آبادی	۲۔	علاقہ
۳۔	تنظیمی ڈھانچہ	۴۔	حکومت
۵۔	دستور	۶۔	اقتدار اعلیٰ

۱۔ آبادی: مملکت کے وجود کے لیے نہایت ضروری ہے بغیر آبادی کے مملکت کا تصور ہی ناممکن ہے کیونکہ مملکت نام ہے اس بلند ترین معاشرتی ادارے کا جو انسان کی تمدنی زندگی کے معاملات کو قانون کی رو سے سرانجام دیتا ہو۔

۲۔ علاقہ: ریاست کا دوسرا جزو علاقہ ہے آبادی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی مخصوص علاقے میں آباد ہوں۔ جس کا مناسب حدود اربعہ ہو۔

۳۔ تنظیمی ڈھانچہ: ریاست کا تیسرا جزو تنظیمی ڈھانچہ ہے جو معاشرے کے تمام طبقات اور اداروں پر مشتمل ہوتا ہے۔

۴۔ حکومت: ریاست کا چوتھا جزو حکومت ہے۔ حکومت اس مشینری کا نام ہے جو ریاست کے فیصلوں کو نافذ کرتی ہے اور امن و امان قائم کرتی ہے۔

۵۔ دستور: ریاست کا پانچواں جزو دستور ہے۔ دستور اس مجموعہ ضوابط کا نام ہے۔ جس میں مملکت کے نظام، تقسیم اختیارات، بنیادی حقوق اور دیگر مختلف حکومتوں سے باہمی تعلقات پر اصولی بحث ہوتی ہے۔

۶۔ اقتدار اعلیٰ: ریاست کا چھٹا جزو اقتدار اعلیٰ ہے۔ اقتدار اعلیٰ سے وہ بالا طاقت مراد ہے جو مملکت

کی حدود کے اندر سب انجمنوں پر فائق ہوتی ہے۔

اقتدار اعلیٰ کے متعلق دنیاوی سیاسی نظریات اور اسلامی نظریہ کا اختلاف ہے۔ دنیاوی سیاسی نظریات کی رو سے اقتدار اعلیٰ یا تو فرد واحد کے ہاتھ میں ہوگا یا چند افراد کے ہاتھ میں یا عوام کے ہاتھ میں یا چرچ کے ہاتھ میں لیکن اسلام کی رو سے اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کو حاصل ہے کوئی بندہ دوسرے بندہ پر حکومت نہیں کرسکتا ارشاد الٰہی ہے:

اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ[1] حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہی حاصل ہے۔

عہد حاضر کا ایک فرانسیسی ماہر سیاسیات ڈی ٹوکوئیل انسانوں کی حاکمیت کے رد میں اور خدا کی حاکمیت کے حق میں لکھتا ہے:

> ''مطلق اقتدار فی الواقع ایک بہت بری چیز ہے اور خطرناک بھی' کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اقتدار مطلق کو دور اندیشی اور احتیاط کے ساتھ استعمال کر سکے اقتدار مطلق کا مرجع صرف خدائے واحد کی ذات ہے کیوں کہ اس کے اقتدار کی کارفرمائی کے پہلو بہ پہلو اس کی حکمت اور اس کا عدل بھی کارفرما ہے لیکن دنیا کے اندر کوئی ایسا معتبر اور قابل اطاعت اقتدار نہیں پایا جاتا جس کے احکام کو میں ہر ہر معاملے میں غیر مشروط طور پر قبول کرتا جاؤں جب میں یہ معلوم کرتا ہوں کہ کسی ملک کو یا کسی حکومت کو خواہ وہ شخصی ہو یا ڈیموکریٹک یا بادشاہت ہو یا ری پبلک ہو اقتدار مطلق سونپ دیا گیا ہے۔ تو مجھے اسی وقت انتشار و انارکی کے بیج نظر آنے لگتے ہیں اور میں فوراً ایک ایسی ریاست کی تلاش کرنے لگتا ہوں۔ جو میری حقیقی آرزو پوری کرے۔''[2]

سیاسی نظریات کی مختصر تاریخ

افلاطون کا نظریہ سیاست

افلاطون یونان میں تقریباً ۴ ½ سال سو سال قبل مسیح پیدا ہوا۔ حکمائے یونان میں افلاطون فلسفہ اور سیاست میں امام تصور کیا جاتا ہے اس کا نظریہ سیاست یہ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے اس لیے وہ مل جل کر زندگی بسر کرے گا مل جل کر رہنے کی وجہ سے معاشرہ میں تقسیم عمل کا اصول کارفرما ہوگا تاکہ لوگ ایک دوسرے کی ضروریات اور احتیاجات کو پورا کرنے کے لیے اپنے دائرہ میں عمل کریں۔ اس لیے کہ کوئی انسان بھی اپنی تمام ضروریات کا خود کفیل نہیں ہے۔ افلاطون کہتا ہے کہ تقسیم کار، پیدائش

[1] یوسف: ۴۰۔ [2] نظام اسلامی مشاہیر کی نظر میں مرتبہ خلیل احمد حامدی ص ۳۵۱۔

کے اعتبار سے ہونی چاہیے کیونکہ مختلف انسان پیدائشی طور پر مختلف استعدادیں اور صلاحیتیں لے کر پیدا ہوتے ہیں۔ بعض ذہین و فطین ہوتے ہیں بعض بہادر اور بعض معاشی کاموں کے کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ چنانچہ افلاطون معاشرہ کو تین طبقات میں تقسیم کرتا ہے:

۱۔ ارباب حل و عقد: جنھیں وہ نگران (Guardian) کہتا ہے حکمرانی کے فرائض صرف یہی لوگ انجام دے سکتے ہیں۔ اس طبقہ کو مثالی بنانے کے لیے تعلیم کا ایک نظام پیش کرتا ہے تاکہ یہ لوگ اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاسکیں اور ان میں یک جہتی پیدا ہو سکے۔

۲۔ سپاہی: علاقے کی حفاظت اور بقا کے لیے فوج کی ضرورت پڑتی ہے۔ کوئی علاقہ اور ملک بغیر دفاع کے اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔ اس لیے ماہر فوجیوں کی جماعت ضروری ہے اس طرح افلاطون فوجیوں کی جماعت کو معاشرہ کا ایک مستقل طبقہ تصور کرتا ہے۔ اس طبقہ کی باقاعدہ تربیت کا بھی خواہاں ہے تاکہ سپاہی ضرورت کے وقت اپنی صلاحیتیں اجاگر کر سکیں۔

۳۔ اہل حرفہ: کسانوں، مزدوروں اور غلاموں پر مشتمل ہے۔ یہ طبقہ انسانی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے مختلف پیشے اختیار کرے گا۔ کیونکہ کوئی شخص بھی خود کفیل نہیں ہے۔ افلاطون کا نظریہ ہے کہ جو انسان جس طبقہ سے تعلق رکھتا ہو۔ اس طبقہ کا کام کرنا ہی عین تقاضائے فطرت ہے۔ اس لیے حکومت کا یہ فرض ہے کہ ہر انسان سے وہی کام لے جو اس کی صلاحیت رکھتا ہے اور اس شخص پر بھی یہ واجب ہے کہ حکومت کے فیصلے کے سامنے سرِ خم تسلیم کرے۔

افلاطون کے نزدیک مثالی حکومت وہی ہو سکتی ہے جب ارباب حکومت سب فلاسفرز ہوں۔ افلاطون نے اپنی مثالی مملکت کا نقشہ اپنی مشہور کتاب "ریاست" میں کھینچا ہے ان کے نزدیک مثالی ریاست کی بقاء عدل و انصاف پر ہے۔ اگر عدل و انصاف ہے تو حکومت قائم ہے۔ ورنہ اس کی تباہی و بربادی سر پر کھڑی ہے۔

افلاطون کے نظریہ عدل پر میکاولی اور مینڈول نے اپنے اپنے نظریات سیاست کی بنیاد رکھی ہے۔ افلاطون کی مثالی ریاست میں معاشی نظام کم و بیش اشتراکی نظام کے مشابہ ہے۔

تنقید

اسلام معاشرتی طبقاتی تقسیم کا قائل نہیں ہے۔ سب انسان پیدائشی لحاظ سے برابر ہیں۔ اس لیے اسلام کسی شخص کو بھی یہ سرٹیفکیٹ نہیں دیتا کہ وہی حکومت کے لیے پیدا ہوا ہے اور نہ کسی سے حکومت کا حق چھینتا ہے۔ نہ کسی کو کوئی خاص پیشہ اختیار کرنے کے لیے مجبور کرتا ہے۔ اسلام انسانی مساوات کا قائل ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ[1] اے

[1] النساء ۱:۴۔

لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تم کو ایک اصل سے پیدا کیا ہے۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلاَّ اُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا۔[1] سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ حکومت کرنا صرف ایک خاص طبقے کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ جو بھی اس کا اہل ہو۔ حکومت اس کے سپرد کر دی جائے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰى اَهْلِهَا۔[2] اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کے سپرد کرو۔

یہ آیت کریمہ ظاہر کرتی ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے کوئی خاص طبقہ حکومت کرنے کا حقدار نہیں ہے بلکہ معاشرہ میں جو بھی اہل ہوگا زمامِ حکومت اس کے ہاتھ میں دی جائے گی۔

اہل کون ہے؟ اسلام اس کا جواب یہ دیتا ہے۔ وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُوْنَ۔[3] زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔

اسلام اسی پر ہی خاموش نہیں رہ جاتا کہ معاشرہ میں سے بہترین شخص کے سپرد حکومت کر دی جائے بلکہ حاکم کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ لوگوں کے مشورہ کے بغیر حکومت نہیں کرنا۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔[4] یعنی مسلمانوں کا نظام حکومت باہمی مشاورت کے ساتھ چلتا ہے۔

ایک جگہ اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ۔[5] معاملات میں ان کا مشورہ لے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: مَا شَاوَرَ قَوْمٌ اِلاَّ هُدُوا۔[6] جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس نے فلاح پائی۔

مذکورہ بالا بحث سے افلاطونی نظریہ حکومت اور اسلامی نظریہ حکومت کا فرق کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ افلاطون شخصی موتمری حکومت (چند فلسفیوں کی حکومت جس کا حکمران شخص واحد ہو) کا قائل ہے۔ اسلام اس امر کا قائل ہے کہ رئیس حکومت معاشرہ میں سے بہترین شخص ہو اور کسی خاص طبقہ سے متعین نہیں کرتا۔ پھر وہ رئیس عوام کے مشورہ سے حکومت چلائے۔

ارسطو کا نظریہ

حکمائے یونان میں ارسطو کا مقام بہت بلند ہے۔ وہ افلاطون کی اکیڈمی میں بحیثیت ایک شاگرد کے بیس سال تک تعلیم حاصل کرتا رہا۔

1۔ یونس ۱۰:۱۹۔ 2۔ النساء ۴:۵۸۔ 3۔ الانبیاء ۲۱:۱۰۵۔
4۔ الشوریٰ ۴۲:۳۸۔ 5۔ آل عمران ۱۵۹۔ 6۔ طبرانی، کنوز الحقائق حدیث ۸۷۔

ارسطو بھی افلاطون کی طرح معاشرہ کو تین حصوں میں تقسیم کرتا ہے لیکن اس کا معیار تقسیم ذرا مختلف ہے:

۱۔ ارباب فکر ونظر کا طبقہ: جسے وہ طالب علموں کا طبقہ لکھتا ہے' یہی لوگ بہترین زندگی کے مستحق ہیں۔

۲۔ غلاموں کا طبقہ: جس کا یہ فرض ہے کہ پہلے طبقہ کی ضرورت اور احتیاجات کو پورا کرے۔

۳۔ عام انسانوں کا طبقہ: ارسطو اونچے طبقہ کے لائق ذہین اشخاص کی حکومت کا قائل ہے۔ ارسطو اسے ارسطوکریسی (Aristocracy) کا نام دیتا ہے۔ اسی طرز حکومت کو بہترین حکومت قرار دیتا ہے۔

نظریہ کلی

اس نظریہ کو مثالی نظریہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے مملکت ایک زندہ شے ہے جذبات خواہشات اور ارادے رکھتی ہے اس کے اختیارات غیر محدود ہیں اگر فرد اور مملکت کے درمیان اختلاف ہو تو مملکت حق بجانب ہو گی' فرد قصوروار افراد حکومت کے اس طرح تابع ہیں کہ جو بھی حکم صادر ہو وہ اس پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہیں۔ حکم کے خلاف احتجاج نہیں کر سکتے۔ فرد کی زندگی' ترقی' خوشحالی' سب مملکت کے قبضے قدرت میں ہے ہر فرد کی خوشحالی اور بہبودی ریاست کی خوشحالی اور برتری میں مضمر ہے انسان بغیر حکومت کے زندہ نہیں رہ سکتا۔ انسان مملکت کے لیے پیدا ہوتا ہے اس کے لیے مرتا ہے۔

تنقید

۱۔ نظریہ کلی عقل کی نفی کرتا ہے جب کہ اسلام عقلی قوتوں سے کام لینے کی تعلیم دیتا ہے اور قرآن بار بار لوگوں کو افلا یتدبرون. افلایعقلون. افلا یشعرون. وغیرہ الفاظ سے مخاطب کرتا ہے اور جو لوگ عقلی قویٰ سے کام نہیں لیتے ان کو حیوانات سے تشبیہ دیتا ہے اور انھیں بہرے گونگے اور اندھے کہتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: دِیْنُ الْمَرْءِ عَقْلُهٗ مَنْ لَادِیْنَ لَهٗ لَا عَقْلَ لَهٗ [1] یعنی آدمی کا دین اس کی عقل ہے اور جس کا کوئی دین نہیں اس کو عقل نہیں۔ یَتَاضَلُ النَّاسُ بِالْعَقْلِ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ [2] دنیا اور آخرت میں حسب عقل لوگوں کو فضیلت ہو گی۔

۲۔ نظریہ کلی آمریت کی تعلیم دیتا ہے اسلام آمریت کے صریحاً خلاف ہے اسلام سیاسی اور قانونی لحاظ سے صرف اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا قائل ہے ارشاد الٰہی ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [3] حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہی ہے۔

۱۔ کنوز الحقائق۔ حرف دال ۲۔ کنوز الحقائق حرف الیاء۔

۳۔ یوسف ۱۲:۴۰۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ[1] پس تم لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور اس قانون حق کو چھوڑ کر جو تمھارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ[2] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ خلیفہ بنتے ہیں تو اپنے پہلے خطبہ میں فرماتے ہیں: اِنْ اَحْسَنْتُ فَاَعِيْنُوْنِي وَاِنْ زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِي. اگر میں قانون کے تحت اچھا کام کروں تو میری مدد کرو اگر قانون سے ہٹ کر کجروی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کرو۔

صحابہ کرامؓ نے جواب میں کہا کہ ہم آپ کو نیزوں کو انیوں سے سیدھا کریں گے۔

۳۔ کلیاتی نظریہ عوام کی ہر قسم کی آزادی سلب کرتا ہے جب کہ اسلام عوام کو آزادی کی نعمت سے متمتع کرتا ہے۔ اسلام تو انسانوں کی گردنوں کو غلامی کے حلقہ سے آزاد کرانے آیا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ[3] سو وہ اونچی گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا اور تجھے کیا خبر کہ اونچی گھاٹی کیا ہے کسی گردن کو آزاد کرنا۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِىْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ اسلام ان بوجھوں کو اتارتا ہے جو لوگوں پر لدے ہوئے ہیں اور ہر قسم کی غلامی کے طوق اور پھندوں کو ان سے دور کرتا ہے۔

یہ آزادی کی پہلی آواز ہے جو آج سے چودہ سو سال پہلے مکہ کی بے آب و گیاہ وادی سے اٹھی اور اس آواز کا یہ اثر ہوا ہے کہ دنیا کے ہر ملک میں عوام نے اپنی آزادی کے لیے آواز اٹھائی۔ حتیٰ کہ اب اقوام متحدہ کے حقوق انسانی کے منشور میں آزادی کی دفعہ رکھ دی ہے۔

۴۔ نظرہ کلی جذبہ قومیت کو ابھارتا ہے۔ جو فساد کا باعث ہے۔ اسلام عالمگیر برادری کا علمبردار ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا[4] انسان ایک ہی امت تھے پھر الگ الگ ہو گئے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ[5] اے لوگو! اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمھیں ایک اصل سے پیدا کیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

1۔ المائدہ ۵: ۴۸۔ 2۔ المجادلہ ۵۸: ۲۰۔ 3۔ البلد ۹۰: ۱۱۔۱۳۔
4۔ یونس: ۱۹۔ 5۔ النساء ۴: ۱۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَرَبُّ کُلِّ شَیْءٍ اَشْھَدُ اِنَّ الْعِبَادَ کُلَّھُمْ اِخْوَۃٌ[1] اے ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی ہیں۔

۴۔ کلی نظام مذہب کا مخالف ہے

جب کہ اسلام سیاست کو دین کا ایک شعبہ قرار دیتا ہے۔ سیاست دین کے تابع ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔

اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامَ یعنی اللہ کے نزدیک اسلام ہی حقیقی دین ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَآءَ ھُمْ عَمَّا جَآءَ کَ مِنَ الْحَقِّ پس تم لوگوں کے درمیان نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اس قانون کو چھوڑ کر جو تمھارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو۔

نظریہ معاہدہ عمرانی (Theory of social contract)

یہ نظریہ زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے کہ ریاست معاہدہ عمرانی سے پیدا ہوئی ہے جس کا ذکر قدیم مقدس کتب اور فلسفیوں کی کتب میں پایا جاتا ہے۔ بائبل میں لکھا ہے:۔

> ''پس اسرائیل کے تمام اکابر جرون میں بادشاہ کے پاس آئے اور بادشاہ داود نے خداوند کے سامنے حبرون میں ان کے ساتھ ایک میثاق کیا اور انھوں نے داود کو اسرائیل کا بادشاہ بنایا۔''

اس نظریہ کی رو سے افراد اپنے ذمہ کچھ فرائض لے لیتے ہیں اور مملکت اپنے ذمے کچھ اختیارات لے لیتی ہے اور اپنے اپنے دائرہ اختیار میں کام کرتے ہیں۔

یہ نظریہ ظاہر کرتا ہے کہ مملکت کوئی الگ چیز نہیں ہے جس سے افراد معاہدہ کرتے ہیں بلکہ وہ ایک ایسا اجتماعی ادارہ ہوتا ہے جو افراد پر مشتمل ہوتا ہے۔ جب مملکت الگ وجود نہیں تو پھر افراد نے معاہدہ کس سے کیا۔ معاہدہ تو اسی صورت میں ہوسکتا ہے۔ جب دو پارٹیاں ہوں۔ اس نظریہ کے مبلغ ہابنر، لاک اور روسو ہیں۔

ہابنر کا نقطہ نگاہ

ہابنر کے نقطہ نگاہ سے انسان خود غرض اور مطلبی ہے اور اپنے مفاد کی خاطر ہی سوچتا ہے۔ دوسروں کے لیے ہمدردی کا جذبہ اپنے دل میں نہیں رکھتا۔ انسان کی اس فطری زندگی کا یہ نتیجہ ہوا کہ سب لوگ ایک دوسرے سے تنگ آگئے۔ زندگی کو بہتر بنانے کے لیے جمع ہوئے اور اپنے تمام اختیارات

1. احمد، ابو داؤد۔

کسی ایک فرد یا افراد کے مجموعہ کے سپرد کر دیے اس کے بدلہ میں ایک فرد یا افراد کے مجموعہ نے بقیہ افراد کی جان، مال اور عزت کی حفاظت اپنے ذمہ لے لی اور ریاست وجود میں آ گئی۔ بقول ہابز:

"اس طرح سے عظیم لیویاتھن پیدا ہوا۔ یا مقدس الفاظ میں یوں کہیے کہ اس طرح یہ فانی خدا جو لافانی خدا کے سایہ میں ہمارے امن و سلامتی کی حفاظت کرتا ہے وجود میں آیا۔"

ہابز کے مقتدر اعلیٰ کو کلی اختیار حاصل ہیں۔ وہ اپنے فیصلوں میں کسی آئین وضوابط کا پابند نہیں اس کے فیصلے ہی افراد کے لیے ضابطہ اخلاق اور قانون بن جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ مقتدر اعلیٰ دوسری حکومتوں کے ساتھ معاہدات بھی کسی ضابطہ اخلاق کے تحت نہیں کرتا۔ معاہدات کے متعلق ہابز کہتا ہے:

"تلوار کے بغیر معاہدات خالی الفاظ رہ جاتے ہیں۔ جن میں اپنی حفاظت کی کوئی قوت نہیں ہوتی۔"

تنقید

۱۔ ہابز کے نقطہ نگاہ سے انسان طبعی طور پر خود غرض ہے۔ وہ معاہدہ کے تحت کیسے اطاعت گزار اور قانون کا فرماں بردار اور پُرامن شہری بن سکتا ہے انسان قانون کا فرمانبردار اور پُرامن شہری اس وقت ہی بن سکتا ہے جب وہ فطرت صحیحہ پر پیدا ہو اور اس کے اندر نیکی کی استعدادیں موجود ہوں۔ اسلام کہتا ہے کہ انسان فطرت صحیحہ پر پیدا ہوا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فِطْرَةَ اللّٰهِ الَّتِىْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا لَا تَبْدِيْلَ لِخَلْقِ اللّٰهِ[1] اللہ کی بنائی ہوئی فطرت پر قائم رہ جس پر اس نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔ اللہ کی پیدائش کوئی بدل نہیں سکتا (فطرۃ اللہ وہ ہے جس میں نیکی اور بھلائی کا شعور ہو۔)

۲۔ اس نظریہ کے تحت فرد یا مجموعہ افراد کو جن کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہوتی ہے غیر محدود اختیارات حاصل ہوتے ہیں اور کوئی بھی اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند نہیں کر سکتا۔

اسلام میں مقتدر اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ ہے جو رئیس مملکت ہوگا۔ وہ خدا کا نائب ہوگا۔ اللہ کے دیے ہوئے اختیارات استعمال کرے گا۔ اگر وہ اپنے اختیارات میں کج روی اختیار کرتا ہے تو عوام کو یہ حق حاصل ہے کہ اس سے باز پرس کریں اگر سیدھے راستے پر نہ آئے تو عوام اس کو الگ کر سکتے ہیں۔

۳۔ اسلام معاہدات کو پورا کرنے کی تعلیم دیتا ہے اور خیانت کرنا حرام ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا. یعنی عہد پورا کرو جب تم خدا سے عہد کر چکو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد نہ توڑو۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِىْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ

---

[1] الروم ۳۰:۳۰۔

اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ یعنی اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ جو سوت کاتنے کے بعد اس کو خود ہی توڑ ڈالتی ہے۔ اپنی قسموں کو باہمی دھوکے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ اس خیال سے کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے زیادہ فائدہ میں رہے۔

اللہ تعالیٰ ایمان داروں کی تعریف میں فرماتا ہے: وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عَاهَدُوْا وہ اپنے عہدوں کو پورا کرتے ہیں جب عہد باندھ لیتے ہیں۔

لاک کا نقطہ نگاہ

نظریہ معاہدہ عمرانی کا دوسرا مبلغ لاک ہے۔ انسانی فطرت کے متعلق لاک کا نظریہ ہابز کے بالکل برعکس ہے۔ لاک کے نزدیک جب انسان قانون فطرت کے مطابق رہتا سہتا تھا تو پُرامن مطمئن تھا۔ اس کے نزدیک قانون فطرت عین مطابق عقل ہے۔ بعض ایسے انسان پیدا ہو گئے جنھوں نے عقل کی بجائے جذبات سے کام لینا شروع کر دیا تو سوسائٹی میں تصادم ہو گیا۔ اس تصادم اور بگاڑ کو روکنے کے لیے انسانوں نے ہمدردی کا معاہدہ کیا کہ ہمیں ایک ایسا نظام قائم کرنا چاہیے جس کے تحت فطری زندگی لوٹ آئے یعنی ہم صلح و آشتی سے زندگی بسر کرنا شروع کر دیں۔ انھوں نے سوچا کہ ایک حاکم ہو جو جھگڑوں وغیرہ کا فیصلہ کرے وہ حاکم اکثریت کی رائے سے منتخب ہو۔ اس لیے لاک کہتا ہے۔ حکومت کے نمائندے اکثریت کی رائے سے منتخب ہوں۔ مملکت کا ایک آئین ہو جس کے تحت حکومت اپنے فرائض انجام دے۔ اگر حکومت آئین کے مطابق اپنے فرائض سرانجام دینے میں ناکام ثابت ہو تو اس کی جگہ دوسری حکومت قائم کر دی جائے۔

> ”کسی حکومت کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ جو کچھ جی میں آئے کرتی رہے قانون فطرت وہ ابدی قانون ہے جو تمام انسانوں پر یکساں طور پر منطبق ہوتا ہے۔ خواہ وہ خود قانون ساز ہوں یا قانون کے تابع“۔[1]
>
> ”قانون ساز طاقت لوگوں کی رضامندی سے قائم ہوتی ہے اور دولت مشترکہ (یعنی ریاست) میں اعلیٰ طاقت بن جاتی ہے۔ مگر یہ بے اصولی طاقت نہیں ہوتی۔ اس کو صرف لوگوں کی بھلائی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ حکومت ایک طرح کی امانت ہے اور اس کو صرف وہی طاقتیں حاصل ہوتی ہیں جو حالت فطرت کو بدلتے وقت اسے ودیعت کی گئی تھیں“۔[2]

1. انسان نے کیا سوچا مصنفہ پرویز صاحب صفحہ ۲۱۷۔
2. تعارف سیاسیات مصنفہ مظہر الحق صفحہ ۸۰۔

اس نظریہ میں اپنی تمام خوبیوں اور محاسن کے باوجود ایک نقص ہے وہ یہ کہ لاک عوام کی حاکمیت اور بالادستی کا حامی ہے حالانکہ حاکمیت اور بالادستی قانون کی ہونی چاہیے۔

اسلام قانون کی بالادستی کا حامی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ. اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو صاحب امر ہو اس کی اطاعت کرو لیکن اگر تمہارا آپس میں یا صاحب امر کے ساتھ جھگڑا ہو جائے تو اللہ اور رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی طرف معاملہ پھیر دو یعنی قانون کی طرف۔

روسو کا نظریہ

روسو فرانس کا ایک عظیم فلسفی تھا اس نے ایک کتاب "معاہدہ عمرانی" لکھی ہے۔ جس میں مملکت کے متعلق اپنا نظریہ تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے۔ اس کا نظریہ ہابز کے نظریہ سے بالکل مختلف ہے روسو کے نزدیک انسان فطرتاً نیک ہے اور اس کا بہترین زمانہ ابتدائی تھا۔ جب انسانی زندگی خوشیوں اور مسرتوں سے لبریز تھی۔ ہر انسان تنہا زندگی بسر کرتا تھا اور اپنے بھائی بندوں کے جذبات اور احساسات کا خیال رکھتا تھا۔ نہ کوئی جھگڑا تھا اور نہ فساد ہر طرف امن کا دور دورہ تھا' مساوات اور آسودگی تھی' آزادی کی نعمت سے متمتع تھا۔ جوں جوں زمانہ گزرتا چلا گیا شہری زندگی کا آغاز ہوا۔ نئی نئی تحریکیں جنم لینے لگیں۔ زندگی میں پیچیدگیاں اور الجھنیں وسیع تر ہو گئیں۔ نئے نئے مسائل ابھر آئے' ضروریات اور احتیاجات میں اضافہ ہو گیا۔ مساوات اور آزادیاں ختم ہو گئیں' طاقت ور لوگوں نے اقتدار حاصل کر لیا' کمزور افراد ظلم وستم کا شکار بن گئے۔ ان تمام مشکلات پر قابو پانے کے لیے لوگوں نے غور وخوض کیا اور آپس میں معاہدہ کر کے مملکت کی بنیاد ڈالی۔ جو ہر فرد کے مال و جان اور عزت کی حفاظت کرے گی۔ روسو کے الفاظ میں مسئلہ ایک ایسے ادارہ کی تشکیل کا ہے۔ جو پوری مشترکہ طاقت سے ہر رکن ادارہ کی جان اور مال کا تحفظ کر سکے اور جس میں ہر ایک سب کے ساتھ مل کر صرف اپنی ہی اطاعت کرے اور اسی طرح آزاد رہے۔ جیسے پہلے تھا۔"

روسو کے نزدیک "اس معاہدہ کی رو سے ہر فرد اپنے تمام حقوق و اختیارات سمیت اپنے آپ کو اجتماعیت کے سپرد کر دیتا ہے۔"

اس لیے ہر فرد پر معاشرہ کے احکام کی اتباع لازمی ہے۔ روسو اس اقتدار اعلیٰ کو ارادہ عامہ (Genral will) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

معاہدہ عمرانی کی رو سے انسان نے کیا کھویا اور کیا پایا؟

روسو اس اہم سوال کا جواب یہ دیتا ہے "معاہدہ عمرانی کی رو سے انسان جو کچھ کھوتا ہے۔ وہ

یہ ہے کہ وہ اپنی فطری آزادی اور اپنے اس غیر محدود حق سے کہ جہاں تک اس کا بس چلے وہ ہر چیز پر جو اسے للچائے قابض ہونے کا مجاز ہے دست بردار ہو جاتا ہے۔'' لیکن اس کے بدلے اسے مدنی آزادی اور اس کی ملکیت پر اسے حق ملکیت حاصل ہوتا ہے جن کا تعین ارادہ عامہ کے ذریعہ ہوتا ہے۔

ارادہ عامہ کی وضاحت

روسو کے نزدیک ہر انسان میں دو ارادے ہوتے ہیں۔ حقیقی ارادہ (Real will) اور واقعی ارادہ (Actual will) اوّل الذکر ارادہ جو ہمیشہ صحیح ہوتا ہے اور دوسروں کی بھلائی اور بہبودی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ثانی الذکر ارادہ خود غرضی اور خود پسندی کا ارادہ ہوتا ہے جو انسان کی حیوانی خواہشات کے تابع ہوتا ہے اس ارادہ کے تحت انسان اپنے بھائی بندوں کو نقصان پہنچانے کی طرف مائل رہتا ہے۔

روسو انھیں ارادوں کے مجموعہ کو ارادہ عامہ کہتا ہے۔

ارادۂ عامہ کی خصوصیات

وحدانیت

یعنی ارادہ عامہ ایک ہی ہے اور اس کی مختلف شکلیں نہیں ہو سکتیں یہ قومی ارادوں میں اتحاد پیدا کرتا ہے۔

پائیداری

ارادہ عامہ مستقل اور پائیدار ہوتا ہے چونکہ یہ ارادہ تمام معاشرے کی بھلائی اور فلاح کا ضامن ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کا تعلق افراد کے ضمیر سے ہوتا ہے۔ یہ قومی ارادوں کو پائیداری اور استحکام عطا کرتا ہے۔

صحت

ارادہ عامہ ہمیشہ صحیح ارادہ ہوگا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ ظلم سے پاک ہے۔ روسو کہتا ہے۔ ارادہ تو صحیح ہوگا۔ لیکن اس کے متعلق فیصلہ غلط ہو سکتا ہے یعنی یہ کہ ارادہ عامہ ہے یا نہیں۔

ناقابل انتقال

روسو کے نزدیک ارادۂ عامہ کو اقتدار اعلیٰ حاصل ہے۔ اس بناء پر وہ لکھتا ہے کہ یہ ناقابل انتقال ہے۔ جس طرح انسانی زندگی ناقابل انتقال ہوتی ہے۔ اسی طرح اقتدار اعلیٰ جو ارادۂ عامہ کو

حاصل ہے غیر انتقال پذیر ہوتا ہے۔

اجتماعی ارادہ معلوم کرنے کا طریقہ

ارادہ عامہ معلوم کرنے کا کیا طریقہ ہوگا؟ اس کا جواب روسو خود دیتا ہے:

''مجھ سے پوچھا جائے گا کہ ارادہ عامہ کو معلوم کرنے کی صورت کیا ہوگی؟ کیا ہر موقعہ پر تمام کی تمام قوم کو اکٹھا کیا جائے گا؟ بالکل نہیں! اسے بہت کم اکٹھا کرنا چاہیے۔ اوّل تو اس لیے کہ یہ بھی ضروری نہیں کہ تمام افراد کا اجتماع بھی ''ارادہ عامہ'' کی صحیح تعبیر کر سکے۔ دوسری یہ کہ بڑی بڑی اقوام میں یہ ناممکن العمل بھی ہوگا۔ جن اقوام میں حکومت نیک نہاد ہوگی وہاں اس کی ضرورت ہی نہیں پیش آئے گی' اس لیے کہ ارباب حکومت اچھی طرح جانتے ہیں کہ ارادہ عامہ کا وہی فیصلہ ہوگا جس سے مفاد عامہ حاصل ہو۔''

تنقید

روسو کے نظریہ ارادہ عامہ پر مفکرین نے سخت تنقیدیں کی ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہا گیا ہے کہ یہ صرف نظریہ ہی ہے۔ اس کا عمل کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ حکمران اپنی صوابدید کے مطابق فیصلے کریں گے اور اسے ارادہ عامہ سے تعبیر کر دیں گے اور یہ ضروری نہیں کہ ہر حکومت نیک ہو اور اس کا ہر حکم صحیح اور درست ہو اور مفاد عامہ کے لیے ہو۔

مملکت کے ابتدائی نظریات

مملکت کا آغاز کس طرح ہوا' منتشر افراد نے کس طرح سوچا کہ انھیں مل جل کر ایک مملکت قائم کرنی چاہیے؟ اس سوال کے جوابات مغربی مفکرین سیاست نے دیے ہیں۔ وہ حسب ذیل ہیں:

قیاسی نظریات:

ا۔ نظریہ تخلیق ربانی (Divine theory)

سیاسی زندگی کے ابتدائی ادوار میں پروہتوں (Priests) کو ایک خاص مقام حاصل تھا وہ مافوق الفطرت قوتوں کے مالک تصور کیے جاتے تھے ہر شخص ان سے خوف کھاتا تھا اور ان کے حکم کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھاتا تھا۔ رفتہ رفتہ ان پروہتوں نے یہ سمجھ لیا کہ انھیں دوسرے لوگوں پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔

قدیم زمانہ میں مذہب اور حکومت دو علیحدہ چیزیں نہیں تھیں۔ مشرق کی تمام شہنشاہتیں اسی

عقیدہ کا نتیجہ تھیں۔ عوام کے دلوں میں یہ عقیدہ راسخ تھا کہ بادشاہ کو اختیارات دیوتاؤں کی طرف سے ودیعت کیے جاتے ہیں۔ عبرانیوں کا یہ عقیدہ تھا کہ خدا اقتدار کا سرچشمہ نہیں بلکہ وہ حکومت کے انتظام و انصرام میں بھی شریک ہے۔ اہل یونان اور اہل روما نے یہ اعلان کیا کہ مملکت ایک انسانی تنظیم تو ہے لیکن بلاواسطہ وہ ربانی (Divine) بھی ہے۔

اس نظریہ کی رو سے مملکت انسان کی بنائی ہوئی نہیں ہے بلکہ خدا کی بنائی ہوئی ہے اس کے قیام سے انسان کا کوئی تعلق نہیں اس کا آغاز اللہ کی مرضی سے ہوا ہے اس وجہ سے سیاسی اقتدار کا سرچشمہ اس کی ذات ہے۔ اللہ تعالیٰ انسانوں میں سے ایک اپنا نائب مقرر کرتا ہے اور بندوں کی حکومت اس کو سونپ دی جاتی ہے۔ بادشاہ خلیفۃ اللہ ہونے کی حیثیت سے خدا کے سامنے جوابدہ ہے۔ عوام کے سامنے نہیں اس کا ہر حکم قانون ہے کوئی شخص اس کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اگر کوئی خلاف ورزی کرتا ہے تو وہ گویا خدا کے احکام کو توڑ رہا ہے اور وہ خدا کا باغی ہوگا انگلستان کے اسٹیورٹ خاندان کے پہلے بادشاہ جیمس اوّل نے اس نظریہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے۔

"جس طرح خدا کے افعال پر نقطہ چینی کرنا غیر مذہبیت اور الحاد ہے اسی طرح رعایا کو بادشاہ کے حرکات و سکنات پر تنازع پیدا کرنا قابل تحقیر ہے۔"

نظریہ تخلیق ربانی کے تین بنیادی تصور ہیں۔

اوّل۔ یہ کہ ریاست خدا کی تخلیق ہے۔ اس کو انسان نے نہیں بنایا بلکہ یہ خدا کی جانب قائم کی گئی ہے۔ دوم۔ بادشاہوں کو خدا نے مقرر کیا ہے۔ سوم۔ وہ اپنے افعال و کردار کے لیے صرف خدا کے سامنے جواب دہ ہیں لہٰذا ریاست اور اس کے قوانین خدا کے بنائے ہوئے ہیں جو ان کی مخالفت کرتا ہے وہ خدا کی مخالفت کرتا ہے ریاست کے قوانین کی خلاف ورزی کرنا صرف جرم ہی نہیں بلکہ گناہ بھی ہے بادشاہ خدا کا نائب ہے بادشاہ ظل اللہ ہے اس لیے عوام کو ہر اس کی اطاعت لازمی ہے۔

تنقید

ریاست انسانی تخلیق ہے۔ جب زمین پر تمدنی زندگی کا آغاز ہوا۔ معاشرہ میں نئے نئے مسائل ابھرے تو ان مسائل میں سے ایک مسئلہ دفاع کا تھا کیونکہ قرب و جوار کے رہنے والے قبائل ایک دوسرے پر حملہ آور ہوتے اور لوٹ مار کرتے۔ ہر قبیلہ نے اپنے دفاع کے لیے تنظیم قائم کی۔ وہی تنظیم آخر میں ریاست کی شکل اختیار کر گئی۔ مختلف قسم کے قوانین بننے لگے۔ آخرکار قبیلہ کے سربراہ نے طاقت حاصل کر لی۔ آہستہ آہستہ قبیلہ کی سربراہی بادشاہت کی شکل اختیار کر گئی۔ بادشاہ نے عوام پر گرفت کو مضبوط کرنے کے لیے یہ نظریہ اختراع کر لیا کہ وہ خدا کا نائب ہے۔

یہ نظریہ اسلام کی سیاسی تعلیم کے سراسر مخالف ہے اسلام صرف اللہ تعالیٰ کو ہی تمام طاقتوں

اور اختیارات کا سرچشمہ قرار دیتا ہے اور اسی کی حاکمیت کا قائل ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: اِنِ الْحُکْمُ اِلَّا لِلّٰہِ ۱حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہی حاصل ہے جو امارت کے منصب پر متمکن ہوگا۔ وہ صرف اللہ کے قانون کے تابع ہوگا۔ اگر وہ قوانین الٰہی سے سرمو انحراف کرے تو عوام کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ امیر کو معزول کر دیں۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ ۲ جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں فرمایا: فَاِنْ اَنَا اَحْسَنْتُ فَاَعِیْنُوْنِیْ وَاِنْ اَنَا زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِیْ پس اگر میں نیکی کی زندگی اختیار کروں تو میری مدد کرو اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔

۲۔ نظریہ قوت (Force theory)

اس نظریہ کی رو سے مملکت کا آغاز فتوحات کی بناء پر ہوا۔ وہ اس طرح کہ کسی قوی اور مضبوط سردار نے دوسروں کو زیر کر لیا اور ان پر اپنی فرمانروائی قائم کر لی۔ پھر ان کی مدد سے اردگرد کے قبائل اور اقوام کو زیر کرنا شروع کر دیا۔ جب اس کی قوت بڑھ گئی تو اس نے اپنی حکومت کا اعلان کر دیا۔ یہ اصول ہر جگہ کارفرما نظر آتا ہے۔ آج بھی یہی ہے اور آج سے ہزاروں سال پہلے بھی یہی تھا۔ قوی کمزور پر غالب آ جاتا ہے۔ قوی حاکم بن کر اور کمزور مغلوب ہو کر زندگی بسر کرتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے قوت ہی حق کی دلیل ہے۔ پلوٹارک نے (سوانح کمیلوس باب ۱۷) میں برنوس شاہ گال کی زبان سے یہ نظریہ بیان کیا ہے۔ ''تمام قوانین میں سب سے قدیم تر قانون وہ ہے جو قوی کو کمزور پر حکمران بناتا ہے۔''

یہ بھی ایک قدیم نظریہ ہے اور مفکرین نے بھی پیش کیا ہے افلاطون نے اپنی کتاب ''جمہوریہ'' میں اس کا ذکر کیا ہے اگرچہ اس نے اس کو رد کیا ہے۔ انیسویں صدی میں انفرادیت پسند مفکرین نے اس کی تائید کی ہے نیز سوشلسٹ مفکرین نے ریاست کو طاقت ور امیروں کی انجمن قرار دیا ہے۔ جرمن مفکرین جو فوجیت یا نازیت کے حامی ہیں اس کو بہت سراہا ہے۔

تنقید

اس نظریے کے مطابق ریاست جبر و طاقت سے وجود میں آئی قدیم زمانوں میں ایک طاقتور شخص اپنے جنگجو گروہ کی مدد سے کمزور گروہوں کو زیر کر لیتا اور خود بادشاہ بن جاتا۔ اپنے مطیع قبائل کو اطاعت پر مجبور کرتا اور جو کچھ وہ کہتا وہ قانون ہوتا تھا۔ جو شخص اس کے حکم یا قانون سے روگردانی کرتا تھا اس کا سر قلم کر دیا جاتا اس طرح جبر و طاقت نے بادشاہ کو جنم دیا اور ریاست وجود میں آئی۔

۱ سورۃ یوسف: ۴۰۔ ۲ المجادلہ: ۲۰۔

ایڈورڈ جنکس لکھتا ہے ''تاریخی لحاظ سے یہ بات ثابت کرنے میں ذرہ برابر بھی وقت محسوس نہیں ہو گی کہ آج کل کی تمام سیاسی جماعتوں کی بنیاد کامیاب فنون جنگ سے بڑی ہے۔''[1]

پھر لکھتا ہے ''جب کوئی سالار جنگ یا سپہ سالار اپنے جنگجو اور جرار رفقاء کی مدد سے کسی وسیع رقبہ کے خاص علاقہ پر قبضہ کر لیا کرتا تھا تو مملکت کی بنیاد پر جاتی تھی۔''[2]

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ بے شمار ریاستیں جبر و قوت سے وجود میں آئیں نویں صدی میں انگلستان کے اندر یہی ہوا جب ہفت شاہی Heplarchy کی برائے نام ''قبائلی سلطنتیں'' سالہا سال تک اقبال و زوال کی صورتیں دیکھنے کے بعد ایگبرٹ (Egbert) کی ماتحتی میں کم و بیش استحکام پذیر ہو گئیں'' تو انگلستان کی بادشاہت وجود میں آ گئی۔ یہی کیفیت ممالک ناروے اور سویڈن کی ہوئی جہاں بے شمار قبائل ملک بالآخر ایک ہو گئے اور سخت جنگ و جدال کے بعد تین مملکتیں قائم ہو گئیں یعنی ناروے سویڈن اور ڈنمارک اور یہی حال سکاٹ لینڈ ویلز اور آئرستان میں ہوا اور یہی حشر وسطی یورپ کا ہوا۔ اس طرح عراق' ایران، مصر، ترکستان، ہندوستان کے ممالک میں قبائل کی جنگوں کے بعد بادشاہتیں اور سلطنتیں وجود میں آئیں۔ سلفن لیکاک لکھتا ہے ''قبیلہ سے بادشاہت سے سلطنت ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں جن سے ریاست وجود میں آئی۔''

مفکرین کے نزدیک ریاست کے ارتقاء کے علاوہ اس کی بقا اور سلامتی کے لیے بھی جبر و طاقت کا استعمال ضروری ہوتا ہے۔ ناقص قانون امن اور باغیوں کی سرکوبی اسی نظریے کے تحت کی جاتی ہے اور یہی نظریہ مملکت میں امن قائم رکھتا ہے۔

پروشیا (Prussia) کے مشہور مورخ ٹرائچکے (Treitschke) کہتا ہے ''مملکت اقدام و دفاع کی قوت عامہ ہے جس کا پہلا کام جنگ کرنا اور انصاف کا انتظام کرنا ہے۔''

ایک جرمن مفکر جنرل فون برن ہارڈی کہتا ہے ''قوت ہی اعلیٰ حق ہے اور جب یہ سوال پیدا ہو کہ حق کیا ہے تو اس کا حل جنگ کی ثالثی ہی سے ہو سکتا ہے۔ جنگ انسان کے لیے ایک حیاتیاتی ضرورت ہے اور حیاتیاتی حیثیت سے ایک صحیح فیصلہ صادر کرتی ہے کیونکہ اس کا فیصلہ اشیاء کی عین فطرت پر مبنی ہوتا ہے۔''[3]

تنقید

اس نظریے کے حامی صرف جبر و قوت کو ہی ریاست کے آغاز' قیام اور بقا کے لیے واحد لازمی عنصر قرار دیتے ہیں۔ یہ عقل کے منافی ہے۔ ریاست کی بقا کے لیے جبر و قوت مختلف عناصر میں

1. تاریخ سیاسیات صفحہ ۷۷ (دار الطبع عثمانیہ)
2. تاریخ سیاسیات صفحہ ۸۰۔
3. اصول علم سیاسیات از گلکرسٹ صفحہ ۱۰۸ (دار الطبع عثمانیہ)

سے ایک عنصر ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی عنصر ہیں۔ مثلاً انصاف' اتحاد' رواداری' حقوق انسانی کا تحفظ (خصوصاً جان و مال اور آبرو کی حفاظت) مساوات بین الناس اور شورائی نظام بہت ضروری عناصر ہیں۔ ان عناصر کی عدم موجودگی کی وجہ سے کسی ریاست کا زوال اور تباہی لازمی ہے تاریخ بھی یہی بتاتی ہے جس ریاست میں انصاف ختم ہوا۔ ظلم نے جنم لیا۔ حقوق انسانی کو پامال کیا گیا۔ وہی سلطنت دنیا کے نقشہ سے مٹ گئی۔

تاریخ ہمیں بتاتی ہے جو ریاستیں محض طاقت کے ذریعہ قائم رہنا چاہتی ہیں وہ جلد مٹ جاتی ہیں جو تلوار پر جیتے ہیں وہ بالآخر تلوار سے ہی مرتے ہیں۔ جابر حکمران اپنے جبر کے جال میں ہی پھنستے ہیں۔ ایک انگریز فلسفی گرین نے ٹھیک کہا ہے کہ ''طاقت نہیں مرضی ریاست کی بنیاد ہے'' یعنی ریاست کی بقا عوام کی مرضی پر ہے۔ جب تک ریاست میں عوام کی مرضی شامل نہ ہو۔ وہ ریاست قائم نہیں ہو سکتی۔ قرآن مجید نے بھی یہی کہا ''اَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ'' کہ مسلمان اپنے حکومتی امور عوام کی مرضی اور شوریٰ سے طے پاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ حکم دیا ہے شَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ یعنی ریاستی امور میں عوام سے مشورہ لے۔

آج تمام دنیا اس نظریہ کی عملی تردید کر رہی ہے اب دنیا کی تمام ریاستوں کی بنیاد جمہوریت یعنی عوام کی مرضی پر ہے ۱۷۸۹ء میں فرانس میں اور ۱۹۱۷ء میں روس اور ۱۹۷۹ء میں ایران میں جبر و قوت کے خلاف ہی انقلاب آئے۔

دوسرا نقص اس نظریہ کا یہ ہے کہ اس نظریہ نے ریاست میں ظلم و ستم کو جنم دیا۔ صاحب اقتدار نے عوام کے حقوق غصب کیے اور ان کو غلامی کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کیا۔ بعض کی رائے یہ ہے کہ یہ معاہدہ دو درجوں میں وقوع پذیر ہوا۔ پہلا معاہدہ لوگوں نے آپس میں کیا۔ جس سے انھوں نے معاشرہ یا ریاست قائم کی۔ اس کو معاشرتی معاہدہ کہتے ہیں۔ دوسرا معاہدہ لوگوں اور حکمران کے درمیان ہوا۔ جس کو حکومتی معاہدہ کہتے ہیں۔ اس کی بناء پر حکومت قائم ہوئی۔

شہریاتی معاشرہ یا ریاست (Civil sosiety or state) معاشرتی معاہدے کی وجہ سے ریاست یا شہریاتی (سول) معاشرہ وجود میں آیا اور اس کی سیاسی تنظیم حاکم اور محکوم کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اسی تنظیم کی وجہ سے شہری آزادی اور شہری حقوق قائم ہوئے اس معاہدہ کی رو سے حاکم ہر شخص کی جان مال اور آبرو کی حفاظت کرتا تھا۔ لوگ ایک نظام کے تحت زندگی بسر کرنے لگے۔ لاقانونیت ختم ہو گئی ریاست نے ہر شخص کو حقوق بخشے اور کچھ فرائض عائد کیے۔ اگر حاکم اپنے دیے ہوئے حقوق کی نگہداشت نہیں کرتا تو معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہا ہے۔ عوام کو حق حاصل ہے اس سے حکمرانی کا عہدہ

چھین لے۔ اگر عوام اپنے فرائض ادا نہیں کرتے تو وہ مجرم ہیں۔ مستوجب سزا ہیں۔ اس طرح اس معاہدہ کے تحت حقوق و فرائض متعین کر دیئے گئے۔ ہر دو فریق نے حقوق و فرائض کو ادا کرنا ہے۔

نظریہ معاہدہ عمرانی (Social contract theory)

یہ نظریہ بے حد مقبول ہے اس نظریہ کی رو سے ایک سوسائٹی کے افراد باہمی رضامندی سے یہ فیصلہ کرتے ہیں۔ کہ ہم سب مل کر ایک اجتماعی نظام قائم کریں جس میں افراد کے مسائل اور حقوق کی نگہداشت کی جائے۔ اس نظام میں عوام اور ریاست کے حقوق و فرائض متعین کرائے جاتے ہیں۔

اس نظریہ کا ذکر قدیم تاریخ میں بھی ملتا ہے۔ مثال کے طور پر بائبل کے عہدنامہ میں کہا گیا ہے کہ "پس اسرائیل کے تمام اکابر جزون میں بادشاہ کے پاس آئے اور بادشاہ داؤد نے خداوند کے سامنے جروں میں ان کے ساتھ ایک میثاق کیا اور انھوں نے داؤد کو اسرائیل کا بادشاہ بنایا۔"[1]

افلاطون اور ارسطو نے بھی اس نظریہ کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ یہ دونوں اس کو رد بھی کرتے ہیں افلاطون نے اپنی کتاب "جمہوریہ" میں ایک سوفسطائی مفکر گلاکون کی زبانی اس نظریہ کو پیش کرتا ہے مگر اس کی تائید نہیں کرتا یونانیوں کے بعد رومیوں نے اس نظریے کی کچھ تائید کی اس کے بعد قرون وسطیٰ میں اس نظریے کو مختلف انداز میں بیان کیا جاتا رہا۔ اسلام کے معاہدہ میثاق سے بھی کچھ اس نظریہ کی تائید ہوتی ہے۔

سولھویں صدی سے لے کر اٹھارویں صدی تک یہ نظریہ یورپ کے مفکرین کے زیر بحث رہا۔ جن میں ہابز Hobbes لاک Locke) اور روسو Rouseau خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق ریاست کے آغاز اور ارتقاء تین مدارج سے گزرتے ہیں۔ جن کو اصطلاح میں ا۔ حالت فطرت۔ ۲۔ معاشرتی معاہدہ اور ۳۔ سول یا شہریاتی معاشرہ یا ریاست کہتے ہیں۔ گویا یہ نظریہ انسان کی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک حصہ جو معاشرتی معاہدے سے پہلے گزرا جس کو حالت فطرت کا نام دیا جاتا ہے۔ ۲۔ دوسرا جو معاشرتی معاہدے کے بعد گزرا جس کو شہریاتی معاشرہ یا ریاست کا نام دیا جاتا ہے ان دونوں کے درمیان معاشرتی معاہدہ آیا۔ جس نے انسان کی زندگی میں تبدیلی پیدا کر دی۔

تینوں مدارج کی مختصر وضاحت یہ ہے۔

حالت فطرت (State of nature)

ریاست کے وجود میں آنے سے پہلے انسان ایسی حالت میں رہتا تھا۔ نہ کوئی ریاست تھی نہ

1. اصول علم ریاست از گلکرسٹ ص ۷۵۔

کوئی قانون نہ کوئی حاکم نہ کوئی محکوم نہ کوئی پابندی۔ انسان بغیر کسی پابندی بغیر کسی ضابطے بغیر کسی قانون کے زندگی بسر کرتے تھے۔ اگر کوئی قانون اس کی راہنمائی کرتا تو وہ قوانین فطرت تھے جو فطرت نے بنائے تھے اور انسان اپنی عقل اور فہم اور ادراک کے مطابق ان قوانین کو سمجھتا اور ان پر عمل کرتا۔ حالت فطرت میں ہر انسان کو چند فطری حقوق حاصل تھے جو فطرت نے اس کو عطا کیے تھے مگر ان کی حفاظت بھی اپنی ذاتی طاقت سے کرتا تھا اس حالت فطرت میں انسان بہت خطرات اور مشکلات میں گھرا ہوا تھا۔ جنگلی وحشیوں کی طرح زندگی بسر کرتا تھا۔ سو انسان نے مشکلات سے نجات پانے اور قواعد وضوابط کے تحت زندگی بسر کرنے کے لیے معاشری معاہدہ کیا۔ بعض مفکرین کی یہ رائے ہے کہ یہ معاہدہ ایک ہی وقت ہوا جس سے معاشرہ اور سیاسی تنظیم قائم ہو گئے۔

شہریاتی معاشرہ یا ریاست (Civil society or state)

معاشرتی معاہدہ کی وجہ سے ریاست یا شہریاتی (سول) معاشرہ وجود میں آیا۔ اس کی سیاسی تنظیم نے حاکم اور محکوم دو طبقے پیدا کیے اور حقوق فرائض متعین کیے گئے۔ حاکم کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا کہ وہ شہریوں کے حقوق کی نگہداشت کرے اور شہریوں کے لیے یہ فرض کیا گیا کہ وہ اپنے فرائض ادا کریں۔ اگر ایک حاکم اپنے فرائض ادا نہیں کرتا تو رعایا کو یہ حق ہے کہ وہ اس سے اقتدار چھین لے۔ اگر رعایا میں سے کوئی اپنا فرض ادا نہیں کرتا تو مستوجب سزا قرار پائے گا۔ اس معاہدے کی رو سے انسان کی جنگلی زندگی ختم ہو گئی۔

اسلام قوت کے بل بوتے پر دوسروں کو زیر کرنے کا حامی نہیں۔ اسلام صرف دفاع کے لیے قوت استعمال کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ (بقرہ) اور اللہ کے راستہ میں جنگ کرو صرف ان لوگوں سے جو تم سے لڑتے ہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا [1] ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا۔

۲۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ مملکت کا آغاز صرف فتوحات پر مبنی ہے بلکہ قوت کے پہلو بہ پہلو اور بھی بہت سی قوتوں اور ضرورتوں نے مملکت کے ڈھانچے کو جنم دیا۔

۳۔ یہ نظریہ ذاتی آزادی اور قانون کی نفی کرتا ہے۔

۴۔ جبر و قوت کا اصول انسانی سوسائٹی کے لیے غیر موزوں ہے۔

۳۔ نظریہ معاہدہ عمرانی (Socialcontract theory)

یہ نظریہ بے حد مقبول ہے اس نظریہ کی رو سے ایک سوسائٹی کے افراد باہمی رضامندی سے

[1] الحج: ۳۹

یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم سب مل کر ایک اجتماعی نظام قائم کریں۔ جس میں افراد کے مسائل اور حقوق اور مملکت کے فرائض اور حقوق مقرر کر دیئے جاتے ہیں۔

اس نظریہ کا قدیم مسکن یونان تھا۔ لیکن اسے اٹھارویں صدی میں یورپ میں ہابز (Hobbes) لاک (Locke) اور روسیو (Rouseau) نے خاص طور پر پھیلایا۔ اسی نظریہ پر جمہوریت کی بنیاد ہے یعنی لوگوں کی حکومت باہمی رضامندی ہے۔

تنقید

محاسن

اس نظریہ سے یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ مملکت انسانوں کی کوشش کا ثمرہ ہے۔ رائے عامہ سے بنائی جاتی ہے اور کسی ایک شخص کو لوگوں پر حکومت کرنے کا حق نہیں۔ اگر رئیس مملکت لوگوں کے مفاد کے خلاف کام کرے تو اس کو الگ کیا جا سکتا ہے۔

نقائص

۱۔ اس نظریہ کی رو سے مملکت ایک مصنوعی چیز ہو جاتی ہے اور مملکت اور عوام کا تعلق عارضی ہوتا ہے۔ لیکن قدیم سے سیاسی مفکرین یہ کہتے چلے آ رہے ہیں کہ عوام اور مملکت میں ایک گہرا رشتہ ہے اور ہمیشہ ہے۔

۲۔ اوّل تو تاریخی نقطہ نگاہ سے یہ بات ثابت نہیں کہ لوگوں نے کبھی مملکت بنانے کے لیے معاہدہ کیا تھا، اگر مان بھی لیا جائے تو یہ کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ معاہدہ کرنے والوں کی اولاد بھی اس معاہدہ کی پابند رہے گی اور ان تمام شرائط کو مان لے گی جن کے تحت وہ معاہدہ ہوا تھا۔

مادرسری یا اموی نظریہ (Matriarchal theory)

انیسویں صدی کے آخر میں ماہرین سیاست نے ایک قدیم معاشرے کی ٹوہ لگائی۔ اس کو مادرسری یا اموی معاشرہ کہا جاتا ہے۔ اس نظریہ کے مویدین میں مکلینن (Melenan) کی تصنیف ''دور اوّلین کا معاشرہ (Primitive society) مورگن (Morgan) کی تصنیف قدیم معاشرے (Ancient society) فریڈرک اینگلز (Frederick engels) کی تصنیف ''کنبہ ملکیت اور ریاست کا آغاز (The origin of Family, Property and State) اور ایڈورڈ جنکس (Edward Jenks) کی تصنیف ''تاریخ سیاست'' (A history of politics) قابل ذکر ہیں:

ان محققین نے مادری سری معاشرے کی تلاش قدیم کتابوں اور دور حاضر کے قدیمی انسانی گروہوں امریکہ افریقہ ہندوستان ملایا اور آسٹریلیا کے قدیمی قبائل کے بود و باش اور رہنے سہنے کے طور طریقوں میں تلاش کیا ہے۔ مادرسری معاشرہ کرہ ارض کے ان علاقوں میں پایا جاتا ہے جو پدرسری معاشرے کے اردگرد امریکہ افریقہ ایشیا اور آسٹریلیا کے دور دراز خطوں میں واقع ہیں۔

اس نظریہ کی رو سے مرد کی جگہ بزرگ عورت کو اختیارات دیے جاتے ہیں اور اس کو قبیلہ کا سربراہ تسلیم کیا جاتا ہے اور اس کے فیصلوں اور حکام کے سامنے سب کو سر تسلیم خم کرنا پڑتا ہے جب قبل از تاریخ کے انسان نے اوزار اور ہتھیار ایجاد کیے۔ زراعت اور گلہ بانی اختیار کی مادرسری معاشرہ کمزور ہو گیا مرد نے کنبہ میں اپنی محنت اور کسب کی وجہ سے امتیازی حیثیت اختیار کر لی۔ آخر کار عورت کا مقام گھٹ گیا اور اس کی جگہ مرد نے لے لی۔

تنقید

یہ نظریہ ریاست کی بجائے انسانی معاشرے کے آغاز اور ارتقاء کی وضاحت کرتا ہے۔

نظریہ پدرسری (Patriarchal theory)

اس نظریہ کی رو سے مملکت کی ابتدا خاندان کے بزرگ فرد کے اختیارات سے ہوتی ہے ہر خاندان میں ایک بزرگ ہوتا ہے جس کے احکام کے مطابق خاندان کے تمام افراد اپنے اپنے فرائض انجام دیتے ہیں اور اس کے ہر حکم کی فرمانبرداری کرتے ہیں۔ جب مختلف خاندان ایک قبیلہ کی شکل اختیار کرتے ہیں تو اس قبیلہ کا انتظام چلانے کے لیے ایک شخص کو بزرگ تسلیم کر لیا جاتا تھا وہ واجب الاحترام اور واجب الاتباع سمجھا جاتا تھا۔ جب قبائل میں باقاعدہ تنظیم آ گئی تو انھوں نے دوسرے قبائل پر حملہ کر کے مغلوب کرنے کی کوشش کی۔ اس طرح مملکت کی بنیاد پڑ گئی۔ ارسطو سے لے کر انیسویں صدی تک علماء سیاست کی ایک نہ ایک جماعت نے اس نظریہ کی تائید کی ہے دور حاضر میں اس نظریہ کا بڑا موید سر ہنری مین (Sir Henry Main) ہے مین نے قدیم یونان اور روما کے معاشرہ کا گہرا مطالعہ کیا تھا جس کے بعد اس نے پدرسری نظریہ قائم کیا۔ اس نظریہ کو اس نے اپنی دو کتابوں "قدیم قانون" (Ancient Law) اور اداروں کی ابتدائی تاریخ (Early History of Institutions) میں بیان کیا ہے۔

مین کے مطابق قدیم معاشرے کا بنیادی ادارہ کنبہ یا خاندان ہے وہ اپنی تصنیف "قدیم قانون" میں رقمطراز ہے "ابتدائی گروہ کنبہ ہے جس میں تعلقات سب سے معمر مرد مورث پر موقوف ہوتے ہیں (ایسے مرد کو قدیم رومی پاتر فامیلیا Pater Familia) کہتے ہیں اور قدیم ہندی کرتا کہتے تھے کئی کنبے مل کر ایک خیل یا برادری (Gens) بناتے ہیں۔ جن میں سب سے بزرگ مرد سردار ہوتا

تھا۔ کئی خیل سے مل کر ایک قبیلہ بنتا ہے اور قبیلوں کا مجموعہ دولت عامہ یا ریاست بن جاتی۔"
اپنے نظریہ کے ثبوت میں مین قدیم روما یونان اور ہندوستان کے تاریخی شواہد پیش کرتا ہے مثلاً رومیوں میں خاندان کے مرد سربراہ کو اپنے کنبے کے تمام افراد اور املاک پر اختیار اعلیٰ حاصل ہوتا ہے جس کو وہ پاتر یا پوتیستاس (Patria potestas) یعنی باپ کا اختیار اعلیٰ کہتے ہیں کنبہ کا معمر ترین مرد اپنے کنبے کے افراد اور ان کی املاک پر پوری طرح قابض ہوتا ہے یہ اختیار غیر محدود اقتدار کے برابر تھا وہ چاہے تو کسی رکن کو کنبہ سے عاق بھی کر سکتا تھا۔ اس کی املاک کو اپنے تصرف میں لا سکتا تھا۔ اس کی بیوی اور بچے اس کے غلام کی جیسی حیثیت رکھتے تھے۔ جوں جوں کنبہ پھیل کر قبیلہ اور قوم بنتا گیا۔ ساتھ ہی وہ قوم یا ملک پر مختار کل حکمران بن گیا۔ لہٰذا ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ "ریاست محض بڑے پیمانہ پر کنبہ ہے۔" علاوہ بریں ابوی کنبہ سے پہلے اموی معاشرہ ہوتا تھا۔

مملکت کی تاریخی ترقی (Evolution of the stste)

ارسطو اپنی کتاب "سیاسیات" میں لکھتا ہے۔ "مملکت ایک سیاسی ادارہ ہے انسان فطری طور پر ایک سیاسی حیوان ہے' اس سے یہ بات واضح ہوتی کہ انسان طبعی طور پر مدنی الطبع ہے اور وہ دوسروں کے ساتھ مل جل کر زندگی بسر کرنے پر مجبور ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر ایسی قوتیں ودیعت کر رکھی ہیں کہ وہ باہمی تعلقات کو منظم کرے اس فطری اہلیت کی بناء پر تنظیم کی ابتداء ہوئی۔ جس نے رفتہ رفتہ مملکت کی شکل اختیار کر لی۔ مملکت کی ابتداء مختلف اثرات کے تحت ہوتی ہے مثلاً معاشی ضروریات امن جان مال اور آبرو کی حفاظت وغیرہ وہ تمام عناصر ہیں جن کی وجہ سے مملکت کا آغاز ہوا۔
بقول گارنر (Ganner) ریاست نہ تو خدا کی تخلیق ہے نہ ہی برتر طاقت کا نتیجہ ہے نہ ہی معاشری معاہدے سے پیدا ہوئی ہے اور نہ ہی کنبہ کے پھیلاؤ سے وجود میں آئی ہے۔" بلکہ تاریخی ارتقاء اور ترقی کی پیداوار ہے جو ہزاروں سالوں میں لاتعداد شکلیں اختیار کرنے کے بعد دور حاضر کی ریاست منصۂ شہود پر آئی۔

مملکت کی قسمیں

جس طرح مملکت کو وجود میں آنے کے لحاظ سے مختلف نظریوں کے تحت تقسیم کیا گیا ہے۔ اسی طرح مملکت کو اختیارات اور اسالیب کے لحاظ سے مختلف انواع میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ یونان قدیم میں ارسطو نے حکومت کی تقسیم تین طرح سے کی ہے۔

۱۔ ایک شخص کی حکومت (بادشاہت)
۲۔ چند مخصوص افراد کی حکومت (اشرافیہ)

۳۔ بہت سے افراد کی حکومت (دستوریہ حکومت)

اب ہم ان اقسام کی مختصر تشریح کرتے ہیں:

ارسطو ایسی ریاست کو جس کا حکمران فرد واحد ہو جو عوام کی بہبود اور فلاح کے لیے حکومت کرتا ہے۔ ملوکیہ (Monarchy) کا نام دیتا ہے۔ جب بادشاہ عوام کی فلاح و بہبود کی بجائے محض ذاتی اغراض کے لیے حکومت کرتا ہے۔ تو ایسی ریاست کو ارسطو جابرانہ حکومت (Tyranny) کا نام دیتا ہے۔

جب بادشاہ کے ظلم و ستم بڑھ جاتے ہیں اور عوام عدل و انصاف سے محروم ہو جاتے ہیں تو معاشرے سے چند افراد عوام کی بھلائی اور عدل و انصاف کا ترازو قائم کرنے کے لیے اٹھتے ہیں اور جابر بادشاہ کی حکومت کو ختم کر دیتے ہیں اور اپنی حکومت قائم کر لیتے ہیں۔ ارسطو اس ریاست کو اشرافیہ (Aristocracy) کے نام سے موسوم کرتا ہے۔

کچھ عرصہ کے بعد اچھے حکمرانوں کی جگہ دولت مند افراد نظام حکومت اپنے ہاتھ میں سنبھال لیتے ہیں وہ دولت مند حکمران طبقہ اپنی خود غرضانہ اغراض کے لیے حکومت کرتا ہے۔ ارسطو اس ریاست کو عدیدیہ (Oligorchy) کہتا ہے۔

جب دولت مند حکمران افراد کے ظلم انتہا کو پہنچ جاتے ہیں تو عوام ان کی حکومت کو ختم کر دیتے ہیں۔ وہ آئین کے مطابق حکومت چلاتے ہیں۔ ارسطو ایسی حکومت دستوریہ (Polity) کہتا ہے۔

ارسطو اس طرز حکومت کو مثالی حکومت کہتا ہے۔

جب کثیر التعداد افراد آئین کو چھوڑ کر اپنی خود غرضانہ اغراض کے لیے حکومت کرنا شروع کر دیں تو مملکت مخرب ہو کر عمومیہ (Democracy) بن جاتی ہے۔

نقشہ

حاکموں کی تعداد	عمدہ مملکت	خراب مملکت
فرد واحد کی حکومت	بادشاہت	جابرانہ حکومت
چند افراد کی حکومت	اشرافیہ	عدیدیہ
بہت سے لوگوں کی حکومت	دستوریہ	عمومیہ

میکیاویلی کی تقسیم

میکیاویلی ارسطو کی تقسیم مملکت کو تسلیم کرتا ہے۔ البتہ ایک نوع کا اضافہ کرتا ہے۔ جسے وہ

"مرکب حکومت" (Mixed State) قرار دیتا ہے۔

جین بودان (Jenbodin) ارسطو کی طرح حاکموں کی تعداد کے لحاظ سے مملکت کی تین انواع بیان کرتا ہے:

بادشاہت

(Monarchy) جس کی تین قسمیں ہیں:

ا۔ استبدادی

(Desfotism) جس میں رعایا کو غلام تصور کیا جاتا ہے۔

ب۔ شاہی

(Royal Monarchy) جس میں بادشاہ قانون کی پابندی کرتا ہے اور رعایا کی فلاح و بہبود کا خیال رکھتا ہے۔

ج۔ قہرمانیت

(Tyranny) جس میں بادشاہ قانون کی کوئی پرواہ نہیں کرتا عوام پر ظلم وستم ڈھائے جاتے ہیں۔

ا۔ امرا کی حکومت (Aristocracy)

۲۔ جمہوریت

(Democracy) عوام کی حکومت۔
بلنچلی (Bluntchli) کی تقسیم۔
جرمن سیاست دان بلنچلی اس پر چوتھی قسم تھیا کریسی کا اضافہ کرتا ہے۔ یعنی خدائی اختیارات کے مطابق حکومت۔

مانٹسکو کی تقسیم

مانٹسکو نے سب سے پہلے مملکتوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے:
ا۔ جابرانہ مملکتیں ۲۔ آئینی مملکتیں

ا۔ جابرانہ مملکتیں (Despotic states)

وہ ہیں جن میں فرد واحد حکومت کرتا ہے۔ جو کسی قانون کے تابع نہیں ہوتا۔

۲۔ آئینی مملکتیں (Constitutional states)

وہ مملکتیں ہیں جن میں قانون کی حکمرانی ہوتی ہے ان کی پھر دو قسمیں ہیں۔ بادشاہت' جس میں فرد واحد حاکم ہوتا ہے۔ ری پبلک (جمہوریہ) جس میں عوام یا ان کا کوئی حصہ حکومت کرتے ہیں۔

جمہوریہ کی پھر دو قسمیں ہیں۔

ا۔ اشرافیہ (Aristocracy)

جس میں حکومت چند افراد کے ہاتھوں میں ہوتی ہے۔

۲۔ جمہوریت (Democracy)

جس میں بہت سے افراد حکومت کرتے ہیں۔

روسو کی تقسیم

فرانس کے فلاسفر اور سیاست دان روسو نے مملکت کو بادشاہت' اشرافیہ اور جمہوریہ میں تقسیم کیا ہے۔ اشرافیہ کی مزید تین قسمیں بیان کرتا ہے۔ اوّل۔ قدرتی اشرافیہ' دوم انتخابی اشرافیہ' سوم وراثتی اشرافیہ۔

روسو انتخابی اشرافیہ کو بہترین طرز حکومت قرار دیتا ہے کیونکہ اس طرز حکومت کو چلانے میں عوام کا دخل ہوتا ہے۔

سرجے اے آر مریوٹ (Sir J.A.R.Marriot) کی تقسیم موجودہ دور میں مریوٹ نے مملکت کی تقسیم بیان کی ہے اس کی تقسیم سہ بندی (Three fold) اساس پر قائم ہے۔

وحدانی (Unitary)

وہ ریاستیں جن میں حاکمیت ایک مرکز پر مرتکز ہوتی ہے وہ وحدانی ریاستیں کہلاتی ہیں۔

وفاقی (Federal)

جن ریاستوں میں حاکمیت دو یا دو سے زیادہ مرکز میں تقسیم کر دی جائے۔ وہ وفاقی ریاستیں کہلاتی ہیں۔

دوم: مریوٹ ریاستوں کو دستور کے لحاظ سے تقسیم کرتا ہے۔ اگر دستور میں آسانی سے ترمیم کی جا سکے تو لچکدار (Flexible) دستور ہوتا ہے۔ اگر دستور میں ترمیم کرنا مشکل ہو تو بے لچک (Rigid) دستور کہلاتا ہے۔

تیسرا اصول: آیا حاکمیت مقننہ کے پاس ہے یا عاملہ کے پاس۔ اگر حاکمیت مقننہ کے پاس

ہے تو ریاست پارلیمانی کہلاتی ہے۔ اگر عاملہ یا صدر کے پاس ہے تو صدارتی نظام حکومت کہلاتی ہے۔

لیکاک (Leacock) کی تقسیم

عصر حاضر میں لیکاک کی تقسیم مملکت اعلیٰ خیال کی جاتی ہے۔ جو درج ذیل ہے:

ا۔ بادشاہت (Monarchy) ۲۔ اشرافیہ (Aristocracy)

۳۔ جمہوریہ (Democracy)

بادشاہت

بادشاہت اس طرز حکومت کا نام ہے جس میں حکومت کے تمام اختیارات فرد واحد کے ہاتھ میں ہوں۔ اس کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ مطلق العنان بادشاہت ب۔ آئینی بادشاہت

ا۔ مطلق العنان بادشاہت (Absolute monarchy)

اس طرز حکومت کو کہتے ہیں جس میں بادشاہ کے اختیارات غیر محدود ہوتے ہیں۔ بادشاہ کی حیثیت ایک دیوتا کی ہوتی ہے لوگ اس کی پرستش کرتے ہیں اس کے ہر حکم کو دل و جان سے مانتے ہیں اس قسم کی مملکتیں سولہویں سترہویں صدی میں یورپ میں پائی جاتی تھیں۔ جاپان میں بادشاہ کو یہی مقام حاصل ہے۔

ب۔ آئینی بادشاہت (Constitutional monarchy)

آئینی بادشاہت میں نظریاتی اعتبار سے بادشاہ کے ہاتھ میں ہر قسم کے اختیار ہوتے ہیں۔ لیکن عملی طور پر ان اختیارات کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی گو بادشاہ فرمان روائے اعلیٰ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن وہ مملکت کے قوانین کے تابع ہوتا ہے اور قوانین سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا۔ صرف مقننہ قانون ساز جماعت ہوتی ہے وہ قانون بناتی ہے اور ان قوانین کی بادشاہ منظوری دیتا ہے۔ اس قسم کی حکومت انگلستان میں ہے۔ نظریاتی طور پر بادشاہ کو تمام اختیارات حاصل ہیں لیکن عملی طور پر وہ تمام اختیارات کابینہ استعمال کرتی ہے جو برطانوی پارلیمان کے سامنے جوابدہ ہے۔

۲۔ اشرافیہ (Aristocracy)

اشرافیہ وہ طرز حکومت ہے جس میں حکومت کی باگ ڈور صرف مخصوص طبقہ کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں امرا اور جاگیرداروں کی حکومت کا نام اشرافیہ ہے۔ اشرافیہ کی بنیاد تعلیم یا دولت پر ہوتی ہے۔ اس قسم کی ریاستیں عموماً قرون اولیٰ یا ازمنہ وسطیٰ میں پائی جاتی تھیں۔ جاگیرداری

(Feudal) دستور اشرافیہ کی ایک قسم ہے۔ گو اس قسم کی مملکت دور حاضر میں نہیں پائی جاتی لیکن اس کے اثرات ہر ملک میں پائے جاتے ہیں کہ امرا اور زمیندار دولت اور ثروت کے بل بوتے پر حکومت پر قابض ہو جاتے ہیں۔

۳۔ جمہوریت (Democracy)

یہ وہ طرز حکومت ہے جس میں عوام خود حکومت کریں۔ ابراہیم لنکن نے جمہوریت کی ان الفاظ میں تعریف کی ہے۔

"Government of the people for the people by the people"

یعنی جمہوریت حکومت کی وہ شکل ہے جو عوام کی حکومت ہو۔ عوام کے لیے ہو اور عوام ہی اسے چلاتے ہوں۔

جمہوریت کی دو قسمیں:

ا۔ بلا واسطہ جمہوریت (Direct Democracy)

ب۔ بالواسطہ جمہوریت (Indirect Democracy)

ا۔ بلاواسطہ جمہوریت

اس قسم کی طرز حکومت قدیم زمانہ میں پائی جاتی تھی قدیم یونان اور اٹلی میں شہری ریاستیں (City States) پائی جاتی تھیں ان کا رقبہ اور آبادی کم ہوتی تھی۔ افراد آسانی کے ساتھ نظامِ حکومت میں حصہ لے سکتے تھے۔ اس قسم کی مملکتوں میں تین قسم کے لوگ ہوتے تھے اوّل وہ شہری جن کو ہر قسم کے حقوق حاصل ہوتے تھے اور وہ آزادی کی نعمت سے متمتع ہوتے تھے۔ انہی لوگوں کے ہاتھوں میں حکومت کا نظم ونسق ہوتا تھا دوسرے غیر ملکی افراد۔ جن کو صرف غیر سیاسی حقوق حاصل ہوتے تھے تیسرے غلام۔ جنھیں کسی قسم کے حقوق اور اختیارات حاصل نہیں ہوتے تھے۔ قسم اوّل کے لوگ ہی مقننہ، عاملہ اور عدلیہ بناتے تھے۔

آج کل مملکتوں کے رقبے بہت وسیع ہیں اس وجہ سے اس قسم کی حکومتیں کہیں نہیں پائی جاتیں۔ لہٰذا عملی اعتبار سے قدیم جمہوریت کو اشرافیہ کا نام دیا جا سکتا ہے۔

بلاواسطہ جمہوریت چھوٹی ریاستوں کے لیے بڑی موزوں ہے۔ لیکن اس دور میں کوئی بھی حکومت ایسی نہیں ہے۔ جس میں رعایا کا ایک حصہ حقوق انسانی سے محروم ہو۔

ب۔ بالواسطہ جمہوریت

عصر حاضر میں ملکوں کا رقبہ بہت وسیع ہوتا ہے۔ عوام براہِ راست حکومت میں حصہ نہیں لے

سکتے اس وجہ سے وہ اپنے نمائندے چن کر بالواسطہ حکومت میں شریک ہوتے ہیں۔ موجودہ زمانہ میں منتخب نمائندوں کے ہاتھوں میں ہی حکومت کی باگ ڈور ہوتی ہے۔ وہی انتظام کرتے ہیں۔

رئیس مملکت کے اقتدار کے لحاظ سے جمہوریت کی دو قسمیں ہیں۔

ا۔ جمہوریت بادشاہت (Democratic Monarchy)

ب۔ جمہوریہ (Republic)

ا۔ جمہوریت بادشاہت (Democratic Monarchy)

یہ طرز حکومت آئینی بادشاہت (Legal monarchy) کا دوسرا نام ہے۔

ب۔ جمہوریہ (Republic)

اس طرز حکومت کو کہتے ہیں جس میں مقننہ کے ارکان اور ان کے علاوہ عاملہ کے ممبران لوگوں کے منتخب نمائندے ہوتے ہیں۔

وحدانی حکومت (Unitary state)

جس میں تمام مملکت ایک ہی وحدت تصور ہوتی ہے۔ اور سارے اختیارات مرکزی حکومت کے سپرد کر دیے جاتے ہیں۔ اس قسم کی مملکت میں صوبائی حکومتیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ حکومتیں مرکز کی ہدایت پر کام چلاتی ہیں۔ مرکز صرف اپنی آسانی کے لیے کچھ اختیارات صوبوں کو تفویض کر دیتا ہے۔ لیکن ان صوبائی حکومتوں پر پورا کنٹرول مرکز کا ہی ہوتا ہے۔

وفاقی مملکت (Federal state)

جس میں مملکت کی مختلف وحدتیں (Units) ہوتی ہیں اور باہمی اشتراک سے کام کرتی ہیں۔ تمام وحدتوں کا مرکز ایک ہوتا ہے اور اقتدار اعلیٰ مرکز کو ہی حاصل ہوتا ہے۔

فری مین نے وفاقی مملکت کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔

> ''وفاقی حکومت وہ ہے جو غیر قوموں کی نگاہ میں ایک مملکت کی حیثیت رکھتی ہے۔ لیکن جو اندرونی معاملات کے متعلق بہت سی حکومتوں پر مشتمل ہو۔ فی الحقیقت وفاق ایک ایسی مملکت ہے۔ جس میں ملک کا دستور اساسی (Constitution) سارے اختیارات مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تقسیم کر دیتا ہے۔ ایک طرح سے ہم اسے دوعملی حکومت (Dual Goovernment) بھی کہہ سکتے ہیں۔ تقسیم اختیارات (Division of power) اس کی روح ہے۔

امریکہ' آسٹریلیا' کینیڈا اور پاکستان وفاقی مملکتیں ہیں۔"

پھر ان میں سے ہر طرز حکومت یا تو پارلیمانی (Parliamentarin) ہوگا یا غیر پارلیمانی۔ پارلیمانی طرز حکومت میں ہیئت اجزائیہ (Exective) مجلس قانون ساز کے سامنے جواب دہ ہے اور مجلس قانون ساز نصب اور عزل کی مجاز ہے۔ لیکن غیر پارلیمانی طرز حکومت میں ہیئت اجزائیہ (Executive) مجلس قانون ساز کے ماتحت نہیں ہوتی۔ بلکہ ایک مدت معینہ کے لیے قائم رہتی ہے۔

انہی میں سے ایک طرز حکومت صدارتی ہے جس میں ایک مقررہ مدت کے لیے صدر حکومت کو تمام اختیارات تفویض کر دیے جاتے ہیں اور مجلس قانون ساز کا اس پر کوئی اقتدار نہیں ہوتا۔ دور حاضر میں جمہوری طرز حکومت کے برعکس آمرانہ حکومتیں بھی ہیں۔

باب دوم

اسلام کا نظریۂ ریاست

اسلامی حکومت کا نام

امامت، خلافت، امارت

اسلامی حکومت کے تین نام ہیں۔ امامت، خلافت، امارت۔ تینوں ناموں کی تشریح جید علماء کے الفاظ میں کی جاتی ہے۔

امامت کبریٰ

''امامت ایک ایسی ریاست عامہ [1] (Leader ship of democratic Government) کا نام ہے جو پیغمبر اعظم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی قانونی نمائندگی سے حاکمانہ بالادستی حاصل کرتی ہے اور دین و دنیا کی اجتماعی سرگرمیوں میں اپنی عظمت و طاقت کا اس طرح اظہار کرتی ہے کہ اس میں اعلیٰ رہنمائی کے اوصاف نمایاں ہو جاتے ہیں۔''

گویا امامت کبریٰ اسلامی حکومت کا اعلیٰ ترین نام ہے۔

علامہ ابن خلدون رقمطراز ہیں:۔

''حکومت کا وہ منصب جو دین کی نگہبانی اور دنیا کے سیاسی فرائض کو پورا کرتا ہے۔ خلافت و امامت ہے۔ اس کو امامت کبریٰ اور خلافت عامہ کہا جاتا ہے۔'' [2]

علامہ شیخ محمد امین ابن عابدین امامت کبریٰ کی شرح ان الفاظ میں کرتے ہیں:۔

''خدا کی پیدا کی ہوئی دنیا کے باشندوں پر وہ عام تصرف جو ایک ریاست عامہ کی تشکیل کا موجب ہوتا ہے اور جس کو پیغمبر کی نمائندگی کا فخر حاصل ہو۔'' [3]

خلافت:۔ قرآن مجید میں تین قسم کی خلافت کا ذکر ہے۔

1۔ المواقف والمرصد الرابع فی الامامۃ جلد ۸ ص ۳۴۴ ماخوذ از اسلام کا نظام حکومت تالیف مولانا حامد الانصاری غازی۔

2۔ مقدمہ کتاب العبر ابن خلدون (امامت و خلافت ص ۱۳۴۔

3۔ رد المختار بر در المختار باب الامامۃ جلد ا ص ۵۱۱۔

۱۔ نوعی خلافت۔ ۲۔ قومی خلافت۔ ۳۔ شخصی خلافت۔

۱۔ نوعی خلافت

یعنی تمام بنی آدم اللہ کے خلیفہ ہیں اور ہر ایک فرد دیگر مخلوقات پر حکومت کرنے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ وَاِذْ قَالَ رَبُّکَ لِلْمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً[۱] اور جب تیرے رب نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین بنانے والا ہوں۔

اس آیت کریمہ میں تمام نوع انسان کو خلیفہ کہا ہے۔

۲۔ قومی خلافت

جب ایک قوم کو حکومت اور بادشاہت سے نوازا جاتا ہے تو وہ اس قوم کی خلافت ہے۔ اللہ تعالیٰ عاد قوم کو مخاطب ہو کر فرماتا ہے:۔ وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ قَوْمِ نُوْحٍ:[۲] اور یاد کرو جب اس نے تم کو نوحؑ کی قوم کے بعد بادشاہ بنایا۔ وَاذْکُرُوْٓا اِذْ جَعَلَکُمْ خُلَفَآءَ مِنْ بَعْدِ عَادٍ وَّبَوَّاَکُمْ فِی الْاَرْضِ (الاعراف ۷:۷۴) اور یاد کرو جب تم کو عاد کے بعد جانشین بنایا اور تمھیں زمین میں آباد کیا۔ یہاں بَوَّاَکُمْ فِی الْاَرْضِ فرما کر خلافت کی تفسیر کر دی یعنی زمین کا وارث ہونا۔ ھُوَ الَّذِیْ جَعَلَکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ۔ (انعام:۱۶۶) یعنی وہی تو ہے جس نے تم کو زمین میں خلیفہ یعنی وارث بنایا۔

۳۔ شخصی خلافت

شخصی خلافت دو طرح کی ہے۔ خلافت خاصہ اور خلافت عامہ۔ خلافت خاصہ سے مراد وہ خلافت ہے۔ جب اللہ تعالیٰ کسی انسان کو لوگوں کی ہدایت کے لیے مامور کرتا ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام خلافت خاصہ کے حامل تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: یٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی فَیُضِلَّکَ عَنْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔[۳] اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں خلیفہ (حاکم) بنایا ہے۔ لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہشات کی پیروی نہ کر۔ ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بہکا دیں گے۔

خلافت عامہ جب کوئی مامور وفات پا جائے تو اس کے مشن کو چلانے کے لیے اس کا نائب خلافت عامہ کا حامل ہوگا۔

کسی مامور کے جانشین کو اللہ کا خلیفہ قرار دینا قرآن مجید سے عدم واقفیت کا نتیجہ ہے۔ جب حضرت ابوبکرؓ کو بعض لوگوں نے خلیفۃ اللہ کہنا شروع کیا تو آپ نے ایسا کہنے سے منع فرما دیا اور کہا: لَسْتُ خَلِیْفَۃُ اللّٰہِ وَلٰکِنْ خَلِیْفَۃَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّمَ یعنی میں اللہ کا خلیفہ نہیں

[۱] البقرہ ۲:۳۰۔ [۲] الاعراف ۷:۶۹۔ [۳] ص ۳۸:۲۶۔

ہو۔ میں تو اللہ کے رسول کا خلیفہ ہوں۔

یہاں جس خلافت کا ذکر ہے یہ وہ نیابتی حکومت ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نیابت کی حیثیت سے حاصل ہوتی ہے اور جو آپ کا نائب ہوگا اور خلافت کی تمام شرائط پر پورا اترتا ہو وہ خلیفہ الرسول کہلائے گا۔

اسلامی خلافت کی خصوصیات

۱۔ اسلامی خلافت کی پہلی خصوصیت جو اس کو دوسرے سیاسی نظاموں سے جدا کرتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ طرز حکومت دین اور دنیا دونوں کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے۔ دوسرے سیاسی نظام صرف دنیا کے امور سے تعلق رکھتے ہیں اور دین کے تصور کو اپنے نظام سے خارج کرتے ہیں۔

۲۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور ان کو ابنائے جنس پر نافذ کرنا جس نظام میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور فرمانبرداری نہ ہوگی وہ خلافت نہیں کہلائے گا۔

۳۔ خلافت اسلامی میں مقتدر اعلیٰ محض اللہ تعالیٰ ہے اور اس کے علاوہ کسی کو بھی یہ حق حاصل نہیں ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ[1] یعنی اللہ کے سوا کسی کو اقتدار اعلیٰ حاصل نہیں۔
اَلَا لَهُ الْحُكْمُ.[2] سنو حکم اسی کا ہے۔
وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. آسمانوں اور زمین کی حکومت اللہ ہی کے لیے ہے۔

امارت

جب حکومت امور عامہ کو اپنے ہاتھ میں لے کر افراد امت کو معروفات کا حکم دیتی ہے اور منکرات سے روکتی ہے۔ تو وہ امارت امت کا درجہ حاصل کر لیتی ہے۔ یہ لفظ امر سے مشتق ہے۔ امر کے معنی ہیں حکم۔ اور حکم حکومت کا فعل ہے ابو البقاء نے مختصر الفاظ میں امارت کی یہ تعریف کی ہے۔
''امارت ولایت ہے۔''[3]
یعنی امارت حکومت ہے۔
امارت میں اطاعت اور غلبہ دونوں باتیں شامل ہیں اور یہی حکومت کی اصل ہیں۔

اسلامی حکومت کے رئیس کے خطابات

I۔ امام اعظم:۔ یہ نام اس امر کو ظاہر کرتا ہے کہ امام حکومت اور اعضائے حکومت کا قائد ہے۔

---

۱ یوسف ۱۲: ۴۰۔ ۲ الانعام ۶: ۶۲۔
۳ کلیات ابو البقاء حنفی لفظ امارت صفحہ ۱۴۳۔

II- خلیفہ:۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نائب ہونے کی وجہ سے خلیفہ کہلاتا ہے۔

III- امیر:۔ معروفات کا حکم دینے اور منکرات سے روکنے کی وجہ سے کہلاتا ہے۔

خلیفہ یا امیر کی ضرورت

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْوَالِیُ مِنَ الرَّعِیَّۃِ کَالرُّوْحِ مِنَ الْجَسَدِ۔ [1] یعنی حاکم رعیت میں ایسے ہیں جیسے روح جسم میں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

لَا اِسْلَامَ اِلَّا بِجَمَاعَۃٍ وَلَا جَمَاعَۃَ اِلَّا بِاَمَارَۃٍ وَلَا اَمَارَۃَ اِلَّا بِطَاعَۃٍ۔ یعنی اسلام بغیر جماعت کے نہیں اور جماعت بغیر امیر کے نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

لَا یَحِلُّ لِثَلَاثَۃٍ یَکُوْنُ فِی الْفَلَاۃِ مِنَ الْاَرْضِ اِلَّا اَمَّرُوْا عَلَیْھِمْ اَحَدَھُمْ (مسند احمد و مشکوٰۃ باب الامارۃ) تین آدمی اگر چٹیل میدان میں بھی موجود ہوں تو وہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنائیں۔

خلیفہ کا انتخاب

رئیس مملکت کا انتخاب عوام یا ارباب حل و عقد سے ہونا چاہیے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:۔

وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ۔ [2] یعنی مسلمانوں کا اجتماعی امور سلطنت باہم مشورہ سے طے پاتے ہیں۔

اسلام کے دور اول میں جب خلفاء راشدین کے انتخاب پر نظر دوڑائیں تو یہ حقیقت کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ ان خلفاء کا انتخاب براہ راست شوریٰ کے ذریعہ ہوا۔ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سقیفہ بنی ساعدہ میں ہوئی۔ اس وقت وہاں انصار اور مہاجرین کے صاحب الرائے افراد موجود تھے۔ تبادلہ خیالات اور اسباب ترجیح پر تبصرہ بھی ہوا تھا۔ پھر مسجد میں عام بیعت ہوئی اور سب نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بعد حضرت عمرؓ کی خلافت کے لیے نام تجویز کیا۔ پہلے اہل حل و عقد سے مشورہ کیا۔ اس کے بعد مرضی عامہ حاصل کرنے کے لیے نام پیش کیا۔ اہل حل و عقد کی رائے اور مرضی عامہ معلوم کر لینے کے بعد حضرت عمرؓ کو اپنے بعد خلیفہ نامزد کیا۔ اس نامزدگی میں بھی اپنی مرضی شامل نہیں بلکہ عوام کی مرضی شامل ہے۔

حضرت عمرؓ نے اہل حل و عقد کی ایک مجلس شوریٰ مقرر کر دی اور خلافت کے لیے چند نام تجویز فرما دیے۔ مجلس شوریٰ کو یہ ہدایت کر دی کہ اصحاب الرائے سے مشورہ کر کے کسی ایک کا نام تجویز

---

[1] کنوز الحقائق حدیث ۱۰۲۔ [2] الشوریٰ ۴۲: ۳۸۔

کر دیں۔ اس کے بعد عوام کی مرضی معلوم کر لی جائے رائے عامہ کے مطابق خلیفہ منتخب کر لیا جائے۔

حضرت علیؓ کی بیعت بھی جمہور کی رائے کے مطابق ہوئی۔

خلفاء راشدین کے انتخاب کے طریقے گو مختلف ہیں۔ لیکن عوام کی رائے کا دخل ہر طریقہ میں کارفرما ہے۔

اسلامی نظام حکومت میں ولی عہدی اور نامزدگی کے لیے کوئی وجہ جواز نہیں ہے۔ نہ ایک ہی خاندان میں خلافت کو محدود کر لینا۔ اسی موروثی خلافت کے خلاف حضرت امام حسینؓ نے جہاد کر کے شہادت کا رتبہ پایا۔

شرائط امارت یا خلافت

شرط اوّل

امیر مملکت مسلمان ہو کیونکہ شریعت اسلامیہ کے مطابق نظام حکومت چلانے کے لیے وہی شخص مستحق ہو سکتا ہے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان رکھتا ہو اور یہ ناممکن ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا منکر آپ کا خلیفہ بنے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولُوا الْاَمْرِ مِنْکُمْ۔[1] اے لوگو جو ایمان لائے ہو۔ اللہ کی تابعداری کرو اور رسول کی اپنے میں سے صاحب امر کی تابعداری کرو۔

اس آیت کریمہ میں منکم کا لفظ اس بات پر صریح النص ہے۔ مسلمانوں کا خلیفہ انہی میں سے ہوگا۔ وَلَنْ یَجْعَلَ اللّٰہُ لِلْکٰفِرِیْنَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ سَبِیْلاً اللہ تعالیٰ کافروں کے لیے مسلمانوں پر فوقیت رکھنے کو ہرگز روا نہیں رکھے گا۔

تمام امت مسلمہ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر خلیفہ مرتد ہو جائے تو اس کا عزل اور اس سے قتال و جدال مسلمانوں پر واجب ہے۔ جو شخص ابتدا ہی سے کافر ہو وہ مسلمانوں کا خلیفہ کیسے بن سکتا ہے۔

شرط دوم

خلیفہ کے لیے دوسری شرط یہ ہے کہ وہ عاقل اور بالغ ہو اس لیے شرعاً مجنوں اور نابالغ کے کسی تصرف پر اعتبار نہیں ہو سکتا۔

شرط سوم

جسمانی نقص نہ ہو۔

---

1 النساء ۵۹۔

خلیفہ جسمانی نقص نہ رکھتا ہو۔ جس وجہ سے وہ فرائض منصبی اچھی طرح سرانجام نہ دے سکے۔ اگر وہ دوران خلافت کسی جسمانی نقص میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ مثلاً پاگل ہو جائے۔ مفلوج ہو جائے۔ اندھا ہو جائے وغیرہ۔ تو پھر بھی اس کو مسند خلافت سے معزول کر دیا جائے گا۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اصۡطَفٰہُ عَلَیۡکُمۡ وَزَادَہٗ بَسۡطَۃً فِی الۡعِلۡمِ وَالۡجِسۡمِ.[1] یقیناً اللہ نے تمھارے مقابلہ میں اس کو چن لیا ہے اور اسے علم اور جسم میں کشادگی دی ہے۔

یہ آیت اس بات پر اشارۃ النص ہے۔ خلیفہ کے لیے حواس اور اعضاء کی سلامتی ضروری ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نقص سے ایک تو کارکردگی پر اثر پڑتا ہے۔ دوم دوسروں کے دل میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے۔

شرط چہارم:۔ کفایت

کفایت سے مراد سیاست حاضرہ اور زمانہ کے جدید تقاضوں کو اچھی طرح سمجھتا ہو۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاٰتَیۡنٰہُ الۡحِکۡمَۃَ وَفَصۡلَ الۡخِطَابِ.[2] یعنی ہم نے داؤد علیہ السلام کو حکمت اور فیصلہ کن بات کرنے کی صلاحیت دی۔

سورۃ بقرہ آیت ۲۴۷ سے جس کا حوالہ اوپر دیا جا چکا ہے۔ یہ بات واضح ہو جاتی ہے۔ خلیفہ کے اندر معاملہ فہمی ژرف نگاہی اور مسائل کے حل کرنے کا ملکہ ہونا چاہیے۔

شرط پنجم

علوم دینیہ کا ماہر۔

خلیفہ کے لیے علوم دینیہ کا ماہر ہونا ضروری ہے تاکہ کلیات شرعیہ کی روشنی میں پیش آمدہ مسائل کو حل کر سکے اور لاعلمی کی بناء پر حدود شروع سے تجاوز نہ کرے۔

شرط ششم

تقویٰ عدل اور امانت۔

امیر متقی عادل اور امین ہونا چاہیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّ اَکۡرَمَکُمۡ عِنۡدَ اللّٰہِ اَتۡقٰکُمۡ.[3] اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ مکرم اور محترم وہ ہے جو سب سے زیادہ متقی ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُکُمۡ اَنۡ تُؤَدُّوا الۡاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهۡلِهَا ۙ وَاِذَا حَکَمۡتُمۡ بَیۡنَ النَّاسِ اَنۡ تَحۡکُمُوۡا بِالۡعَدۡلِ.[4] بے شک اللہ حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے اہل کے سپرد کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل کے ساتھ فیصلہ کرو۔

---

[1] بقرہ ۲:۲۴۷۔ [2] ص ۳۸:۲۰۔ [3] الحجرات ۴۹:۱۳۔ [4] النساء ۴:۵۸۔

مفسرین کا اس بات پر اتفاق ہے کہ "امانات" سے مراد حکومت کی باگ ڈور ہے۔

قَالَ اجْعَلْنِیْ عَلٰی خَزَآئِنِ الْاَرْضِ اِنِّیْ حَفِیْظٌ عَلِیْمٌ۔[1] حضرت یوسف علیہ السلام نے کہا کہ مجھے زمین کے خزانوں پر مقرر کیجئے۔ میں حفاظت کرنے والا اور باخبر ہوں۔

شرط ہفتم

شجاعت۔ خلیفہ کا شجاع ہونا ایک ناگزیر شرط ہے تاکہ دشمن کے حملے کے وقت جہاد کا جوش پیدا کر سکے۔

خلیفہ کے اختیارات

اختیارات معروف کاموں میں اطاعت

خلیفہ ہر محکمہ کا حاکم اعلیٰ ہے۔ اس وجہ سے ہر فرد پر معروف کاموں میں اس کی اطاعت واجب ہے۔

قواعد وضوابط بنانے کا اختیار

قوانین شرعیہ کی تنفیذ کے لیے قواعد وضوابط بنانے کا اختیار ہے۔

حکام کے نصب وعزل کا اختیار

حکومت کے حکام کے نصب وعزل کا اس کو اختیار حاصل ہے۔

احتساب ومواخذہ کا اختیار

خلیفہ سلطنت کے ہر فرد سے اس کی کسی قانون شکنی پر مواخذہ کر سکتا ہے اور اسے سزا دے سکتا ہے۔

جنگ وصلح کا اختیار

خلیفہ کو ملکی حالات کے مطابق جنگ اور صلح دونوں کا اختیار حاصل ہے۔

حکام کی کاروائیوں کی تفتیش کا اختیار

خلیفہ کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ہر حاکم کی غیر اسلامی کاروائی کی تفتیش کرے اور ان کو سزا دے۔

خلیفہ کی انتظامی مجلس شوریٰ

خلیفہ کے لیے ملکی امور چلانے کے لیے ایک ایسی مجلس ہوگی۔ جس کے ارکان کا انتخاب

---

[1] یوسف ۱۲:۵۵۔

خلیفہ خود کر سکتا ہے تاکہ وہ تنفیذی اختیارات کے استعمال کے سلسلہ میں مشورہ دے۔ مجلس کی رکنیت کے لیے مندرجہ ذیل شرائط ہیں۔

ا۔ مسلمان ہونا۔ (غیر مسلم رعایا میں سے بھی صاحب رائے سے مشورہ لیا جا سکتا ہے)

۲۔ عالم دین ہونا۔ ۳۔ عادل ہونا۔ ۴۔ مشورہ دینے کا اہل ہونا۔ ۵۔ ملکی حالات سے باخبر ہونا۔

اختیارات تشریعی

خلیفہ کو اصحاب الرائے کے مشورہ کے ساتھ ضمنی قوانین وضع کرنے کا اختیار حاصل ہے۔

جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے:۔ وَاَمْرُهُمْ شُورىٰ بَيْنَهُمْ.[1] تو ان سے کاموں میں مشورہ لے۔

امیر کا حق تنسیخ

ایک اہم سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا مجلس تشریعی کے متفقہ یا کثرت رائے سے پاس شدہ سودہ قانون کو خلیفہ مسترد کر سکتا ہے یا کہ نہیں۔

اگر مجلس تشریعی ایک قانون متفقہ یا کثرت رائے سے پاس کر لیتی ہے۔ جو کسی نص صریح کے خلاف ہو۔ تو خلیفہ کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اس قانون کو مسترد کر دے۔ مثلاً۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد اکثر جید صحابہ نے حضرت ابوبکرؓ کو یہ مشورہ دیا کہ وہ مانعین زکوٰۃ کے خلاف سردست جہاد نہ کریں۔ لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اس مشورہ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

لیکن کسی نص صریح کے خلاف فیصلہ نہ ہو تو خلیفہ کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ کثرت رائے سے پاس شدہ قانون کو مسترد کر دے۔ اگر امیر ایسا لیگل فریم ورک (ضابطہ قوانین) جاری کر دے جو آئین کے صریحاً خلاف ہو تو مجلس شوریٰ اس ضابطہ کو رد کر سکتی ہے اس کے ساتھ حاکم کا محاسبہ بھی کر سکتی ہے کیونکہ اسلام آئین شکنی کی اجازت نہیں دیتا۔

عادلانہ اختیارات

عدالتوں کے لیے ضوابط مقرر کرنے کا اختیار خلیفہ کو ہے۔ لیکن خلیفہ کو یہ اختیار حاصل نہیں کہ وہ عدالت کی آزادی میں دخل اندازی کرے۔ خلیفہ نہ عدالت کو کسی فیصلہ کا حکم دے سکتا ہے اور نہ کسی فیصلہ سے روک سکتا ہے۔ اگر کوئی حاکم عدالت کے فیصلہ میں دخل اندازی کرتا ہے یا اس کو اپنی مرضی کا فیصلہ لکھنے پر مجبور کرتا ہے تو منصف کا یہ فرض ہے کہ وہ مجلس شوریٰ کو مطلع کر دے اور مجلس شوریٰ اس کا محاسبہ کرے یا منصف احتجاجاً مسند انصاف سے الگ ہو جائے۔ اسی میں کسی ملک کی ترقی اور استحکام کا راز مضمر ہے۔

---

[1] سورۂ شوریٰ: ۳۸۔

امیر مملکت کے اختیارات پر پابندیاں

اسلام خلیفہ کو کلی طور پر اختیارات نہیں دیتا کہ وہ جس طرح چاہے کرے بلکہ اس پر کچھ پابندیاں بھی عائد کرتا ہے۔

امیر کو یہ اختیار نہیں کہ شریعت کے کسی حکم کو بدل ڈالے اور نہ اس کو یہ اختیار حاصل ہے کہ مفاد عامہ کے خلاف کوئی قانون نافذ کر دے۔ خلیفہ عوام کے سامنے اپنے فعل کا جواب دہ ہے۔ عوام اس سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس نے یہ کام کیوں کیا۔ یہ حکم کیوں دیا۔

خلیفہ کی معزولی

خلیفہ کو حسب ذیل صورتوں میں منصب خلافت سے الگ کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ خلیفہ دین اسلام سے مرتد ہو جائے۔

۲۔ پاگل ہو جائے۔

۳۔ دشمن کے ہاتھ اسیر ہو جائے اور رہائی کی امید نہ رہے۔

۴۔ ایسا مرض لاحق ہو جائے جس وجہ سے سلطنت کے فرائض سرانجام نہ دے سکتا ہو۔

۵۔ فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے۔

۶۔ قانون کی بالادستی کو تسلیم نہ کرے۔

۷۔ مسلمانوں کے دینی اور دنیوی امور کی حفاظت نہ کرے۔ یا بیرونی حکومتوں کا آلہ کار بن جائے اور ملکی مفاد کو چھوڑ کر بیرونی حکومتوں کے مفاد کی پاسداری کرے۔

سید شریف لکھتے ہیں:۔

"اگر مسلمانوں کے کام درست طریقہ پر انجام نہ پائیں اور دین کے معاملات میں خرابی کی صورت نظر آئے تو امت امام کو عہدہ سے علیحدہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اجتماعی نظم کے لیے امام کا تقرر بھی امت کے حق میں ہے اور معزول کرنا بھی۔"[1]

۸۔ اگر امام ارباب حل و عقد کے مشورہ کے بغیر حکومت کا نظام چلانا چاہے تو اس کو معزول کر دینا چاہیے۔ ابن عطیہ لکھتا ہے۔

"اگر صدر حکومت ماہرین علم و فن اور امت کے دین دار افراد کا مشورہ طلب کیے بغیر اپنی رائے سے کام کرتا ہے تو اس کو عہدہ سے معزول کر دینا چاہیے۔ اس پر تمام علماء قانون متفق ہیں۔"[2]

---

[1] المواقف معہ شرح جلد ۸ صفحہ ۳۵۳۔ [2] وحکی القرطبی من ابن عطیہ لاخلاف فی وجوب العزل من لایستشیر اہل العلم والدین۔ فتح القدیر شوکانی ال عمران جلد ۱ صفحہ ۳۶۰۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ خلیفہ کی اطاعت اسی وقت تک ضروری ہے۔ جب تک وہ اللہ تعالیٰ کا مطیع ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَا طَاعَةَ فِی مَعْصِیَةٍ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِی الْمَعْرُوْفِ۔[1] امیر کی معصیت میں کوئی فرمانبرداری نہیں ہے۔ فرمانبرداری صرف معروف میں ہے۔

حضرت ابوبکرؓ جب خلیفہ منتخب ہوئے تو مسجد نبوی میں صحابہ کرام کے سامنے اپنے پہلے خطبہ میں فرمایا۔ یَاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّمَا اَنَا مُتَّبِعٌ وَلَسْتُ بِمُبْتَدِعٍ فَاِنْ اَنَا اَحْسَنْتُ فَاَعِیْنُوْنِی وَاِنْ اَنَا زِغْتُ فَقَوِّمُوْنِی۔[2] اے لوگو! میں اسلام کے احکام کی پیروی کرنے والا ہوں اور کسی بدعت کا موجد نہیں ہوں اگر میں نیکی کا راستہ اختیار کروں تو میری مدد کرو اور اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کرو۔

صحابہ نے فرمایا ہم آپ کو نیزوں کی آنیوں سے درست کر دیں گے۔

1۔ متفق علیہ بخاری۔ 2۔ کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۳۶۶۔

اقتدار اعلیٰ (حاکمیت)

اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کے تصور کی تاریخ

اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کا تصور علم سیاسیات میں ابتدا ہی سے پایا جاتا ہے۔ قدیم یونانی مفکر ارسطو اپنی کتاب "سیاست" میں اگرچہ لفظ "حاکمیت" کہیں استعمال نہیں کرتا مگر اس کے تصور کو "اختیارات اعلیٰ" کے الفاظ میں موسوم کرتا ہے اور جب اس نے ریاستوں کو مختلف اقسام میں تقسیم کیا تو اس تقسیم کا اصول بھی اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کے اصول پر مبنی کیا۔

ارسطو کے بعد رومی مفکرین نے بھی اس نظریے پر بحث کی۔ ازمنہ وسطی میں جب یورپ پر عیسائیت کا غلبہ تھا تو اقتدار اعلیٰ کے تصور نے شاہنشاہیت اور پاپائیت یعنی دنیاوی حاکمیت اور دینی اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کی شکل اختیار کر لی۔ جس کی وجہ سے ان دو حاکمین میں مدت دراز تک جھگڑا رہا کہ ان میں سے مقتدر اعلیٰ کون ہے۔

ابن خلدون نے اپنی شہرہ آفاق کتاب "مقدمہ" میں حاکمیت (اقتدار اعلیٰ) کا تصور واضح اور بین الفاظ میں پیش کیا ہے وہ کہتا ہے کہ اقتدار اعلیٰ ایسی قوت ہے جو ریاست کے وجود کو قائم رکھتی ہے اور جب حاکم اعلیٰ کمزور ہو جاتا ہے تو ریاست بھی کمزور ہو جاتی ہے حتیٰ کہ زوال پذیر ہو کر دنیا کے نقشہ سے مٹ جاتی ہے اور نئی حاکمیت اس کی جگہ لے لیتی ہے۔

دور حاضر میں یورپی مفکرین نے اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کے مختلف تصورات و نظریات پیش کیے ہیں۔ ان میں سب سے پہلا شخص فرانسیسی مفکر ژاں بوداں (Jean Bodin) تھا۔ اس نے کہا کہ "اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) وہ طاقت ہے جو قانون سے بالاتر ہر شہری اور رعایا پر فائق ہوتی ہے" بوداں کے نزدیک یہ طاقت بادشاہ کو حاصل ہے۔

بوداں کی طرح تھامس ہوبز نے بھی اقتدار اعلیٰ (حاکمیت کے تصور) کو بادشاہت کے تصور میں پیش کیا ہے اگرچہ اس نے اس کے تصور کو بہتر رنگ میں پیش کیا ہے اور زیادہ وضاحت کی اس نے کہا ہے کہ اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) قطعی ناقابل تقسیم اور ناقابل انتقال طاقت ہے۔

اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کے معنی اور مفہوم

ریاست افراد، اداروں اور گروہوں کا منظم معاشرہ ہوتی ہے ان افراد اداروں اور گروہوں

وغیرہ میں باہمی رشتہ کو مضبوط کرنے امن و امان قائم رکھنے اور ان کے طریقہ کار میں میل جول رکھنے کے لیے ریاست قانون نافذ کرتی ہے اور رسم و رواج قائم رکھتی ہے اس طرح اپنے قانون اور حکم کے ذریعہ اپنے اختیارات ظاہر کرتی ہے اور اپنے اختیارات کو سب پر لاگو کرتی ہے اور وہ اپنی مرضی سے کسی اور بیرونی طاقت یا قانون کے تابع نہیں ہوتی ریاست کی اس طاقت اور اختیار کو اقتدار اعلیٰ (حاکمیت) کہا جاتا ہے۔

اقتدارِ اعلیٰ (حاکمیت) (Sovereignty)

چند مستند تعریفیں

مغربی مفکر بودین اقتدار اعلیٰ کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے۔ ''شہریوں اور رعایا پر ریاست کا ایسا فائق اختیار جو قانونی حد بندیوں سے آزاد ہو۔''

برگس (Burgess) نے اقتدار اعلیٰ کی اس طرح تعریف کی ہے:

''اقتدار اعلیٰ مملکت کا وہ اصلی مطلق العنان غیر محدود اور مکمل اختیار ہے۔ جس کے ماتحت ملک کا ہر فرد اور ہر جماعت ہوتی ہے۔''

جان آسٹن نے اس طرح تعریف کی ہے۔

''اگر ملک میں ایسا برتر اور افضل انسان ہو جو کسی کے ماتحت نہ ہو اور جس کے احکام کی پابندی کی سوسائٹی عادی ہو چکی ہو تو اس مخصوص اور برتر شخص کو اس سوسائٹی کا مقتدر اعلیٰ یا فرمانروا (Sovereign) متصور کیا جائے گا اور وہ منظم سوسائٹی مع اس افضل شخص کے سمجھی جائے گی۔''

پولک (Pollak) کہتا ہے:۔

''اقتدار اعلیٰ کی قوت نہ وقتی ہوتی ہے اور نہ مستعار لی ہوئی اور نہ دنیا میں وہ کسی دوسری طاقت کے روبرو جواب دہ ہوتی ہے۔''

گروشیس کہتا ہے:۔

''ایسے شخص میں تفویض شدہ سیاسی اختیار اعلیٰ ہے جس کے اعمال کسی دوسرے کے تابع نہیں ہیں اور جس کی منشاء کا رد نہیں ہو سکتا۔''

روسو جان لاک کہتا ہے:۔

''یہ اعلیٰ اختیار عوام کے قبضہ قدرت میں ہے لیکن اس کا عملی اظہار حکومت کے ذریعہ ہوتا ہے۔''

روسو کا نظریہ اقتدار اعلیٰ

روسو نے اقتدار اعلیٰ کو ارادہ عامہ یا مشیت عامہ (General will) کے سپرد کیا ہے۔ اس طرح وہ عمومی اقتدار اعلیٰ کا قائل ہے۔

مندرجہ بالا تعریفات کی رو سے اقتدار اعلیٰ یا تو سلطنت کو حاصل ہے ہے جیسا کہ بودین کا نظریہ ہے یا سلطنت کا بادشاہ اقتدار اعلیٰ کا مالک ہے۔ جیسا کہ جان اسٹن گروشیس کا خیال ہے۔ یا مرضی عامہ یعنی قوم کی عام منشاء اقتدار اعلیٰ ہے جیسا کہ روسو کہتا ہے:۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے اقتدار اعلیٰ کا مفہوم

اسلامی نقطہ نگاہ سے اقتدار اعلیٰ وہ بالادست طاقت ہے۔ جس سے بالا کوئی طاقت نہ ہو۔

اسلام کے نظام حکومت میں خدا تعالیٰ ہی اقتدار اعلیٰ کا حقیقی مالک ہے جیسا قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَاللّٰهُ یَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ [1] اللہ حکمرانی کرتا ہے کوئی اس کے حکم کو ٹالنے والا نہیں ہے۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ [2] حکم دینے کا اختیار صرف اللہ ہی کو ہے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ. [3] تو لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کر اور اس قانون حق کو چھوڑ کر جو تمھارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ. [4] اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔

ان آیات سے واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام میں سیاسی اور قانونی حاکمیت صرف اللہ کو ہی حاصل ہے۔ عہد حاضر کا فرانسیسی ماہر سیاسیات ڈی ٹوکویل خدا کی حاکمیت کے متعلق لکھتا ہے:۔

> "مطلق اقتدار فی الواقعہ ایک بری چیز ہے اور خطرناک بھی۔ کسی انسان کے بس میں نہیں ہے کہ وہ اقتدار مطلق کو دور اندیشی اور احتیاط کے ساتھ استعمال کر سکے۔ اقتدار مطلق کا مرجع صرف خدائے واحد کی ذات ہے۔ کیونکہ اس کے اقتدار کی کارفرمائی کے پہلو بہ پہلو اس کی حکمت اور عدل بھی کارفرما ہے لیکن دنیا کے اندر کوئی ایسا معتبر اور قابل اطاعت اقتدار نہیں پایا جاتا۔ جس کے احکام کو میں ہر معاملے میں غیر مشروط طور پر قبول کرتا جاؤں۔ جب میں یہ معلوم کرتا ہوں کہ کسی قوم یا کسی ملک کو یا کسی حکومت کو خواہ وہ شخصی ہو یا

---

1. الرعد ۱۳:۴۱۔ 2. سورۃ یوسف ۱۲:۴۰۔
3. المائدہ ۵:۴۸۔ 4. المائدہ ۵:۴۴۔

ڈیموکریٹک یا بادشاہت ہو یا ری پبلک ہو۔ اقتدار ہونپ دیا گیا ہے تو مجھے اسی وقت انتشار و انارکیت کے بیج نظر آنے لگتے ہیں اور میں فوراً ایک ایسی ریاست کی تلاش کرنے لگتا ہوں جو میری حقیقی آرزو پوری کرے۔"

اقتدار اعلیٰ کی خصوصیات

قرآن مجید کی رو سے اقتدار اعلیٰ کی حسب ذیل خصوصیات ہیں:۔

ا۔ وحدتِ اقتدار

اسلامی حکومت کا اقتدار اعلیٰ اپنے اقتدار میں وحدت اور یگانگت کا مالک ہوتا ہے اور اس کے اقتدار میں کوئی دوسرا شریک اور ساجھی نہیں ہوسکتا جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:۔ وَلَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا۔[1] وہ اپنے حکم میں کسی کو شریک نہیں ٹھہراتا۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔[2] حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہی ہے۔ لَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ۔ یعنی مملکت میں اس کا کوئی بھی شریک نہیں ہے۔

۲۔ قدرتِ عامہ

قدرت اور قوت اللہ تعالیٰ کے حاکمانہ اقتدار کی ایک خصوصیت ہے۔ علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ قدرت عامہ ایک ایسی خصوصیت ہے۔ جس کی مکمل نسبت اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسری ہستی کے ساتھ نہیں ہوسکتی وہی ہے جس کی اعلیٰ ہستی اعلیٰ درجہ کا اقتدار اور قدرت رکھتی ہے۔ وہ ایک قادر اور مقتدر ہستی کی حیثیت سے اپنے حکم اور حکومت کے کام میں قابل تعریف تشخص کا مالک ہے۔[3]

ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ. اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

۳۔ بالادستی

بالادستی اقتدار اعلیٰ کی روح ہے۔ اس وجہ سے اسلام میں بالادستی اقتدارِ اعلیٰ کی حقیقت ہے۔ علامہ ابنِ اثیر فرماتے ہیں۔ "خداوند عالم بلند و بالا دست ہے۔" اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ اپنے مرتبہ اور حکومت میں اتنا اونچا ہے کہ اس سے کوئی اونچا نہیں۔[4]

حضرت امام غزالی مقتدرِ اعلیٰ کی بالادستی کے متعلق لکھتے ہیں۔

۱۔ الکہف ۱۸: ۲۶۔ ۲۔ یوسف ۱۲: ۴۰۔ ۳۔ مفردات القرآن (قدر) صفحہ ۴۲۷۔۲۷۶۔ ۴۔ التبر المسبوک فی نصائح الملوک ماخوذ از اسلام کا نظام حکومت مصنف مولانا حامد انصاری غازی صفحہ ۱۶۴۔

"دنیا کی ہر چیز اس کے تخت سلطنت کے ماتحت ہے اور تخت اس کے اقتدار اعلیٰ کے ماتحت ہے۔ اس کا اقتدار اور قدرت عامہ اور حکومت کمال کے ایسے منتہا پر ہے کہ اس سے اوپر کوئی اقتدار نہیں ہر کمی سے محفوظ اور ہر نقص سے خالی اس کے غلبے اور تسخیر کی قوتیں یہ ثابت کرتی ہیں کہ حکومت اس کی چیز ہے اور سلطنت اس کی ملک ہے۔"[1]

قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَتَعٰلَى اللّٰهُ الْمَلِكُ الْحَقُّ. (سورہ حج) اللہ بادشاہ برحق و بالادست ہے۔ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِیُّ الْكَبِیْرُ (مومنون ۲۳:۶۲) اور بے شک اللہ بلند شان والا بڑا ہے۔ كَلِمَةُ اللّٰهِ هِىَ الْعُلْيَا. یعنی اللہ کا ہی حکم سب حکموں سے بلند ہے۔

۴۔ آزادی

اقتدار اعلیٰ کو حکم اور نفاذ حکم کی مکمل آزادی ہونی چاہیے۔ بلنچلی لکھتا ہے۔ "اقتدار کی آزادی اقتدار اعلیٰ کے مفہوم میں داخل ہے۔"

قرآن مجید میں آتا ہے۔ یَفْعَلُ اللّٰهُ مَا یَشَآءُ.[2] اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔

وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِیُعْجِزَهٗ مِنْ شَیْءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا فِی الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا.[3] اور اللہ ایسا نہیں کہ اسے کوئی چیز عاجز کر دے۔ نہ آسمانوں میں اور نہ زمین میں وہ جاننے والا قدرت والا ہے۔

۵۔ جلالت عامہ

اقتدار اعلیٰ کی حاکمیت کے لیے جلالت ایک ضروری وصف ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں۔ جلالت ایک خاص وصف ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے خاص ہے۔[4]

۶۔ دوام

لازوال زندگی اقتدار اعلیٰ کی ایک اہم خصوصیت ہے یہ وہ وصف ہے جو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہی مخصوص ہے۔ وہی ہستی ہے جو ہر قسم کے زوال سے پاک ہے ہمیشہ ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کی حاکمیت نامعلوم زمانہ تک ہے۔ هُوَ الْاَوَّلُ وَالْاٰخِرُ. کائنات کی تخلیق سے پہلے بھی اللہ اور اس کے نیست و نابود ہو جانے کے بعد بھی وہی رہے گا۔

---

[1] نظریہ سلطنت نمبر ۲/۷ صفحہ ۵۰۳۔ [2] ابراہیم ۱۴:۲۷۔

[3] فاطر ۳۵:۴۴۔ [4] مفردات القرآن جل الجلالۃ۔

لِلّٰہِ الْاَمْرُ مِنْ قَبْلُ وَمِنْ بَعْدُ یعنی پہلے بھی اور بعد میں بھی حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔ ھُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ. وہ ہمیشہ زندہ اور قائم رہنے والا ہے۔

۷۔ بے تعطلی

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت میں لحہ بھر بھی تعطل واقع نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ہر وقت فعال اور خبردار رہتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لاَ تَاْخُذُہٗ سِنَۃٌ وَّلاَ نَوْمٌ (البقرہ ۲:۲۵۵) یعنی اس کو نہ کسی وقت نیند آتی ہے اور نہ اونگھ وَلاَ یَؤُدُہٗ حِفْظُھُمَا[1] اسے دنیا و مافیہا کی حفاظت تھکا نہیں دیتی۔

۸۔ ناقابل انتقال

اللہ تعالیٰ کے اختیارات ناقابل انتقال ہیں۔ اس کے تمام اختیارات ذاتی ہیں۔ دوسرے کسی شخص کو منتقل نہیں کیے جا سکتے۔ دنیا کی ہر چیز اسی کے ماتحت اور حلقہ اقتدار میں ہے۔ سورۃ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی صفت مالک بیان کی ہے۔ عربی زبان میں مالک وہ ہستی ہوتی ہے۔ جس کے ہاتھ میں ہر قسم کے اختیارات ہوں۔

۹۔ جامعیت تامہ

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کائنات کی ہر چیز پر محیط ہے۔ اس کے اقتدار کی حدود غیر معین اور غیر محدود ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لِلّٰہِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ (البقرہ ۲:۱۱۵) مشرق اور مغرب کی وسعتیں سب اللہ تعالیٰ کے لیے ہیں۔ وَسِعَ کُرْسِیُّہُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ[2] یعنی اس کی حکومت زمین اور آسمان تک ہے۔

اگر کوئی انسان یہ کوشش کرے کہ اس کی حکومت سے کہیں باہر نکل جا سکتا ہے تو وہ نکل نہیں سکتا۔

حکومت کے فرائض

اسلامی ریاست کا سب سے بڑا وصف حقوق انسانی کی بحالی ہے اسلام سے قبل تمام کرہ ارض کی سلطنتوں میں حقوق انسانی کا تصور محض عنقا تھا۔ معاشرہ مختلف طبقات میں بٹا ہوا تھا عوام حقوق انسانی سے محروم تھے۔ ان کی زندگی بہائم سے بھی بدتر تھی۔ اس تاریک دور میں مکہ کی بے آب و گیاہ وادی میں تکریم انسانیت کی آواز بلند ہوئی اور تمام مرعات یافتہ طبقہ آپ کا دشمن بن گیا جب ہجرت فرما کر مدینہ آئے تو مسلم ریاست کی بنیاد رکھی اور تمام حقوق انسانی کو عملی جامہ پہنایا۔ دنیا کی تاریخ میں پہلے شخص حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔ جنھوں نے انسانی حقوق کی تنفیذ کو ایک ریاست کے لیے لازمی قرار دیا۔ حقوق انسانی حسب ذیل ہیں۔

---

[1] البقرہ ۲:۲۵۵۔ [2] البقرہ ۲:۲۵۵۔

ا۔ تحفظ جان

ہر انسان کو اللہ تعالیٰ نے زندگی بخشی ہے۔ حیات کو منقطع کرنے کا حق دار وہ صرف اللہ ہی ہے کسی کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی کی جان لے اگر کوئی شخص کسی کی جان باورائے تعلیم اسلام لیتا ہے تو وہ زمین میں فساد پھیلاتا ہے۔ اس لیے حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ رعایا کے ہر فرد کی جان کی حفاظت کرے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ (بنی اسرائیل ۱۷:۳۳) اور اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔

دوسری جگہ آتا ہے مَنْ قَتَلَ نَفْسًا بِغَيْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِي الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِيْعًا وَمَنْ اَحْيَاهَا فَكَاَنَّمَا اَحْيَا النَّاسَ جَمِيْعًا (المائدہ ۵:۳۲) جو کوئی کسی کی جان کو بغیر جان کے بدلہ کے یا زمین میں فساد کے مار ڈالے تو گویا اس نے سب لوگوں کو مار ڈالا اور جو کوئی اس کو زندہ رکھے تو گویا اس نے سب لوگوں کو زندہ رکھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں اِنَّ دِمَاءَ كُمْ وَاَمْوَالَكُمْ وَاَعْرَاضَكُمْ حَرَامٌ كَحُرْمَةِ يَوْمِكُمْ هٰذَا (بخاری کتاب الحج) تمہاری جانیں اور تمھارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت۔ (یعنی حج کے دن کی)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "ایک آدمی کے قتل پر اگر آسمان و زمین کی سب مخلوق بھی متفق ہو جائے تو اللہ ان سب کو سزا دیے بغیر نہ چھوڑے گا۔"

قتل جان کی مختلف صورتیں

ا۔ قتل اولاد

اسلام سے قبل اہل عرب اپنی اولاد کو مفلسی کے خوف سے قتل کر دیتے لڑکیوں کی پیدائش کو اپنے لیے باعث عار سمجھ کر انھیں زندہ درگور کر دیتے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان بے قصور جانوں کو بھی زندہ رہنے کا حق دیا ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ (الانعام ۶:۱۵۱) اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ تمھیں بھی ہم رزق دیتے ہیں اور ان کو بھی ہم دیں گے بچیوں کو زندہ درگور کرنے کے جرم کو قابل مواخذہ اور قابل تعذیب قرار دیتے ہوئے فرمایا وَاِذَا الْمَوْءٗدَةُ سُئِلَتْ بِاَيِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ جب زندہ گاڑی ہوئی لڑکی سے پوچھا جائے گا وہ کس قصور میں ماری گئی۔

ب۔ قتل مومن

مومن کا قتل ایک سنگین جرم ہے ارشاد الٰہی ہے "وہ شخص جو کسی مومن کو جان بوجھ کر قتل کرتا ہے اس کی سزا جہنم ہے اور اس پر اللہ کا غضب اور لعنت ہے اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں "کسی مسلمان کے قتل کے مقابلے میں پوری دنیا کا تباہ ہو جانا اللہ کے نزدیک زیادہ آسان ہے۔"

فرمایا "جس شخص نے کسی مومن کے قتل ناحق میں ذرہ برابر بھی مدد کی وہ قیامت کے دن اس حال میں لایا جائے گا کہ اس کی آنکھوں کے درمیان لکھا ہوا ہوگا "اللہ کی رحمت سے ناامید"

ج۔ خودکشی

تحفظ جان کا مطلب صرف یہ نہیں ہے کہ دوسروں کو قتل نہ کیا جائے بلکہ اسلام میں جس طرح دوسروں کی جان لینے کو حرام قرار دیا ہے اسی طرح خود اپنی جان کو بھی اپنے ہاتھوں عمداً ضائع کرنے کو قابل مواخذہ قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوْا اَنْفُسَكُمْ اور اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔

د۔ غیر مسلم کا خون

اسلامی قانون میں مسلمان اور ذمی مساوی درجہ رکھتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "جس نے کسی ذمی کو قتل کیا اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی۔

ایک اور حدیث ہے "جس نے کسی معاہد غیر مسلم کو قتل کیا۔ وہ کبھی بھی جنت کی خوشبو کو نہ سونگھ سکے گا۔

۲۔ تحفظ عزت و آبرو

اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو قابل تحریم و تکریم پیدا کیا ہے۔ اس تکریم کی وجہ سے وہ اشرف المخلوقات ہے لہٰذا اسلام نے حرمت جان کے ساتھ حرمت آبرو کا حکم دیا۔ (سورۃ الحجرات آیات ۱۱،۱۲) میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی تکریم کے بارے میں فرمایا۔

ا۔ کسی کا مذاق نہ اڑایا جائے۔ ۲۔ کسی پر طعن و تشنیع نہ کی جائے۔ ۳۔ کسی کو برے القاب سے نہ پکارا جائے۔ ۴۔ کسی کے متعلق بدگمانی نہ کریں اور غیبت سے بچا جائے۔ ۵۔ ایک دوسرے کے عیوب اور خامیاں تلاش نہ کی جائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ بے عزتی اور آبروریزی کا یوم قیامت شدید

احتساب ہوگا۔ اسلام نے عورتوں کی آبرو کے تحفظ پر خصوصاً بہت زور دیا ہے اور ان کی آبرو پر بھٹہ لگانے کو موردِ سزا ٹھہرایا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ الْغٰفِلٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ لُعِنُوْا فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَةِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ (النور۲۴:۲۳) جو لوگ پاک دامن بے خبر مومن عورتوں پر بہتان باندھتے ہیں ان پر دنیا اور آخرت میں لعنت کی گئی ہے اور ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر جہاں جان کی حفاظت کا ذکر کیا ہے وہاں آبرو کی حفاظت کا بھی ذکر کیا۔ گویا جتنی جان کی حفاظت ضروری ہے اتنی ہی آبرو کی حفاظت لازمی ہے۔

ایک اور حدیث ہے آپ نے فرمایا جس نے کسی دوسرے کی بے عزتی یا آبرو ریزی کی ہو یا کوئی اور ظلم کیا ہو۔ وہ آج معاف کرائے اس دن سے پہلے جب نہ کوئی روپیہ پیسہ ہوگا نہ مال و دولت البتہ جو نیک عمل اس کے پاس ہوگا وہ لے لیا جائے گا۔ اور اگر نیک عمل نہ ہوگا تو مظلوم کی برائیاں لے کر اس پر ڈال دی جائیں گی۔

۳۔ مال کی حفاظت

انسان کو اپنی جان اور آبرو کے علاوہ مال سے بہت محبت ہوتی ہے۔ دوم زندگی کی بقا کا ایک وسیلہ ہے۔ ضروریات حیات کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ اس کے بغیر زندگی کا کاروبار نہیں چل سکتا۔ اس لیے اسلام نے مال کی حفاظت کی بھی ضمانت دی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ (بقرہ۲:۱۸۸) آپس میں دوسرے کا مال ناحق طور پر نہ کھاؤ۔

اس آیت کریمہ میں ناجائز طریقے سے مال کمانے کی تمام صورتوں مثلاً چوری، ڈکیتی، غصب، جوا، سود، دھوکہ اور خیانت کم تول و ماپ، اکتناز، احتکار اور تجنیس کو حرام قرار دیا ہے۔ قابل مواخذہ قابل حد اور قابل تعزیر قرار دیا ہے۔ کسی کی زمین ناجائز طور پر غصب اور چھیننے کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ "جس شخص نے کسی کی ایک بالشت برابر بھی زمین ظلم کر کے لی۔ اس کی گردن میں اس برابر ساتوں زمینوں کا طوق بنا کر ڈال دیا جائے گا۔

۴۔ حق خلوت (نجی زندگی کا تحفظ)

اسلام نے شہریوں کی نجی زندگی کو مکمل تحفظ دیا ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ بغیر اجازت کے کسی کے گھر کی چار دیواری میں داخل ہو۔ اگر گھر کی چار دیواری کو یہ تحفظ نہ ہو تو اس کے لیے آزادی سے سانس لینا محال ہو جائے گا اور گھر کی چار دیواری قید خانے کی شکل اختیار کر جائے گی اسلام نے نجی زندگی کے تحفظ کی کامل ضمانت دی ہے اور ارشاد الٰہی ہے۔ لَا تَدْخُلُوْا بُیُوْتًا غَیْرَ

بُیُوتِکُمْ حَتّٰی تَسْتَاْنِسُوْا (النور۲۴:۲۷) اے ایمان والو! تم اپنے گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں مت داخل ہو جب تک ان سے اجازت حاصل نہ کر لو۔ سورۃ نور میں نجی زندگی کے تحفظ کے لیے قیمتی ہدایات ہیں۔

۱۔ اس وقت تک کسی کے گھر میں داخل نہ ہوں جب تک معروف طریقے سے گھر والوں سے اجازت نہ لے لیں۔

۲۔ اگر گھر میں کوئی موجود نہیں تو تب بھی واضح اجازت کے بغیر گھر میں داخل نہ ہوں۔

۳۔ اگر گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی جائے تو لوٹ جانا چاہیے۔

۴۔ ایسے مکان جو نجی رہائش گاہیں نہ ہوں۔ مثلاً دفاتر' پبلک عمارات' ہوٹل' مہمان خانے' دکانیں وغیرہ یہاں اجازت کی ضرورت نہیں۔

۵۔ اسی طرح سورہ احزاب میں یہ حکم دیا گیا ہے اگر کسی کے گھر میں کسی ضرورت اور اجازت سے جاؤ تو وہیں دھرنا مار کر بیٹھ نہیں رہنا چاہیے کیونکہ گھر والے کو اور بھی کئی ضروری کام ہوتے ہیں۔

۶۔ جب کسی کے گھر کے دروازے پر جاؤ تو ایک طرف ہو کر کھڑا ہونا چاہیے۔ جھانکنا نہیں چاہیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے کہ کوئی شخص کسی کو گھر میں جھانکتے ہوئے دیکھے تو اس کی آنکھ پھوڑ دے تو اس پر کوئی مواخذہ نہیں۔

کسی کی ٹوہ لگانا بھی نجی زندگی میں مداخلت کے مترادف ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ لَا تَجَسَّسُوْا تم تجسس نہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حکمرانوں کو بھی تجسس سے منع فرمایا ہے حدیث میں ہے "حکمران جب لوگوں کے اندر شبہات کے اسباب تلاش کرنے لگتے تو وہ انھیں بگاڑ کر رکھ دیتا ہے۔

اس سے صاف واضح ہوتا ہے کہ کسی ریاست کو اپنے کسی شہری کے خلاف جاسوسی کرنا جائز نہیں۔

۵۔ شخصی آزادی کا تحفظ

اسلامی ریاست میں بغیر جرم ثابت ہوئے کسی شہری کو قید یا نظر بند کرنا جائز نہیں۔ شخصی آزادی ہر شہری کا بنیادی حق ہے۔ موطا میں لکھا ہے "اسلام میں کسی شخص کو بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا۔

ایک مرتبہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم مسجد نبوی میں خطبہ دے رہے تھے کہ ایک شخص نے کھڑے ہو کر اپنے ہمسایہ کے بارے میں پوچھا کہ اسے کس جرم میں گرفتار کر لیا گیا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم پر یہ بات ظاہر ہوئی کہ اسے بغیر کسی جرم کے ثبوت کے گرفتار کر لیا گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اسی وقت اس کی رہائی کا حکم صادر فرمایا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ

وآلہ وسلم کا یہ عدالتی طریقہ تھا کہ جب تک جرم کی پوری طرح تحقیق کر کے اس کی تہہ تک نہیں پہنچ جاتے اور جرم کا ثبوت فراہم نہ ہو جاتا۔ کسی کو کسی قسم کی سزا نہ دیتے تھے۔ ماعز کی مثال واضح ہے کہ آپ ماعز سے مختلف انداز اور طریقے سے جرم کے بارے میں استفسار فرماتے ہیں جب اس امر کا قطعی یقین ہو گیا کہ ماعز مجرم ہے تو اس کے بعد آپ نے رجم کا حکم صادر فرمایا۔

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے "جس حد تک ممکن ہو مسلمانوں (شہریوں) کو سزا سے بچاؤ۔ کوئی گنجائش نکلتی ہو تو انہیں چھوڑ دو یہ بات کہ کسی شخص کو چھوڑ دینے میں خطا کر جائے اس بات سے بہتر ہے کہ وہ اس کو سزا دینے میں غلطی کر جائے۔

ایک دوسری حدیث ہے "جب تک بچانے کا کوئی راستہ مل رہا ہو اس وقت تک لوگوں کو سزا سے بچاؤ۔"

آپ نے واضح طور پر ایک اصول مقرر فرمایا اِدْرَءُ وا الْحُدُوْدَ بِالشُّبُهَاتِ حدود شرعیہ کو شکوک وشبہات کی بناء پر ساقط کر دیا کرو۔

قرآن مجید میں شخصی آزادی کے تحفظ کو اتنا اہم قرار دیا ہے کہ اللہ کا رسول بھی ان سے سلب نہیں کر سکتا چہ جائے کہ کوئی اور حکمران اس کو سلب کرے ارشاد الٰہی ہے۔

"کسی انسان کی یہ شایان شان نہیں کہ اللہ تو اسے کتاب وحکمت اور نبوت عطا کرے اور وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کے بجائے تم میرے غلام بن جاؤ وہ تو یہی کہے گا کہ ربانی (خدا کے غلام) بنو۔"

۶۔ اختلاف رائے کے اظہار کا حق

ارشاد الٰہی ہے۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء ۴:۵۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر (حاکم) کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم امور سلطنت کے بارے میں صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔ جنگ احد میں صحابہ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رائے سے اختلاف بھی کیا۔

غزوہ بدر میں آپ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ فلاں فلاں مقام پر قیام کریں۔ ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا کہ یہ ارشاد وحی الٰہی سے ہے یا آپ کی ذاتی رائے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ میری رائے ہے صحابی نے عرض کیا کہ فلاں مقام مناسب نہیں بلکہ اس کی بجائے فلاں جگہ قیام کیا جائے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابی کی رائے کو قبول فرمایا۔

ایک بار آپ مال غنیمت تقسیم فرما رہے تھے کہ کسی نے کہا کہ یہ ایسی تقسیم ہے جس میں اللہ کی

رضی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان ناروا کلمات کو سنا اور درگزر کر دیا۔

ایک اور شخص نے کہا کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدل سے کام نہیں لیا آپ نے اس سے کوئی باز پرس نہ فرمائی اور فرمایا کہ اگر میں عدل نہ کروں گا تو اور کون عدل کرے گا۔

ایک مرتبہ حضرت زبیر اور ایک انصاری کا مقدمہ آپ کی خدمت میں پیش ہوا۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے حضرت زبیر کے حق میں فیصلہ فرمایا انصاری نے غصے میں آ کر کہا کہ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اپنے پھوپھی زاد بھائی کے حق میں فیصلہ کر دیا ہے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے اس کے ناروا کلمات کو سن کر درگزر فرمایا اور انصاری کو کچھ نہ کہا۔ یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ اسلام اظہار رائے کی غیر مشروط آزادی نہیں دیتا بلکہ اسلام نے حدود مقرر کر دی ہیں ان کے اندر رہتے ہوئے اظہار رائے کی آزادی ہے۔

اظہار رائے کی آزادی افہام تفہیم کا ایک ذریعہ ہے۔ کسی معاملہ کو سمجھنے میں آسانی پیدا ہوتی ہے۔ اظہار رائے سے ہی مختلف مسائل کا حکومت کو علم ہوتا ہے۔ پھر ان مسائل کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

۷۔ عقیدے کی آزادی

اسلام نے جبراً عقیدے کی تبدیلی کو ناپسند کیا ہے اور واضح اعلان کیا ہے کہ دین میں کوئی جبر نہیں ارشاد الٰہی ہے۔ لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ (البقرہ ۲:۲۵۶) دین میں کوئی جبر نہیں۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِي الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِيْعًا اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ (یونس ۱۰:۹۹) اور اگر تیرا رب چاہتا تو زمین میں جس قدر لوگ ہیں سب کے سب ایمان لے آتے تو کیا تو لوگوں کو مجبور کرے گا یہاں تک کہ وہ مومن بن جائیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ تمہارا اپنا دین ہے اور میرا اپنا دین ہے۔

ایک اور جگہ آتا ہے۔ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ (۸۸:۲۲) تو ان پر داروغہ نہیں ہے۔

وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ (ال عمران ۳:۲۰) پس اگر یہ لوگ (اسلام) سے منہ موڑتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر صرف پیغام پہنچا دینے کے سوا اور کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

۸۔ ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق

اسلام نے ایک طرف شہریوں کو یہ حکم دیا ہے کہ کسی پر ظلم نہ کریں دوسری طرف انھیں یہ حق بھی دیا ہے اگر ان پر ظلم ہو تو اس کے خلاف آواز اٹھائیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ

بِالسُّوْءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ (النساء۴:۱۴۸) اللہ بری بات کے مشہور کرنے کو (کسی سے) پسند نہیں کرتا سوائے جس پر ظلم کیا گیا۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ جس شخص پر ظلم ہو۔ وہ اپنے ظلم کے خلاف احتجاج کر سکتا ہے۔

مشہور حدیث ہے اَفْضَلُ الْجِهَادِ كَلِمَةُ حَقٍ عِنْدَ سُلْطَانٍ جَابِرٍ افضل ترین جہاد یہ ہے کہ ظالم حاکم کے سامنے کلمہ حق کہا جائے۔

گو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات رحمۃ للعالمین تھی کسی کو آپ کی ذات سے نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا لیکن پھر بھی اگر کسی کو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) سے کوئی شکایت ہوتی تو آپ اسے اظہار کی اجازت دیتے اور اپنے آپ کو بدلے کے لیے پیش فرما دیتے غزوہ بدر میں آپ صفیں درست فرما رہے تھے حضرت سواد صف سے کچھ آگے بڑھے ہوئے تھے آپ نے انھیں تیر چبھو کر صف میں برابر ہونے کا حکم دیا وہ کہنے لگے! یا رسول اللہ صلی اللہ! آپ نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے حالانکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عدل قائم کرنے کے لیے بھیجا ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوراً اپنا شکم مبارک کھول کر فرمایا۔ سواد! اپنا بدلہ لے لو۔ سواد دوڑ کر آپ کے جسم اطہر کے ساتھ لپٹ گیا اور شکم مبارک کو چوم لیا۔

ایک شخص رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اپنے قرض کی ادائیگی کا تقاضا کرتے ہوئے سخت کلامی سے پیش آیا صحابہ کرام کو اس کے طرز عمل پر غصہ آیا۔ آپ نے فرمایا اسے کہنے دو۔ اسے کہنے دو۔ جس کا کچھ حق نکلتا ہے وہ ایسی باتیں کر سکتا ہے۔

۹۔ حصول انصاف کا حق

عدل و انصاف ہی سلطنتوں کے استحکام کا ذریعہ ہے اور عدل و انصاف ہی وہ حق ہے جو بعثت نبوی سے قبل تمام کرہ ارض کی سلطنتوں سے عنقا تھا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عدل و انصاف کو قائم کیا' آپ کا فرمان ہے اُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمھارے درمیان عدل قائم کروں۔ قُلْ اَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ اے محمدؐ! آپ ان سے کہہ دیجئے کہ میرے رب نے انصاف کا حکم دیا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ "امام عادل کا ایک دن ساٹھ سال کی عبادت سے بہتر ہے۔"

نیز آپ نے فرمایا مخلوق میں خدا کو سب سے زیادہ محبوب امام عادل ہے اور خدا کے نزدیک سب سے زیادہ مبغوض آدمی امام ظالم ہے اگر آپ کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ ادنیٰ اعلیٰ مسلم غیر مسلم آقا غلام کے درمیان عدل و انصاف قائم رکھا۔ قریش کی ایک فاطمہ نامی

عورت کی چوری کا مقدمہ مشہور ہے آپ کے پاس سفارش کے لیے حضرت اسامہ گئے آپ کا رخ مبارک غصہ سے سرخ ہو گیا اور خطبہ فرمایا کہ "تم سے پہلے قومیں اسی وجہ سے تباہ ہوئیں کہ بڑوں کو جرم کے ارتکاب میں چھوڑ دیتے اور کمزور اور غریب کو سزا دیتے۔ اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔"

۱۰۔ ہجرت کا حق

ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ط اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۔ (الزمر ۳۹: ۱۰) اور اللہ کی زمین فراخ ہے۔ صابروں کو ان کا اجر بے حساب ملے گا۔

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے۔ اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوْا فِيْهَا (النساء ۴: ۹۷) (فرشتے کہیں گے کیا اللہ کی زمین وسیع نہ تھی تم اس میں ہجرت کر جاؤ۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا (المومن: ۶۴) اللہ وہ ہے جس نے تمھارے لیے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔

۱۱۔ پناہ لینے کا حق

ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ (التوبہ: ۶) مشرک (دشمن) اگر تم سے پناہ کا خواستگار ہو تو اسے پناہ دے دو۔

۱۲۔ آزادی سکونت کا حق

ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ سلطنت کے جس حصہ میں رہائش اختیار کرنا چاہے۔ اختیار کرے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ سِيْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا كَيْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ (العنکبوت ۲۹: ۲۰) دنیا میں پھرو پھر دیکھو کس طرح اس نے پہلی بار پیدا کی۔

آپ نے فرمایا "تم جہاں چاہو رہو اور تمھارے اور ہمارے درمیان شرط یہ ہے کہ نہ تم خون ریزی کرو اور نہ تم راہ زنی کرو اور نہ کسی پر ظلم کرو (نیل الاوطار جلد ۷ ص ۱۳۹)

۱۳۔ آزادی اجتماع کا حق

یہ حق آزادی ضمیر اور اظہار رائے کی آزادی کے حق سے منسلک ہے اس حق سے مراد یہ ہے کہ ہر شہری کو آزادانہ طور پر میل ملاپ اور تنظیمیں بنانے کا حق ہے اگر تنظیمیں بنانے کا حق نہ ہو تو اظہار رائے کا حق بیکار ہے اس لیے اسلام نے آزادی اجتماع کا حق دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ (ال عمران ۳: ۱۰۴) اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے

کاموں سے روکیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

۱۴۔ حصول علم کا حق

اسلام ہر شخص کو حصول علم کا حق دیتا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا (بقرہ ۲:۲۶۹) جسے اللہ نے علم وحکمت سے نوازا ہے اسے بڑی دولت حاصل ہوگی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ علم حاصل کرنا ہر مسلم مرد اور عورت پر علم فرض ہے۔

ابوالدرداء سے روایت ہے کہ حصول علم کے لیے سفر کرنا جنت کی راہ طے کرنا ہے جویانِ علم کی رضا جوئی کے لیے فرشتے اپنے پر بچھاتے ہیں ارض وسما کا ایک ایک فرد حتیٰ کہ سمندر کی مچھلیاں بھی اس کی مغفرت کے لیے دست بدعا رہتی ہیں عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے بدر کامل کو ستاروں پر ہوتی ہے۔ ترکہ انبیاء علیہم السلام کے یہی اہل علم وارث ہیں نبیوں نے درہم و دنیا کی میراث نہیں چھوڑی بلکہ میراث علم چھوڑا ہے جس نے اسے حاصل کرلیا اس نے بہت کچھ لے لیا (ترمذی ابوداؤد)

۱۵۔ حق مساوات

اسلام نے تمام لوگوں کو بحیثیت انسان برابر پیدا کیا کسی کو کسی پر برتری اور فوقیت نہیں ارشاد الٰہی ہے يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنَّا خَلَقْنَاكُمْ مِنْ ذَكَرٍ وَأُنْثَىٰ وَجَعَلْنَاكُمْ شُعُوبًا وَقَبَائِلَ لِتَعَارَفُوا إِنَّ أَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللَّهِ أَتْقَاكُمْ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ خَبِيرٌ (الحجرات ۴۹:۱۳) اے لوگو! ہم نے تمھیں مرد اور عورت سے پیدا کیا ہے اور تمہاری شاخیں اور قبیلے بنائے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیز گار ہو۔ اللہ جاننے والا خبردار ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّا أُمَّةً وَاحِدَةً فَاخْتَلَفُوا (یونس ۱۰:۱۹) اور (ابتداء میں) انسانوں کی ایک ہی امت تھی پھر الگ الگ ہو گئے۔ ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ مِنْ نَفْسٍ وَاحِدَةٍ (النساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے رب سے ڈرو۔ جس نے تمھیں ایک جان سے پیدا کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ (بیہقی کتاب الایمان) ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے۔

فرمایا إِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ إِخْوَةٌ (مسند احمد بن حنبل ابوداؤد) تمام انسان بھائی بھائی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا أَلَا إِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَإِنَّ أَبَاكُمْ وَاحِدٌ لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلَى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلَى عَرَبِيٍّ وَلَا لِأَحْمَرَ عَلَى أَسْوَدَ وَلَا

لَا سْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی۔ (مسند احمد) لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک اور تمہارا باپ ایک ہے بے شک عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر یا سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

۱۶۔ بنیادی ضروریات کے حصول کا حق

ماہرین عمرانیات نے ایک انسان کے لیے تین بنیادی ضروریات قرار دی ہیں وہ ہیں گھر، لباس اور روٹی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آج سے چودہ سو سال پہلے اس بات کا اظہار کیا تھا۔ ابن آدم کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کے لیے ایک گھر ہو۔ جس میں وہ رہ سکے کپڑا ہو جس سے وہ اپنے جسم کو ڈھانپ سکے اور کھانے کے لیے روٹی اور پینے کے لیے پانی۔"

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ آ کر جب اسلامی ریاست کی بنیاد رکھی تو مہاجرین کی سب سے پہلے انہی ضروریات کو نہایت حکمت عملی اور منصوبہ بندی سے پورا کیا۔ وہ حکمت عملی انصار اور مہاجرین کے درمیان "عقد مواخات" تھی عقد مواخات کے تحت انصار نے مہاجرین کی ان ضروریات کو پورا کر دیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں کے لیے مدینہ میں میٹھے پانی کا بھی سرکاری سطح پر انتظام کیا چنانچہ آپ کی خواہش پر حضرت عثمان نے چار ہزار دینار میں بئر رومہ خرید کر مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔

رہائشی مکانات کے لیے قطائع کے علاوہ متعدد قطائع زرعی مقاصد کے لیے بھی مسلمانوں کو دیے۔ یہ زرعی قطائع بعض اوقات گھاس کھجوروں اور باغات پر مشتمل ہوتے تھے۔ قابل کاشت اراضی کے علاوہ زمینیں بھی مسلمانوں کو بطور قطائع عطا فرمائی تھیں تا کہ ان پر کاشت کی جائے اور زراعت کو ترقی دی جائے۔

بعض ایسی زمینیں بھی تقسیم کیں۔ جن سے حاصل ہونے والی پیداوار کے ایک حصے سے مستقل یا عارضی طور پر مستفید ہونے کا حق دیا گیا مگر ملکیت کے حقوق نہیں ملتے تھے۔

۱۷۔ کسب کی آزادی

اسلامی ریاست ہر شخص کو کسب کی آزادی کا حق جائز حدود میں دیتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰہِ (الجمعہ:۱۰) خدا کے فضل (رزق) کی تلاش کے لیے زمین میں پھیل جاؤ۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَآءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ

(النساء: ۳۲) مردوں کے لیے ان کی کمائی کے موافق حصہ ہے اور عورتوں کے لیے ان کی کمائی کے موافق حصہ ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يَرَى الْعَبْدَ مُحْتَرِفًا. (طبرانی بحوالہ کنوز الحقائق) اللہ تعالیٰ اپنے بندہ کو کوئی پیشہ کرتے ہوئے دیکھنا پسند کرتا ہے۔

اِسْعَوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَيْكُمُ السَّعْىَ (مسند امام احمد۔ کنزالحقایق) کوشش کرو کیونکہ اللہ نے تم پر کوشش کرنی فرض کی ہے۔

طَلَبُ الْحَلَالِ جِهَادٌ. حلال روزی کمانا جہاد ہے۔

قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ طَلَبُ كَسْبِ الْحَلَالِ فَرِيْضَةٌ بَعْدَ الْفَرِيْضَةِ (کنزالعمال) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا فریضہ عبادت کے بعد حلال کمائی کا طلب کرنا بھی ایک فریضہ ہے۔

۱۸۔ مزدور کا حق

ارشاد الٰہی ہے۔ وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا (الزخرف: ۳۲) اور ہم نے ایک کے دوسرے پر درجے بلند کیے ہیں تاکہ ایک دوسرے سے کام لے اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اکتساب کا ایک قانون وضع کر دیا ہے وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ نے سامان روزی کے لحاظ سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے تاکہ ایک دوسرے سے خدمت کے کام لے سکیں اور نظام قائم رہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اعْطُوْا الْاَجِيْرَ اَجْرَهٗ قَبْلَ اَنْ يجف عَرَقُهٗ (ابن ماجہ باب الاجارہ) مزدور کی اجرت اس کا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ادا کر دو۔

عَنْ اَبِىْ هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ عزَّ وَجَلَّ ثَلٰثَةٌ اَنَا اَخْصَمُهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَمَنْ كُنْتُ خَصَمَهٗ خَصَمْتُهٗ...... وَرَجُلٌ اِسْتَاجَرَا جِيرًا اسْتَوْفٰى مِنْهُ وَلَمْ يُوَفِّهٖ (بیہقی کتاب الاجارہ) حضرت ابوھریرہ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ کا ارشاد ہے تین قسم کے انسان ایسے ہیں جن سے میں قیامت کے دن جھگڑا کروں گا اور جس سے میں جھگڑا کروں گا۔ اس کو مغلوب و مقہور ہی کر کے چھوڑوں گا۔ ان میں سے ایک وہ شخص ہے جو مزدور سے کام تو پوری طرح لیتا ہے اور اس کے مناسب اس کی اجرت نہیں دیتا۔

عَنْ اَبِىْ سَعِيْدِ الْخُدْرِىْ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰهِ نَهٰى عَنْ اِسْتِجَارِ الْاَجِيْرِ حَتّٰى يُبَيَّنَ لَهٗ اَجْرُهٗ (بیہقی کتاب الاجارہ) ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ممانعت فرمائی کہ مزدور اور اجیر کو اس کی اجرت طے کیے بغیر کام پر لگایا جائے۔

۱۹۔ امورِ سلطنت میں شرکت کا حق

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ اسلام ہی پہلا دین ہے جس نے عوام کو امور سلطنت میں شریک کیا ہے اسلام سے قبل بادشاہت تھی۔ بادشاہ کا ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا تھا۔ اسلام نے اس طرز سلطنت کو مٹا کر ایک جمہوری اور شورائی نظام کی بنیاد رکھی اور امور سلطنت میں عوام کو شریک کیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوری ۳۸:۴۲) کہ ان کا کام آپس میں شوری سے ہوتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ (ال عمران ۱۵۸:۳) اور ان سے (حکومتی کاموں) میں مشورہ لیتے رہا کیجئے۔

فرمایا مَا شَاوَرَ قَوْمٌ اِلَّا هُدُوْا (طبرانی کنوزالحقایق حدیث ۸۷) جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاح پائی۔

يَدُ اللّٰهِ عَلَى الْجَمَاعَةِ یعنی جمہور کو اللہ کی تائید حاصل ہے۔

۲۰۔ معصیت سے اجتناب کا حق

کوئی حاکم کسی کو اللہ کی نافرمانی پر مبنی حکم دینے کا مجاز نہیں۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں۔" (کنزالعمال)

امراء کی اطاعت اس وقت تک واجب ہے جب وہ خدا اور رسول کی نافرمانی کا حکم نہ دیں جب خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا۔ (بخاری)

۲۱۔ معاہدہ

ہر شہری کو حق حاصل ہے کہ قانون کے مطابق کسی دوسرے شہری سے معاہدہ کر کے کاروبار کرسکتا ہے اگر کوئی فریق معاہدے کی شرائط پوری نہیں کرتا تو قانون اس کو جبراً پورا کرنے پر مجبور کرسکتا ہے اس کا معاوضہ دلوا سکتا ہے۔ اگر معاہدے کی تکمیل کا احترام نہ کیا جائے تو سارا اقتصادی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ اس لیے اسلام نے معاہدات کی پابندی پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ (مائدہ ۱:۵) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے عہد کو پورا کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں لَادِيْنَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهٗ (احمد۔ طبرانی) جس میں عہد کا پاس نہیں اس کا دین نہیں۔

۲۲۔ عمل غیر کی مسؤلیت سے براءت کا حق

دور حاضر میں عموماً یہ ہوتا ہے کہ مجرم روپوش ہو جاتا ہے اور مجرم کے مرد و زن کو پکڑ لیا جاتا

ہے۔ اسلام اس کی اجازت نہیں دیتا کہ مجرم کی جگہ کسی غیر مجرم کو پکڑ لیا جائے۔ قرآن مجید میں ضابطہ مقرر ہوا ہے۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (الانعام: ۱۲۶۴) ہر شخص جو کچھ کماتا ہے وہ خود اس کا ذمہ دار ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

لَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (البقرہ: ۱۹۳) نہ کسی پر زیادتی ہو سوائے ظالم کے۔

۲۳۔ قومی دفاع

جس طرح عوام کا یہ حق ہے کہ حکومت ان کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کرے اور پُرامن زندگی بسر کریں۔ اسی طرح عوام اپنی حکومت سے یہ بھی امید رکھتے ہیں کہ وہ بیرونی دشمنوں سے ان کی حفاظت کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مدینہ میں مدنی ریاست کی بنیاد رکھی تو سب سے پہلے اس ریاست کے دفاع کا بندوبست کیا۔ یہود سے پُرامن رہنے کو کہا۔ لڑائی میں ایک دوسرے سے تعاون کرنے کا وعدہ کیا۔ اردگرد قبائل سے بھی معاہدے کیے۔ دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے لیے باہر دستے بھیجنے شروع کر دیے۔ قرآن مجید نے اس اہم قومی ذمہ داری کے متعلق فرمایا ہے يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا (ال عمران ۳: ۱۹۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور مقابلہ میں بڑھ کر صبر دکھاؤ اور سرحدوں کی حفاظت کرو۔

دوسری جگہ آتا ہے وَاَعِدُّوْا مَا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ اللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ (الانفال ۸: ۶۰) اور جو کچھ طاقت اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھ رکھنے سے تم سے ہو سکے ان کے لیے تیار رکھو تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو اور ان کے سوائے اوروں کو بھی جنھیں تم نہیں جانتے اللہ ان کو جانتا ہے۔

اسلامی حقوق انسانی کی اہمیت دور حاضر کے تناظر میں

جب یورپ طبقاتی تقسیم میں بٹ گیا حقوق انسانی پامال ہونے لگے۔ صنعت و حرفت نے جاگیرداری کی جگہ لے لی۔ تو مزدوروں میں بیداری پیدا ہوئی۔ تو حقوق انسانی کے لیے مختلف ممالک میں آوازیں اٹھنی شروع ہوئیں۔ وہ تحریکیں بھی انسانی حقوق کے تعین میں اس کمال تک نہیں پہنچیں۔ جس کمال تک اسلام پہنچا تھا بلکہ یوں کہہ لیجیے اس دور کی تحریکات اسلام کے ہی مقرر کردہ حقوق انسانی کی بازگشت ہیں۔ سب سے پہلے ۱۲۱۵ء میں انگلینڈ کے شہنشاہ جان نے ایک دستور جاری کیا جس کا نام میگنا کارٹا ہے۔ جس کا مقصد صرف وہاں کے امراء کی بغاوت کو فرد کرنا تھا۔ اس میں عام انسانوں کے حقوق کی کوئی خاص واضح اور ٹھوس تجویز یا سفارش نہیں تھی۔ اس کی کل تریسٹھ دفعات ہیں بہرحال منشور میں ایک حد تک انسانی حقوق کے تحفظ کی ضمانت دی گئی۔

امریکہ کا اعلان ورجینیا ۱۸۷۶ء میں. اس اعلان کے ذریعہ یہ کیا گیا کہ تمام انسان مساوی درجہ لے کر پیدا ہوئے۔ انھیں زندہ رہنے کا حق ہے دیگر حقوق میں قانونی تحفظ جائیداد رکھنے کا حق معقول اجرت کا حق تعلیم تحریر وتقریر اور اظہار رائے کا حق انجمن سازی' سیاسی آزادی اور حصول مسرت کے اہم حقوق شامل ہیں۔

انسانی حقوق کا فرانسیسی اعلان

۱۸۸۹ء میں انسانی حقوق کا اعلان فرانس میں ہوا۔ اس کی بین الاقوامی کوئی اہمیت نہیں۔ صرف انقلاب فرانس کے مقاصد کا منظر ہے۔

اقوام متحدہ اور انسانی حقوق

اقوام متحدہ نے ۱۹۴۸ء میں تیس نکات پر مبنی انسانی حقوق کا عالمی منشور جاری کیا۔ اس میں اقتصادی' معاشرتی' دیوانی' سیاسی اور قانونی حقوق کی علیحدہ علیحدہ جو دستاویزات منظور ہوئیں شامل ہیں۔ اقوام متحدہ کے منشور کے مطابق اس ادارہ کا فرض ہے کہ وہ بنیادی حقوق کی پاسداری کرے اور عمل کرائے تاکہ انسانی وقار دنیا میں بحال ہو سکے۔

اگر ان تحریکات کے منشوروں کا مطالعہ کیا جائے۔ اس کے ساتھ اسلامی منشور کا مطالعہ کریں تو ہر قاری پر واضح ہو جائے گا کہ اسلام نے آج سے چودہ سو سال قبل جس بلندی پر انسانی حقوق کا اعلان کیا تھا اس دور کی تحریکوں کے منشور ابھی بہت پیچھے ہیں۔ اسلامی منشور کی سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو منشور پیش کیا اس پر خود عمل کیا اور عمل کروایا۔ مثلاً اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حق مساوات کا اعلان کرتے ہیں تو حضرت بلال' حضرت سلمان' حضرت صہیب رومی' حضرت خباب بن الارت' عمار بن یاسر کا مقام اسلامی ریاست مدینہ اور اسلامی معاشرہ میں کسی رئیس مہاجر اور کسی رئیس انصاری سے کم نہیں اسلام نے غلاموں کو بھی وہی حقوق دیے ہیں۔ جو ایک معزز خاندان کے آزاد فرد کو حاصل تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب مسلمانوں میں مواخات کروائی تو حضرت یزید بن حارث (آزاد کردہ غلام) کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عزیز چچا حضرت امیر حمزہ کا بھائی بنا دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وفات سے قبل روم کی سرحدوں کے دفاع کے لیے ایک لشکر تیار کیا۔ اسکا قائد اسامہ مقرر کیا۔ اس لشکر میں قریش کے بڑے بڑے رئیس شامل تھے۔

غرض کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس انسانی حقوق کی تعلیم دی ان پر عمل کیا اور عمل کرایا۔ دوم ان تحریکات کے منشوروں کا ماخذ اسلامی منشور ہے جس کا نفاذ آج سے چودہ سو سال

قبل ہو چکا ہے۔

بیت المال کی حفاظت

اسلامی ریاست کا یہ فرض ہے کہ بیت المال کی حفاظت کریں اور حکمران ناجائز طریقہ سے اپنی ذاتی ضروریات پر خرچ نہ کریں کیونکہ بیت المال قومی ملکیت ہے اس میں ناجائز تصرف نہیں ہونا چاہیے۔ خلفاء راشدین کی مثالیں تاریخ میں موجود ہیں انھوں نے بیت المال سے اتنا ہی وظیفہ لیا جتنی ضرورت تھی۔ ارشاد الٰہی ہے۔

قَالَ اجْعَلْنِي عَلٰى خَزَآئِنِ الْأَرْضِ إِنِّيْ حَفِيْظٌ عَلِيْمٌ (یوسف ۱۲:۵۵) یوسف نے کہا مجھے ملک کے خزانوں پر مقرر کر دو میں نگہبان اور خبردار ہوں۔

اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت

تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ جب سے ریاست نے جنم لیا ہے۔ اقلیتوں اور ماتحت اقوام کا وجود ذلت اور مسکنت کا نشانہ بنا رہا ہے۔ حاکم قوم کے تحت ذلیل و خوار ہو کر زندگی گزار دی۔ اگر محکوم قوم کو غالب آنے کا موقع مل گیا تو غالب آ کر اپنی سابقہ ذلت اور رسوائی کا انتقام لیا۔ اس قسم کے انقلابات سے تاریخ کے اوراق بھرے پڑے ہیں۔

غلامی کا رواج بھی اسی ظلم و عدوان کا نتیجہ ہے۔ محکوم قوم غلام تصور کی جاتی تھی۔ ان کو معاشرتی اقتصادی سیاسی اور مذہبی آزادی سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ اسلام سے قبل تمام متمدن حکومتوں میں اقلیتوں کی ناگفتہ بہ اور المناک حالت تھی۔

مصر

مصر میں قبطی قوم حکمران تھی۔ وہ اقلیت بنی اسرائیل سے نہایت ہی ذلت آمیز سلوک کرتی تھی۔ ان سے بیگار لیا جاتا۔ انکار کرنے والے کو زندگی سے ہاتھ دھونے پڑتے۔ ان کی جان مال عزت قبطیوں کے ہاتھوں محفوظ نہ تھی تورات میں ارشاد ہے:۔

> "انھوں نے (مصری قبطیوں نے) ان پر بیگار لینے والے مقرر کیے جو ان سے سخت کام لے کر ان کو ستائیں۔ سو انھوں نے فرعون کے لیے ذخیرہ کے شہر پتوم رعمسیس بنائے۔ پھر انھوں نے جتنا ان کو ستایا وہ اتنا ہی زیادہ بڑھے اور پھیلنے لگے۔ اس لیے وہ لوگ بنی اسرائیل کی طرف سے فکر مند ہو گئے اور مصریوں نے ہر تشدد کر کے ان سے کام کرایا اور انھوں نے ان سے سخت محنت سے گارا اور اینٹ بنوا بنوا کر اور ہر کھیت میں ہر قسم کی محنت لے لے کر ان کی زندگی تلخ

کی ان کی سب خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے تشدد کی تھیں۔"[1]

قرآن مجید میں آتا ہے۔ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَاءَ هُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَ هُمْ یعنی وہ (فرعون اور اس کی قوم) ان کے (بنی اسرائیل کے) بیٹوں کو ذبح کر دیتے اور لڑکیوں کو زندہ چھوڑ دیتے۔

جب بنی اسرائیل محکومیت اور مظلومیت کے پھندے سے باہر نکلی اور دوسری اقوام کو زیر کرنے کے لیے میدان جنگ میں نکلی تو ماتحتوں کے متعلق ان کو یہ تعلیم دی۔

"جب خداوند (تیرا خدا) اسے تیرے قبضہ میں کر دیوے تو واں کے ہر ایک مرد کو تلوار کی دھار سے قتل کر...... لیکن ان قوموں کے شہر میں جنھیں خداوند (تیرا خدا) تیری میراث کر دیتا ہے۔ کسی چیز کو جو سانس لیتی ہے جیتا نہ چھوڑیو۔"[2]

"سو تم ان بچوں کو جو لڑکے ہیں سب کو قتل کرو اور ہر ایک عورت کو جو مرد کی صحبت سے واقف نہیں ہوئیں ان کو اپنے لیے زندہ رکھو۔"[3]

خداوند نے ساؤل کو حکم دیا۔

"سو اب تو جا اور عمالیق کو مار اور سب جو کچھ ان کا ہے یک لخت حرم کر (قتل کر) اور ان پر رحم مت کر بلکہ مرد اور عورت اور ننھے بچے اور شیر خوار بیل اور بھیڑ اونٹ اور گدھے تک سب کو قتل کر۔"[4]

یشوع جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا جرنیل تھا۔ اس کے بارے میں لکھا ہے:۔

"اور انھوں نے ان سب کو جو اس شہر میں تھے مرد کیا عورت کیا جوان کیا بوڑھا کیا۔ بیل کیا بھیڑ اور گدھا سب کو تہہ تیغ کیا۔"[5]

ساؤل جسے خداوند نے سموئیل کی معرفت بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا تھا۔ جب اس کی جنگ عمالیقیوں کے ساتھ ہوئی تو اس نے سب کو ہلاک کر دیا۔ ان میں سے کسی کو بھاگنے نہ دیا اور نہ جیتا چھوڑا مگر اچھی اچھی بھیڑوں بیلوں اور پالے ہوئے بچوں اور بڑوں کو جیتا رکھا۔ خداوند کا غصہ اس پر بھڑکا کہ ہر ایک جان دار کو ہلاک کیوں نہ کیا گیا؟ اور خدا پچھتایا کہ اس نے ساؤل کو بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر کیا۔[6]

بابل

بابلیوں کے عہد میں محکوم قوم کی حالت نہایت ہی ذلت آمیز اور درد ناک تھی۔ بابل کے

1۔ تورات خروج باب نمبر ا۔ 2۔ استثناء ۲۰: ۱۳۔ ۱۶۔
3۔ گنتی باب ۳۱: ۹۔ ۱۶۔ ۱۷۔ 4۔ سموئیل اول ۱۵: ۳۔
5۔ یشوع ۶: ۲۱۔ 6۔ سموئیل اول ۱۵: ۹، ۳۵۔

بادشاہ بخت نصر کے عہد میں بنی اسرائیل کو نظر بند کیا گیا۔ ان سے ہر قسم کا ذلت آمیز سلوک کیا جاتا۔ نہ ان کی عزت محفوظ تھی اور نہ ان کو سماجی اور دینی آزادی حاصل تھی۔ ساٹھ فٹ لمبا سونے کا بت بنا کر انھیں پوجنے کے لیے مجبور کیا گیا۔ جو اس سے انکار کرتا اس کو نذر آتش کر دیا جاتا۔

یونان

یونان میں اقلیتوں کی حالت نہایت ہی ناگفتہ بہ تھی۔ مشہور یونانی فلسفی ارسطو نے ملکی استحکام اور بقاء کے لیے غلام کے وجود کو ناگزیر قرار دیا اور کہا:-

"غلام ایک ایسا ذی روح آلہ یا متاع ہے جس کے ذریعہ زندگی کا نظام چل رہا ہے۔"

یونانی قوم جن ممالک کو مغلوب کر لیتی تھی۔ وہاں کے باشندے ان کے غلام سمجھے جاتے اور وہ ہر قسم کی آزادی سے محروم کر دیے جاتے۔ ان سے نہایت ہی ذلت آمیز اور مشقت کا کام لیا جاتا۔ اگر کوئی انکار کرتا تو مار مار کر اس کی کھال ادھیڑ دی جاتی۔

رومی سلطنت

رومی سلطنت میں اقلیتوں کا بہت ہی بُرا حال تھا۔ ان لوگوں کے نزدیک مفتوحہ قومیں غلام ہوا کرتی تھیں۔ جنگ میں جو لوگ گرفتار ہوتے تھے ان کو رُوما کے بازاروں میں فروخت کر دیا جاتا تھا۔ رومی بادشاہ نے جب عیسائیت قبول کی تو غیر عیسائیوں کو جبراً عیسائیت قبول کرایا جانے لگا۔ اس جبر و استبداد کی بناء پر بہت سوں نے خودکشی کر لی۔ ان کے تمام مذہبی ادارے توڑ دیے گئے۔

یہودی اقلیت کو بیت المقدس سے باہر نکال دیا اور بیت المقدس کے تین ہزار فٹ کے احاطہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔

فارس

فارسی اکثریت نے عیسائی اقلیت کو ظلم و استبداد کا نشانہ بنا رکھا تھا۔ اس کے مقابل پر شاہ روم عیسائی تھا۔ اس وجہ سے ایرانی عیسائیوں کو ہمیشہ شک و شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا تھا اور معمولی سی غلطی پر انتہائی الم ناک سزا دی جاتی تھی۔

سیکولرزم اور اقلیت

آج کل یہ کہا جاتا ہے کہ اقلیتوں پر ظلم و تشدد کی وجہ مذہب ہے۔ اگر مذہب کو انفرادی معاملہ قرار دے دیا جائے تو اکثریت اقلیت پر دست درازی نہیں کرے گی۔

اگر دنیا کی سیکولر حکومتوں کا جائزہ لیا جائے تو لادینی نظام بھی اقلیتوں کو اکثریت کے ظلم و استبداد سے نجات نہیں دلا سکا اور ان کی وہی ابتر حالت ہے جو قدیم زمانہ میں اقلیتوں کی تھی۔ وہ آج بھی اکثریت کے رحم و کرم پر زندگی گزارنے پر مجبور ہیں۔

امریکہ میں نیگرو کی حالت نہایت ہی خراب ہے وہ سماجی اقتصادی مذہبی آزادی سے محروم ہیں۔ وہ سفید فام لوگوں کے گرجا میں داخل نہیں ہو سکتے۔ امریکہ کے قدیم باشندے ریڈ انڈین حیوانی زندگی گزار رہے ہیں۔ اس ظلم کے خلاف لوتھر کنگ نے آواز اٹھائی تو اس کو گولی کا نشانہ بنا دیا گیا۔

برطانیہ میں بیرونی باشندوں کی جو ابتر حالت ہے۔ وہ کسی سے ڈھکی چھپی نہیں نسلی منافرت دن بدن بڑھتی جا رہی ہے۔ حالیہ انتخاب (۱۹۷۰ء) میں اس کا جو نتیجہ نکلا وہ قابل غور ہے۔

بنگلہ روزنامہ اتفاق کے مبصر لکھتے ہیں:۔

> "نسلی عصبیت کے علمبردار ٹوری لیڈر مسٹر انک پال پہلے سے زیادہ ووٹ حاصل کر کے کامیاب ہوئے بعض کا خیال ہے کہ ٹوری پارٹی کے ممبروں میں کم از کم تیس اوی پال نواز ہیں۔
>
> یہ بات صحیح ہے کہ نسلی منافرت کے ڈاکہ اور لوٹ مار کو عام باشندے پسند کی نگاہ سے نہیں دیکھتے لیکن اندیشہ ہے کہ حالات کی زد میں آ کر پورا برطانیہ ان جراثیم کے اثر سے متاثر ہو جائے گا۔ عام آدمی بیرونی باشندے کی ضرورت کی وجہ تلاش نہیں کرتے بلکہ ہر کسی بیرونی کو وہ طفیلی کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ برطانیہ میں رنگ و نسل کی عصبیت کا سیلاب بہتا جا رہا ہے۔"[1]

ہندوستان میں جو اقلیتوں کی مٹی پلید ہو رہی ہے۔ گاہے بگاہے اخبارات میں ان کی خستہ حالی اور مظلومیت کی داستانیں شائع ہو جاتی ہیں۔ ان کو پڑھ کر ایک قاری بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ لادینی نظام کہاں تک اقلیتوں کے حقوق کو تحفظ دے سکا ہے۔

۸ مئی ۱۹۷۰ء کو پولیس کی حفاظت میں بیس فسادی نوجوانوں نے جل گاؤں کے علاقہ میں ایک بیوہ کے گھر پر بم پھینکا اور اس بیچاری کے دو لڑکوں اور لڑکیوں کو جلا کر راکھ کر دیا۔

(روزنامہ آزاد مورخہ ۱۰/ اساڑھ ۱۳۷۷ بنگلہ)

فرقہ وارانہ فسادات ہندوستان میں روزمرہ کا معمول بن چکا ہے۔ وہاں اقلیتوں کا مال جان اور عزت ہر وقت خطرے میں رہتی ہے اور حکومت کے رحم و کرم پر زندگی کے دن گزار رہی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ عراق میں اسرائیل فلسطین، ہندوستان، کشمیر میں جس بے رحمی کا عمل کر رہا ہے وہ تاریخ کا ایک سیاہ باب ہے۔

---

[1] ۶/ اساڑھ ۱۳۷۷ بنگلہ۔

اسلامی حکومت میں اقلیت

اس بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اب تک کسی نظام حکومت نے اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ نہیں کیا۔ اسلام ہی صرف ایک ایسا نظام حیات ہے۔ جس میں غیر مسلم رعایا کے حقوق کو تحفظ دیا گیا ہے۔

اسلامی حکومت کے اعتبار سے اقلیتوں کی دو قسمیں ہیں۔

ایک وہ معاہد جو مصالحت یا معاہدے کے ذریعہ اسلامی حکومت کے ماتحت آتے ہیں۔ ان کو اسلامی اصطلاح میں معاہدہ یا ذمی کہا جاتا ہے۔ یہ غیر مسلم رعایا جزیہ دیتی ہے اور اسلامی حکومت کی رعایا بنا منظور کرتی ہے۔

دوم: اہل الصوۃ یعنی جو لڑائی میں شکست کھا کر مغلوب ہوتے ہیں۔

غیر مسلم رعایا کے حقوق

معاہدات کی پابندی

اسلام نے معاہدات کو دیانت داری کے ساتھ نبھانے کی تعلیم دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَوْفُوا بِالْعَهْدِ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُوْلاً [1] اے مسلمانو! تم اپنے عہد کو پورا کرو کیونکہ عہدوں کے متعلق پوچھا جائے گا۔

دوسری جگہ آتا ہے وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يُهَاجِرُوْا مَالَكُمْ مِّنْ وَّلَايَتِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا وَاِنِ اسْتَنْصَرُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ اِلَّا عَلٰى قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ [2] اور وہ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت نہیں کی۔ تم پر ان کی دوستی کا کوئی حق نہیں یہاں تک کہ وہ ہجرت کریں اور اگر تم سے دین کے متعلق مدد چاہیں تو تم پر مدد دینا فرض ہے سوائے اس کے کہ یہ مدد ان لوگوں کے خلاف نہ ہو جن کے اور تمھارے درمیان عہد ہے۔ اللہ جو تم کرتے ہو اسے دیکھتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں معاہدہ کی پابندی کا اس قدر تاکیدی حکم دیا ہے کہ اگر اسلامی حکومت کا کسی غیر مسلم قوم کے ساتھ معاہدہ ہو اور پھر اس غیر مسلم معاہدہ کے خلاف کوئی دوسری مسلمان قوم اسلامی حکومت سے مدد طلب کرے تو وہ معاہد قوم کے خلاف ہرگز مدد نہ کرے اور اپنے عہد پر قائم رہے۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابوعبیدہؓ فاتح شام کو لکھا:

---

1. بنی اسرائیل ۱۷:۳۴۔ 2. الانفال ۸:۷۲۔

وَامْنَعِ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ ظُلْمِهِمْ وَالْاِضْرَارِ لَهُمْ وَاَكْلِ اَمْوَالِهِمْ اِلَّا بِحِلِّهَا وَوَفِّ لَهُمْ بِشَرْطِهِمُ الَّذِيْ شُرِعَتْ لَهُمْ فِيْ جَمِيْعِ مَا اَعْطَيْتُمْ[1] مسلمانوں کو ذمیوں پر ظلم کرتے ان کو نقصان پہنچانے اور ناجائز طور پر ان کا مال کھانے سے روکو ان سے جو شرطیں کی گئی ہیں اور ان سے جو وعدے کیے گئے ہیں ان کو پورا کرو۔

ایک مرتبہ آپ کو معلوم ہوا کہ اہواز کے ذمی بھاگ رہے ہیں تو تحقیقات کے لیے بصرہ سے دس نیک سیرت مسلمان طلب کر لیے ان میں سے ایک احنفؓ بن قیس بھی تھے۔ ان سے پوچھا کہ ذمی مسلمانوں کے ظلم و تشدد کی وجہ سے بھاگ رہے ہیں یا اور کسی وجہ سے۔ انھوں نے جواب دیا کہ ان پر کسی قسم کا ظلم نہیں ہوا۔ وہ از خود بلا کسی وجہ کے بھاگ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ آپ کی مرضی کے مطابق سلوک کیا جاتا ہے۔

مگر اس بیان سے آپ کو اطمینان قلب نصیب نہ ہوا تو عتبہ بن غزوان والی بصرہ کو لکھا کہ:۔

> "لوگوں کو ذمیوں کے ساتھ جور و ظلم سے روکو اور اس سے ڈرو اور محتاط رہو ایسا نہ ہو کہ تمہاری بدعہدی یا ظلم کی وجہ سے حکومت تم سے چھین لی جائے خدا نے تم کو اس وعدہ پر حکومت عطا کی ہے۔ اس لیے اس عہد کو پورا کرو اور اس کے حکم اور مرضی پر عمل کرو اس وقت خدا تمہاری مدد کرے گا۔"[2]

دشمن کے حملے سے حفاظت

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جن قوموں پر جزیہ لگایا تو ان کو یہ لکھ کر دیا کہ اگر دشمن ان پر حملہ کرے گا تو ان کی طرف سے مدافعت کی جائے گی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں: یمنعوا۔[3]

مذہب کی آزادی

ذمی اپنی بستیوں میں مذہبی فرائض بجا لانے میں آزاد ہوں گے اور ان کے مذہبی حقوق پر کسی قسم کی پابندی عائد نہیں کی جائے گی۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَاۤ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ[4] یعنی دین میں کوئی جبر نہیں۔

ابو عبید نے تلوار کے ذریعہ فتح کیے ہوئے مقامات کی فہرست دینے کے بعد لکھا: کہ "سارے مقامات بزور شمشیر فتح ہوئے اور ان میں ان کے باشندوں کو ان کے مذہب و شریعت کی پوری آزادی کے ساتھ بسنے کی اجازت دی گئی۔"[5]

1۔ کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۸۲ مطبوعہ مصر۔ 2۔ طبری جلد ۴ ص ۲۵۴۴۔
3۔ فتوح البلدان صفحہ ۵۹۔ 4۔ بقرہ ۲:۲۵۶۔ 5۔ کتاب الاموال ابو عبیدہ صفحہ ۱۵۰۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کے عہد میں حیرہ کی فتح کے بعد حضرت خالدؓ بن ولید نے جو اہل حیرہ سے معاہدہ کیا اس میں لکھا۔ لَا یُهْدَمُ لَهُمْ بَیْعَةٌ وَلَا کَنِیْسَةٌ وَلَا یُمْنَعُوْنَ مِنْ ضَرْبِ النَّوَاقِیْسِ وَلَا مِنْ اِخْرَاجِ الصُّلْبَانِ فِیْ یَوْمِ عِیْدِهِمْ۔[1] ان کی خانقاہیں اور گرجے پیوند خاک نہیں کیے جائیں گے۔ نہ ان کے عید کے دن ان کو ناقوس بجانے اور صلیبیں نکالنے سے روکا جائے گا۔

شام کے پادری کو یہ ضمانتیں دیں۔

وَلَا یُهْدَمُ لَهُمْ بَیْعَةٌ وَلَا کَنِیْسَةٌ وَعَلٰی اَنْ یَضْرِبُوا النَّوَاقِیْسَهُمْ فِیْ اَیِّ سَاعَةٍ شَاؤُا مِنْ لَیْلٍ اَوْنَهَارٍ اَلَّا فِیْ اَوْقَاتِ الصَّلٰوةِ وَعَلٰی اَنْ یَخْرِجُوا الصُّلْبَانَ فِیْ اَیَّامِ عِیْدِهِمْ۔[2] ان کی خانقاہیں اور گرجے نہ ڈھائے جائیں گے۔ وہ نماز کے اوقات کے علاوہ رات دن جب چاہیں ناقوس بجا سکتے ہیں اور عید کے موقع پر صلیبیں نکال سکتے ہیں۔

ابو عبیدہؓ فاتح شام نے اہل شام کو عبادت خانوں کے تحفظ کی پوری ضمانت دی۔ وَاشْتَرَطَ عَلَیْهِمْ حِیْنَ دَخَلَهَا اَنْ تُتْرَکَ کَنَائِسُهُمْ وَبِیَعُهُمْ۔[3] حضرت ابو عبیدہؓ نے اہل شام سے وعدہ کیا کہ ان کی خانقاہیں اور گرجے برقرار رکھے جائیں گے۔

جان کی حفاظت

اسلام نے اقلیتوں کی جان مسلمانوں کی جان کے برابر قرار دی ہے۔ اگر کوئی مسلمان کسی ذمی کو قتل کرے گا تو قاتل کو مقتول کے قصاص میں قتل کر دیا جائے گا۔ اگر مقتول کے ورثاء قصاص لینے کی بجائے خون بہا لینے پر راضی ہو جائیں تو قاتل کو خون بہا دینا ہو گا۔ بیہقی میں روایت ہے کہ عہد نبوی میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا۔ مقدمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش ہوا۔ تو آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا کہ مجھ پر ذمی کے عہد کو پورا کرنے کی زیادہ ذمہ داری ہے اور مسلمان کو قصاص میں قتل کر دیا۔[4]

عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: جس نے کسی ذمی کو قتل کر دیا وہ جنت کی خوشبو نہیں سونگھے گا۔[5]

قبیلہ بکر بن وائل کے ایک مسلمان نے حیرہ کے ایک عیسائی کو قتل کر دیا حضرت عمرؓ کو اس کی اطلاع دی گئی تو آپ نے لکھ بھیجا کہ "قاتل مقتول کے ورثاء کے حوالے کر دیا جائے"۔ چنانچہ قاتل حنین نامی ایک شخص کو جو مقتول کے ورثاء میں سے تھا سپرد کر دیا گیا اور اس نے اس کو قتل کر دیا۔[6]

1۔ کتاب الخراج صفحہ ۸۴۔ 2۔ کتاب الخراج صفحہ ۸۶۔
3۔ کتاب الخراج صفحہ ۸۰۔ 4۔ سنن بیہقی جلد ۸ صفحہ ۳۰، ۳۱۔
5۔ بخاری احمد۔ 6۔ زیلعی تخریج ہدایہ مطبوعہ دہلی صفحہ ۳۳۸، ۳۳۹۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ من کان له ذمتنا فدمه کدمنا و دیته کدیتنا. یعنی جو ذمی ہیں ان کا خون ہمارا خون ہے اور ان کا خون بہاء ہمارا خون بہا ہے۔

حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں ایک مسلمان شامی نے شام کے ایک قبطی کو قتل کر دیا مقدمہ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں پیش ہوا تو آپ نے قاتل کو قتل کرنے کا حکم دیا لیکن حضرت زبیرؓ بن عوام اور بعض دوسرے صحابہ کی سفارش پر قصاص معاف کرایا اور مقتول کے ورثاء کو مسلمان کی دیت کے برابر ایک ہزار دینار دیت دلوائی۔[1]

امام شعبیؒ، نخعیؒ اور امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں:

''اقلیت کا قاتل اگر مسلمان بھی ہو اس کو قصاص میں قتل کیا جائے گا۔''

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے عہد میں ایک مسلمان نے ایک ذمی کو قتل کر دیا تو آپ نے مسلمان کو ذمی کے ورثاء کے سپرد کر دیا کہ وہ چاہیں معاف کر دیں چاہیں قصاص میں قتل کر دیں۔ انھوں نے قتل کر دیا۔[2]

مال کی حفاظت

ذمی کی جان کی حفاظت کی طرح اس کے مال کی حفاظت بھی اسلامی حکومت کے ذمہ ہے۔ ذمیوں کے قبضہ میں جس قدر زمینیں تھیں انھیں کی تحویل میں رہنے دیں اگر خلیفہ کو مسجد یا اور کسی عمارت کی غرض سے زمین لینے کی ضرورت ہوتی تو معاوضہ دے کر لی جاتی تھی۔

جب عراق فتح ہوا تو صحابہ کی رائے تھی کہ ان کی اراضی مجاہدین میں تقسیم کر دی جائے لیکن حضرت عمرؓ کی یہ رائے تھی کہ زمینداروں اور کاشتکاروں کی تحویل میں رہنے دی جائے۔ کئی دن بحث و مباحثہ ہوتا رہا۔ آخر کار یہ ٹھہرا کہ مہاجرین اور انصار سے مشورہ کیا جائے۔ چنانچہ ایک اجتماع ہوا۔ انصار میں سے دس آدمی اپنے اپنے قبیلہ کی طرف سے حاضر ہوئے اور بڑے بڑے مہاجرین صحابہ یعنی حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ حضرت طلحہؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ بھی موجود تھے۔ حضرت عمرؓ نے کھڑے ہو کر اپنے خیالات کا اظہار کیا۔ حضرت بلالؓ اور حضرت عبدالرحمٰن بن عوف مخالف رہے لیکن عام رائے یہی ہوئی کہ ذمیوں کو ان کی زمینوں سے بے دخل نہ کیا جائے۔ حضرت بلالؓ قائل نہیں ہوتے تھے لیکن حضرت عمرؓ نے قرآن مجید کی ایک آیت سے استدلال کیا تو ان کو مجبور ہونا پڑا اور تمام صحابہ حضرت عمرؓ کی رائے سے متفق ہو گئے۔[3]

چنانچہ عراق کی کل اراضی زمینداروں کے قبضہ میں رہنے دی گئی۔ ان کو مالکانہ حقوق دے

---

[1] سنن بیہقی جلد ۸ صفحہ ۳۴۳۔

[2] نصب الرایہ جلد ۴ صفحہ ۳۳۷۔ [3] تفصیل کے لیے کتاب الخراج صفحہ ۱۴، ۱۵ ملاحظہ کریں۔

دیے گئے۔ مصر کی اراضی بھی مالکان کے قبضہ میں رہنے دی گئی۔ حکومت بھی بغیر معاوضہ کے ان سے لینے کی مجاز نہ تھی۔

وَلَيْسَ لَهُ اَنْ يَاْخُذَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْهُمْ وَهِيَ مِلْكٌ لَهُمْ يَتَوَارَثُوْنَهَا یعنی امام وقت بھی زمین لینے کا مجاز نہیں ہے وہ کاشتکاروں کی ملک ہے جو ان میں نسلاً بعد نسل منتقل ہوتی رہے گی اور وہ اس کی خرید وفروخت کر سکتے ہیں۔

اگر حکومت کو زمین کی ضرورت پڑتی تو مالک کو معاوضہ دیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک شخص نے دجلہ کے کنارے گھوڑوں کے پالنے کے لیے ایک رمنہ بنانا چاہا۔ آپ نے حضرت ابو موسیٰؓ اشعری کو جو بصرہ کے گورنر تھے لکھا کہ اگر وہ زمین ذمیوں کی نہ ہو اور اس میں ذمیوں کی نہروں اور کنوؤں کا پانی نہ آتا ہو تو سائل کو زمین دے دی جائے۔[1]

حضرت عمرؓ جابیہ میں تھے کہ ایک ذمی نے آ کر شکایت کی کہ لوگوں نے اس کا انگوروں کا باغ تباہ کر دیا ہے۔ حضرت عمرؓ تحقیق کے لیے خود وہاں گئے دیکھا کہ ان کے ساتھیوں میں سے ایک صاحب ڈھال میں انگور لیے جا رہا ہے۔ آپ نے فرمایا اچھا آپ بھی ہیں۔ اس نے جواب دیا یا امیر المومنین بھوک شدت سے لگی ہوئی تھی اس وجہ سے یہ حرکت کی ہے۔ حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ باغ کے مالک کو اس کے انگوروں کی قیمت ادا کر دی جائے۔[2]

تحفظ عزت

اقلیت کی عزت و ناموس کو وہی تحفظ حاصل ہے جس طرح ایک مسلمان کی عزت و آبرو کو۔ حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں حمص کے گورنر حضرت عمیر بن سعد کی زبان سے کسی ذمی کے متعلق اخزاک اللہ (اللہ تجھے رسوا کرے) یہ کلمہ نکل گیا تھا۔ اس پر حضرت عمیر بن سعد کو سخت ندامت ہوئی اور اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور فرمایا کہ اس منصب کے غرور میں مجھ سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے۔ لہٰذا یہ عدل و انصاف کے خلاف ہے کہ میں اس منصب پر فائز رہوں (الفاروق)

درالمختار میں لکھا ہے: "اس کو تکلیف دینے سے باز رہنا واجب ہے اور اس کی غیبت اسی طرح حرام ہے جیسی مسلم کی غیبت حرام ہے۔"[3]

ارشاد نبوی ہے: مَنْ ظَلَمَ مُعَاهِدًا اَوِ انْتَقَصَهُ اَوْ كَلَّفَهُ فَوْقَ طَاقَتِهٖ اَوْ اَخَذَ مِنْهُ شَيْئًا بِغَيْرِ طِيْبِ نَفْسِهٖ فَاَنَا حَجِيْجُهُ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ. جو شخص کسی معاہد پر ظلم کرے یا اس کو نقصان پہنچائے یا اس کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف دے یا اس کی خوشی کے بغیر کچھ لے لے تو میں اس معاہد کی طرف

1۔ فتوح البلدان صفحہ ۳۵۱۔ 2۔ کتاب الاموال ابو عبیدہ صفحہ ۱۵۱۔
3۔ درالمختار جلد ۳ صفحہ ۲۷۳، ۲۷۴۔

سے قیامت کے دن حجت کروں گا۔

روزی اور کفاف کا ذمہ

اگر ذمی اپنی روزی کمانے سے عاجز آ جائے تو اس کے گزارے کے لیے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا جائے گا۔ حضرت عمرؓ بن عبدالعزیز نے اپنے عامل عدی بن ارطاۃ کو حکم بھیجا کہ اپنے علاقہ کے ذمیوں کے حالات معلوم کرو جو بوڑھے ہو چکے ہوں اور روزی کمانے کے قابل نہیں رہے تو ان کے گزران کے لئے بیت المال سے وظیفہ مقرر کیا جائے۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک بوڑھے ذمی کو دیکھا کہ در در بھیک مانگتا پھرتا تھا آپ نے اس سے فرمایا ہم نے تمھارے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا۔ جب تم جوان تھے اور کماتے تھے تو ہم نے تم سے جزیہ وصول کیا اب جب تم کمانے کے قابل نہیں رہے اب ہم نے تم کو نظر انداز کر دیا ہے۔ اس کے بعد آپ نے اس کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا۔[1]

اگر ذمی دشمن کے قبضہ میں آ جائے اور فدیہ دے کر چھڑانے کی ضرورت پیش آئے تو فدیہ بیت المال سے دیا جائے گا۔[2]

خالد بن ولیدؓ نے فتح حیرہ کے وقت جو معاہدہ کیا تھا اس میں درج کیا اور میں نے ان کو یہ حق دیا کہ اگر کوئی بوڑھا کام کرنے سے معذور ہو جائے یا اس پر کوئی مصیبت آن پڑے یا پہلے دولت مند تھا پھر مفلس ہو گیا اور اس وجہ سے اس کے ہم مذہب اس کو خیرات دینے لگے تو اس کا جزیہ موقوف کر دیا جائے گا اور اس کا اور اس کے اہل و عیال کا نفقہ مسلمانوں کے بیت المال سے مقرر کر دیا جائے گا۔ جب تک وہ مسلمانوں کے ملک میں رہے اگر وہ اسلامی ملک سے چلا جائے تو مسلمانوں پر اس کے اہل و عیال کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔[3]

اقتصادی آزادی

اسلامی حکومت میں اقلیتوں کو اقتصادی آزادی حاصل ہوتی ہے کمانے اور خرچ کرنے میں مکمل آزادی ہے یہاں تک کہ بعض ایسی چیزوں کی تجارت کرنا جو ایک مسلمان کے لیے حرام ہے۔ اقلیتوں کو اجازت ہے جیسے شراب اور خنزیر کی خرید و فروخت کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے:

"ان کے لیے شراب جیسے ہمارے لیے سرکہ ہے ان کے لیے خنزیر جیسے ہمارے لیے بکری۔" (ہدایہ)

---

[1] کتاب الاموال ابو عبیدہ صفحہ ۴۶۔ [2] کتاب الاموال ابو عبیدہ صفحہ ۱۲۷۔
[3] کتاب الخراج از امام ابو یوسف۔

یعنی جس طرح ایک مسلمان کے لیے سرکہ اور بکری کی خرید وفروخت اور استعمال حلال ہے اسی طرح اقلیتوں کے لیے شراب اور خنزیر کی بیع وشراء اور اکل وشرب جائز ہے۔

سیاسی حقوق

اسلامی حکومت میں اقلیتوں کو یہ حق حاصل ہے کہ خلیفہ ملکی امور میں ان سے مشورہ لے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں بنیامین نامی مصری قبطیوں کا ایک سردار تھا۔ جب حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا کہ وہ اپنی قوم میں بااثر شخص ہے تو حضرت عمروؓ بن العاص کو لکھ بھیجا کہ انتظامی امور میں اس سے مشورہ لیں۔

اسی طرح اقلیتوں کے امور میں انہی کی رائے معتبر تصور ہوگی۔ عراق کے انتظام کے وقت وہاں کے قائدین کو مدینہ بلوایا اور ان سے مشورہ لیا۔ ایسا ہی مصر کے اقلیتی لیڈر مقوقس کی رائے لینے کے بعد وہاں انتظامی امور کا فیصلہ فرمایا تھا۔

اقلیتوں کے پرسنل لاء

اسلام نے اقلیتوں کے اپنے مذہبی قانون میں ہر قسم کی آزادی دی ہے اسلامی عدالت میں ان کے قانون کے مطابق ہی فیصلے ہوں گے۔ اہل نجران کے معاہدہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاف طور پر فرما دیا تھا کہ:

''ان کے خالص مذہبی امور میں کوئی مداخلت نہیں کی جائے گی۔'' (کتاب الاموال)

خلفائے راشدین کے دور میں اس پر عمل ہوتا رہا۔ حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز نے حضرت حسن بصریؒ سے پوچھا:

''کیا وجہ ہے کہ خلفائے راشدین نے ذمیوں کو محرمات کے ساتھ نکاح' شراب اور خنزیر کے معاملہ میں آزاد چھوڑ دیا ہے۔''

حضرت حسن بصریؒ نے جواب دیا:

''انھوں نے جزیہ دینا اس وجہ سے قبول کیا ہے کہ انھیں ان کے عقیدے کے مطابق زندگی بسر کرنے کی آزادی دی جائے۔ آپ کا کام انہی کے نقش قدم کی پیروی کرنا ہے۔ اور اپنی طرف سے کوئی نئی بات ایجاد نہیں کرنی ہے۔''[1]

علامہ ابوالحسن ماوردی تحریر فرماتے ہیں:

''انھیں اپنے حقوق اپنے حکام کے پاس لے جانے میں کسی قسم کی ممانعت نہیں کی جاسکتی۔'' (احکام سلطانیہ)

1۔ کتاب الاموال ابو عبیدہ صفحہ ۳۶۔

تاریخ چین کا مصنف لکھتا ہے:

"جن عیسائیوں نے مفتوحہ ملک میں رہنا پسند کیا ان کے مال و جان کی پوری حفاظت کی گئی۔ انھیں پورا حق حاصل تھا کہ اپنے طور پر اپنی عبادت کریں۔ معینہ حدود میں انہی کے قوانین رائج تھے۔ بعض ملکی اور قومی عہدوں پر ان کا تقرر کیا گیا۔ ان کی عورتوں کو اجازت تھی کہ وہ فاتحوں کے ساتھ شادی بیاہ کریں غرض ازروئے قانون ان کے ساتھ کوئی ایسا برتاؤ نہیں کیا جاتا تھا جس سے مفتوح یا غلام معلوم ہوں۔"[1]

دفاعی نظام اور اقلیت

اصولی طور پر اسلامی حکومت کسی اقلیت کو جبری طور پر فوج میں بھرتی نہیں کر سکتی کیونکہ اسلامی حکومت ان سے ایک دفاعی ٹیکس لیتی ہے اور اقلیت کے ہر فرد کی جان، مال اور ناموس کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ اس دفاعی ٹیکس سے بچے، بوڑھے، عورت اور اپاہج وغیرہ مستثنیٰ تھے۔

اگر اسلامی حکومت ان کی حفاظت نہ کر سکے تو وہ دفاعی ٹیکس واپس کرنا پڑتا ہے۔ حضرت ابو عبیدہؓ کے عہد گورنری میں رومیوں کے ساتھ ایک دفعہ شام کی لڑائی میں مسلمان کچھ پسپا ہو گئے تھے تو اس وقت حضرت ابوعبیدہؓ نے اقلیتوں سے لیا ہوا ٹیکس یہ کہہ کر واپس کر دیا کہ تمہاری حفاظت کے بدلہ میں یہ لیا گیا تھا۔ اس وقت ہم تمہاری حفاظت نہیں کر سکے اس لیے ہمیں اس کے رکھنے کا کوئی حق نہیں۔

ہاں! جو اقلیت اپنی خوشی سے فوج میں بھرتی ہونا چاہے اس سے یہ جزیہ وصول نہیں کیا جاتا بلکہ اس کو فوجی وظیفہ بھی ملتا ہے۔ معاہدہ آذربائیجان میں یہ واضح طور پر لکھا تھا کہ اقلیت کے وہ افراد جو اسلامی فوج میں حصہ لیں گے ان سے اس سال کا جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ اسلامی حکومت میں رہنے والے غیر مسلم باشندے اگر اپنی مرضی سے فوج میں بھرتی ہوں تو حکومت کو ان سے خدمت لینے میں کوئی حرج نہیں اور اس کے عوض ان کو عطیہ یعنی مال غنیمت سے کچھ دیا جائے گا۔ (کتاب الاموال)

سرکاری ملازمت

سرکاری مناصب پر اسلام اقلیتوں کو بھی ان کی صلاحیت کے مطابق ملازمت کا موقع دیتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے جب اپنے عہد خلافت میں قاہرہ سے بحر احمر تک ایک نالی کھدوائی تھی تو اس وقت ایک ذمی کو انجینئر مقرر فرمایا تھا۔

---

1 الہارون صفحہ ۲۸۴۔

حضرت سید احمد شہید نے اپنے زمانہ میں ایک ہندو کو اسلحہ خانہ کا نگران مقرر کیا تھا۔

قانون کی نظر میں مساوات

اسلامی حکومت میں مسلمان اور اقلیت قانون کی نظر میں برابر ہے۔ دنیا میں کوئی ایسی مثال نہیں کہ فاتح قوم نے مغلوب قوم کو قانون میں اپنے برابر قرار دیا ہو۔ یہ امتیاز بھی اسلام کو حاصل ہے۔ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل نجران کو یہ تحریر فرما دیا تھا کہ ان میں سے اگر کوئی حق کا دعویٰ لے کر حاضر ہو تو اس کے ساتھ غیر جانبدارانہ انصاف کیا جائے گا۔''[1]

عہد علیؓ مرتضیٰ میں ایک یہودی نے ان کی زرہ چوری کر لی تھی۔ حضرت علیؓ قاضی کی عدالت میں حاضر ہوئے اور ان کے دو گواہ تھے۔ ایک حضرت حسنؓ بن علی اور دوسرے ان کے غلام۔ لیکن قاضی نے باپ کے حق میں بیٹے کی شہادت اور آقا کے حق میں غلام کی گواہی کو مسترد کر دیا اور یہودی کے حق میں فیصلہ صادر فرما دیا۔ یہودی اسلام کے اس عدل و انصاف کو دیکھ کر مسلمان ہو گیا۔

جزیہ اور خراج وصول کرنے میں نرمی

اسلام جزیہ اور خراج کی وصولی میں سختی سے منع کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے شام کے گورنر حضرت ابو عبیدہؓ کو لکھا:

''مسلمانوں کو ان پر ظلم کرنے اور انھیں ستانے اور ناجائز طریقے سے ان کے مال کھانے سے منع کرو۔''[2]

حضرت عمرؓ جزیہ کی وصولی کے بعد خفیہ طور پر تفتیش کرتے تھے کہ ان پر کسی قسم کا دباؤ ڈال کر تو جزیہ وصول نہیں کیا گیا۔

1۔ کتاب الاموال۔ 2۔ کتاب الخراج صفحہ ۸۲۔

شہریوں کے فرائض اور اسلامی حکومت کے حقوق

سمع و طاعت

اسلامی ریاست کے ہر شہری پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ خلیفہ اور ارباب کار کا حکم مانیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح اپنی اطاعت کے لیے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس طرح اولوالامر کی اطاعت کو رسول کی اطاعت کے لیے لازمی قرار دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔[1] اطاعت کرو اللہ کی اور رسول کی اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہیں۔

موطا میں حضرت عبادہؓ بن صامت سے روایت ہے:

بَایَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِی الْعُسْرِ وَالْیُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرِهِ. یعنی ہم سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سمع و طاعت (ماننے اور تعمیل کرنے) کا عہد لیا۔ تنگی، فراخی، خوشی اور ناخوشی ہر حال میں۔

ایک اور حدیث میں ہے، فرمایا: اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ حَبْشِیٌّ كَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِیْبَةٌ (بخاری ۱:۵۴) "سنو اور اطاعت کرو" اگر تم پر کوئی حبشی غلام مقرر کر دیا جائے۔ جس کا سر کشمش کی طرح ہو جب تک کہ وہ کتاب اللہ کے مطابق تم کو حکم دے۔ (بخاری)

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ حَقٌّ مَالَمْ یُؤْمَرْ بِالْمَعْصِیَةِ فَاِذَا اُمِرَ بِالْمَعْصِیَةِ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ (بخاری ۵۶:۱۰۸) اولو الامر کے احکام سننا اور ان کی تعمیل کرنا واجب ہے جب تک کہ وہ معصیت کا حکم نہ دے جب برائی کا حکم دیا جائے تو پھر اس کا نہ سنا جائز ہے اور نہ اس کی تعمیل کرنا۔

اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ فِیْمَا اَحَبَّ وَاَكْرَهَ مَالَمْ یُؤْمَرْ بِمَعْصِیَةٍ فَاِذَا اُمِرَ بِمَعْصِیَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ. (بخاری کتاب الاحکام) ہر مسلمان پر امراء کی اطاعت ضروری ہے جب تک کہ وہ برائی کا حکم نہ دے جب برائی کا حکم دیا جائے تو پھر نہ سننا ہے اور نہ ماننا۔

قانون کی پابندی

قانون کی تابعداری ہر شہری کا فرض ہے۔ اس کے بغیر نہ ملک میں امن قائم رہ سکتا ہے اور

[1] النساء ۴:۵۹۔

نہ معاشرہ کی عمارت صحیح بنیادوں پر کھڑی ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

لَا تُفْسِدُوا فِی الْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَاحِهَا [1] یعنی زمین میں اس کی اصلاح ہو جانے کے بعد فساد نہ کرو۔

فساد ہمیشہ قانون شکنی سے پیدا ہوتا ہے گویا فساد قانون شکنی کا دوسرا نام ہے۔ دوسری جگہ آتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَٰئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ [2] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگ ہیں۔

تعاون

انسان مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کا محتاج ہے اگر باہمی تعاون کے ساتھ انسان ایک دوسرے کی ضروریات اور احتیاجات کو پورا نہ کریں تو سوسائٹی میں فساد برپا ہو جائے اور ایک دوسرے کی زندگی اجیرن ہو جائے۔ اس وجہ سے سوسائٹی کو برقرار رکھنے کے لیے ایک دوسرے کا تعاون ضروری ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

تَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوَىٰ [3] نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو۔

وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ [4] اور گناہ اور زیادتی پر ایک دوسرے کی مدد نہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اسلامی سوسائٹی کے افراد کو ایک عمارت سے تشبیہ دے کر فرماتے ہیں:

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا شَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهِ۔ [5] ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسا کہ عمارت کی اینٹیں ایک جز دوسرے جز کو قوت دیتا ہے۔ پھر اپنی انگلیوں کو ملا کر مثال بتائی۔ اور پھر فرمایا:

تَكَاتَفَا وَلَا تَعَاصِيَا وَيُسِّرَا وَلَا تُعَسِّرَا۔ [6] مل کر رہو ایک دوسرے کے خلاف نہ رہو۔ آسانی کرو اور تنگی مت کرو۔

قربانی (ٹیکس کی ادائیگی)

حکومت کا انتظام چلانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ مالی حالت مضبوط ہو اور حکومت خرچ پورا کرنے کے لیے ٹیکس لگاتی ہے ہر شہری کا یہ فرض ہے کہ وہ ٹیکس ادا کرے۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنْفِقُونَ قُلِ الْعَفْوَ۔ [7] وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خرچ کریں کہہ جو ان کی

---

[1] الاعراف ۷:۸۵۔ [2] المجادلہ ۵۸:۲۰ [3] المائدہ ۵:۲۔
[4] المائدہ ۵:۲۔ [5] بخاری کتاب الادب۔
[6] کنوز الحقائق صرف التاء۔ [7] البقرہ ۲:۲۱۹۔

ضرورت سے بچ جائے وہ سب خرچ کرو۔

امن کا قیام

اچھے شہری کا صرف یہ کام نہیں ہے کہ وہ خود قانون کی تابعداری کرے بلکہ اس سے یہ بھی امید ہوتی ہے کہ وہ خود قانون کی تابعداری کرے بلکہ اس سے یہ بھی امید ہوتی ہے۔ وہ حکومت کی قوانین کے نفاذ میں مدد کرے اور قانون شکنی کرنے والوں کی سرکوبی کے لیے حکومت کا ہاتھ بٹائے۔ جب تک ہر شہری ملک کے قانون کا محافظ نہیں ہوتا۔ اس وقت تک ملک میں امن قائم نہیں ہو سکتا۔

فوجی خدمات

مملکت کا تحفظ سب سے اہم فریضہ ہے۔ اس وجہ سے ہر شہری کا فرض ہے کہ وہ بیرونی حملہ کے وقت ملک کے دفاع میں ہر ممکن کوشش کرے اور بڑی سے بڑی قربانی دینے کے لیے تیار رہے۔ قرآن میں آتا ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔[1] اور جو کچھ طاقت گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھ رکھنے سے تم سے ہو سکے ان کے لیے تیار رکھو تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو۔

مَا لَكُمْ اِذَا قِيْلَ لَكُمُ انْفِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اثَّاقَلْتُمْ اِلَى الْاَرْضِ.[2] تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ جب تم کو خدا کی راہ میں نکلنے کے لیے کہا جاتا ہے تو تم زمین پر جم جاتے ہو۔

وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ.[3] اور اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔

تعلیم وصحت

ہر شخص کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی صحت کا خیال رکھے تعلیم کے ساتھ ان میں سیاسی اور تمدنی شعور پیدا ہوتا ہے اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ.[4] کہہ دیجئے کیا علم والے اور جہل برابر ہو سکتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ. یعنی ہر مسلم مرد اور عورت پر علم کا حاصل کرنا فرض ہے۔[5]

---

[1] الانفال ۸:۶۰ [2] توبہ ۹:۳۸۔ [3] البقرہ ۲:۱۹۰۔
[4] الزمر ۹: [5] مشکوٰۃ بروایت بیہقی۔

باب سوم

دستور اساسی

دستور اساسی کے معنی

انگریزی لفظ (Constitution) کے لغوی معنی جسمانی ساخت ہوتے ہیں۔ لیکن اصطلاح میں دستور اساسی (Constitution) سے مراد وہ منظور شدہ قواعد وضوابط ہیں جن کے مطابق حکومت کا انتظام و انصرام ہوتا ہے۔

ارسطو دستور کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:

''کہ دستور اساسی ان اصول کو کہتے ہیں جس کے مطابق حکومت کا ڈھانچہ تیار کیا جاتا ہے۔''

گرٹ (Guret) کہتا ہے:

''مملکت کا دستور اساسی ان بنیادی اصولوں کا مجموعہ ہے۔ جو حکومت کی نوعیت کا تعین کرتے ہیں۔ بنیادی اصولوں میں وہ طریقہ جس کے ذریعہ مملکت کی تنظیم ہوتی ہے۔ مختلف اعضائے حکومت (Organs of Government) کے درمیان اختیارات کی تقسیم اور فرائض حکومت انجام دینے کا طریقہ کار شامل ہے۔''

دوسری جگہ کہتا ہے:

''دستور اساسی ان چند انقلابی اصولوں پر خاص طریقے سے پاس کیے ہوئے رسوم و رواج کے مجموعہ کو کہتے ہیں جن کے مطابق مملکت کی تنظیم ہوتی ہے۔''

برائس (Bryce) کہتا ہے:

''کسی قوم یا مملکت کا دستور اساسی ان قوانین وضوابط پر مشتمل ہوتا ہے جو حکومت کی نوعیت شہریوں اور حکومت کے حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہیں۔''

پروفیسر ووکے (Prof Wookey) کہتا ہے:

''دستور اساسی ان اصولوں کا مجموعہ ہے جن کے مطابق حکومت کا اختیار رعایا کے حقوق اور دونوں کے مابین جو تعلق ہے ان کی ترتیب و تنظیم کی جاتی ہے۔''

پروفیسر ڈائسی (prof Dicy) کہتا ہے:

"دستور اساسی ان قاعدوں کو کہتے ہیں جو بالواسطہ یا بلاواسطہ حکومت کے اختیارات اور فرائض پر اثر انداز ہوتے ہیں۔"

ان مفکرین کی تعریفات سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دستور اساسی مملکت کے وہ بنیادی اصول ہیں جس کے ذریعہ حکومت کی مشینری چلتی ہے اور ملک کے دوسرے ضمنی قوانین اسی کی روشنی میں وضع کیے جاتے ہیں۔

اسلامی حکومت کا دستور اساسی قرآن مجید ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر تقریباً تئیس سال تک نازل ہوتا رہا۔

دستور اساسی کی اہمیت

سیاسی نقطہ نگاہ سے دستور اساسی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ کوئی حکومت دستور اساسی کے بغیر چل نہیں سکتی۔ اس سے ملک میں امن و امان قائم رہتا ہے۔ لوگ آرام سے زندگی بسر کرتے ہیں وہ شہریوں کے حقوق و فرائض متعین کرتا ہے عمال حکومت کے اختیارات اور فرائض پر روشنی ڈالتا ہے۔

دستور اساسی کے بغیر ملک میں طوائف الملوکی پھیل جاتی ہے ہر طرف فساد اور لاقانونیت کا دور دورہ ہو جاتا ہے۔ ہر شہری کی جان و مال اور عزت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اس وجہ سے ہر حکومت کے لیے ایک دستور اساسی ہونا ضروری ہے۔ جس کے بغیر وہ چند دن بھی چل نہیں سکتی۔

اسلامی دستور کی بنیادیں

۱۔ حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔[۱] حکم صرف اللہ کے لیے ہے۔

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِی الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ مِمَّنْ تَشَآءُ۔[۲]

کہہ اے اللہ ملک کے مالک تو جسے چاہے بادشاہت دے اور جس سے چاہے چھین لے۔

اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ[۳] خبردار اسی کی پیدائش ہے اور حکم بھی اسی کا ہے۔

علامہ آمدیؒ اصول فقہ کی مشہور کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں رقم طراز ہیں:

اِعْلَمْ اَنَّهٗ لَا حَاكِمَ سِوَى اللّٰهِ وَلَا حُكْمَ اِلَّا مَا حَكَمَ بِهٖ جان لو کہ حاکم اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے حکم وہی ہے جو اللہ نے دیا ہے۔

۱۔ یوسف ۱۲: ۴۰۔ ۲۔ آل عمران ۳: ۲۶۔ ۳۔ الاعراف ۷: ۵۴۔

شیخ محمد خضری اصول فقہ میں لکھتے ہیں:

اِنَّ الْحُكْمَ هُوَ خِطَابُ اللّٰهِ فَلَا حُكْمَ اِلَّا لِلّٰهِ وَهٰذِهٖ قَضِيَّةٌ اِتَّفَقَ عَلَيْهَا الْمُسْلِمُوْنَ قَاطِبَةً. یقیناً حکم اللہ کے فرمان کو کہتے ہیں پس حکم دینے کا حق صرف اللہ ہی کو حاصل ہے۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے۔

۲۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ.[1] جو رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تابعداری کرے تو اس نے اللہ کی تابعداری کی۔

وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا[2] اور جو کچھ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تم کو دے اسے لے لو اور جس سے تم کو روکے اس سے رُک جاؤ۔

۳۔ حکومت وراثت نہیں ہے

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِى الْاَرْضِ كَمَا اسْتَخْلَفَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ.[3] اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کے ساتھ جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں وعدہ کیا ہے کہ وہ انھیں زمین پر خلیفہ بنائے گا جیسا کہ انھیں خلیفہ بنایا جو ان سے پہلے تھے۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے۔ تمام مسلمان بحیثیت مجموعی حامل خلافت ہوتے ہیں۔ اس پر جمہوریت کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ جب حضرت امیر معاویہؓ نے قرآنی تعلیم اور خلفاء راشدین مہدیین کے اسوہ حسنہ سے ہٹ کر یزید کو خلیفہ بنایا تو حضرت امام حسینؓ نے جمہوری نظام اور اسلامی طریقہ حکومت کو قائم رکھنے کی خاطر شہادت پائی۔ اگر کسی ملک میں ایک طاقت ور ادارہ محض طاقت کے بل پر حکومت پر قبضہ جما لیتا ہے۔ اس کے بعد اسی ادارہ کا کوئی دوسرا سربراہ حکومت پر قبضہ کر لیتا ہے وہ بھی ایک لحاظ سے وراثت میں شامل ہوگا۔ اسلام حکومت میں ہر قسم کی وراثت کی نفی کرتا ہے۔

۴۔ شوریٰ

حکومت کے امور باہمی مشورہ سے طے پائیں گے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ.[4] مسلمانوں کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے۔

خطیب بغدادی نے حضرت علیؓ سے یہ روایت نقل کی ہے:

''میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ کے بعد کوئی معاملہ ایسا پیش آ جائے۔ جس کے متعلق نہ قرآن مجید میں کچھ اترا ہو اور نہ آپ سے کوئی

---

[1] النساء ۴:۸۰۔ [2] الحشر ۷:۔ [3] النور ۲۴:۵۵۔ [4] الشوریٰ ۴۲:۳۸۔

بات سنی گئی ہو فرمایا میری امت میں سے عبادت گزار لوگوں کو جمع کرو اور اسے ان کے سامنے مشورہ کے لیے رکھ دو اور کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔"[1]

قرآنی آیت اور حدیث ہر قسم کی آمریت کو رد کرتی ہے اور اسلامی حکومت وہی ہو گی جو عوام کے مشورہ سے تشکیل پائے گی اس کے لیے غیر جانب دارانہ انتخاب ضروری ہیں جو بھی حکومت جانب دارانہ انتخاب یا طاقت کے بل پر قائم ہو گی وہ غیر اسلامی ہو گی۔

۵۔ حکومت صالحین کے سپرد ہو

رئیس مملکت اور حکام وہ لوگ ہوں جو اہل اور صلاحیت رکھتے ہوں۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمَانَاتِ اِلٰٓی اَھْلِھَا. [2] اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے اہل کو دو۔

وَلَقَدْ کَتَبْنَا فِی الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّکْرِ اَنَّ الْاَرْضَ یَرِثُھَا عِبَادِیَ الصّٰلِحُوْنَ اِنَّ فِیْ ھٰذَا لَبَلٰغًا لِّقَوْمٍ عٰبِدِیْنَ. [3] اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے۔ یقیناً اس میں عبادت کرنے والوں کے لیے پیغام ہے۔

لَا یَنَالُ عَھْدِی الظّٰلِمِیْنَ. (بقرہ ۲:۱۲۴) میرا عہد ظالموں کو نہیں پہنچے گا۔

ظالمین سے مراد وہ امرا ہیں جو عوام کی اکثریت رائے سے نہیں آتے محض اپنی طاقت سے حکومت پر قبضہ کرتے ہیں۔

۶۔ بھلائی کا فروغ اور منکرات کا خاتمہ

اسلامی دستور کی اساس معروفات کو فروغ دینا اور منکرات کا خاتمہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰھُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَھَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ. [4] وہ جنھیں اگر ہم زمین میں طاقت دیں تو وہ نماز کو قائم کریں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور اچھی باتوں کا حکم کریں گے اور بری باتوں سے روکیں گے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ حکومت تشکیل سیرت اور رفاہ عامہ اور ضروریات عوام کو پورا کرنے کے لیے معرض وجود میں لائی جاتی ہے۔

۷۔ قرآن اور سنت کی بالادستی

قرآن اور سنت کے خلاف کوئی قانون نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ ارشاد الٰہی ہے:

۱۔ روح المعانی۔ ۲۔ النساء ۴:۵۸۔

۳۔ الانبیاء ۲۱:۱۰۵، ۱۰۶۔ ۴۔ الحج ۲۲:۴۱۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ.[1] سو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کرو جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا ان کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔

إِنَّ الَّذِيْنَ يُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهُ أُولٰئِكَ فِي الْأَذَلِّيْنَ.[2] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّ عَدْلًا لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ (الانعام ۶:۱۱۵) اور تیرے رب کی بات سچائی اور انصاف میں کمال کو پہنچ گئی ہے کوئی اس کی باتوں کو بدلنے والا نہیں ہے۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اسلامی ریاست میں قرآن اور سنت کو ہی بالادستی حاصل ہے اور اس کے خلاف قانون سازی نہیں ہو سکتی۔

۸۔ امیر کی اطاعت

اسلامی دستور میں بھلائی کے کاموں میں امیر کی اطاعت واجب ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يَا أَيُّهَا الَّذِيْنَ آمَنُوْا أَطِيْعُوا اللّٰهَ وَأَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنْكُمْ فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ.[3] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی اطاعت کرو پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ حَقٌّ مَالَمْ يُؤْمَرْ بِالْمَعْصِيَةِ فَإِذَا أُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَطَاعَةَ.

"ایک مسلمان پر سمع و طاعت لازم ہے تاوقتیکہ اسے برائی کا حکم نہ دیا جائے جب اللہ کی نافرمانی کا حکم دیا جائے تو نہ سننا ہے اور فرمانبرداری کرنا"[4]

آپ نے فرمایا۔ اِسْمَعُوْا وَأَطِيْعُوْا وَإِنْ اسْتُعْمِلَ حَبَشِيٌّ كَأَنَّ رَأْسَهُ زَبِيْبَةٌ.[5] سنو اور اطاعت کرو اگرچہ ایک حبشی حاکم بنایا گیا ہو جس کا سر گویا کہ کشمش کا دانہ ہو۔ فرمایا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ (بخاری ۶۴:۶۱) فرمانبرداری صرف نیک کاموں میں ہے۔

۹۔ عدل

اسلامی دستور عدل کے ہر تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے کہ:

وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰى أَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى[6] اور کسی قوم کی

---

[1] المائدہ ۵:۴۸۔ [2] المجادلہ ۵۸:۲۰۔ [3] النساء ۴:۵۹۔
[4] بخاری ۵۶:۱۰۸۔ [5] بخاری ۱۰:۵۴۔ [6] المائدہ ۵:۸۔

دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"جب تیرے سامنے دو فریق اپنا معاملہ لے کر آئیں تو ان کا فیصلہ نہ کر جب تک کہ دوسرے کی بات بھی نہ سن لے جس طرح پہلے کی سنی ہے۔"[1]

اسلام میں کوئی شخص بغیر عدل کے قید نہیں کیا جا سکتا۔[2]

عدل میں سب سے اہم باتیں جان، مال اور عزت کی حفاظت ہے۔ اس کے متعلق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا: اِنَّ دِمَاءَکُمْ وَاَمْوَالَکُمْ وَاَعْرَاضَکُمْ حَرَامٌ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا [3] تمہاری جانیں اور تمہارے مال اور تمہاری آبروئیں ویسی ہی حرمت رکھتی ہیں جیسے آج کے دن کی حرمت یعنی حج کے دن کی۔

۱۰۔ مساوات

اسلامی دستور کی اساس مساوات ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّا اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَاخْتَلَفُوْا [4] اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہے۔ سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

وَاِنَّ ھٰذِہٖ اُمَّتُکُمْ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ اَنَا رَبُّکُمْ فَاتَّقُوْنِ۔ [5] اور کہ یہ تمہاری امت ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا پروردگار ہوں سو میرا تقویٰ کرو۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّخَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالًا کَثِیْرًا وَّنِسَآءً۔ [6] اے لوگو اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

اِنَّ الْعِبَادَ کُلُّھُمْ اِخْوَۃٌ۔ [7] انسان آپس میں سب بھائی ہیں۔

۱۱۔ ضروریات زندگی بہم پہنچانا

قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَا مِنْ دَآبَّۃٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ رِزْقُھَا۔ [8] زمین میں کوئی جاندار نہیں مگر اللہ کے ذمہ ہی اس کا رزق ہے۔ نَحْنُ قَسَمْنَا بَیْنَھُمْ مَّعِیْشَتَھُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا۔ [9] ہم نے ان کے درمیان ان کی دنیا کی زندگی میں ان کی روزی تقسیم کی ہے۔

وَفِیْ اَمْوَالِھِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ۔ (الذاریات ۵۱:۱۹) اور ان کے مالوں میں سے سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق ہے۔

۱۔ ابو داؤد، ترمذی۔ ۲۔ موطا۔ ۳۔ بخاری کتاب الحج۔
۴۔ یونس ۱۰:۱۹۔ ۵۔ المومنون ۲۳:۵۲۔ ۶۔ النساء ۴:۱۔
۷۔ اخرجہ احمد۔ ابو داؤد۔ ۸۔ ہود ۱۱:۶۔ ۹۔ الزخرف ۴۳:۳۲۔

مَا اَفَاءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَىْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَاءِ مِنْكُمْ. (۵۹:۷) اور اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے مال غنیمت دلایا تو وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے ہے تاکہ تم میں سے دولت مندوں کے اندر نہ پھرتا رہے۔

۱۲۔ یسر

اسلامی دستور کی بنیاد یسر پر ہے۔ اِنَّ الدِّيْنَ يُسْرٌ۔

قرآن مجید میں آتا ہے:

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا. یعنی اللہ کسی جان کو اس کی طاقت سے بڑھ کر مشقت میں نہیں ڈالتا۔

۱۳۔ امن کا قیام

اسلامی دستور کی بنیاد امن کا قیام ہے۔ اسلام کا لفظ خود سلامتی اور امن کے قیام کی طرف راہ نمائی کرتا ہے۔ جس دستور میں امن قائم کرنے کے متعلق وضاحت موجود نہیں ہے وہ اسلامی دستور نہیں کہلا سکتا۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا.[1] اگر وہ صلح کی طرف مائل ہو جائیں تو تم بھی جھک جاؤ

قرآن مجید میں بیت اللہ کے متعلق کہا گیا ہے:

وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا.[2] جو وہاں داخل ہوا امن والا ہو گیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے دعا کی:

رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا.[3] اے میرے رب اس شہر کو امن والا شہر بنا۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ اسلام امن کا نصب العین پیش کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جہاد کا حکم دیا ہے وہ بھی امن قائم کرنے اور فساد اور فتنہ کو مٹانے کے لیے ہے۔

۱۴۔ اشاعت اسلام

اسلام ایک عالمگیر مذہب ہے لہٰذا اشاعت اور تبلیغ اسلامی دستور کا ایک اہم جزو ارشاد الٰہی ہے:

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ.[4] تم بہترین امت ہو جو سارے انسانوں کے فائدے کے لیے پیدا کی گئی ہو تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

---

[1] الانفال ۸:۶۱۔ [2] آل عمران ۳:۹۷۔

[3] البقرہ ۲:۱۲۶۔ [4] آل عمران ۳:۱۱۰۔

هُوَ الَّذِیْ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ۔[1] وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایات اور دین حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو کل دینوں پر غالب کرے۔

۱۵۔ سرحدوں کی حفاظت

جس طرح اسلامی دستور ملک کے اندر امن کے قیام کا داعی ہے۔ اسی طرح ملک کی سرحدوں کی حفاظت ضروری قرار دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَا اسْتَطَعْتُمْ مِنْ قُوَّةٍ وَمِنْ رِبَاطِ الْخَیْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔[2] اور جو کچھ طاقت اور گھوڑوں کے سرحدوں پر باندھ رکھنے سے ہو سکے ان کے لیے تیار رہو تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوفزدہ رکھو۔ دوسری جگہ آتا ہے۔ جَاهِدُوْا فِی اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ اللہ کے راستے میں جہاد کرو جیسا کہ جہاد کا حق ہے۔

اسلام میں جہاد اس وقت فرض ہوتا ہے جب اسلامی حکومت کی سرحدوں کو خطرہ لاحق ہو اور خارج قوت امن کو برباد کرتی ہے۔

۱۶۔ انسانی حقوق کا تحفظ

اسلامی دستور انسانی حقوق کی مکمل حفاظت کرتا ہے۔ جس میں جان، مال اور آبرو مذہب کا تحفظ اور حریت شامل ہے۔

لَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِیْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ۔[3] اس جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے مگر حق کے ساتھ۔

لَا تَاْكُلُوْا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ۔[4] اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔

لَا یَسْخَرْ قَوْمٌ مِنْ قَوْمٍ۔[5] ایک قوم دوسری قوم پر ہنسی نہ کرے۔

لَا اِكْرَاهَ فِی الدِّیْنِ۔[6] دین میں کوئی جبر نہیں۔

وَیَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِیْ كَانَتْ عَلَیْهِمْ (الاعراف ۷:۱۵۷) وہ بوجھوں کو ان سے دور کرتا ہے جو ان پر لدے ہوئے ہیں اور طوق جو ان پر پڑے ہوئے ہیں انھیں دور کرتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں باریک سے باریک غلامی سے آزادی عطا کرنے کا اعلان ہے۔

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ۔[7] سو وہ اونچی گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا اور تجھے کیا خبر کہ اونچی گھاٹی کیا ہے۔ کسی گردن کو آزاد کرنا۔

۱۔ التوبہ ۹:۳۳۔ ۲۔ الانفال ۸:۶۰۔ ۳۔ بنی اسرائیل ۱۷:۳۳۔
۴۔ البقرہ ۲:۱۸۸۔ ۵۔ الحجرات ۴۹:۱۱۔ ۶۔ البقرہ ۲:۲۵۶۔ ۷۔ البلد ۹۰:۱۱-۱۳۔

انسانی حقوق کی فہرست درج ذیل ہے اور آزادی کے متعلق بحث "اسلامی حکومت کے اوصاف" کے زیرِ عنوان آئے گی۔

انسانی حقوق کی فہرست: ۱۔ شخصی آزادی کا تحفظ۔ ۲۔ عزت و ناموس کی حفاظت۔ ۳۔ حرمت جان یا جینے کا حق۔ ۴۔ نجی زندگی کے تحفظ کا حق۔ ۵۔ مستضعفین کا تحفظ۔ ۶۔ سیاسی کارفرمائی (امور حکومت) میں شرکت کا حق۔ ۷۔ ظلم کے خلاف احتجاج کا حق۔ ۸۔ اظہار رائے کا حق۔ ۹۔ تحفظ ملکیت۔ ۱۰۔ معاشی تحفظ۔ ۱۱۔ حصول انصاف کا حق۔ ۱۲۔ مساوات کا حق۔ ۱۳۔ حصول تعلیم کا حق۔ ۱۴۔ حق حریت عقیدہ۔ ۱۵۔ عمل غیر کی مسئولیت سے برات کا حق۔ ۱۶۔ آزادی تنظیم و اجتماع۔ ۱۷۔ آزادی نقل و حرکت اور سکونت کا حق۔ ۱۸۔ حق اجرت و معاوضہ۔ ۱۹۔ ہجرت کا حق۔ ۲۰۔ پناہ لینے کا حق۔ ۲۱۔ ملکیت میں دوسروں کا حق۔

۱۷۔ انفرادی جائیداد کی اجازت

اسلام ذاتی ملکیت بنانے کی اجازت دیتا ہے لیکن جائز طریقوں کے ساتھ۔ اسلام کا دولت کے بارے میں یہ نظریہ ہے کہ حقیقی ملکیت اللہ تعالیٰ کی ہی ہے۔ انسان کو اس کا امین بنایا گیا ہے۔ اس لیے اسلام دولت کمانے کی اجازت دیتا ہے لیکن کمانے اور خرچ کرنے پر بعض ضروری پابندیاں عائد کرتا ہے تاکہ دولت انسان اور معاشرے کے لیے مفید ثابت ہو۔ ارشاد الٰہی ہے:

اَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى. [۱] انسان کسب معاش کے لیے جو بھی کوشش کرتا ہے۔ اس کا پھل پانے کا مستحق ہے۔

كُلُّ امْرِئٍ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ. [۲] ہر آدمی اپنے کیے کا ثمرہ پانے کا حق دار ہے۔

لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ. [۳] اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔

وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا. [۴] بے جا خرچ کر کے مال کو نہ اڑاؤ۔

وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَنْفَقُوْا لَمْ يُسْرِفُوْا وَلَمْ يَقْتُرُوْا وَكَانَ بَيْنَ ذٰلِكَ قَوَامًا. [۵] اور وہ جو جب خرچ کرتے ہیں نہ بے جا خرچ کرتے ہیں اور نہ موقع پر تنگی کرتے ہیں اور ان کا خرچ ان دونوں حالتوں کے درمیان اعتدال پر ہے۔

اسلام میں نہ سرمایہ داری جائز ہے اور نہ جاگیر داری۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ. [۶] اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے۔

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِ نِ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ. [۷] تباہی ہے ہر عیب لگانے والے طعن کرنے والے کے لیے جو مال جمع کرتا ہے

۱ النجم ۵۳: ۳۹۔ ۲ الطور ۵۲: ۲۱۔ ۳ بقرہ ۲: ۱۸۸۔
۴ بنی اسرائیل ۱۷: ۲۶۔ ۵ الفرقان ۲۵: ۶۷۔ ۶ التوبہ ۹: ۳۴۔
۷ الہمزہ ۱۰۴: ۱-۴۔

اور اسے شمار میں لاتا ہے وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اسے ہمیشہ رکھے گا۔ ہرگز نہیں وہ ضرور حطمہ میں ڈالا جائے گا۔

۱۸۔ تعلیم کا انتظام

اسلامی دستور تعلیم عام کا ضامن ہوتا ہے بلکہ یہ بھی ضروری قرار دیتا ہے۔ اسلامی سلطنت میں ہر شخص علم حاصل کرے۔ علم کے حصول میں کوتاہی کرنے والا قابل مواخذہ ہے کیونکہ انفرادی اور قومی ترقی علم کے ساتھ ہی وابستہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔[1] (نبی کے فرائض میں ہے) کہ وہ لوگوں کو کتاب اور حکمت سکھائے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِي الَّذِينَ يَعْلَمُونَ وَالَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ۔[2] کہہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلَى كُلِّ مُسْلِمٍ۔[3] علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد پر فرض ہے۔

۱۹۔ غیر مسلم ریاستوں سے مصالحانہ روابط

غیر مسلم ریاستیں جو اسلام اور مسلمانوں کے لیے معاند نہ ہوں۔ ان سے مصالحانہ روابط قائم کیے جائیں۔

لَا يَنْهَاكُمُ اللَّهُ عَنِ الَّذِينَ لَمْ يُقَاتِلُوكُمْ فِي الدِّينِ وَلَمْ يُخْرِجُوكُم مِّن دِيَارِكُمْ أَن تَبَرُّوهُمْ وَتُقْسِطُوا إِلَيْهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ۔[4] اللہ تمھیں ان سے نہیں روکتا۔ جنھوں نے تمھارے ساتھ دین کے بارے میں لڑائی نہیں کی اور تمھیں اپنے گھر سے نہیں نکالا کہ تم ان سے احسان کرو اور ان سے انصاف کرو اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

۲۰۔ معاہدات کی پابندی

اسلامی دستور معاہدات کی پابندی لازمی قرار دیتا ہے۔ کیونکہ وہ ہدایت کی پابندی ہی امن عالم کا ذریعہ ہے۔ اس لیے دوسری حکومتوں کے ساتھ کیے ہوئے معاہدات کی پابندی کی جائے گی۔ اگر معاہدہ کو کسی جائز وجہ سے توڑنا مقصود ہو تو پہلے اعلان کیا جائے گا۔

إِلَّا الَّذِينَ عَاهَدتُّم مِّنَ الْمُشْرِكِينَ ثُمَّ لَمْ يَنقُصُوكُمْ شَيْئًا وَلَمْ يُظَاهِرُوا عَلَيْكُمْ أَحَدًا فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَىٰ مُدَّتِهِمْ۔[5] مگر جن مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا پھر انھوں نے تمھارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی اور نہ تمھارے خلاف کسی کو مدد دی تو ان کے ساتھ ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کر دیں۔

وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ۔[6] اور تجھے کسی قوم کی دغابازی کا خوف ہو تو ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔ اللہ دغابازوں سے محبت نہیں کرتا۔

---

[1] البقرہ ۲:۱۲۹۔ [2] الزمر ۳۹:۹۔ [3] سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء۔
[4] الممتحنہ ۶۰:۸۔ [5] توبہ ۹:۴۔ [6] الانفال ۸:۵۸۔

دستور کی اقسام

دنیاوی

سیاسی مفکرین نے دستور اساسی کو حسب ذیل طریقوں سے تقسیم کیا ہے۔
پہلا طریقہ یہ ہے کہ دستور کس حد تک لکھا گیا ہے۔ اس اعتبار سے دستور کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ تحریری دستور (Written Constitution)

ب۔ غیر تحریری دستور (Unwritten Constitution)

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ دستور میں ترمیم کس طرح کرنی چاہیے۔ اس بناء پر دستور اساسی کی دو اقسام ہیں:

ا۔ استوار (Rigid)

ب۔ لچکدار (Flexible)

تیسرا طریقہ یہ ہے۔ دستور اساسی کے مطابق عوام کس حد تک حکومت میں حصے دار ہیں۔ اس اعتبار سے بھی دو قسمیں ہیں:

ا۔ جمہوری (Democratic)

ب۔ غیر جمہوری (Undemocratic)

چوتھا طریقہ یہ ہے کہ دستور کی بنیاد کس طرح پڑی؟ کسی معینہ وقت پر بنایا اس نے بتدریج ترقی کی۔ اس بناء پر دستور کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ بنایا ہوا۔

ب۔ ارتقائی۔

پانچواں طریقہ یہ ہے کہ اختیارات حکومت کی تقسیم کیا ہے۔ اس لحاظ سے بھی دستور کی دو قسمیں ہیں:

ا۔ فردیہ (Unitary)

ب۔ وفاقی (Federal)

تحریری اور غیر تحریری دستور اساسی

تحریری دستور وہ ہوتا ہے۔ جس میں نظام مملکت کے اصول وقواعد تحریر میں لائے گئے ہوں اور اس کے برخلاف غیر تحریری دستور اساسی وہ ہوتا ہے کہ جس کے زیادہ تر اصول وقواعد روایات پر مبنی ہوں۔ صرف چند ایک اصول تحریر کیے گئے ہوں۔

امریکہ اور فرانس، پاکستان وغیرہ کے دستور تحریری دستور ہیں اور انگلستان کا دستور غیر تحریری ہے۔ دنیا میں زیادہ تر دستور تحریری ہیں۔

تنقید

کوئی دستور بھی قطعی طور پر تحریری یا غیر تحریری نہیں کہلا سکتا نہ اس کے تمام اصول احاطہ تحریر میں لائے جا سکتے ہیں۔ امریکہ کا دستور تحریری کہلاتا ہے کیونکہ اس کے تمام اصول حکومت ایک ہی دستاویز میں درج ہیں۔ لیکن یہ بات صحیح نہیں ہے کہ اس کی سیاسی تنظیم کا ہر ایک اصول اس میں درج ہو مثلاً سیاسی جماعتیں، وفاقی حکومت کے اختیارات سیاسی تنظیم کے اہم پہلو ہیں لیکن دستور اساسی میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اسی طرح زمانے کے گزرنے کے ساتھ ساتھ بے شمار نئے مسائل اور نئے تقاضے ابھر آتے ہیں۔ جن کے حل کے لیے تحریری دستور میں کوئی دفعہ نہیں ہوتی۔ بعد میں نئے تقاضوں کے مطابق نئے اصول مرتب کیے جاتے ہیں اور تحریری دستور اساسی میں شامل کیے جاتے ہیں۔ اسی طرح زمانہ کے گزرنے کے ساتھ ساتھ تحریری دستور کے متعلق بہت سی روایات بن جاتی ہیں۔ اسی طرح تحریری دستور بھی قریب قریب غیر تحریری صورت اختیار کر جاتا ہے اسی طرح غیر تحریری دستور بھی بالکل غیر تحریری نہیں کہلا سکتا۔ مثال کے طور پر انگلستان کا دستور اساسی غیر تحریری کہلاتا ہے لیکن اس کے اکثر حصے تحریری بھی ہیں مثلاً:

A.ACT of 1911, b ACT of Settlement.

تحریری اور غیر تحریری دستور کا موازنہ

۱۔ تحریری دستور اساسی صاف اور واضح ہوتا ہے کیونکہ دستور ساز اسمبلی بڑے غور وخوض کے بعد اس کو مرتب کرتی ہے۔

۲۔ تحریری دستور کے الفاظ اور مطالب کا تعین زیادہ آسان ہوتا ہے۔

۳۔ تحریری دستور سے عوام پوری طرح روشناس ہوتے ہیں۔

۴۔ تحریری دستور آئے دن کی تبدیلیوں سے پاک رہتا ہے کیونکہ تحریری دستور میں طریقہ ترمیم واضح ہوتا ہے۔ اگر کوئی ترمیم یا تبدیلی کرنا مقصود ہو تو اس طریقہ ترمیم کی روشنی میں کی

جائے گی۔ کسی حکمران طبقے کو اپنی مرضی سے ترمیم کرنے کی جرأت نہ ہوگی۔

۵۔ حکومت کے تمام شعبوں کے اختیارات اور فرائض واضح طور پر احاطہ تحریر میں ہوتے ہیں۔ جن کی روشنی میں وہ اپنے کام خوش اسلوبی سے سرانجام دے سکتے ہیں اور کسی قسم کا جھگڑا نہیں ہوتا۔

۶۔ وحدانی طرز حکومت کے لیے تحریری دستور نہایت ہی ضروری ہے گویا اس دستور سے مرکز اور صوبوں کے اختیارات علیحدہ علیحدہ تجویز کر دیے جاتے ہیں۔

۷۔ عدالتوں کے لیے مقدمات کا فیصلہ کرنا آسان ہو جاتا ہے۔

نقص

چونکہ تحریری دستور میں ترمیم آسانی سے نہیں کی جا سکتی بسا اوقات ملکی حالات کے مطابق بروقت ترمیم کرنا مشکل ہو جاتی ہے جس سے ملک کو نقصان پہنچتا ہے۔

غیر تحریری دستور کے فائدے

غیر تحریری دستور کے فائدے حسب ذیل ہیں:

۱۔ اس دستور میں لچک ہوتی ہے۔ ملکی حالات کے مطابق تبدیلی پیدا کر لینا آسان ہوتا ہے۔

۲۔ اس دستور کا تعلق زیادہ تر رسم و رواج سے ہوتا ہے اس وجہ سے اس کا قوم کے مزاج سے گہرا رشتہ ہوتا ہے۔

نقصانات

اس کے نقصانات حسب ذیل ہیں:

۱۔ یہ دستور عام قانون اور دستوری قوانین کے درمیان مابہ الامتیاز فرق ظاہر نہیں کرتا۔ اس وجہ سے ملک میں بہت سی خرابیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہوتا ہے۔

۲۔ یہ دستور عدلیہ کو وسیع اختیارات دے دیتا ہے۔ جو رسم و رواج اور ملک کی روایات سے نئے نئے قوانین وضع کرتی رہتی ہے۔

۳۔ یہ دستور ملک کے نئے تقاضوں کو پورا نہیں کر سکتا۔

۴۔ یہ دستور اس وقت کامیاب ہو سکتا ہے جب عوام کا سیاسی شعور بہت بیدار ہو اور تحریری دستور کی طرح اس کے تابع چلیں اگر سیاسی شعور نہیں ہوگا تو عوام قانون شکنی کا ارتکاب کریں گے۔

استوار اور لچک دار دساتیر اساسی

عام طور پر استوار دستور اساسی اسے کہا جاتا ہے جس کا تبدیل کرنا مشکل ہو اور لچک دار دستور اساسی اسے سمجھا جاتا ہے جس کا تبدیل کرنا آسان ہو لیکن اس سے پوری وضاحت نہیں ہوتی۔

حقیقت میں استوار (Rigid) دستور اساسی وہ ہوتا ہے جس کی اہمیت ملک کے عام قوانین سے زیادہ ہو۔ مجلس قانون ساز کی روزانہ کی نشستیں اس میں ترمیم کرنے کی مجاز نہیں ہوتیں۔ امریکہ اور فرانس کی مجالس قانون ساز روزانہ کی نشست میں صرف عام قوانین پاس کرتی ہیں لیکن دستور اساسی میں کوئی ترمیم نہیں کرسکتیں۔ ترمیم یا اضافہ کرنے کے لیے ایک مخصوص طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ استوار دستور اساسی عموماً تحریری ہوتا ہے۔

استوار دستور کے محاسن

استوار دستور کے محاسن حسب ذیل ہیں:

۱۔ یہ دستور تحریری ہونے کی وجہ سے واضح اور صاف ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے مطالب متعین کرنے آسان ہوتے ہیں اور ہر شخص آسانی سے سمجھ سکتا ہے۔

۲۔ یہ دستور عوام کی آزادی کا محافظ ہوتا ہے۔

۳۔ یہ دستور مستقل بنیادوں پر قائم ہوتا ہے۔ معمولی معمولی امور کے لیے اس میں ترامیم تبدیلی کی گنجائش نہیں ہوتی۔

۴۔ اس دستور میں حکام کے اختیارات اور فرائض واضح کردیے جاتے ہیں اس وجہ سے وہ اپنی حدود سے تجاوز نہیں کرسکتے اور نہ اپنے اختیارات کو ناجائز استعمال کرسکتے ہیں۔

نقائص

اس کے نقائص یہ ہیں:

۱۔ چونکہ اس قسم کے دستور میں ترمیم کرنے کے لیے مخصوص طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے بسا اوقات ضروری ترمیم کے لیے مشکل کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور ملک کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوجاتا ہے۔

۲۔ اگر کسی ناگہانی حادثہ یا کسی نئے تقاضا کی وجہ سے یہ ضروری محسوس ہو کہ اس دستور کو حالات کے مطابق ڈھالا جائے تو ایسا کرنا دشوار ہوجاتا ہے۔ بسا اوقات ملک میں ایک انقلاب کی راہ ہموار ہوجاتی ہے۔

لچک دار دستور اساسی

یہ وہ دستور اساسی ہوتا ہے جس کی اہمیت ملک کے عام قوانین کے مساوی ہوتی ہے۔ اس میں مجلس قانون ساز اپنی روزانہ کی نشست میں ترمیم کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔

- اس کی مثال انگلستان کا دستور اساسی ہے۔ جس طرح وہاں کی پارلیمان عام قوانین پاس

کرنے کی مجاز ہوتی ہے۔ اسی طرح وہ ضرورت اور ملک کے حالات کے مطابق دستور اساسی میں ترامیم کر سکتی ہے۔ یہ دستور عموماً غیر تحریری ہوتا ہے۔

محاسن

اس کے محاسن یہ ہیں:

۱۔ اس دستور کو وقت کے تقاضوں کے مطابق آسانی سے ڈھالا جا سکتا ہے۔

۲۔ مملکت میں انقلاب کا خدشہ بہت کم ہوتا ہے کیونکہ دستور کو بروقت عوام کے جذبات کے مطابق کیا جا سکتا ہے۔

۳۔ اس دستور کے ذریعہ عوام کو بتدریج حقوق دیے جا سکتے ہیں اور ناظم حکومت میں حصہ لینے کے اہل ہو جاتے ہیں۔

نقائص

اس کے نقائص یہ ہیں:

۱۔ یہ دستور اس وقت تک کامیاب نہیں رہ سکتا جب تک عوام میں تعلیم اور سیاسی شعور نہ ہو۔

۲۔ چونکہ یہ دستور غیر تحریری ہوتا ہے اس وجہ سے اس میں حکومت کے عام اصول اور قواعد لکھے ہوئے نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے جج اور وکیل اپنی اپنی ضرورت کے مطابق مطلب اخذ کرتے ہیں اور عدل و انصاف کو خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

۳۔ اس دستور کی ترجمانی کا کوئی خاص طریقہ نہیں ہوتا اس لیے وقتی جذبات اور ہنگامی جوش کے تحت اس میں ترمیم یا تنسیخ کر دی جاتی ہے جس سے ملک کو خطرناک نتائج کا سامنا کرنا پڑ جاتا ہے۔

۴۔ چونکہ اس دستور میں ترمیم کرنا آسان ہوتا ہے اس وجہ سے ایسا دستور سیاسی راہنماؤں میں کھلونا بن جاتا ہے۔ اپنی مرضی کے مطابق جب چاہیں ترمیم کر لیتے ہیں۔

جمہوری اور غیر جمہوری دساتیر اساسی

جمہوری دستور اساسی وہ کہلاتا ہے۔ جس کی رو سے عوام کو نظام حکومت چلانے میں زیادہ سے زیادہ حصہ ملے۔ وہ اپنے نمائندے مجالس قانون ساز میں انتخاب کر کے بھجوائیں اور حکومت کی مشینری پر پوری طرح نگاہ رکھیں۔ لنکن کہتا ہے:

> "جس ملک میں جمہوری دستور اساسی ہوتا ہے وہاں کی حکومت کی باگ ڈور مکمل طور پر عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ یہ دستور اساسی

سب سے اچھا اور مستقل ہوتا ہے جس کی وجہ سے قوم کی ہمدردیاں حکومت کے ساتھ وابستہ رہتی ہیں۔"

غیر جمہوری دستور وہ سمجھا جاتا ہے جس میں نظام حکومت کے چلانے میں عوام کا حصہ بہت کم ہوتا ہے۔ اس قسم کے دستور میں تمام تر اختیارات فرد واحد کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ جس طرح جرمنی میں ہٹلر اور اٹلی میں مسولینی کو حاصل تھے۔

اس قسم کے دستور میں عوام حکومت کے معاملات میں دخل نہیں دے سکتے نہ وہ حکمرانوں کی پالیسی پر نکتہ چینی کر سکتے ہیں اور نہ مجلس قانون ساز میں اپنے نمائندے منتخب کر کے بھیج سکتے ہیں۔

اس قسم کے دستور کو عوام کی ہمدردیاں حاصل نہیں ہوتیں ملک کی تباہی کا موجب بنتا ہے۔

بنایا ہوا Enacted اور ارتقائی Evolved دساتیر اساسی

بنایا ہوا دستور اساسی وہ ہے جسے کسی مخصوص اور معینہ وقت پر مجلس قانون ساز یا ملک کی کوئی دوسری با اختیار جماعت بنائے۔

ارتقائی دستور وہ دستور کہلاتا ہے جس کو کسی مخصوص جماعت نے معینہ عرصہ میں نہ بنایا ہو بلکہ زمانہ کے ساتھ ساتھ اس میں ترمیم اضافہ یا تبدیلی ہوتی رہی ہو۔ اس قسم کے دستور میں ملک کے رسوم ورواج زیادہ تر اثر انداز ہوتے ہیں۔

فردیہ یا وفاقی دستور اساسی

فردیہ دستور اسے کہا جاتا ہے جس کے مطابق تمام اختیارات مرکزی حکومت کو تفویض کر دیے جاتے ہیں اور صوبائی اور مقامی حکومتیں مرکز کے رحم وکرم پر ہوتی ہیں۔

وفاقی دستور اسے کہتے ہیں جس کی رو سے تمام اختیارات مرکز اور صوبائی حکومتوں کے درمیان تقسیم کر دیے جاتے ہیں اور دونوں ایک حد تک خود مختار ہوتے ہیں۔

دساتیر کی یہ وہ تقسیم ہے جو مفکرین نے کی ہے چونکہ یہ دساتیر انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں ان میں نقائص بھی ہیں اور محاسن بھی۔ لیکن اسلامی دستور اساسی خدا کی طرف سے نازل کیا ہوا ہے۔ تمام دساتیر عالم کے محاسن کا حامل ہے اور تمام خرابیوں سے مبرا ہے۔ اس وجہ سے ہر اسلامی ملک کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید پر اپنے دستور کی بنیاد رکھے۔ اس میں مسلمانوں کی ترقی اور فلاح مضمر ہے۔ مسلمانوں کے تنزل کی بڑی وجہ ہی یہ ہے کہ انھوں نے قرآن مجید کو چھوڑ کر انسانوں کے بنائے ہوئے دستوروں کو اپنا ملجا و ماوی بنا لیا ہے اور آمروں نے اپنی حکومت کو طول دینے کے لیے مفاد عامہ سے ہٹ کر قانون وضع کر لیے ہیں۔ جب آمر عوام کے غیظ وغضب کا شکار بنتا ہے اور

اقتداء کی کرسی سے محروم کر دیا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس کا آمرانہ دستور ختم ہو جاتا ہے۔

قانون

انگریزی لفظ (Law) جس کے معنی قانون کے ہیں۔ قدیم جرمن لفظ (Log) سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں منجمد یا ہموار۔ انگریزی میں یہ لفظ یکسانیت کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ سائنٹفک نقطہ نگاہ سے یہ لفظ سبب اور نتیجہ کا تعلق ظاہر کرتا ہے۔ مثلاً اگر پودے کو پانی نہ دیا جائے تو وہ مرجھا جائے گا۔ پانی نہ دینا سبب ہے' اور مرجھا جانا نتیجہ ہے۔

علم تمدن میں قانون (Law) اس اصول کو کہتے جس کا تعلق سلطنت سے ہو۔

ارتقائے قانون

جب سے معاشرہ کی بنیاد پڑی ہے۔ اس وقت سے قانون کا اختراع شروع ہوا ہے کیونکہ افراد اور معاشرہ کا ایک گہرا تعلق ہے بلکہ افراد کے بغیر معاشرہ وجود میں ہی نہیں آ سکتا۔ افراد اور معاشرہ کے باہمی تعلق اور روابط کو منضبط کرنے کے لیے قواعد وضوابط وضع کیے جانے لگے۔ معاشرتی روابط کے ان قواعد (قانون) کی تشکیل و تدوین شروع ہو گئی۔ اس ضمن میں زمانہ قبل مسیح (۲۰۸۴ تا ۲۰۸۱) میں آسریا اور بابل کے بادشاہ کا مجموعہ تعزیرات موسوم بہ ''تعزیرات حمو رابی (Code of Hammurabi) اور روما کے احکام دوازدہ (Twelvetables of Rome) مثال کے طور پر پیش کیے جا سکتے ہیں۔

تمدنی زندگی کے آغاز میں ہی انسان نے یہ سوچ لیا تھا کہ معاشرتی زندگی بغیر قواعد وضوابط کے چل نہیں سکتی۔ ایک پرانا مقولہ ہے:

''جہاں یہ قانون ختم ہوا وہاں ظلم و جور کا آغاز ہو جاتا ہے۔''

یہ مقولہ حقیقت اور صداقت پر مبنی ہے۔ اس وجہ سے ہے ہالینڈ کہتا ہے:

''قانون آزادی کے قلعہ کا دربان ہے۔ یہ ہر شخص کے حقوق متعین کرتا اور فرد کی آزادی و حریت کی حفاظت کرتا ہے یہ انسان کی آزادی کا ایک زبردست محافظ اور پاسبان ہے اور معاشرے کی بہترین جائے پناہ۔''

قدیم قانون کے تین مراحل ہیں:

اوّل: پہلا مرحلہ اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب دنیا میں عدالتوں کا وجود قائم نہیں ہوا تھا۔

دوم: دوسرا مرحلہ اس دور سے تعلق رکھتا ہے جب عدالتیں قائم ہو گئیں اور آئینی قواعد وضوابط کو رسوم و رواج اور دوسری معاشرتی قیود اور پابندیوں سے الگ کر دیا گیا یہ تبدیلی ''زرعی دور'' کے آغاز میں رونما ہوئی۔ اس دور میں قانون کی تنفیذ کے لیے ایک باقاعدہ ادارہ قائم ہو

گیا اور قانون کی ترقی اور تدوین و تشکیل کے لیے ایک خاص ادارہ وجود میں آیا۔

سوم: تیسرا مرحلہ تسوید قانون کا تھا۔ جب عدالتوں کی راہنمائی کے لیے تعزیری قواعد وضوابط کے مجموعے تیار ہو گئے تا کہ قانون کی تشریح کا کام آسان ہو جائے۔ اس مرحلہ کی نمائندگی تعزیرات حمورابی اور روما کے احکام دوازدہ کرتے ہیں۔

اس دور کے خاتمہ کے بعد قانون رسمیات (Formalism) کے دور میں داخل ہوتا ہے سرہنری مین لکھتے ہیں کہ:

"قدیم قانون کے منضبط ہونے کے ساتھ ہی اس کی ترقی وارتقاء کا خاتمہ بھی ہو گیا۔"[1]

قانون کے متعلق چند نظریات

قانون کو سمجھنے کے لیے اس کے مختلف نظریات کا مطالعہ ضروری ہے۔

حکمی نظریہ (Imperative Theory) کی رو سے قانون ایک حکم ہے جو ایک مقتدر اعلیٰ اپنی رعایا پر نافذ کرتا ہے۔

جان آسٹن قانون کی تعریف کرتے ہوئے کہتا ہے:

"مقتدر اعلیٰ کا حکم قانون ہے۔"

جان آسٹن قانون کو انصاف اور عدل سے الگ رکھتا ہے۔ اس کے نزدیک قانون صرف ایک حکم ہے۔ رعایا پر یہ فرض ہے اس پر عمل کرے۔ اس حکم کی خلاف ورزی جرم ہے۔ یہ نظریہ صحیح نہیں ہے۔ سرہنری مین (Sir Henry Main) اور اس کے دوسرے ہم خیال مفکرین نے اس نظریہ پر سخت تنقید کی ہے۔ چنانچہ سرہنری حکمی نظریہ کی تردید کرتے ہوئے کہتا ہے: "یہ نظریہ حکمی" ان مختلف رسوم ورواج اور روایات کو نظر انداز کر دیتا ہے جو قانون کی قدرت رکھتے ہیں۔ احکامات سے مراد محض احکام صادر کرنے والے کی مرضی ہے۔ بغیر اس پر کوئی حد مقرر کیے ہوئے۔

سالمنڈ کہتا ہے:

"انصاف کا تصور وضع قانون کے لیے لابدی امر ہے" چنانچہ وہ ان الفاظ میں تعریف کرتا ہے۔

"ہم کہہ سکتے ہیں کہ قانون ان اصول وقواعد کے مجموعے کا نام ہے جو ریاست یا مملکت اپنی حکومت میں عدل وانصاف قائم رکھنے کی خاطر منظور کرتی اور نافذ کرتی ہے بالفاظ دیگر قانون ان اصول وقواعد پر مشتمل ہوتا ہے جو عدالت ہائے انصاف کے نزدیک مسلمہ ہو اور جس پر یہ عدالتیں عامل ہوں۔"[2]

---

[1] آئین قدیم صفحہ ۲۶۔

[2] Jurisprudence to The D. (1948) P:41

بعض مفکرین کہتے ہیں کہ تمام قوانین حکم نامے میں شامل نہیں ہوتے بلکہ صرف دعوے ہوتے ہیں چنانچہ وڈ رو ولسن (Wood Row Wilson) کہتا ہے:

"قانون اصلہ خیال اور عادت کا ایک جز ہے۔ جس نے حکومت کے بنائے ہوئے قواعد وضوابط کی شکل میں ایک امتیازی اور رسمی شناخت کرنی ہے۔"

اسی طرح ہالینڈ کہتا ہے:

"انسانی حکومت کا وہ عام اصول جس کا نفاذ مقتدر سیاسی طاقت کرتی ہے قانون کہلاتا ہے۔"

تاریخی نظریہ (Historical Theory)

اس نظریہ کا سرخیل سیلاگنی ہے۔ تاریخی نظریہ کی بنیاد اس امر پر ہے کہ قانون کا اصل ماخذ نہ تو مقتدر اعلیٰ کا حکم ہے اور نہ ہی عوام کے رسم و رواج بلکہ اس کا منبع اچھائی اور نیکی کا وہ فطری احساس ہے جو ہر فرد میں موجود ہوتا ہے۔ فرد ان امور سے دل چسپی لیتا ہے جن سے ان کا براہِ راست واسطہ پڑتا ہے اور وہ خود محسوس کر لیتا ہے۔ کون سی چیز غلط ہے اور کون سی صحیح ہے۔ اپنے تجربہ اور مشاہدہ کی بناء پر ایک نظریہ قائم کر لیتا ہے۔ اسی طرح سوسائٹی کا کوئی فرد بھی ان امور سے متعلق کوئی نظریہ قائم نہیں کرتا۔ جس سے اس کا براہ راست تعلق نہ ہو۔

عمرانی نظریہ (Sociological Theory)

اس نظریہ کا حامی مویدڈین پاؤنڈ ہے۔ اس نظریہ کی رو سے قانون سوسائٹی میں نظم و ضبط برقرار رکھنے کے لیے وضع کیا جاتا ہے۔ ہماری معاشرتی تنظیم کے لیے قانون ایک لازمی چیز ہے۔ اس کے بغیر نہ تو سوسائٹی کی ضروریات پوری ہو سکتی ہیں اور نہ سوسائٹی میں امن قائم رہ سکتا ہے۔

اخلاقی نظریہ (Ethical Theory)

علم اخلاق اور علم قانون دونوں کا موضوع انسانی اعمال ہے اور دونوں کی غرض لوگوں کو برائی سے روکنا اور ان کو سیدھی راہ پر چلانا ہے۔ گو علم اخلاق کا دائرہ وسیع ہے اور علم قانون کا دائرہ ذرا تنگ۔ بہر حال قانون کی بنیاد اخلاق ہے۔ اگر قانون سے اخلاقی اقدار کو حذف کر دیا جائے تو قانون بنی نوع انسان کی بہبود و فلاح کی بجائے ضرر رساں بن جائے گا اور معاشرتی زندگی کی عمارت منہدم ہو جائے گی۔ کیونکہ سماجی زندگی کی خوش حالی کا تعلق قانون سے ہے۔ اس وجہ سے مقنن حضرات قانون کو اخلاق کا لازمہ سمجھتے ہیں اور قانون کی عمارت اخلاق پر رکھتے ہیں۔ جس طرح اخلاق انسان کی مادی اور روحانی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ اسی طرح وہ قانون جو اخلاق پر مبنی ہو۔ انسان کی مادی اور روحانی

زندگی کا ضامن ہے۔

قانون کی تعریف

قانون سے متعلق نظریات پر بحث کرنے کے بعد انسانی قانون کی تعریف کرنا آسان ہو گئی ہے۔ پس ''قانون ان قواعد و ضوابط کا نام ہے، جن کے ذریعہ نظم سلطنت چلایا جاتا ہے اور حکومت اور شہریوں کے مابین تعلق استوار کیا جاتا ہے۔ قانون کے ذریعہ حکومت سے لوگوں کو برے کاموں سے روکا جاتا ہے اور سیدھی راہ کی تلقین کی جاتی رہی ہے۔''

مادی نقطہ نگاہ سے قانون افراد کی رضامندی سے مرتب کیا جاتا ہے۔ لیکن اسلامی نقطہ نگاہ سے ''قانون وہ ضمنی قواعد ہیں جو قوم کی طبعی خصوصیات کے مطابق قرآن مجید اور سنت کی روشنی میں ایک تفصیلی نظام مرتب کیا جاتا ہے۔''

اسلامی نقطہ نگاہ سے قرآن اور سنت رسول کو چھوڑ کر انسان کے بنائے ہوئے ضوابط قانون میں داخل نہیں ہوں گے۔

الٰہی اور انسانی حقوق میں فرق

انسانی قانون اس وقت وجود میں آیا۔ جب لوگ خاندان اور قبیلوں میں بٹ گئے اور افراد نے ایک دوسرے کے حقوق پامال کرنے شروع کر دیے۔ حفاظت حقوق کے لیے لوگوں نے چند قواعد و ضوابط کی ضرورت محسوس کی۔ خاندان اور قبیلوں کے رسم و رواج نے ان قواعد و ضوابط کے لیے مواد فراہم کیا۔ اس طرح انسانی قانون کی عمارت تعمیر ہونا شروع ہو گئی۔

اس کے برعکس اسلامی قانون کا آغاز اس وقت ہوا جب اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو اس دنیا میں بھیجا اور حضرت آدم علیہ السلام کو وحی کے ذریعہ وہ باتیں سکھائیں۔ جو اس دور کے لیے ضروری تھیں۔ پھر وقتاً فوقتاً لوگوں کی ہدایت و راہ نمائی کے لیے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ شروع ہو گیا اور اللہ تعالیٰ ہر دور اور زمانے کی ضرورت کے مطابق انبیاء علیہم السلام پر قانون نازل کرتا رہا۔ آخر کار یہ قانون رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہر دور اور زمانے کی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے نازل کیا وہ ایک کامل ضابطہ حیات ہے اور انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر حاوی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا۔[1]

یعنی آج میں نے تمہارا قانون حیات مکمل کر دیا ہے اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے۔ تمہارا دین اسلام کو ٹھہرا کر راضی ہوا ہوں۔

1۔ المائدہ ۵:۳

۲۔ انسانی قانون کے لیے کسی فرد واحد یا قوم کی منظوری اور عدالت کا اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی چیز بھی قانون کو حاصل نہ ہو تو اس کی قانونیت ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے برعکس اسلامی قانون کسی کی منظوری کا محتاج نہیں۔ نہ وہ اس بات کا محتاج ہے کہ عدالت اس پر عمل پیرا ہو۔ اگر قوم اور عدالت اس کو تسلیم نہیں کرتی تو وہ خود مجرم ٹھہرتی ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا جَاءَ كَ مِنَ الْحَقِّ.[1] پس تو لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کر اور اس قانون حق کو ترک کر کے جو تمھارے پاس آیا ہے۔ لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ.[2] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں، وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ.[3] اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ وہ لوگ کافر ہیں۔

وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰى اِلَيْكَ.[4] اس قانون کی پیروی کر جو تیری طرف وحی کیا جاتا ہے۔

۳۔ انسانی قانون روحانیت اور تقدس کا کوئی پہلو اپنے ساتھ نہیں رکھتا۔ جبکہ اسلامی قانون ہر مسلمان کے لیے واجب ہے۔ اس پر ایمان لانا ضروری ہے اس پر ایمان لائے بغیر دائرہ اسلام میں نہیں رہ سکتا۔

۴۔ اسلامی قانون اخلاقی اقدار کی آبیاری کرتا ہے لیکن انسانی قانون کو اخلاقی اقدار سے کوئی دل چسپی نہیں۔ ہاں انسانی قانون صرف اس وقت حرکت میں آتا ہے۔ جب دوسرے افراد کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہو اور نظم حکومت میں کوئی خلل پڑتا نظر آ رہا ہو۔ مثلاً قوانین مروجہ کی نگاہ میں زنا اس وقت جرم ہے۔ جب عورت پر جبر کیا جائے لیکن اسلامی قانون ہر شکل میں زنا کو ناجائز قرار دیتا ہے اور اس کے مرتکب کو سزا دیتا ہے۔

۵۔ اسلامی قانون کا ماخذ ذات الٰہی ہے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ. لیکن انسانی قانون کا مصدر انسانی دماغ ہے۔

انسانی دماغ جذبات اور ماحول سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے کسی موضوعہ قانون کے متعلق یہ نہیں کیا جا سکتا کہ ذاتی رجحانات اور تعصبات سے بالاتر ہے۔ بعض اوقات آمر اپنے ذاتی رجحانات کو قانون میں شامل کر لیتے ہیں۔

---

[1] المائدہ ۵: ۴۸۔ [2] المجادلہ ۵۸: ۲۰۔ [3] المائدہ ۵: ۴۴۔ [4] احزاب ۳۳: ۱۔

۶۔ انسانی قانون میں نہ تو وحدت ہے اور نہ یکسانی۔ یہ دونوں چیزیں قانون کے لیے ضروری ہیں۔ اس کے برعکس اسلامی قانون میں وحدت اور یکسانی پائی جاتی ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

شَرَعَ لَكُمْ مِنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّ الَّذِيْ اَوْحَيْنَا اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖ اِبْرٰهِيْمَ وَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ۔[1] اس نے تمھارے لیے دین کا وہی راستہ مقرر کیا ہے جس کا نوح علیہ السلام کو حکم دیا گیا' اور جو ہم نے تیری طرف وحی کی اور جس کا ہم نے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو حکم دیا کہ دین (قانون) کو قائم رکھو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

۷۔ انسانی قانون محدود اصول اور قواعد کی شکل میں وجود میں آتا ہے۔ جوں جوں قوم کی ضروریات بڑھتی ہیں اور نئے نئے مسائل سامنے آتے ہیں۔ قانون موضوعہ میں تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ نئے اصول اور قواعد بنتے رہتے ہیں۔ گویا قانون موضوعہ کی ترقی رفتار زمانہ کے ساتھ ہے۔

اس کے برعکس اسلامی قانون کلیات اور قواعد کی صورت میں قرآن مجید میں بیان کر دیے گئے ہیں جو کسی زمانہ میں بھی تبدیل نہیں ہو سکتے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے:

لَا تَبْدِيْلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ۔[2] اللہ کی باتیں بدل نہیں سکتیں۔

لیکن ہر زمانہ کی نئی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے قواعد کلیہ کی روشنی میں ضمنی قواعد بنائے جائیں گے۔ جن کو آج کل کی زبان میں بائی لاز کہنا چاہیے۔

۸۔ اسلامی قانون فطرت انسانی کے مطابق خلق کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

فِطْرَتَ اللّٰهِ الَّتِيْ فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا یعنی اللہ کی بنائی ہوئی فطرت جس پر انسان کو پیدا کیا ہے۔ اس کے برعکس موضوعہ قانون انسان کی طبیعت جذبات رجحانات اور تعصبات کا مرہون منت ہے۔ اس وجہ سے اسلامی قانون ہر قسم کے معائب سے پاک ہے اور موضوعہ قانون انسانی جذبات اور تعصبات کی وجہ سے نقائص سے خالی نہیں۔

---

[1] الشوریٰ ۴۲:۱۳۔ [2] یونس ۱۰:۶۴۔

اسلامی دستور کے مآخذ

قرآن مجید کی تعریف

قرآن مجید کی جامع مانع تعریف یہ ہے کہ ''قرآن وہ کلام معجز ہے جسے آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل کیا گیا ہے۔ جسے صحیفوں میں لکھا جاتا ہے۔ جو آپ سے بتواتر منقول ہے اور جس کی تلاوت عبادت کا درجہ رکھتی ہے۔ (علوم القرآن ڈاکٹر صبحی الصالح ص ۳۰)

قرآن مجید کا اشتقاق

قرآن مجید کے اشتقاق اور مادہ کے متعلق علماء کے مختلف افکار اور آراء ہیں۔

ا۔ حضرت امام شافعیؒ

فرماتے ہیں کہ القرآن کا لفظ جس پر الف لام داخل کیا گیا ہے کسی سے مشتق نہیں۔ (یہ لفظ کسی سے نہیں نکلا) گو امام صاحب کے نزدیک کتاب الٰہی کا اسی طرح نام ہے جسے تورات اور انجیل دونوں نام ہیں۔ (تاریخ بغداد از خطیب ج ۲ ص ۶۲)

۲۔ امام اشعری

اور اس کے متبعین کا قول ہے کہ قرآن مجید لفظ قَرْنٌ سے مشتق ہے۔ قَرَنَ الشَّیْءَ بِالشَّیْ ''ایک چیز کو دوسری کے ساتھ ملا دیا۔'' کیونکہ قرآن کی آیتیں اور سورتیں باہم ملی جلی ہوتی ہیں۔ (البرہان ج ۱ ص ۲۷۸)

۳۔ زجاج

کا قول ہے قرآن کا مادہ ''اَلْقَرْءُ'' (جمع کرنا) ہے۔ (البرہان ج ۱ ص ۲۷۸)

عربی میں بولتے ہیں قَرَءَ الْمَاءَ فِی الْحَوْضِ (حوض میں پانی جمع کیا) قرآن کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس میں سابقہ کتب کے ثمرات اور نتائج کو جمع کیا گیا ہے اور اولین اور آخرین کے علوم کا مجموعہ ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: فِیْھَا کُتُبٌ قَیِّمَۃٌ (البینۃ ۹۸:۳) ''اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں۔ یعنی قرآن مجید میں تمام سابقہ کتب کے علوم جمع ہیں۔''

دوسری جگہ آتا ہے: نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ (النحل ۸۹:۱۶) ''ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے۔ جو تمام چیزوں کو واضح بیان کرنے والی ہے۔''

دوم قرآن مجید کو اس لحاظ سے بھی قرآن کہا گیا ہے کہ یہ تمام منتشر دنیا کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے والی ہے اور اس میں اتحاد بین الناس کا پیغام ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً (البقرہ ۲۱۳:۲) ''یعنی سب لوگ ایک ہی قوم ہیں۔''

علامہ اللحیانی کا قول ہے۔ قرآن کا مادہ قَرَءَ (پڑھا) ہے۔ قرآن مجید کو یہ نام اس لیے دیا گیا ہے کہ یہ کتاب پڑھی جاتی ہے اور پڑھی جائے گی گویا اس میں ایک عظیم الشان پیشگوئی ہے یہ وہ کتاب ہے۔ جو دنیا میں سب سے زیادہ پڑھی جائے گی۔

نزول قرآن

قرآن مجید تقریباً تیئس (۲۳) سال کے عرصہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوتا رہا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَآمَنُوا بِمَا نُزِّلَ عَلَىٰ مُحَمَّدٍ وَهُوَ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ (محمد ۲:۴۷) ''اور جو اس پر ایمان لایا جو محمد پر نازل کیا گیا اور وہ اپنے رب کی طرف سے حق ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غار حرا میں عبادت میں منہمک تھے۔ حضرت جبرائیل علیہ السلام رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن کی سورۃ علق کی پہلی پانچ آیات سے لے کر نازل ہوا۔ تو اس پیغام ربانی کو لے کر کانپتے ہوئے گھر تشریف لائے۔ حضرت خدیجہؓ سے فرمایا کہ مجھ پر کپڑا اوڑھ دو۔ ذرا سکون آیا تو آپ نے تمام ماجرہ سنایا اور کہا خَشِيتُ عَلَىٰ نَفْسِي ''مجھے اصلاح دنیا کی ذمہ داری کے بوجھ سے ڈر لگتا ہے۔ تو حضرت خدیجہؓ نے آپ کو تسلی دی اور ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں انھوں نے کہا کہ یہ وہ ناموس ہے جو موسیٰ پر نازل ہوا تھا۔ یہ رمضان کی ایک خاص رات کو اتارا گیا۔ ارشاد الٰہی ہے: شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ (البقرہ ۱۸۵:۲) ''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا۔'' إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةِ الْقَدْرِ (۱:۹۷) ''ہم اسے عزت والی رات میں اتارا ہے۔'' إِنَّا أَنزَلْنَاهُ فِي لَيْلَةٍ مُّبَارَكَةٍ (الدخان ۳:۴۴) ''ہم نے اسے برکت والی رات میں اتارا۔'' قرآن مجید عربی زبان میں نازل ہوا۔ ارشاد الٰہی ہے: فَإِنَّمَا يَسَّرْنَاهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ (۵۸:۴۴) ''سو ہم نے اسے تیری زبان (عربی) میں آسان کر دیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کریں۔''

إِنَّا جَعَلْنَاهُ قُرْآنًا عَرَبِيًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ (الزخرف ۲:۴۳) ''ہم نے اسے عربی زبان میں بنایا تاکہ تم سمجھو۔''

یہ کتاب سب کی سب ایک دفعہ نہیں بلکہ تھوڑا تھوڑا کر کے نازل ہوئی اور جونہی قرآن مجید کا کوئی حصہ نازل ہوتا تو اس کو احاطہ تحریر میں لایا جاتا اور حفظ کر لیا جاتا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَقُرْآنًا فَرَقْنَاهُ

لِتَقْرَاَهٗ عَلَى النَّاسِ عَلٰى مُكْثٍ وَّنَزَّلْنٰهُ تَنْزِيْلًا (۱۰۶:۱۷) "اور قرآن مجید کو ہم نے جدا جدا کر دیا ہے تاکہ تو ٹھہر ٹھہر کر لوگوں پر پڑھے اور ہم نے اسے تھوڑا تھوڑا کر کے نازل کیا۔"

حضرت جبرائیل علیہ السلام اللہ تعالیٰ سے وحی نبوت (پیغام' شریعت' احکام خداوندی) حاصل کر کے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قلب مطہر پر اتارا۔ ارشاد الہٰی ہے: فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ (البقرہ ۹۷:۲) "اس نے اللہ کے حکم سے اس کو تیرے دل پر اتارا۔"

(قرآن مجید کو دوسری سماوی کتب پر یہ فضیلت حاصل ہے کہ قرآن مجید میں ہی یہ بتا دیا گیا ہے کہ کب اتارا گیا۔ کس پر اتارا گیا۔ اس کتاب کا نام کیا ہے اور کس زبان میں اتارا گیا اور قرآن مجید کا مہبط (اترنے کی جگہ) کیا ہے۔ کسی سماوی کتب میں ان باتوں کا علم نہیں ملتا۔ قرآن مجید کے مطالعہ سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ قرآن وحی الہٰی کی بہترین شکل ہے۔

تدوین وحفاظت قرآن مجید

تدوین اور حفاظت قرآن مجید کے تین ادوار ہیں۔ ا۔ عہد رسالت۔ ۲۔ عہد صدیقی۔ ۳۔ عہد عثمانی۔

عہد رسالت

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (الحجر ۹:۱۵) "یعنی ہم نے ہی ذکر (قرآن مجید) اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔"

دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّ عَلَيْنَا جَمْعَهٗ وَقُرْاٰنَهٗ (القیمۃ ۱۷:۷۵) "یعنی اس کتاب کا جمع کرنا اور پڑھنا ہمارے ذمہ ہے۔"

یہ دونوں آیات ظاہر کرتی ہیں کہ قرآن مجید کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ پر ہے۔

قرآن مجید کی حفاظت دو طریقوں سے ہوئی ہے۔ ایک زبانی یاد کرنے سے دوسری کتابت سے اور یہی دو طبعی اور قدرتی طریقے ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی کثیر صحابہ سارا قرآن مجید حفظ کر چکے تھے۔ مہاجرین میں سے مشہور حفاظ' خلفاء راشدینؓ حضرت طلحہؓ حضرت سعد حضرت ابن مسعود حضرت حذیفہؓ حضرت سالم حضرت ابو ہریرہؓ حضرت عبداللہ بن سائبؓ حضرت عبداللہ بن عباسؓ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ حضرت عبداللہ بن عمرؓ حضرت عبداللہ بن زبیرؓ حضرت عائشہؓ حضرت حفصہؓ حضرت ام سلمہؓ انصار میں سے حضرت عبادہ بن صامتؓ حضرت معاذؓ ابو حلیمہؓ مجمع بن جاریہؓ فضالہ بن عبیدؓ مسلمہ بن مخلدؓ۔

جن مہاجرین اور انصار صحابہ اور امہات المومنین کے اسماء گرامی کا ذکر کیا گیا ہے۔ انھوں

نے قرآن کریم کو یاد کیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سنایا اس طرح وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے براہ راست شاگرد تھے اور آپؐ ان کے استاد محترم تھے۔

اور جن لوگوں نے قرآن مجید کو خود یاد کیا اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نہیں سنایا۔ ان کی تعداد بے شمار ہے۔

صحابہ کا قرآن مجید سے شغف

صحابہ کرام کا شغف قرآن مجید سے حد سے بڑھا ہوا تھا۔ قرآن مجید کا پڑھنا اور سننا ان کا اوڑھنا بچھونا تھا۔ بخاری اور مسلم نے ابو موسیٰ اشعری سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جب اشعری (حضرت ابو موسیٰ اشعری کے ہم قبیلہ) لوگ رات کو اپنے گھروں میں داخل ہوتے ہیں۔ تو میں ان کی آواز پہچان لیتا ہوں۔ وہ رات کے وقت جب اپنے گھروں میں قرآن پڑھتے ہیں تو میں ان کے گھروں کو پہچان لیتا ہوں۔ اگرچہ دن کے وقت میں ان کے یہاں کبھی نہیں گیا۔ (مناہل العرفان للزرقانی ج ا ص ۳۱۳)

صحابہ کرام ایک دوسرے کو قرآن کریم سناتے اور یاد کرتے تھے تاکہ فرضی اور نفلی نمازوں میں شب و روز روانی سے اس کی تلاوت کر سکیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کو حفظ قرآن کی ترغیب دیتے۔ حضرت عثمانؓ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "تم میں سب سے بہتر وہ شخص ہے جو قرآن سیکھتا ہے اور سکھاتا ہے۔" اور آپ اس شخص کو نماز میں امام بناتے تھے۔ جس کو سب سے زیادہ قرآن مجید حفظ ہوتا۔

جب کوئی شخص ہجرت کر کے مدینہ پہنچتا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی صحابی کے سپرد کر دیتے جو اسے قرآن پڑھاتا۔ مسجد نبوی میں تلاوت قرآن کا یہ عالم تھا کہ مسجد گونج جاتی تھی۔ یہاں تک کہ آپ نے آہستہ آہستہ تلاوت کا حکم دیا تاکہ ایک دوسرے کی تلاوت میں خلل اندازی نہ ہو۔ (مناہل العرفان ج ا ص ۲۳۴)

قرآن مجید پڑھانے میں صحابہ کرام میں سات حضرات نے خصوصی شہرت پائی تھی۔ ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ عثمان بن عفان۔ علی بن ابی طالب' ابی بن کعب' زید بن ثابت' عبداللہ بن مسعود ابو الدرداء ابو موسیٰ اشعریؓ۔

کتابت

قرآن مجید عہد رسالت میں ہی احاطہ تحریر میں آ چکا تھا۔ جب کوئی آیت نازل ہوتی۔ تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کسی کاتب وحی کو بلاتے اور اس آیت کو اس کی جگہ (جہاں اللہ تعالیٰ

نے تفہیم دی ہوئی ہوتی تھی) پر لکھوا دیتے تھے۔ اس طرح قرآن مجید آپ کی حیات طیبہ میں ہی لکھا جا چکا تھا۔ ایک حدیث میں آتا ہے: قُبِضَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَالْقُرْاٰنُ فِیْ الْعَسِیْبِ وَالْقَضِمِ ''یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس وقت دنیا سے اٹھائے گئے جبکہ قرآن مجید کھجور کے پتوں پر لکھا جا چکا تھا۔''

کاتبین وحی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حسب ذیل کاتبین وحی مقرر فرماتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت معاویہؓ، حضرت زید بن ثابتؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت خالد بن ولیدؓ، حضرت ثابت بن قیسؓ۔

حاکم نے مستدرک میں حضرت زید بن ثابت سے روایت ہے کہ زید بن ثابت نے کہا کہ تم عہد رسالت میں ''رقاع'' سے قرآن جمع کیا کرتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص کہتے ہیں۔ جَمَعْتُ الْقُرْاٰنَ فَقَرَاْتُ بِهٖ كُلَّ لَيْلَةٍ فَبَلَغَ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ اِقْرَاْهُ فِیْ شَهْرٍ (مسند احمد) ''میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہی سارا قرآن جمع کر لیا تھا اور ایک رات میں سب پڑھ جاتا تھا۔ آپ کو علم ہوا تو فرمایا ایک مہینہ میں ختم کیا کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں جن چیزوں پر قرآن مجید لکھا جاتا تھا۔ حسب ذیل ہیں۔

۱۔ عسیب

کھجور کی شاخوں کا وہ حصہ جو تنے سے متصل ہوتا ہے۔ اس میں کافی کشادگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس حصہ کو شاخ سے الگ کر لیا جاتا تھا۔ پھر ان کو خشک کر کے ان پر لکھا جاتا تھا۔

۲۔ لخف

ہر معمولی پتھر کو نہیں کہتے بلکہ بالاتفاق اہل لغت نے لکھا ہے کہ سفید رنگ کی پتلی پتلی چوڑی چوڑی تختیاں پتھر سے بنائی جاتی تھیں۔

۳۔ کتف

اونٹ یا بکری کے مونڈھے کے پاس کی گول اور چوڑی ہڈی کو کہتے ہیں۔

۴۔ ادیم

باریک کھال سے دباغت کے عمل سے تیار ہوتا ہے۔

۵۔ قتب

اونٹ کے کجاوہ میں چھوٹی چھوٹی تختیاں استعمال ہوتی تھیں۔ ان کو کہتے ہیں۔

عہد صدیقی

قرآن مجید رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں مدون ہو چکا تھا اور بے شمار حفاظ کے سینوں میں محفوظ تھا۔ بے شمار افراد کے پاس قرآن مجید کے لکھے ہوئے نسخے موجود تھے امام بن حزم نے لکھا ہے کہ خلیفہ اول ابوبکرؓ کے زمانہ میں کوئی ایسا شہر نہیں تھا۔ جہاں لوگوں کے پاس کثرت سے قرآن مجید کے لکھے ہوئے نسخے نہ ہوں اور حضرت عمرؓ کے زمانہ میں مسلمانوں کے پاس قرآن مجید کے لکھے ہوئے نسخے ایک لاکھ سے کم نہ تھے۔ (کتاب الملل والنحل)

عہد صدیقی میں کتابی صورت میں ایک مستند نسخہ مرتب کرنے کی ضرورت اس وقت پیش آئی۔ جب حفاظ لڑائیوں میں کثرت سے شہید ہو رہے تھے۔ قرآن لکھا ہوا موجود تو تھا لیکن اس کے اجزاء منتشر تھے۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے اس ضرورت کو محسوس کیا اور حضرت ابوبکرؓ سے کہا: بخاری میں زید بن ثابت سے روایت ہے۔

''مجھے ابوبکرؓ نے جنگ یمامہ کے بعد بلوا بھیجا۔ میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے دیکھا کہ عمر بن الخطاب ان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ ابوبکرؓ نے فرمایا کہ عمر میرے پاس آئے ہیں اور کہتے ہیں کہ جنگ یمامہ میں قرآن کے بہت سے قراء شہید ہوئے ہیں اور مجھے خطرہ محسوس ہوا ہے کہ اگر اسی طرح دوسری لڑائی میں قراء شہید ہوتے رہے تو بہت سا قرآن ہاتھوں سے جاتا رہے گا۔ لہٰذا میری رائے ہے کہ آپ قرآن کو جمع کرنے کا حکم دیں تو میں نے عمرؓ کو جواب دیا کہ ہم اس کام کو کس طرح انجام دیں۔ جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا۔ تو عمرؓ نے کہا: خدا کی قسم یہ نہایت ضروری اور بہتر کام ہے اور عمرؓ مجھ سے اس معاملہ میں اصرار اور بحث کرتے رہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے میرے سینے کو اس کام کے لیے کھول دیا اور میری بھی وہی رائے ہوگئی جو عمرؓ کی ہے۔''

حضرت زید بن ثابت کہتے ہیں کہ ابوبکرؓ نے مجھے مخاطب ہو کر فرمایا:

تم جوان اور زیرک ہو ہم تم پر کسی طرح کی تہمت نہیں لگا سکتے۔ نیز تم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں کاتب وحی تھے۔ لہٰذا تم پورے قرآن کو ایک جگہ جمع کرنے میں لگ جاؤ۔ خدا کی قسم اگر وہ مجھے کسی پہاڑ کو منتقل کرنے کی تکلیف دیتے تو مجھ پر اس قدر گراں نہ گزرتا جتنا قرآن کے جمع کرنے کی ذمہ داری کا بارِ گراں، جس کا انھوں نے حکم دیا۔ میں نے کہا کہ آپ دونوں کس طرح وہ کام کرنا چاہتے ہیں جسے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کیا۔ یہاں تک کہ اللہ نے میرا سینہ

اس کام کے لیے کھول دیا۔ جس کے لیے اس نے ابوبکرؓ اور عمرؓ کے سینوں کو کھول دیا تھا۔ چنانچہ قرآن کو کھجور کے درخت کی چھالوں سے اور پتھر کی تختیوں سے اور لوگوں کے سینوں سے جمع کرتا رہا۔ البتہ یہ سورہ توبہ کا آخری حصہ مجھے صرف ابوخزیمہؓ انصاری کے پاس سے ملا اور ان کے سوا کسی اور کے پاس سے وہ مجھے نہ ملا۔ یعنی لَقَدْ جَآءَکُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ ختم سورہ براء تک۔ پس یہ صحیفے ابوبکر کے پاس اس کی وفات تک رہے' پھر عمرؓ کے پاس ان کی وفات تک رہے پھر حفصہؓ کے پاس آ گئے۔ حضرت علی کا ارشاد ہے۔ اللہ تعالیٰ ابوبکرؓ پر رحم فرمائے وہ پہلے شخص تھے جس نے قرآن کو کتابی صورت میں جمع کیا۔

حضرت ابوبکرؓ کے اہتمام سے تدوین قرآن کا کام ایک سال کی مدت میں تکمیل پایا۔ حضرت زید بن ثابت نے قرآن مجید کو کس طرح کاغذ کے ٹکڑوں' کھجور کی ٹہنیوں' پتھر کی سلوں چمڑے کے ٹکڑوں اور کجاوہ کی لکڑی سے جمع کیا۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں؟ حضرت زید بن ثابت نے قرآن کا جو نسخہ کتابی شکل میں تیار کیا۔ وہ پہلے حضرت ابوبکرؓ کے پاس رہا۔ جب آپ نے وفات پائی۔ تو وہ نسخہ حضرت عمرؓ کے پاس آ گیا۔ آپ کی شہادت کے بعد یہ صحیفہ ام المومنین حضرت حفصہ بنت عمر کی تحویل میں آ گیا۔ (البرہان ج ۱ص ۲۳۹)

حضرت ابوبکر کے جمع کردہ قرآن مجید پر پوری امت مسلمہ کا اجماع منعقد ہو چکا ہے۔ اس کو تواتر کا درجہ حاصل ہے حضرت ابوبکرؓ کے جمع کردہ قرآن اور عہد رسالت میں مرتب قرآن کے درمیان کامل یک رنگی ہم آہنگی پائی جاتی ہے اور دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

عہد عثمانی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سہولت کے لیے عرب کے ہر قبیلہ کو اپنے اپنے لہجہ اور رسم الخط میں پڑھنے اور لکھنے کی اجازت دے رکھی تھی۔ عثمانی عہد میں اختلاف قرات کی وجہ سے نو مسلم عجمیوں میں ایک فتنہ کھڑا ہوا۔ جس کا ذکر احادیث میں آتا ہے۔ حضرت امام بخاری نے حضرت انسؓ سے روایت کی ہے۔

"حذیفہؓ بن الیمانؓ حضرت عثمانؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے انھوں نے ارمینیہ کی فتح میں اہل شام کے ساتھ اور آذربیجان کی فتح میں اہل عراق کے ساتھ جہاد میں شرکت کی تھی' وہاں ان دونوں علاقوں کے مسلمانوں کا قرات قرآن میں اختلاف دیکھ کر گھبرائے گئے' پس جب وہ حضرت عثمانؓ کے پاس آئے تو کہا اے امیرالمومنین! اس امت کی خبر لیجیے قبل اس کے کہ وہ کتاب اللہ میں اس طرح اختلاف کرنے لگیں۔ جس طرح یہود اور انصاری نے اختلاف کیا تو حضرت عثمانؓ نے حضرت حفصہؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ ہمارے پاس صحیفے ارسال کر دیں تاکہ ہم اس کی نقلیں مصاحف میں کر لیں۔ پھر

آپ کو اصل صحیفے واپس کر دیں گے تو حضرت حفصہؓ نے ان صحیفوں کو حضرت عثمانؓ کی خدمت میں بھیج دیا اور حضرت عثمان نے زید بن ثابتؓ عبداللہ بن زبیرؓ سعید بن العاصؓ اور عبدالرحمٰن بن الحارثؓ کو حکم دیا تو ان لوگوں نے اس کو مصاحف میں نقل کیا حضرت عثمانؓ نے (زیدؓ بن ثابتؓ کے سوا بقیہ) تینوں قریشی صحاب سے کہا تھا کہ جب تم لوگ اور زید بن ثابتؓ قرآن کے کسی لفظ میں اختلاف کرو تو اس کو لغت قریش میں لکھنا کیونکہ قرآن انھیں کی زبان میں نازل ہوا ہے تو انھوں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں تک جب اصل مسودات مصاحف میں نقل کر لیے گئے۔ حضرت عثمانؓ نے اصل صحیفوں کو حضرت حفصہؓ کے پاس بھیج دیا اور جو مصاحف نقل کرائے تھے ان میں ایک ایک نسخہ مملکت کے ہر علاقے میں بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس کے سوا جس صحیفہ یا مصحف میں قرآن لکھا ہوا ہے جلا دیا جائے حضرت زید بن ثابتؓ کہتے ہیں کہ جس وقت ہم مصحف لکھ رہے تھے تو سورۃ احزاب کی ایک آیت (اصل صحیفوں) میں ہمیں نہ ملی۔ جسے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پڑھتے ہوئے سنا کرتا تھا تو ہم نے اس کی تلاش کی خزیمہؓ بن ثابتؓ انصاری کے پاس لکھی ہوئی پائی اور وہ آیت "مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ رِجَالٌ صَدَقُوْا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ عَلَيْهِ" تھی "چنانچہ ہم نے اس کو اسی سورۃ میں مصحف میں شامل کر لیا۔" (صحیح بخاری کتاب فضائل القرآن)

غیر مسلموں کی شہادتیں

سرولیم میور اپنی تصنیف "لائف آف محمدؐ" کے دیباچہ میں لکھتے ہیں۔ "اس بات کی تسلی بخش اور قابل اطمینان اندرونی اور بیرونی شہادت موجود ہے کہ قرآن اس وقت بھی ٹھیک اسی شکل وصورت میں محفوظ و مامون ہے جس حالت میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے دنیا کے سامنے پیش کیا تھا۔" (دیباچہ لائف آف محمدؐ ص ۲۵)

"نیو یونیورسل انسائیکلوپیڈیا" میں "قرآن" کے عنوان سے مقالہ درج ہے۔ اس میں لکھا ہے۔ یہ کتاب پیمبر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ان کی زندگی کے آخری تیئس سال میں اور مدینہ میں نازل ہوتی رہی اور مسلمانوں کے عقیدہ میں کلام الٰہی ہے۔ یہ خلاف حدیث کے جو مجموعہ کلام رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے۔ قرآن پیغمبر کی زندگی میں ہی اور انہی کی زیر ہدایت ونگرانی ضبط تحریر میں آ گیا تھا اور ان کے صحابیوں نے اسے حفظ یاد کر لیا تھا اور یہ معمول آج تک جاری ہے چنانچہ صدہا مسلمان کلام پاک کے حافظ ہیں اور اسے سارے کا سارا دہرا سکتے ہیں۔ بغیر کسی غلطی کے اس کتاب کا دعویٰ ہے کہ اس میں تمام کتب آسمانی کے حقائق آ گئے ہیں اور یہ کہ آخری اور ناقابل تغیر کتاب ہے نیز یہ کہ نوع انسان کے لیے وہ جامع ترین دستور العمل ہے اور اسلام یعنی دین فطرت کی آخری توضیح ہے اور یہی دین ابراہیم وموسیٰ اور عیسیٰ اور سارے قدیم انبیاء کا رہ چکا ہے۔ اس کی عبارت کا غیر منحرف ہونا مسلم ہے۔

جرمن کے مشہور مستشرق نولڈ یکی نے لکھا ہے۔

''یورپ کے جن جن مصنفین نے اب تک اس امر کی زبردست کوشش کی ہے کہ قرآن میں تحریف ثابت کریں۔ وہ اپنی سعی اور جدوجہد میں حیرت انگیز طور پر ناکام ثابت ہوئے ہیں۔'' (انسائیکلوپیڈیا برٹینیکا زیر لفظ قرآن)

مشہور مستشرق ہرٹ وگ ہرشفیلڈ اپنی کتاب ''New researches into the composition and exegesis of the Quran'' میں لکھتا ہے ''عہد حاضر کے نقاد اس پر متفق ہیں کہ قرآن کے موجودہ نسخے اس اصلی نسخے کا ہو بہو عکس ہیں جسے (حضرت) زیدؓ نے لکھا تھا اور قرآن کا متن بعینہٖ وہی ہے۔ جسے محمد نے (لکھا کر) دیا تھا۔''

سرجان ہمرٹن کے زیر اہتمام یونیورسل انسائیکلوپیڈیا شائع ہوا تھا۔ اس میں قرآن کے عنوان سے جو مقالہ درج ہے اس میں تحریر ہے۔ ''اس کی عبارت کا غیر محرف ہونا مسلّم ہے۔''

معنوی حفاظت

اللہ تعالیٰ نے جس طرح قرآن مجید کے الفاظ و ترتیب کی حفاظت کی ہے۔ اس طرح اس مقدس صحیفہ کو تحریف معنوی سے محفوظ کر رکھا ہے۔

ائمہ اسلام نے قرآن مجید کی اجمالی مقامات کی تفسیر احادیث نبوی کی مدد سے کی اور قرآن مجید کو تحریف معنوی سے محفوظ رکھا۔ متکلمین نے قرآنی تعلیمات کو عقل کے ساتھ تطبیق دے کر فلسفیانہ اعتراضات کے جوابات دیے۔ جب کبھی کوئی غلط عقیدہ پیدا ہوا تو علماء کرام نے قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں اس غلط عقیدہ کی اصلاح کی۔ خلق قرآن کا غلط عقیدہ پیدا ہوا تو احمد بن حنبل و دیگر علمائے نے اس کو رد کیا۔

قرآن مجید کے اعجازی پہلو

ا۔ قرآن مجید کا بے مثل ہونا

ارشاد الٰہی ہے: قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا (بنی اسرائیل ۱۷:۸۸) ''کہہ دیجئے کہ اگر انس و جن جمع ہو جائیں اور کوشش کریں کہ اس قرآن کی مثل بنا لائیں تو وہ ہرگز اس کی مثل نہ بنا سکیں گے۔ خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار بن جائیں۔''

علمی لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید دقائق علمیہ کا خزانہ ہے جن کو بوجہ خارق عادت ہونے کے علمی اعجاز کہنا

چاہیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: مَافَرَّطْنَا فِی الْکِتَابِ مِنْ شَیْءٍ (انعام ۶:۳۸) "ہم نے کتاب (قرآن) میں بیان کرنے سے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔" دوسری جگہ آتا ہے: تِبْیَانًا لِکُلِّ شَیْءٍ (النحل ۱۶:۸۹) "یعنی قرآن مجید میں ہر چیز کو وضاحت سے بیان کر دیا گیا ہے۔"

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے: وَلَا رَطْبٍ وَّلَا یَابِسٍ اِلَّا فِی کِتَابٍ مُّبِیْنٍ اس آیت میں رطب سے مراد روحانی علوم اور یابس سے مراد بقیہ علوم مراد ہے۔ گویا ہر قسم کے علوم اس قرآن میں بیان کر دیے گئے ہیں۔

برکات روحانیہ کے لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید رشد و ہدایت اور برکات روحانیہ کے لحاظ سے معجزہ ہے موسیو سیڈیو فرانسیسی لکھتا ہے۔ "اسلام کو جو لوگ وحشیانہ مذہب کہتے ہیں۔ انھوں نے قرآن کی تعلیم کو نہیں دیکھا جس کے اثر سے عربوں کی تمام بُری اور معیوب عادتوں کی کایا پلٹ ہو گئی۔" (بحوالہ تاریخ القرآن مصنفہ مولانا عبدالقیوم ندوی ص ۱۷)

قوت تاثیر کے لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید کے الفاظ میں خارق عادت تاثیر ہے۔ حضرت عمر کا ایمان لانا اور اس کے قسم کے بے شمار واقعات ہیں جو قرآن مجید کی قوت تاثیر پر دلالت کرتے ہیں۔ جان رینیک جرمن فلاسفر لکھتا ہے جبکہ قرآن پیغمبر کی زبان سے منکر سنتے تھے تو بے تاب ہو کر سجدے میں گر جاتے تھے اور مسلمان ہو جاتے تھے۔ (بحوالہ تاریخ القرآن مصنفہ عبدالقیوم ندوی صفحہ ۶۷)

عدم اختلاف کے لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید تیئس برس دکھ سکھ کے مختلف اوقات میں نازل ہوتا رہا لیکن اس میں کوئی اختلاف نہیں پایا جاتا۔ اسی لیے قرآن مجید نے منافقوں اور مخالفوں کو مخاطب ہو کر فرمایا اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ کَانَ مِنْ عِنْدِ غَیْرِ اللّٰہِ لَوَجَدُوْا فِیْہِ اخْتِلَافًا کَثِیْرًا (النساء ۴:۸۲) "پھر کیا وہ قرآن میں غور و فکر نہیں کرتے اور اگر یہ غیر اللہ کی طرف سے ہوتا۔ اس میں ضرور اختلاف پاتے۔"

غیب کی خبروں کے اعلان کرنے کے لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید غیب کی خبروں سے بھرا پڑا ہے۔ یہ اس امر کا بین ثبوت ہے کہ یہ کتاب ایک ایسی ہستی کی طرف سے نازل ہوئی جو علیم و خبیر ہے بعض وہ خبریں ہیں جو ماضی سے تعلق رکھتی ہیں اور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان خبروں کے معلوم کرنے کا کوئی ذریعہ نہ تھا اور بعض وہ خبریں ہیں

جو مستقبل سے تعلق رکھتی ہیں۔ مثلاً فرعون کی لاش کے متعلق یہ خبر دی کہ وہ محفوظ رہے گی۔ ارشاد الٰہی ہے: فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْکَ بِبَدَنِکَ لِتَکُوْنَ لِمَنْ خَلْفَکَ اٰیَةً (یونس ۱۰:۹۲) "سو آج ہم تیرے بدن کو بچا دیں گے تا کہ تو ان کے لیے جو تیرے پیچھے ہیں۔ نشان ہو۔"

حضرت موسیٰ کے مقابل جو فرعون تھا۔ وہ رعمیس ثانی تھا۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف بری ٹانیکا میں مضمون ممی کے تحت لکھا ہے کہ رعمیس ثانی کی لاش مصالحہ کے ذریعہ محفوظ ہے۔

قرآن پیش گوئیوں سے بھرا پڑا ہے۔ صرف نمونہ کے لیے ایک ایسی پیشگوئی بیان کی گئی ہے جو تمام شک وشبہ سے بالا ہے اور سورج کی روشنی کی طرح روشن ہے۔

قوت دلائل کے لحاظ سے معجزہ

قرآن مجید کا نام بینہ ہے جس کے معنی ہیں واضح اور کھلی دلیل ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَقَدْ جَآءَکُمْ بَیِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ (الانعام ۶:۱۵۷) "یقیناً تمھارے پاس خدا کی دلیل آ چکی ہے۔"

قرآن پڑھنے والا آسانی سے یہ جان سکتا ہے کہ قرآن مجید ہر دعویٰ کو دلائل و براہین قاطعہ سے منواتا ہے۔

اسلامی قانون میں قرآن مجید کا مقام

قرآن مجید اسلامی شریعت کا اصل الاصول اور مرجع اول ہے۔ اس میں تمام کلی قواعد اور ان کی بہت سی تفصیلات مذکور ہیں۔

قرآن مجید کے اوّلین ماخذ ہونے کے دلائل

پہلی دلیل

تمام علماء امت کا اس بات پر اتفاق اور اجماع ہے کہ قرآن مجید اسلامی شریعت کا اولین ماخذ ہے۔ پہلی دلیل یہ ہے کہ یہ وہ کتاب ہے جو ہر قسم کے شک وشبہ سے بالا ہے۔ قرآن مجید کے آغاز میں ہی اس بات کا اعلان ہے: ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ یہ وہ کتاب ہے جس میں کسی قسم کا شک نہیں۔ شک وشبہ سے بالا ہونے کے کئی دلائل ہیں۔ ایک دلیل یہ ہے: اِنْ کُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ (البقرہ ۲:۲۳) "اگر تمھیں اس پر جو ہم نے اپنے بندے پر اتارا ہے شک ہے تو اس کی مانند ایک سورت تو لاؤ۔"

لَا رَیْبَ ہونے کے ساتھ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کتاب محفوظ ہے اور اس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ پر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّکْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ

(الحجر ۹:۱۵) بے شک ہم نے ہی ذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔"

لہٰذا اوّل ماخذ ہونے کی یہ دلیل ہے کہ قرآن مجید شک و شبہ سے بالا ہے اور محفوظ ترین کتاب ہے۔

دوسری دلیل

قرآن مجید اوّلین اور آخرین کے علوم کا مجموعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتَابَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ "یعنی ہم نے تم پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے جو تمام چیزوں کو واضح بیان کرنے والی ہے۔"

دوسری جگہ آتا ہے: فِيهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ (البینۃ ۹۸:۳) "اس میں قائم رہنے والی کتابیں ہیں یعنی اس میں تمام کامل صداقتیں اور علوم اولین و آخرین درج ہیں۔

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے: مَا فَرَّطْنَا فِي الْكِتَابِ مِن شَيْءٍ "ہم نے (قرآن) میں بیان کرنے سے کوئی چیز نہیں چھوڑی۔ یعنی قرآن مجید میں سب علوم خدمت دین کے لیے بطور خارق عادت معجزہ بیان ہوئے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ مُهَيْمِنًا عَلَيْهِ (۵:۴۸) "سابقہ کتب کی تعلیمات کا محافظ ہے۔"

اسی لیے امام ابن حزم کہتے ہیں کہ "اس (قرآن) میں فقہ کے تمام ابواب موجود ہیں۔ یعنی فقہ کا کوئی باب ایسا نہیں۔ جس کا اصل اس میں موجود نہ ہو اور سنت نے اس کی وضاحت نہ کر دی ہو۔"

گویا قرآن مجید علوم کا ایک ذخار ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید کو فقہاء نے شریعت اسلامی کا اوّل ماخذ قرار دیا ہے۔

تیسری دلیل

قرآن مجید ایک واحد کتاب ہے جس نے مکمل ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: الْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا (المائدہ ۵:۳) "آج میں نے تمہارا دین مکمل کر دیا اور اپنی نعمت کو پورا کر دیا ہے تمہارا دین اسلام ٹھہرا کر راضی ہوا ہوں۔"

فقہاء نے قرآن مجید کو اسی وجہ سے اوّل ماخذ قرار دیا ہے کہ یہ اکمل کتاب ہے۔

چوتھی دلیل

قرآن مجید وہ کتاب ہے جو تمام تنازعات اور اختلافات کا فیصلہ کرتی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: إِنَّهُ لَقَوْلٌ فَصْلٌ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ "یعنی قرآن مجید تمام تنازعات کا فیصلہ کرتی ہے اور یہ بے سود اور بے کار نہیں ہے۔ یعنی ہم نے اس کتاب کو اس لیے نازل کیا ہے۔ تاکہ جو اختلاف پیدا ہوئے۔ ان سب کو دور کرے۔ پس قرآن مجید اس وجہ سے شریعت اسلامی کا اول مصدر و ماخذ ہے کہ اس میں تمام

اختلافات کا حل موجود ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا اَنْزَلْنَا عَلَيْکَ الْكِتَابَ اِلَّا لِتُبَيِّنَ لَهُمُ الَّذِي اخْتَلَفُوْا فِيهِ وَهُدًى وَّرَحْمَةً لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (النحل ۱۶:۶۴) اور ہم نے تجھ پر کتاب صرف اس لیے کہ نازل کی ہے کہ تو ان کے لیے باتیں کھول کر بیان کرے۔ جن میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ وہ لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے جو ایمان لاتے ہیں۔

پانچویں دلیل

قرآن مجید وہ کتاب ہے جو انسان کے نفس میں طرح طرح کے وساوس گزرتے ہیں اور شکوک وشبہات پیدا ہوتے ہیں۔ جس وجہ سے تاریکیوں میں ٹامک ٹویاں مارتا پھرتا ہے۔ جہالت کی وادی میں سرگردان پھرتا رہتا ہے۔ اس کی ہدایت کے لیے قرآن مجید اتارا گیا ہے تاکہ انسان کو معرفت کامل کا نور عطا کرے اور اس کو منزل مقصود تک پہنچائے۔ ارشاد الٰہی ہے: الٓرٰ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْکَ لِتُخْرِجَ النَّاسَ مِنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ "ہم نے تیری طرف ایسی کتاب نازل کی ہے۔ جو (جہالت کی) تاریکی سے نکال کر (علم کی روشنی کی طرف لاتی ہے۔)"

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے: هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ "یہ کتاب متقیوں کے لیے ہدایت ہے۔ یعنی یہ کتاب متقیوں کو منزل مقصود تک پہنچانے والی ہے۔ ایک اور جگہ قرآن کو هُدًى لِّلنَّاسِ کہا ہے۔ یعنی قرآن مجید لوگوں کے لیے ہدایت کا موجب ہے۔

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید اصول وکلیات کی کتاب ہے۔ جزوی قوانین کی تفصیل بہت کم ہے۔ علامہ شاطبی فرماتے ہیں۔ قرآن مجید مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اور یہ جامعیت اسی وقت ہوسکتی ہے۔ جبکہ اس میں کلیات بیان ہوئے ہیں کیونکہ شریعت اس کے نزول کے بعد کامل ہوگی۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ "آج میں نے تمھارے لیے تمھارے دین کو کامل کر دیا ہے۔ الخ" (الموافقات المسالۃ الخامسۃ ج ۳ ص ۲۶۷)

ایک اور موقع پر فرماتے ہیں۔ "قرآن حکیم میں احکام شرعیہ اکثر کلی طور پر بیان ہوئے ہیں۔ جہاں جزئی طور پر تفصیل ہے وہ کسی حکم کلی کے تحت ہے۔" (الموافقات صفحہ ۲۶۶)

گویا قرآن مجید انسانی ہدایت وراہنمائی کی آخری کتاب ہے۔ اس بناء پر اس کی تعلیمات کا ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنا لازمی امر ہے۔

چھٹی دلیل: خدا کی طرف سے نازل کردہ

قرآن مجید کے نزول سے قبل دنیا کی کسی قوم کے پاس اس کے مذہب کی کتاب اصلی

حالت میں موجود نہیں۔ پھر جب ان کتب کی تعلیمات پر نظر دوڑائیں تو وہ انسانوں کی ضروریات کو پورا نہیں کرتیں نہ ان کتب کا دعویٰ ہے کہ ان میں موجود تعلیم ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرے گی۔ اس کے برعکس جب قرآن مجید پر نظر دوڑائیں تو قرآن دعویٰ کرتا ہے کہ یہ کتاب خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِنَّهٗ لَتَنْزِيْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ (الشعراء ۲۶:۱۹۲،۱۹۳،۱۹۴) ''اور بے شک اس قرآن کو پروردگار عالم نے نازل کیا ہے اور اس کو روح الامین نے تیرے دل پر اتارا تا کہ تو ڈرانے والوں میں سے ہو۔''

ساتویں دلیل: محفوظ کتاب

دوسری کتب مذاہب کے برعکس قرآن مجید ایک محفوظ کتاب ہے۔ جس شکل وصورت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی۔ اسی صورت میں بغیر کسی تحریف وتبدل کے محفوظ چلی آ رہی ہے۔ اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے لی۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (۱۵:۹) ''ہم نے ہی قرآن کو اتارا ہے اور ہم ہی اس کی حفاظت کریں گے۔''

آٹھویں دلیل: دعویٰ کے ساتھ دلیل

پہلی کتب میں اگر کسی چیز کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ تو اس کے ساتھ دلیل نہیں دی۔ قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو ہر بات دلیل سے تسلیم کراتا ہے اور ہر دعویٰ کے ساتھ دلیل دیتا ہے۔ شروع میں ہی لَا رَيْبَ فِيْهِ کہہ کر یہ بات ثابت کر دی ہے یہ وہ کتاب ہے جس میں کوئی شک نہیں اور دعویٰ بغیر دلیل نہیں کرتی۔ اگر کسی چیز کا دعویٰ کرتی ہے تو ساتھ دلائل دیتی ہے۔ جب یہ دعویٰ کیا کہ اس میں کوئی شک نہیں تو ساتھ ہی اس کی یہ دلیل دی۔ اِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا (البقرہ ۲:۲۴) ''اور اگر تمہیں شک ہو اس بات پر کہ جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کی ہے تو اس جیسی کوئی سورت بنا لاؤ اور اپنے گواہوں کو بلاؤ سوائے اللہ کے اگر تم سچے ہو۔ پس اگر تم نے اس کی مثل پیش نہ کی اور یاد رکھو کہ ہرگز کبھی نہ کر سکو گے۔

نویں دلیل: عدم اختلاف

قرآن مجید سے پہلے کا جتنا بھی مذہبی ادب ہے۔ وہ اختلاف سے پاک نہیں۔ صرف قرآن مجید ہی ایک ایسی کتاب ہے جو اختلاف سے پاک ہے۔ اختلاف سے پاک کلام وہی ہو سکتا ہے۔ جو ایک علیم وخبیر ہستی کی طرف سے نازل ہوا۔ ارشاد الٰہی ہے: اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا (نساء ۴:۸۲) ''پھر کیا وہ قرآن میں غور وفکر نہیں کرتے۔ اگر یہ

غیر اللہ کی طرف سے ہوتا تو اس میں ضرور اختلاف کرے۔"

قرآن مجید سے قوانین اخذ کرنے کے شرائط

ا۔ قرآنی علوم کی گہرائی اور گیرائی سے کما حقہ علم واقفیت اور عبور تامہ

قرآن مجید میں دو اقسام کی آیات ہیں محکمات اور متشابہات ارشاد الٰہی ہے: هُوَ الَّذِیْ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتَابَ مِنْهُ مُحْکَمَاتٌ هُنَّ اُمُّ الْکِتَابِ وَاُخَرُ مُتَشَابِهَاتٌ (آل عمران ۳:۶) خدا وہ ذات ہے جس نے تجھ پر کتاب نازل کی۔ اس میں کچھ آیات محکم ہیں جو کتاب کی اصل ہیں اور کچھ متشابہات ہیں۔

محکم آیات وہ ہیں جن میں لفظ اور معنی کی حیثیت سے کوئی شبہ وارد نہ ہو۔ (امام راغب) قرآن کی متشابہ آیات وہ ہیں ''جن کی تفسیر بوجہ اس کی غیر کے ساتھ مشابہت کے مشکل ہو۔ خواہ مشابہت لفظ کی حیثیت سے ہو یا معنی کی حیثیت سے (امام راغبؒ) مزید براں قرآن مجید کے اندر عقائد ایمانیات، اخلاق معاشرت، سیاست، اقتصاد، موعظت، قصص، امثال، سب ملے جلے مضامین ہیں۔ ان مختلف قسم کے مضامین کے اندر ان امور کو نکالنا، چھانٹنا جو قانونی قدر و جہت رکھتے ہیں۔ بہت مشکل امر ہے قرآن مجید کا ایک ایک لفظ اپنے اندر معانی اور معارف کا سمندر لیے ہوئے ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید سے وہی شخص قانون اخذ کر سکتا ہے جو قرآنی علوم و معارف کی گہرائی و گیرائی سے کما حقہ واقف ہو اور قانون اخذ کرنے کا ملکہ رکھتا ہو۔

۲۔ قرآنی زبان (عربی) پر کامل دسترس

قرآن مجید سے قانون کے اخذ کے لیے صرف قرآن مجید کا ترجمہ سمجھ لینا ہی کافی نہیں بلکہ جب تک انسان قرآن مجید کی زبان عربی پر کامل دسترس حاصل نہیں اس وقت تک قرآنی متن سے قانون کا استنباط نہیں ایک تو اس دور کی عربی میں نثر اور نظم پر عبور ہونا چاہیے۔ بعض اوقات قرآن مجید کے اسرار اور رموز کی طرف صرف ونحو راہنمائی کرتی ہے وہاں عجیب وغریب نکات نکل آتے ہیں۔ اس لیے عربی زبان کے ساتھ ساتھ فنی علوم یعنی صرف نحو اور علم معانی وغیرہ کا جاننا ضروری ہے۔

حضرت امام شافعی کا قول ہے کہ جب تک کسی آدمی میں کسی عربی عبارت کو عربی کے ہی انداز فہم اور تعبیر کے مطابق سمجھنے کی صلاحیت نہ ہو گی وہ قرآن مجید کے رسیلے اسلوب بیان اور اس کے مخصوص انداز تعبیر سے واقف نہیں ہو سکے گا۔

۳۔ تدبر اور غور وخوض

فقیہی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قرآن مجید، تدبر اور غور وخوض کرتا رہے۔ غور وخوض سے ہی

نئے معارف سامنے آتے ہیں۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ( ) جو ہمارے راستہ میں کوشش کرتے ہیں ہم ان کو راہ راست پر چلا کر منزل مقصود تک پہنچا دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں اسی وجہ سے فہم تدبر پر زور دیا گیا ہے: ارشاد الٰہی اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ کیا قرآن پر تدبر نہیں کرے۔

۴۔ سابقہ شرائع کی واقفیت

فقیہی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ ابراہیمیؑ موسویؑ عیسوی شرائع سے واقف ہو۔ ان چیزوں سے ایک حد تک باخبر ہونا اس لیے ضروری ہے کہ قرآن مجید ان میں سے بعض کی تصدیق کرتا ہے بعض کی تردید بعض کو نظر انداز کرنے کی ہدایت کرتا ہے۔ اگر کوئی فقیہی سابق شرائع سے واقفیت نہیں رکھتا تو وہ قرآن مجید کے احکام کی تہ تک نہیں پہنچ سکے گا کیونکہ قرآن مجید نے سابقہ شرائع کے بعض فقہی احکام کو برقرار رکھا ہے اور بعض کو منسوخ کر دیا ہے۔

۵۔ سابقہ فقہاء کے لٹریچر سے واقفیت

ایک فقیہی کے لیے یہ سب ضروری ہے کہ وہ سابقہ فقہاء کے فتاوی اور آرا سے واقف ہو۔ اگر کوئی فقیہی گزرے ہوئے فقہاء کی آراء سے واقفیت نہیں رکھتا تو وہ قرآن مجید سے کوئی فقہی مسئلہ استنباط نہیں کرسکتا۔

۶۔ سنت اور حدیث پر عبور

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر قرآن نازل ہوا۔ آپ نے اپنے قول اور فعل کے ذریعہ اس کی تشریح فرمادی وہ وضاحت سنت اور حدیث کے ذریعہ ہم تک پہنچی ہے اس وجہ سے سنت اور حدیث کو نظر انداز کر کے قرآن مجید سے کوئی قانون اخذ نہیں کرسکتا۔

صحابہ کے دور کے بعد تابعین کا دور آیا تو تابعی فقہاء نے بھی قانون سازی کے لیے سنت اور حدیث کو اپنا ماخذ بنایا بعدازاں تبع تابعین نے بھی۔ الغرض اب تک تمام فقہاء نے سنت اور حدیث کو قانون سازی کا ماخذ بنایا اور قرار دیا۔ لہٰذا قانون سازی کے لیے حدیث پر گہری نظر ہونی چاہیے۔ صرف متن حدیث پر ہی نہیں بلکہ علوم حدیث پر بھی۔

۷۔ اقوال صحابہ کا جاننا

فہم قرآن کے لیے صحابہ کرام کے اقوال نہایت ہی قیمتی سرمایہ ہیں۔ صحابہ کرام نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بالمشافہ علم حاصل کیا پھر بعض صحابی قرآن مجید سے مسائل اخذ کرنے میں مشہور تھے اور وہی لوگ لوگوں کا مرجع خاص بنے ہوئے تھے۔

۸۔ زمانہ کے تقاضوں سے آگاہی

ہر دور کے تقاضے وقت کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں۔ وقت گزرتا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آگے بھی بڑھتا ہے اور نئے نئے مسائل لاتا ہے۔ اس طرح معاشرہ میں نئے نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ معاشرہ کے ان ابھرتے ہوئے مسائل کا جاننا فقیہی کے لیے بحث ضروری ہے۔ ہمارا یہ دور جس میں ہم گزر رہے۔ تمام دنیا ایک گاؤں شکل اختیار کر گئی ہے اور نئے مسائل پیدا ہو گئے ہیں۔ اب اسلامی معاشرہ میں اسلامی قانون بناتے وقت بین الاقوامی معاشرہ کی اہمیت کو سامنے رکھنا پڑے گا۔ میں یہ بھی عرض کروں۔ قرآن مجید ان تمام ضرورتوں کو پورا کرتا ہے اسی وجہ سے قرآن کو تِبۡیَانًا لِکُلِّ شَیۡءٍ قرار دیا ہے۔

۹۔ اسلامی معاشرہ کی تدریجی ترقی اور تدریجی قانون سازی کا علم

اسلامی معاشرہ نے تدریجی ترقی کی ہے۔ اس ترقی کے پیش نظر فقہاء نے قانون سازی کی گویا معاشرہ تدریجی ترقی کر رہا ہے تو فقہاء بھی قانون سازی میں تدریجی تبدیلیاں لا رہے ہیں گویا ان کی قانون سازی میں تدریجی ترقی ہو رہی ہے۔ ہر دور کے فقیہی اور قانون ساز کو سابقہ ادوار کی تدریجی ترقی اور قانون سازی میں تدریجی ارتقاء سے بکلی واقفیت ضروری ہے تاکہ اس کو یہ سمجھ سکے کہ ایک فقیہی کس طرح حالات کے پیش نظر قانون سازی میں تبدیلی کرتا ہے اور قرآنی روح بھی برقرار رہتی ہے۔

۱۰۔ متقی اور صالح ہونا

قانون ساز اور مجتہد کے لیے صالح ہونا ضروری ہے۔ اس کا قدم تقوی کی باریک راہوں سے کبھی نہ ہٹے کیونکہ عوام اس شخص پر علمی اعتماد کرتے ہیں جو متقی اور صالح ہوتا ہے اور اس کی بات کو ماننے کو تیار نہیں ہوتے جو بداعتقاد اور بدچلن ہوتے ہیں کیونکہ بدچلن نور بصیرت سے محروم ہوتا ہے اس وجہ سے وہ شریعت کی باریکیوں سے واقف ہی نہیں سکتا۔

دوسرا ماخذ سنت

سنت کے لغوی معنی

شریعت اسلامی کا دوسرا ماخذ سنت اور حدیث ہے۔ سنت کے معنی لغت میں طریقہ قاعدہ یا کسی کام کا ڈھب یا زندگی کا اسلوب ہے۔ قرآن مجید اور کتب حدیث میں بھی یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ مثلاً قرآن میں سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ کے الفاظ آئے ہیں۔ جن کے معنی ہیں لوگوں کا طریقہ اور اسلوب زندگی۔

ایک اور جگہ قرآن مجید میں لفظ سنن (جمع سنت) استعمال ہوا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُبَیِّنَ لَکُمْ وَیَھْدِیَکُمْ سُنَنَ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (النساء ۴:۲۶) "اللہ چاہتا ہے کہ تمھارے لیے کھول کر بیان کر دے اور تم کو ان کی راہیں دکھائے جو تم سے پہلے تھے۔ حدیث میں بھی لفظ سنت' طریقہ' قاعدہ زندگی کے اسلوب کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ حدیث میں آتا ہے۔ تم اگلوں کی سنت کے قدم بقدم پیروی کرو گے۔" اس حدیث میں سنت بمعنی طریقہ یا قاعدہ استعمال ہوا ہے۔

اصطلاحی معنی

لیکن اصطلاحی معنوں میں سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے افعال اور اعمال پر بولا جاتا ہے۔ جو ہم تک تواتر کے ساتھ پہنچے ہیں۔

حدیث

حدیث کے معنی ہیں قول یا بات۔ لیکن اصطلاحی معنی ہیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال۔

سنت یا حدیث کی اقسام

سنت یا حدیث کی تین اقسام ہیں۔ یا تو قول ہو سکتا ہے جو آپ نے کسی مسئلہ کے متعلق فرمایا ہو یا فعل یعنی آپ نے کوئی کام یا عمل کیا ہو یا تقریر یعنی کسی دوسرے شخص نے آپ کو سامنے کوئی کام کیا ہو اور آپ نے سکوت اختیار کیا ہو۔ یہ سکوت آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رضا مندی اور پسندیدگی پر دلالت کرتا ہو۔

حجیّت سنت

سنت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اعمال اور افعال کا نام ہے۔ جس کی اطاعت اور اتباع لازمی اور جزو ایمان ہے اور اتباع رسول میں ہی مسلمانوں کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ جب تک مسلمان اتباع رسول کو لازم نہیں پکڑتے۔ ترقی کا راستہ پر گامزن نہیں ہو سکتے۔

پہلی دلیل

قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ وَیَغْفِرْلَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (آل عمران ۳:۳۱) "کہو اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو میری پیروی کرو۔ اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھارے لیے تمھارے گناہوں کو معاف کر دے گا اور اللہ بخشنے والا اور رحم کرنے والا ہے۔"

دوسری دلیل

قُلْ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ (آل عمران ۳:۳۲)

"کہو اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرو۔ پھر اگر وہ پھر جائیں تو اللہ انکار کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔"

تیسری دلیل

وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ (آل عمران ۳:۱۳۲) "اور اللہ اور رسول کی اطاعت کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔"

چوتھی دلیل

اَلَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ مِنْ بَعْدِ مَآ اَصَابَهُمُ الْقَرْحُ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا اَجْرٌ عَظِيْمٌ (آل عمران ۳:۱۷۲) "وہ جنھوں نے اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کی۔ اس کے بعد جو انھوں نے زخم کھایا۔ جنھوں نے ان میں سے احسان کیا اور تقویٰ کیا۔ ان کے لیے بڑا اجر ہے۔"

پانچویں دلیل

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ذٰلِكَ خَيْرٌ وَّ اَحْسَنُ تَاْوِيْلًا (النساء ۴:۵۹) "اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اور اپنے میں سے صاحب امر لوگوں کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ اگر تم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو۔ یہ بہتر اور انجام کار اچھا ہے۔

چھٹی دلیل

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (النساء ۴:۸۰) "جو شخص رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرتا ہے۔ وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔"

ساتویں دلیل

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ رَاَيْتَ الْمُنٰفِقِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْكَ صُدُوْدًا (النساء ۴:۶۱) "اور جب ان کو کہا جاتا ہے کہ اس کی طرف آؤ جو اللہ نے اتارا اور رسول کی طرف آؤ تو منافقوں کو دیکھے گا کہ وہ تجھ سے (کیسا) ہٹتے ہوئے رکتے ہیں۔

آٹھویں دلیل

وَرَحْمَتِي وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ فَسَأَكْتُبُهَا لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ وَيُؤْتُونَ الزَّكٰوةَ وَالَّذِينَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُونَ الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الخ (الاعراف ۷:۱۵۷، ۱۵۸) "اور میری رحمت سب چیزوں پر حاوی ہے۔ میں اس کو ان لوگوں کے لیے لکھوں گا جو پرہیز گاری کرتے اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور جو ہماری آیتوں پر ایمان لاتے ہیں۔ وہ لوگ جو میرے رسول نبی امی کی پیروی کرتے ہیں۔"

نویں دلیل

تِلْكَ حُدُودُ اللّٰهِ وَمَنْ يُطِعِ اللّٰهَ وَرَسُولَهُ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ "یہ اللہ کی حدیں ہیں، اور جو حکم مانے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اللہ اسے ایسا باغات میں داخل کرے گا۔ جن کے نیچے نہریں چلتی ہیں اور یہی بڑی کامیابی ہے۔

دسویں دلیل

لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِي رَسُولِ اللّٰهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (الاحزاب ۳۳:۲۱) "بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں تمہارے لیے پیروی کا بہترین نمونہ ہے۔" قرآن مجید میں اطاعت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے متعلق بے شمار آیات ہیں۔ صرف دس پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

حجیت سنت (از روئے حدیث)

۱۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کتاب اور سنت کو ایک حکم میں رکھ کر امت مسلمہ کو ان پر چلنے کا حکم دیتا ہے۔ فرمایا: إِنِّي تَرَكْتُ فِيكُمْ أَمْرَيْنِ إِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهِ لَنْ تَضِلُّوا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِي. "یعنی میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں۔ جب تک تم انہیں تھامے رہو گے۔ گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے۔ اس حدیث میں سنت سے مراد اتباع رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہے یعنی جو تعلیم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہے۔ اس کی پیروی کی جائے۔

۲۔ جس نے میری سنت سے محبت کی۔ اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے مجھ سے کی وہ جنت میں میرے ہمراہ ہوگا۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

۳۔ آپ کا ارشاد ہے۔ "میری سب امت جنت میں داخل ہو گی سوائے اس کے جو انکار کرے۔ حاضرین نے عرض کیا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کون انکار کرنے والا

ہے۔ فرمایا جس نے میری اطاعت کی۔ وہ جنت میں داخل ہو گا۔ جس نے نافرمانی کی اس نے انکار کیا۔ (بخاری)

صحابہؓ کا عمل

صحابہ کرامؓ کے عمل سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دین کا ایک ضروری اور اہم جزو سمجھتے تھے۔ ترمذی' ابو داؤد' دارمی' بیہقی اور ابن سعد' ابن عبدالبر نے روایت کی ہے کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو ان سے دریافت کیا کہ اگر تمھارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو تو کیسے فیصلہ کرو گے؟ انھوں نے جواب دیا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ پوچھا اگر کتاب اللہ میں اس کا ذکر نہ ہو تو؟ انھوں نے جواب دیا۔ "پھر میں سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ اگر سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نہ پاؤ تو؟ انھوں نے جواب دیا تو پھر میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے دست مبارک سے ان کا سینہ ٹھونکا' اور فرمایا: "حمد ہے اس خدا کے لیے جس نے اللہ کے رسول کے فرستادہ کی رائے کو اللہ کے رسول کی مرضی سے موافق کر دیا۔"

اس طرح صلح حدیبیہ کے موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کو سر منڈوانے اور احرام کھول دینے کا حکم دیا مگر انھوں نے ذرا تامل کیا۔ آپ پر یہ چیز شاق گزری۔ آپ نے خود پہلے سر منڈوایا اور احرام کھولا' تب صحابہ کرامؓ نے فوراً آپ کی اتباع میں سر منڈوا دیے اور احرام کھول دیے۔

امام بخاریؒ نے حضرت عبداللہ بن عمر سے روایت کی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مرتبہ سونے کی انگوٹھی اتار کر پھینک دی اور آپ نے فرمایا کہ میں اسے کبھی نہیں پہنوں گا۔ صحابہؓ جن کے پاس سونے کی انگوٹھیاں تھیں سب نے اتار کر پھینک دیں۔

ابو داؤد ابن عبدالبر نے روایت کی ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود ایک دفعہ نماز جمعہ کے لیے مسجد کی طرف آ رہے تھے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خطبہ دے رہے تھے۔ ان کے کان میں آواز پڑی۔ "بیٹھ جاؤ" حضرت ابن مسعود اس وقت مسجد کے دروازے میں تھے۔ سنتے ہی بیٹھ گئے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب آپ کو بیٹھے ہوئے دیکھا تو فرمایا: "اے ابن مسعود آگے آ جاؤ۔"

حضرت عبداللہ بن مسعود اور ایک خاتون کا سبق آموز واقعہ ہے۔ ایک دفعہ حضرت عبداللہ کے پاس ایک عورت آئی اور کہا کہ مجھے خبر ملی ہے کہ تم فلاں فلاں باتیں کہتے ہو کہ گودنا لگانے والی اور جو بدن پر گودنا لگاتی ہو' ان پر لعنت کی گئی ہے حالانکہ میں نے قرآن کے دونوں لوحوں کے درمیان جو کچھ ہے سب پڑھا ہے۔ اس میں ایسی کوئی بات نہیں ملی جو تم کہتے ہو۔ آپ نے اس عورت سے کہا

کہ جاؤ اور قرآن مجید کو پھر سے بنظر عمیق پڑھو۔ وہ تعمیل حکم کے بعد دوبارہ حاضر ہوئی اور کہا' مجھے قرآن مجید سے وہ باتیں نہیں ملیں جو آپ سے مجھے پہنچتی ہیں۔ تب ابن مسعود نے اسے سمجھایا کہ کیا تم نے یہ نہیں پڑھا۔ وَمَا اٰتٰكُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَانَهٰكُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹:۷) ''جو کچھ تمہیں رسول دے اسے لے لو اور جس سے تمہیں روکے اس سے رک جاؤ۔'' اس عورت نے کہا ہاں! یہ تو پڑھا ہے۔ ابن مسعودؓ نے فرمایا: فَهُوَ ذَاكَ ''پس یہی وہ بات ہے۔''

حضرت ابوبکرؓ کے نزدیک حدیث اور سنت کی اہمیت

حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جب کوئی مسئلہ پیش ہوتا تو آپ سب سے پہلے کتاب اللہ میں اس کا حکم ڈھونڈتے۔ اگر وہاں سے نہ ملتا تو سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں اس کی نظیر ڈھونڈتے۔ آپ کو سنت رسول معلوم کرنے کے لیے لوگوں میں اعلان بھی کرانا پڑتا تاکہ اگر کسی کو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کوئی عمل یا فیصلہ اس مسئلہ کے متعلق یاد ہو تو بتائے۔ لوگ جمع ہوتے اور آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی احادیث بیان کرتے۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ فیصلے کرتے تھے اور اظہار تشکر کے طور پر یہ الفاظ فرماتے ''خدا کا شکر ہے کہ ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ہمارے نبی کی باتیں یاد رکھتے ہیں۔ علامہ ابن قیمؒ نے اعلام الموقعین جلد ۴ ص ۱۲۰ پر لکھا ہے۔ ابوبکر صدیقؓ کی زندگی میں نص کی خلاف ورزی کی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ آپ نے خلیفہ بننے کے بعد سب سے پہلے یہ اعلان کیا: اَطِيْعُوْنِيْ مَا اَطَعْتُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنْ عَصَيْتُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَلَا طَاعَةَ لِيْ عَلَيْكُمْ. ''میری اطاعت کرو۔ جب تک میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتا ہوں لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کروں تو میری اطاعت تم پر فرض نہیں ہے۔''

حضرت عمرؓ اور سنت رسول

حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے دوران قاضی شریح کو لکھا: ''اگر تم کوئی حکم کتاب اللہ میں پاؤ تو اس کے مطابق فیصلہ کرو اور اس کی موجودگی میں کسی دوسری چیز کی طرف توجہ نہ دو۔ اگر کوئی ایسی بات آجائے۔ جس کا حکم کتاب اللہ میں نہ ہو تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق حکم دو اور اگر معاملہ ایسا ہو کہ جس کا حکم نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنت رسول میں تو اس کا فیصلہ اسے قانون کے مطابق کرو جس پر اجماع ہو چکا ہے۔ (اعلام الموقعین مصنفہ حافظ ابن قیمؒ)

فرمایا آئندہ ایسے لوگ پیدا ہوں گے۔ جو قرآنی مشتبہات کے متعلق تم سے جھگڑیں گے ایسی صورت میں سنتوں کے ذریعہ ان پر حجت قائم کرنا۔ (کتاب المیزان للشعرانی) آپ نے فرمایا میں اس لیے گورنروں کو بھیجتا ہوں کہ وہ تمہارا دین اور نبی کی سنت سکھائیں۔

اہمیت سنت از روئے عمل فقہاء کرام

امت مسلمہ میں جتنے فقہاء گزرے ہیں ان سب نے اپنے فکر کی بنیاد قرآن سنت و حدیث پر رکھی ہے۔ کسی نے بھی سنت و حدیث سے ہٹ کر صرف قرآن کو ہی اپنا مرجع و ماویٰ نہیں سمجھا۔ سب نے قرآن کے ساتھ ساتھ حدیث و سنت کو اپنے فکر کے لیے ضروری ماخذ و مصدر قرار دیا ہے۔ تمام فقہاء کا یہ عمل اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ حدیث و سنت اسلام کی عمارت کا ایک مضبوط ترین ستون ہے۔

حضرت امام ابوحنیفہؒ فرماتے ہیں

اِیَّاکُمْ وَالْقَوْلَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ بِالرَّاءِ وَعَلَیْکُمْ بِاتِّبَاعِ السُّنَّۃِ فَمَنْ خَرَجَ مِنْھَا ضَلَّ

(قواعد الحدیث ص ۲۳) "اللہ کے دین کے معاملہ میں رائے اور قیاس سے بچو اور سنت کی پیروی کو اپنے اوپر لازم کرلو۔ جو سنت سے نکلا وہ گمراہ ہوا"

"اگر سنتیں نہ ہوتیں تو ہم سے کوئی بھی قرآن مجید کا فہم حاصل نہ کر سکتا۔" (کتاب المیزان)

امام مالک فرماتے ہیں

ہر شخص کی بات کو اختیار بھی کیا جا سکتا ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ سوائے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے قول کو بہرحال اپنانا ہی پڑے گا۔ "جس نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث کو رد کیا۔ وہ ہلاکت و تباہی کے کنارے پر پہنچ گیا۔" (کتاب المناقب ابن الجوزی ص ۱۸۲)

حضرت امام شافعی کا ارشاد ہے۔ "مسلمانوں کا اس بات پر اجماع ہے کہ جب کسی پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت واضح ہو جائے تو پھر اس کے لیے کسی قول کی وجہ سے اس کو چھوڑنا جائز نہیں۔ (اعلام الموقعین ج ۲)

سنت مجملات کی تشریح ہے

مشہور حدیث ہے: اِنِّیْ اُوْتِیْتُ الْکِتَابَ وَمِثْلَہٗ "یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے کتاب اور اس کی مثل دی گئی ہے کتاب سے مراد قرآن مجید اور مثل سے مراد وہ حدیث یا سنت ہے جو قرآن مجید کے مجملات۔ متشبہات کی توضیح و تشریح ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں نماز کا حکم ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کے اوقات طریق ادا اور آداب وغیرہ سکھائے اسی طرح حلال و حرام کی وضاحت سنت نبوی سے ہوئی ہے۔ مثلاً فتح خیبر کے موقع پر پالتو گدھے اور درندوں کے گوشت کے حرام ہونے کا اعلان کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وضاحت اور تشریح کے بغیر بعض اوقات احکام سمجھنے میں غلطیاں ہوسکتی ہیں اس کی بعض مثالیں صحابہ کرام میں ملتی ہیں۔ جب وضو کے لیے پانی نہ ملنے کی صورت میں تیمم کا حکم آیا تو ایک صحابی کو تیمم کے طریقہ کا علم نہیں تھا۔ وہ ایک دفعہ پانی نہ ملنے کی صورت میں مٹی میں جا کر لوٹیں لگانے لگا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر یہ واقعہ سنایا تو آپ نے اس صحابی کو تیمم کا طریقہ سکھایا۔

حضرت شاہ ولی اللہ کی خوبصورت توجیہہ

حضرت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ کے ساتویں مبحث باب ۵ میں اس پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ یہاں صرف اس بحث کا مغز بیان کر دیا جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے دو پہلو ہیں ایک طبعی اور دوسرا تشریعی طبعی پہلو کا تعلق اس وقت کے خصوصی ماحول سے تھا۔ اس کی اتباع واجب نہیں۔ تاہم رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کے پیش نظر کوئی مسلمان اس پہلو کی پیروی کرتا ہے تو اسے محبت کا اجر ضرور ملے گا۔ تشریعی پہلو کا تعلق تبلیغ رسالت سے ہے اس میں آپ کا اتباع واجب ہے۔ آپ نے خود اس میں تمیز فرمادی ہے آپ نے فرمایا: اِنِّیْ تَرَکْتُ فِیْکُمْ اَمْرَیْنِ اَنْ تَمَسَّکْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا کِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِیْ "یعنی میں نے تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں جب تک تم انہیں پکڑے رہو گے گمراہ نہیں ہو گے۔ وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہیں۔ آپ نے اس سنت کا ذکر کیا ہے۔ جس پر عمل کرنا واجب ہے۔" دیگر امور کے بارے میں فرمایا: اَنْتُمْ اَعْلَمُ بِاُمُوْرِ دُنْيَاكُمْ "یعنی تم اپنے دنیوی کاموں کو بہتر جانتے ہو۔"

قرآن مجید کے احکام کی تفصیل یا تشریح کرنے کے لحاظ سے دو اقسام ہیں۔

ایک وہ احکام جن کا ذکر اپنی تفصیلات و تشریحات سمیت خود قرآن مجید میں آ گیا ہے۔ وہ سنت کے محتاج نہیں اور سنت صرف ان کی تاکید و تائید کرتی ہے۔ جیسے قذف' لعان' روزے وغیرہ کا وجوب اور اس کے رمضان میں ہونے سے متعلق احکام۔ دوسرے وہ احکام جن کی تشریح سنت کرتی ہے۔ مثلاً اسلام کے دو بڑے اصول نماز اور زکوۃ ہیں اور یہ دونوں مکی اور مدنی وحی میں بار بار ملتے ہیں۔ اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ (نماز قائم کرو) قرآن کا حکم ہے مگر اس کی تفصیلات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائیں۔ اسی طرح اٰتُوا الزَّكٰوةَ (زکوۃ دو) قرآن کا حکم ہے جو بار بار قرآن مجید میں آتا ہے۔ مگر اس کی ادائیگی اور اس کے جمع کرنے کے قواعد و ضوابط رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مرتب فرمائے یہاں صرف دو مثالیں بیان کی جاتی ہیں۔ لیکن چونکہ اسلام انسانی کاروبار کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ سینکڑوں امور کی تفصیل حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے فعل یا اپنی زبان سے دینی پڑتی تھیں۔ لہٰذا قانون سازی کے لیے قرآن مجید کے ساتھ سنت کی

ضرورت ہوتی ہے۔

علامہ شاطبی کا بیان

علامہ شاطبی نے مذکورہ مفہوم کو درج ذیل انداز میں بیان کیا ہے۔ "سنت اپنے معنی و مفہوم کے لحاظ سے قرآن حکیم ہی کی طرف رجوع ہونے والی ہے۔ وہ (سنت) قرآن حکیم کے مجمل کی تفسیر ہے۔ یا مشکل کا بیان ہے اور یا مختصر کی تشریح ہے۔" (الموافقات للشاطبی ج ۴ المسالۃ الثالثۃ)

آپ کے اقوال و افعال کا ایک دوسرے کو پہنچانا رسول اللہ کی زندگی میں

آپ کے اقوال و افعال رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں ہی دوسروں تک پہنچانا ضروری ہو گیا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جو کچھ فرماتے اور جو کچھ کرتے خود اس کو دوسروں تک پہنچانے کی نصیحت فرماتے تھے۔ چنانچہ مدینہ کے ابتدائی ایام میں جب قبیلہ ربیعہ کا وفد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ کی آخری وصیت ان کو یہ تھی کہ "ان باتوں کو یاد رکھو اور ان کو بھی پہنچا دو۔ جن کو تم پیچھے چھوڑ آئے ہو۔" (المشکوٰۃ المصابیح)

ایک دوسرے موقع پر بھی آپ نے ایسی نصائح ارشاد فرمائی۔ فرمایا اپنے لوگوں کے پاس جاؤ اور ان کو ان باتوں کی تعلیم دو۔ (بخاری ۳:۲۵) ایک اور روایت سے ثابت ہے کہ حجۃ الوداع کے موقع پر مسلمان کو ایک دوسرے کی جان و مال و عزت کی حرمت کی نصیحت فرماتے ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا۔ "وہ جو یہاں موجود ہے اس کو جو یہاں موجود نہیں ہے۔ پہنچا دے۔" (بخاری ۳:۲۷) پھر اس امر کے متعلق تاریخی شہادت موجود ہے کہ جب کوئی گروہ اسلام قبول کرتا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کے پاس ایک یا ایک سے زیادہ مبلغ بھیجتے جو ان کو صرف قرآن مجید کی ہی تعلیم نہیں دیتے تھے بلکہ ان کو بتاتے تھے کہ احکام قرآنی کی کس طرح سے عملی طور پر اتباع کرنی چاہیے۔ یہ بات بھی تاریخی طور پر ثابت ہے کہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہوتے اور آپ سے درخواست کرتے کہ ان کے ہاں معلم بھیجے جائیں۔ جو ان کو کتاب و سنت کی تعلیم دیں اور آپ کے صحابہ خوب جانتے تھے کہ اگر قرآن مجید میں کسی امر کی تصریح نہ ہو تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت پر عمل پیرا ہونا چاہیے۔ روایت ہے کہ جب معاذ بن جبل کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن کا گورنر بنا کر بھیجا تو آپ نے ان سے دریافت کیا کہ معاملات کو کسی طرح نمٹایا جائے گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ کتاب اللہ سے پھر دریافت کیا اگر کتاب اللہ میں کوئی صراحت نہ ہو۔ تو پھر؟ انھوں نے جواب دیا۔ سنت رسول اللہ سے۔ (سنن ابی داؤد ۱۱:۲۳) مذکورہ بحث سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و

افعال آپ کی زندگی میں ہی دوسروں تک پہنچائے جاتے تھے۔ ان اقوال اور افعال پر آپ کی زندگی میں ہی عمل کیا جانے لگا تھا اور آپ کی سنت کو مذہبی امور میں مشعل ہدایت تسلیم کر لیا گیا تھا۔

اہل مغرب کا یہ عام خیال ہے کہ سنت کی ضرورت کا احساس رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی کے بعد پیدا ہوا۔ مذکورہ واقعات اس خیال کو غلط قرار دیتے ہیں۔

حدیث کا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں معرض تحریر میں آنا

جہاں صحابہ کرام رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال اور افعال پر عمل پیرا ہو جاتے تھے تو دوسری طرف ان کو اپنے حافظوں میں نیز کاغذ پر محفوظ کر لینے کا اہتمام کر لیتے تھے۔ حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ جب انصار میں سے ایک شخص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے شکایت کی کہ جو کچھ وہ حضور سے سنتا ہے اس کو یاد نہیں رکھ سکتا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اس کو اپنے دائیں ہاتھ کی مدد لینا چاہیے۔ (یعنی قلم کا استعمال کرنا چاہیے) (ترمذی ۳۹:۲)

دوسری مشہور روایت عبداللہ بن عمرو سے ہے کہ فرماتے ہیں کہ "میں جو کچھ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنتا تھا لکھ لیتا تھا تا کہ میں اس کو یاد رکھ سکوں۔ (کسی شخص نے اعتراض کیا) میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا ذکر کیا تو آپ نے ارشاد فرمایا "لکھ لیا کرو" کیونکہ میں جو کچھ کہتا ہوں۔ حق ہے۔ (سنن ابو داؤد) اس کے علاوہ حضرت ابو ہریرہ کی ایک اور روایت ہے۔ "مجھ سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث کو کوئی محفوظ نہیں رکھتا تھا۔ سوائے عبداللہ بن عمرو کے کیونکہ وہ لکھ لیا کرتا تھا اور میں نہیں لکھتا تھا۔ (بخاری ۳۹:۳) انس ابن مالک کا بیان ہے کہ حضرت ابوبکر نے ان کے لیے صدقات کے قوانین تحریر کیے۔ (بخاری ۲۴:۳) حضرت علیؓ کے پاس ایک قول رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تحریر کردہ موجود تھا۔ (بخاری ۳۹:۳) فتح مکہ کے وقت آپ نے خطبہ پڑھا جب خطبہ ختم ہوا۔ تو یمن کے لوگوں میں سے ایک شخص آگے بڑھا اور اس نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے درخواست کی کہ یہ خطبہ اس کے لیے لکھوا دیا جائے۔ اس پر حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسا کرنے کا حکم دیا۔ (بخاری ۳۹:۳)

ان روایات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے۔ ایک طرف جب کہ احادیث کو یاد رکھا جاتا تھا۔ تو دوسری طرف موقع بہ موقع حسب ضرورت ان کو لکھ بھی لیا جاتا تھا۔

حدیث عموماً عہد رسول میں کیوں لکھی نہ جاتی تھی

امر واقعہ یہ ہے کہ عموماً حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں اقوال لکھے نہیں جاتے تھے۔ حافظہ ہی ان کے تحفظ کا بڑا ذریعہ تھا۔ بعض اوقات حضور نے منع بھی فرمایا۔ حضرت ابو

ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے جبکہ ہم حدیث لکھ رہے تھے۔ آپ نے پوچھا کیا ہے جو تم لکھ رہے ہو۔ ہم نے عرض کیا کہ حدیث جو ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنتے ہیں۔ آپ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) نے فرمایا ''کیا خدا کی کتاب کے علاوہ کوئی اور کتاب؟ اب اس خاص واقعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حدیث کے لکھنے پر اظہار ناراضگی اور ناپسندیدگی فرمایا ہے۔ اس کی وجہ یہ خوف تھا کہ کہیں حدیث قرآن سے خلط ملط نہ ہو جائے۔ ورنہ حدیث کے لکھنے میں کچھ مضائقہ یا غلطی نہ تھی۔ فتح مکہ کے وقت ایک شخص کی درخواست پر آپ خود حدیث لکھ دینے کا حکم دیتے ہیں۔''

آپ نے خطوط بھی تحریر فرمائے۔ معاہدات بھی معرض وجود میں لائے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا کبھی یہ مقصد نہ تھا کہ قرآن مجید کے علاوہ کسی چیز کا لکھنا ناجائز تھا۔ جیسا کہ روایت بالا سے بظاہر معلوم ہوتا ہے۔ جس بات کی آپ کو فکر تھی وہ یہ تھی کہ اگر احادیث کو بھی قرآن مجید کی طرح لکھا گیا۔ تو دونوں آپس میں خلط ملط ہو جائیں گے اور اس سے قرآن مجید کے متن کی صحت میں خرابی آنے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ جب صحابہ میں قرآن مجید اور اقوال رسول میں تمیز کرنے کا ملکہ پختہ ہو گیا اور آپ نے سمجھ لیا کہ آپ حدیث اور قرآن میں تخلیط نہ ہو گی تو آپ نے لکھنے کی اجازت دے دی جیسا کہ احادیث سے واضح ہے۔

علم کو محفوظ رکھنے کے لیے حافظے پر اعتماد کیا جا سکتا ہے

سنت اور حدیث کو محفوظ رکھنے کے لیے حافظہ پر اعتماد کیا جا سکتا ہے۔ صحابہ نے قرآن مجید کو حفظ یاد کیا۔ پھر اسی حافظہ کی مدد سے بھی قرآن مجید کو احاطہ تحریر میں لانے میں مدد ملی۔ عربوں کا حافظہ حیرت انگیز طور پر مضبوط تھا۔ وہ لاتعداد چیزوں کا علم اپنے حافظوں میں رکھ سکتے تھے۔ یہ ان کا حافظہ ہی تھا۔ جس میں قبل اسلام کے دلکش نظمیں بغیر کسی تغیر کے زندہ اور محفوظ چلی آتی تھیں۔ اسلام سے قبل تحریر کا رواج بہت شاذ تھا اور تمام ضروری امور سے متعلق حافظے پر ہی اعتماد کیا جاتا ہے۔ ایک شخص سینکڑوں نہیں ہزاروں اشعار اپنے حافظے سے پڑھ سکتا تھا۔ ان اشعار کے پڑھنے والے ان اشخاص کے نام بھی یاد رکھتے تھے۔ جن کے ذریعے وہ اشعار ان تک پہنچے۔ اصمعی جو بعد کے زمانہ کے راوی ہیں کہتے ہیں کہ بلوغت سے پیشتر انھوں نے بارہ ہزار اشعار زبانی یاد کر لیے تھے۔ ابو ضمضم کے متعلق اصمعی کہتا ہے۔ ایک ہی نشست میں وہ ایک سو شاعر کے اشعار پڑھ دیتا تھا۔ شعبی اپنے متعلق کہتا ہے کہ اس کو اس قدر اشعار زبانی یاد تھے کہ ان کو لگاتار ایک مہینے تک پڑھ سکتا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحابہ میں سے کئی ایک ایسے تھے جن کو قبل اسلام نظموں کے ہزاروں اشعار نوک زبان تھے۔

غرض کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال کو یاد کر کے دوسروں تک پہنچانے میں کوئی ایسی انہونی بات نہیں جس پر اعتراض کیا جا سکے۔ علم کو محفوظ رکھنے کے لیے حافظے پر اعتماد کیا جاتا رہا ہے اور وہی حافظ علم سنت اور حدیث کو محفوظ رکھنے میں ممد و معاون ثابت ہوا ہے۔ پھر یہ بھی امر واقع ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد یہ علم تحریراً اور قولاً دوسروں تک پہنچنا شروع ہو گیا۔ بڑے بڑے صحابہ کے گھر اس علم کی اشاعت کے لیے درس گاہیں بن گئے۔

حدیث کا مقام

حدیث اور سنت قرآن کو منسوخ نہیں کرتی جو لوگ اس بات کے قائل ہیں کہ حدیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہے۔ وہ غلطی پر ہیں۔ صحیح رائے یہی ہے حضرت امام احمد بن حنبلؒ کا ارشاد فضل بن زیاد کے حوالے سے ملاحظہ فرمائیں۔

> قال سمعت احمد بن حنبل و سئل عن الحدیث الذی روی ان السنة قاضیة علی الکتاب قال: ما اجسر علی هذا ان اقول ولکن السنة تفسر الکتاب و تعرف الکتاب تبینه۔[1]
>
> وہ کہتے ہیں کہ میں احمد بن حنبل سے سنا اور ان سے سوال کیا گیا تھا اس قول (حدیث) کے بارے میں جس کی روایت ہوئی کہ السنة قاضیة علی الکتاب (سنت کتاب اللہ کا حاکم ہے) تو انھوں نے فرمایا کہ بھئی یہ کہنے کی میں جسارت نہیں کر سکتا۔ سنت تو قرآن کی تفسیر کرتی ہے اس کی تعریف کرتی اور اس کی مجمل باتوں کی وضاحت کرتی ہے۔

سنت کے ماخذ قانون ہونے پر چند اعتراضات اور جوابات

سنت کے ماخذ قانون ہونے پر معترضین نے کئی ایک اعتراضات کیے ہیں۔ اوّل۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی حیات مبارکہ میں حدیث کی کتابت سے منع فرمایا۔ آپ کی وفات کے لمبے عرصہ بعد کتب حدیث کی اشاعت ہوئی۔ دوم۔ حدیث وضع کرنے کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا تھا۔ جس نے بے شمار جھوٹی احادیث معاشرہ میں پھیلا رکھی تھیں۔ اگر ان اعتراضات پر علمی اور منطقی لحاظ سے نظر دوڑائی جائے تو ان کا بودا پن قاری پر ظاہر ہو جاتا ہے۔

---

1. کتاب الکفایة فی علم الروایة باب تخصیص السنن العموم محکم القرآن و ذکر الحاجة فی المجمل الی التفسیر والبیان۔

پہلا اعتراض

کتابت حدیث کی ممانعت

معترضین کا ایک اعتراض یہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاف صاف اعلان فرما دیا تھا کہ "مجھ سے سوائے قرآن کے کچھ نہ لکھو اور جو کسی نے کچھ لکھ لیا ہے تو اس کو مٹا دے۔" اسی طرح حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث بھی بیان کی جاتی ہے کہ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہمارے پاس تشریف لائے جبکہ ہم حدیث لکھ رہے تھے۔ آپ نے پوچھا یہ کیا ہے جو تم لکھ رہے ہو ہم نے عرض کیا کہ حدیث جو ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنتے ہیں۔ آپ نے فرمایا "کیا خدا کی کتاب کے علاوہ کوئی اور کتاب؟"

جواب: ممانعت مطلق نہیں تھی

مذکورہ احادیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو حدیث کے لکھنے پر ناپسندیدگی کا اظہار فرمایا ہے اس کی وجہ یہ خوف تھا کہ کہیں قرآن سے خلط ملط نہ ہو جائے۔ ورنہ حدیث کے لکھنے میں کچھ مضائقہ نہیں۔ یا غلطی نہ تھی۔ آپ نے ایک خاص پس منظر میں حدیث کے لکھنے کی ممانعت فرمائی۔ یہ مطلق حکم نہیں تھا۔ اگر مطلق ممانعت کا حکم ہوتا تو پھر آپ کبھی بھی کسی کو لکھنے کی اجازت نہ دیتے۔ احادیث سے یہ واضح ہے کہ آپ نے بعض صحابہ کو لکھنے کی اجازت دی۔ ایک انصاری صحابی نے عرض کیا کہ "آپ جو کچھ فرماتے ہیں مجھے اچھا معلوم ہوتا ہے۔ مگر یاد نہیں رہتا۔ آپ نے فرمایا اپنے داہنے ہاتھ سے کام لو۔ (یعنی لکھ لیا کرو۔)"

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ مجھ سے زیادہ احادیث کسی کو یاد تھیں۔ مگر حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص کے۔ کیونکہ وہ لکھا کرتے تھے اور میں لکھا نہیں کرتا تھا۔ ایک مرتبہ جب حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص نے کچھ حضرات کے کہنے پر حدیث کو لکھنا چھوڑ دیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا "جو کچھ سنا کرو، لکھ لیا کرو۔ اس منہ سے حق کے سوا اور کچھ نہیں نکلتا۔" محدثین میں ان کی مرتبہ کتاب حدیث "صحیفہ صادقہ" کے نام سے مشہور ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرو وہ بزرگ ہستی ہیں۔ جن کو عبرانی اور عربی دونوں میں لکھنے کا ملکہ تھا۔ جو قرآن اور حدیث کے علاوہ تورات اور صحف انبیاء پر بھی نظر رکھتے تھے۔ فتح مکہ کے وقت ایک شخص ابو شاہ کی درخواست پر آپ خود حدیث لکھ دینے کا حکم دیتے ہیں۔

لہٰذا آپ نے خطوط بھی تحریر فرمائے اور معاہدات بھی معرض تحریر میں لائے گئے۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کا کبھی یہ مقصد نہ تھا کہ قرآن مجید کے علاوہ کسی چیز کا لکھنا ناجائز ہے۔ جیسا کہ

روایت بالا سے ظاہر ہے جس بات کا آپ کو فکر تھا۔ وہ صرف یہ تھا کہ اگر احادیث کو بھی قرآن کی طرح لکھا گیا تو دونوں آپس میں خلط ملط ہو جائیں گی اور اس سے قرآن مجید کے متن کی صحت میں خرابی کا اندیشہ ہو سکتا تھا۔

صحابہ کا عمل

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا کتابت حدیث کے متعلق ممانعت کا حکم ہوتا تو صحابہ کرام کبھی بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث نہ لکھتے۔ کسی صحابی سے یہ توقع ہی نہیں کی جا سکتی کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک کام سے منع فرمایا ہو پھر وہ صحابہ وہی کام کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ حضرت ابوہریرہؓ خود اپنی یادداشت کے لیے اپنی روایت کردہ حدیثوں کو کتابی شکل میں لے آئے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے جامع میں ان کی اس کتاب کے واقعہ کو اس طرح درج کیا ہے کہ مشہور صحابی عمرو بن امیہ ضمیری کے صاحبزادہ حسن بیان کرتے ہیں ''میں نے ابوہریرہؓ کے سامنے ایک حدیث بیان کی۔ انھوں نے اس کا انکار کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اس حدیث کو میں نے آپ ہی سے سنا ہے۔ بولے اگر تم نے مجھ سے حدیث سنی ہے تو پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی پھر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرہ میں لے گئے۔ مجھے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثوں کی بہت سی کتابیں دکھائیں اسی (ذخیرہ) میں وہ حدیث بھی پائی گئی۔ حضرت ابوہریرہ نے اس کے بعد فرمایا میں نے تم سے کہا تھا کہ میں نے اگر کوئی حدیث تم سے بیان کی تھی تو وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہے۔'' حافظ ابن حجر نے بھی دوسری سند سے فتح الباری میں اسی روایت کو درج کیا ہے۔ اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ ابوہریرہؓ کے پاس صرف چند حدیثیں لکھی ہوئی تھیں بلکہ جو کچھ وہ روایت کرتے تھے کتابی شکل میں ان کے پاس موجود تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خادم خاص اور صحابہ میں معمر ترین بزرگ حضرت انسؓ بھی ہیں ان کی حدیثوں کی تعداد ایک ہزار دو سو چھیاسی ہے دارمی میں ان سے۔ یہ منقول ہے کہ اپنی اولاد سے جن کی ایک بڑی تعداد تھی فرمایا کرتے۔ ''یَابُنِیَّ قَیِّدُوْا ھٰذَا الْعِلْمَ'' ''میرے بچو اس علم حدیث کو قلم بند کرو'' اسی سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ان کی حدیثوں کا مجموعہ یقیناً لکھا جا چکا ہوگا صرف اسی قدر نہیں دارمی ہی میں منقول ہے کہ رَاَیْتُ اَبَانَ یَکْتُبُ عِنْدَ اَنَسٍ ''میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انسؓ کے پاس بیٹھے لکھ رہے ہیں۔''

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز مستدرک میں سعید بن ہلال کا بیان ہے۔ کُنَّا اِذَا اَکْثَرْنَا عَلٰی اَنَسِ بْنِ مَالِکٍ رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُ فَاَخْرَجَ اِلَیْنَا مِحَالًا عِنْدَہٗ فَقَالَ ھٰذِہٖ سَمِعْتُھَا مِنَ النَّبِیِّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَتَبْتُھَا وَعَرَضْتُھَا عَلَیْہِ (مستدرک حاکم) ''ہم جب حضرت انس سے

زیادہ پوچھ گچھ کرتے تو وہ اپنے پاس سے ایک چونگہ (صحیفہ) نکالتے اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے میں نے سنیں اور ان کو لکھا اور لکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش کر چکا ہوں۔"

اس حدیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زندگی میں ہی احادیث لکھ لیا کرتے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کتابت حدیث کے حکم ممانعت کو مطلق حکم ممانعت نہ سمجھتے تھے بلکہ خاص پس منظر میں اس حکم کو دیکھتے تھے۔ ۲۔ حضرت انس نے اپنی مکتوبہ احادیث کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تصدیق بھی کرالی تھی۔

حضرت جابر بن عبداللہ کا حلقہ درس مسجد نبوی میں تھا۔ صحیح مسلم میں ان کے متعلق یہ روایت درج ہے کہ حج کے متعلق انھوں نے ایک کتاب جمع کی تھی۔

صحابہ کرام کے عہد میں تدوین حدیث

تدوین و حفاظت حدیث کا یہ دور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات کے بعد ہوتا ہے۔ اس دور میں احادیث کی شہرت عام شروع ہو گئی۔ خلفاء نے کوئی فیصلہ کرنا ہوتا تو پہلے قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے اگر قرآن سے واضح حکم نہ ملتا تو حدیث کی طرف رجوع کرتے اس طرح حدیث عام شہرت پکڑ جاتی۔

قبیصہ کی روایت ہے کہ ایک فوت شدہ شخص کی دادی حضرت ابوبکرؓ کے پاس آئیں اور ترکہ سے حق کا دعویٰ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ اللہ کی کتاب سے اور نہ سنت رسول سے آپ کا حق ملتا ہے۔ لیکن جب دوسروں (صحابہ کرام) سے اس کے متعلق دریافت کیا تو مغیرہ نے گواہی دی کہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دادی کا چھٹا حصہ دیا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے ان سے ایک گواہ طلب کیا اس پر محمد بن مسلم نے مغیرہ کے بیان کی تصدیق کی اس بناء پر حضرت ابوبکرؓ نے دادی کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ (ترمذی ۹:۲۷ سنن ابی داوَد ۵:۱۸)

مسلمانوں کی بڑھتی ہوئی ضروریات کی وجہ سے اس قسم کے واقعات ہر روز ظہور پذیر ہوتے تھے۔ تو لازماً خلفاء کو یا صحابہ کرام کو حدیث نبوی کی طرف رجوع کرنا پڑتا تھا۔ جس سے حدیث ایک ہاتھ سے نکل کر عوام کا ورثہ بن جاتی۔

صحابہ کرام کا تدوین حدیث میں سعی عمل

صحابہ کرام نے خود بھی فرمان نبوی لِيُبَلِّغِ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ حضار غائب کو یہ اقوال پہنچا دے) کی وجہ سے حدیث کی عام اشاعت کی۔ صحابہ کے گھر حدیث کے لیے درس گاہیں بن گئے۔

حضرت ابو ہریرہؓ کے آٹھ ہزار شاگرد تھے۔ اسی طرح حضرت عائشہ‘ حضرت عبداللہ بن عباس‘ حضرت عبداللہ بن عمر‘ حضرت انسؓ بن مالک‘ حضرت زید بن ثابت‘ حضرت ابوسعید خدری اور حضرت جابر بن عبداللہ کے گھر حدیث کی درس گاہیں تھیں ان درس گاہوں کے علاوہ خلفاء راشدین نے احادیث کی اشاعت اور تعلیم کے لیے صحابہ کرام کو دوسرے ملکوں میں بھیجا۔

عہد صحابہ میں حدیث کے کتابی نسخے

۱۔ حضرت ابو ہریرہؓ کا کتابی نسخہ

محدثین لکھتے ہیں کہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیثوں اور مرویات کی تعداد پانچ ہزار تین سو چوہتر ہے۔ ایک ذریعہ سے نہیں مختلف ذرائع سے یہ بات ثابت ہے کہ حضرت ابو ہریرہؓ خود اپنی یادداشت کے لیے اپنی روایت کردہ حدیثوں کو کتابی شکل میں لے آتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے جامع میں ان کی اسی کتاب کے واقعہ کو اس طرح درج کیا ہے۔ مشہور صحابی عمرو بن امیہ ضمیری کے صاحبزادے حسن بیان کرتے ہیں۔ میں نے ابو ہریرہؓ کے سامنے ایک حدیث بیان کی۔ انھوں نے اس کا انکار کیا۔ میں نے عرض کیا کہ اس حدیث کو میں نے آپ سے ہی سنا ہے۔ اگر تم نے مجھ سے حدیث سنی ہے تو پھر وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہوگی پھر انھوں نے میرا ہاتھ پکڑا اور اپنے کمرہ میں لے گئے مجھے انھوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیثوں کی بہت سی کتابیں دکھائیں۔ اسی (ذخیرہ) میں وہ حدیث بھی پائی گئی۔ حضرت ابو ہریرہؓ نے اس کے بعد فرمایا میں نے تم سے کہا نہ تھا کہ میں نے اگر کوئی حدیث تم سے بیان کی تھی تو وہ میرے پاس لکھی ہوئی ہے۔

حافظ ابن حجر نے بھی دوسری سند سے فتح الباری میں اس روایت کو درج کیا ہے۔ اس سے صرف یہی نہیں معلوم ہوتا کہ ابو ہریرہؓ کے پاس صرف چند حدیثیں لکھی ہوئی تھیں بلکہ جو کچھ وہ روایت کرتے تھے کتابی شکل میں موجود تھا۔

جب یہ معلوم ہوا کہ ان مرویات کی تعداد پانچ ہزار سے اوپر ہے تو کیا یہ بات واضح نہ ہو گئی کہ تمام مرویات حضرت ابو ہریرہؓ کے پاس کتابی شکل میں موجود تھیں پھر اس کے شاگردوں نے اسی کتابی نسخہ سے مزید نسخے تیار کیے۔

۲۔ حضرت عبداللہ بن عمروؓ کا صحیفہ صادقہ

حضرت عبداللہ بن عمروؓ کی مرویات کی تعداد حضرت ابو ہریرہؓ سے بھی زیادہ تھی۔ جس کا اقرار واعتراف حضرت ابو ہریرہؓ نے خود ان الفاظ میں کیا۔ فرماتے ہیں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے

صحابیوں میں حضور کی حدیثوں کا بیان کرنے والا مجھ سے زیادہ کوئی نہیں البتہ عبداللہ بن عمرو بن العاص اس سے مستثنٰی ہیں (یعنی ان کی حدیثوں کی تعداد مجھ سے زیادہ ہے)

عبداللہ بن عمرو بن العاص کے متعلق تو سب کو علم ہے کہ وہ خود براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے آپ کی حدیثیں لکھا کرتے تھے۔ ان کا اپنا بیان ہے جس کا حافظ ابن عبدالبرؒ ابن سعد بلکہ ابو داؤد وغیرہ سب نے ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن عبدالبر کی روایت ہے کہ خود عبداللہ بن عمرو فرماتے ہیں۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا وہ سب کچھ جو آپ سے سنتا ہوں لکھ لیا کروں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہاں۔ میں نے عرض کیا کہ خوشی یا غصہ دونوں حالتوں کی باتوں کو لکھ سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کیونکہ میں ان سب حالات میں حق کے سوا کچھ نہیں بولتا۔

محدثین میں ان کی یہ کتاب ''صحیفہ صادقہ'' کے نام سے مشہور ہے اور اکثر کتابوں میں اس کا تذکرہ آتا ہے۔ اس سے یہ معلوم ہوتا ہو گیا کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم سے پانچ ہزار احادیث سے زیادہ تحریر میں لا چکے تھے۔

۳۔ حضرت انسؓ بن مالک کا تحریری نسخہ

ان کی حدیثوں کی تعداد ایک ہزار دو سو چھیاسی ہے دارمی میں ان سے یہ روایت منقول ہے کہ اپنی اولاد سے جن کی ایک بڑی تعداد تھی فرمایا کرتے یَابُنِیَّ قَیِّدُوْا ھٰذَا الْعِلْمَ میرے بچو اس علم حدیث کو قلم بند کر لیا کرو۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کی حدیثوں کا مجموعہ یقیناً لکھا جا چکا ہو گا۔ اسی وجہ سے اپنے بچوں کو کہتے ہیں کہ اس علم (حدیث) کو لکھ لیا کرو۔

دارمی کی یہ روایت بھی اس کی تائید کرتی ہے: رَاَیْتُ اَبَانَ یَکْتُبُ عِنْدَ اَنَسٍ میں نے ابان کو دیکھا کہ حضرت انسؓ کے پاس بیٹھے لکھ رہے تھے۔

مستدرک میں سعید بن ہلال کا بیان ہے۔ ''جب ہم حضرت انس سے زیادہ پوچھ گچھ کرتے تو وہ اپنے پاس سے ایک چونگہ نکالتے اور فرماتے یہ ہیں وہ حدیثیں جو آنحضرت سے میں نے سنیں اور ان کو لکھا اور لکھ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پیش کر چکا ہوں۔

حضرت انسؓ نے نہ صرف حدیثوں کو کتابی شکل دی بلکہ ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سامنے پیش کر کے صحت کی توثیق بھی کروائی۔

۴۔ صحیفہ جابر بن عبداللہ

حضرت جابر بن عبداللہ کی مرویات کی تعداد جیسا کہ ابن جوزی نے لکھا ہے ایک ہزار پانچ

بھی چھپ چکی ہے حضرت جابر کا مسجد نبوی میں درس کا حلقہ تھا۔ صحیح مسلم میں ان کی روایت درج ہے کہ حج کے متعلق انہوں نے ایک کتاب جمع کی اور ان کے شاگرد وہب بن منبہ ان کی حدیثوں کو قلمبند کیا کرتے تھے۔

۵۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا تحریری نسخہ

حضرت عبداللہ بن عباس کی مرویات کی تعداد دو ہزار چھ سو ساٹھ ہے۔ مشہور آزاد کردہ غلام عکرمہ سے امام ترمذی نے اپنی کتاب العلل میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابن عباس کے پاس طائف کے کچھ لوگ ان کی کتابوں کو لے کر حاضر ہوئے اور ان کے سامنے ان کی کتابیں پڑھنے لگے۔ حضرت عبداللہ بن عباس ابو رافع سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی احادیث لکھا کرتے تھے۔ بعض روایات میں ہے۔ ان کے ساتھ کاتب ہوتا تھا اور ابن عباس اس کاتب سے ابورافع کی احادیث تحریر کرواتے تھے۔

روایات سے یہ ثابت ہے کہ یہ تمام تحریریں حضرت عبداللہ بن عباس کے پاس صحیفوں کی شکل میں موجود تھیں۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں ہی ان کی حدیثوں کا مجموعہ قلمبند ہو چکا تھا۔ ابن سعد میں روایت بھی ہے کہ ابن عباس کی وفات کے بعد جو علم انھوں نے چھوڑا۔ وہ ایک بارشتر تھا۔ یہ کوئی وجہ نہیں اس شتر باز (اونٹ پر لادا جانے والا وزن) میں حدیث کا تحریری مجموعہ نہ ہو۔

۶۔ عبداللہ بن عمر

ان کی حدیثوں کی تعداد ایک ہزار چھ سو تیں ہے۔ ان کے شاگرد خاص نافع کے متعلق دارمی میں یہ روایت ہے بلکہ طبقات ابن سعد میں بھی یہ روایت موجود ہے کہ سلیمان بن موسیٰ کا بیان کہ انھوں نے "ابن عمر کے مولیٰ نافع کو دیکھا کہ لوگ ان کے ساتھ بیٹھ کر لکھ رہے ہیں۔"

گویا ابن عمر کا علم خود ان کے براہ راست شاگرد کے ذریعہ یقیناً قلمبند ہو چکا تھا۔

۷۔ اوائل بن حجر کا تحریری نسخہ

اوائل بن حجر حضرت موت کے شہزادوں میں سے تھے۔ مدینہ آ کر مسلمان ہوئے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک صحیفہ لکھوا کر ان کے حوالے کیا۔ جس میں نماز، روزہ، شراب وسود وغیرہ کے احکام تھے۔

۸۔ سمرہ بن جبیر

ابن حجر نے تہذیب میں سمرہ بن جبیر مشہور صحابی کے بیٹے سلیمان بن سمرہ کے متعلق لکھا ہے

کہ رَوٰی عَنْ اَبِیْہِ نُسْخَۃً کَبِیْرَۃً (تہذیب جلد ۴ ص ۱۹۸) اپنے والد سے وہ ایک بڑا نسخہ روایت کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت سمرہ کی حدیثیں بھی جمع ہو چکی تھیں۔

۹۔ سعد بن عبادہ کا صحیفہ

ترمذی نے کتاب الاحکام میں لکھا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ کے پاس ایک صحیفہ تھا۔ جس کے حوالے سے ان کے صاحبزادے بعض روایتیں بیان کیا کرتے تھے۔

۱۰۔ حضرت علی کا نسخہ

بخاری ترمذی اور صحاح کی دوسری کتابوں میں حضرت علی کے ایک صحیفہ کا ذکر کیا جاتا ہے۔ جسے وہ اپنی تلوار کی نیام میں رکھا کرتے تھے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ اس صحیفہ میں شریعت کے بعض اہم مسائل تھے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ سے بیان کیے تھے۔

جب حدیث کے کتابی ذخیروں کا اتنا سرمایہ عہد صحابہ میں جمع ہو چکا تھا اور حدیث کی عام کتابوں میں ذکر موجود ہے۔ لہٰذا یہ ثابت ہوتا ہے کہ عہد صحابہ میں حدیث کی تدوین کا سلسلہ کافی آگے بڑھ چکا تھا۔ یہی سلسلہ تابعین میں منتقل ہوا۔

مکتوبات صحابہ

عہد صحابہ میں بعض صحابہ کے مکتوبات کتب حدیث میں درج ہیں جو تدوین حدیث میں ممد ہیں کیونکہ وہ ان احکام کے حامل ہیں۔ جو شریعت سے تعلق رکھتے ہیں اور وہ احکام رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے تھے۔

مکتوب حضرت عمرؓ

حضرت عمر بن خطابؓ کے ایک خط کا جس میں صدقہ کے احکام درج تھے۔ لیث بن سعد نے نافع مولیٰ ابن عمر کے توسط سے مطالعہ کیا نافع کہتے ہیں کہ انھوں نے کئی مرتبہ یہ خط عبداللہ بن عمر کے سامنے پیش کیا (کتاب الاموال)

امام مالک اپنی موطا میں رقم طراز ہیں کہ انھوں نے صدقات کے احکام پر مشتمل حضرت عمر کا مکتوب گرامی خود دیکھا ہے۔ اس خط کو امام مالک نے اپنی موطا میں روایت کیا یہی خط امام مالک کے توسط سے اندلس سے لے کر انڈونیشیا تک تمام مسلمانوں کے پاس پہنچا۔

حضرت ابوبکرؓ کا مکتوب

حضرت ابوبکرؓ کا ایک مکتوب گرامی حضرت انس بن مالک کے خاندان میں عرصہ دراز تک محفوظ رہا۔ بعد کے زمانہ میں محدثین اور طالبین علم نے حضرت انسؓ کی اولاد سے نقل کیا۔

تابعین کے دور میں تدوین حدیث

جب علم حدیث تابعین کی متاع بنا تو اکابر تابعین نے حدیث کی تدریس کے لیے درس گاہیں قائم کر دیں۔ اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال سننے اور سیکھنے کے لیے کسی ایک فرد کے پاس نہیں جانا پڑتا تھا بلکہ لوگ درس گاہوں کی طرف رجوع کرتے۔ یہ خیال نہیں کرنا چاہیے کہ تمام احادیث ایک ہی مرکز میں مل سکتی تھیں بلکہ وہی احادیث جو کسی تابعی نے ایک صحابی سے یا زیادہ صحابیوں سے بن کر حفظ کی ہوئی تھیں۔ ان کی اشاعت کرتا۔ اس دور میں لکھنے کا سامان عام ہو چکا تھا۔ لوگ درس گاہوں میں جاتے۔ حدیثوں کو لکھ لیتے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے مدینہ کے گورنر ابوبکرؓ بن محمد بن عمر بن حزم کو لکھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو حدیث اور سنت اسے ملے اس کو لکھ لے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں یہ علم مٹ نہ جائے اور علماء فنا نہ ہو جائیں۔ مجالس قائم کی جائیں۔ تاکہ جو شخص نہیں جانتا وہ بھی جان جائے۔ (بخاری کتاب العلم کیف یقبض العلم)

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ یہی علمی سرمایہ وقت کے ساتھ ساتھ آگے بڑھتا چلا گیا۔ پہلے اس سرمایہ کو تابعین نے پایا انھوں نے بھی اس سرمایہ کو احاطہ تحریر میں لایا۔ پھر تبع تابعین اس سرمایہ کے وارث بنے۔ اس علمی ورثہ کو عمر بن عبدالعزیز کے حکم سے محدثین نے قلمبند کیا۔ آخرکار یہ سرمایہ بنو عباس کے عہد میں صحاح ستہ کی شکل میں مدون ہوا۔ نہ صرف مدون ہی نہیں ہوا بلکہ حدیث کی پرکھ کے لیے اصول وضع کیے گئے اور راویوں کی ثقاہت تولنے کے لیے اسماء الرجال کا علم معرض وجود میں آیا۔ لاکھوں راویوں کے حالات زندگی لکھے گئے۔

لہٰذا تاریخی طور پر یہ بات ثابت ہے کہ حدیث کی تحریر کا رواج عہد رسول میں ہی پڑ گیا تھا۔ بعدازاں تابعین نے بھی اس مقدس علمی کام کو جاری رکھا۔ کئی کتب احاطہ تحریر میں آئیں۔

ایک اہم نکتہ

معترض کو قرآن مجید کی حفاظت اور حدیث کی حفاظت کے درمیان ایک خط امتیاز کھینچنا چاہیے کہ قرآن مجید کا ایک پہلو علمی ہے اور ایک ایمانی اس لیے ضروری ہے کہ اس کا ایک ایک لفظ احاطہ تحریر لایا جائے۔ کیونکہ ایک لفظ نے عمل کا روپ بننا تھا اور اس کا نام سنت ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قرآن مجید صرف پڑھانے ہی نہیں آئے تھے بلکہ ہر حکم پر عمل کر کے دکھانا بھی مقصود و

مقصود تھا اور صحابہ کرام کو اس حکم پر چلانا ضروری تھا۔ چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن مجید کے ہر حکم پر عمل کر کے لاکھوں صحابہ کو دکھایا اور ان کو اسی راستہ پر چلایا جس پر خود چلے۔ اس وجہ سے حدیث یا سنت کو احاطہ تحریر میں لانا ثانوی حیثیت تھی۔

اولین حیثیت عملی تھی لہٰذا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سارے قرآن پر عمل کر کے دکھا دیا۔ اگر سنت علمی اور فکری حقائق پر مشتمل ہوتی تب تو اس کی حفاظت کا یہی ایک طریقہ تھا کہ اس کو بلا کسی تاخیر کے احاطہ تحریر میں لایا جائے چونکہ سنت قرآن مجید کے احکام پر عمل کرنے کا نام ہے۔ لہٰذا وہاں عمل کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے لیکن پھر بھی سنت کو احاطہ تحریر میں لانے سے صرف نظر سے کام نہیں لیا بلکہ مناسب وقت کے ساتھ اسلام کے اس عملی حصے کو بھی ضبط تحریر لانا شروع کر دیا تھا۔ جیسا کہ صحابہ کرام اور تابعین کی تدوین شدہ کتب ظاہر کرتی ہیں۔

اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عملی پہلو یعنی سنت ضبط تحریر میں نہ بھی لائی جاتی تب بھی یہ سنت اسی شکل میں ہم تک پہنچ جاتی جس شکل میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کیا۔ کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قرآن کے احکام عمل کی شکل میں صحابہ کو سکھائے اور صحابہ نے اپنی اگلی نسل تک اسی طرح رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کو پہنچایا تھا۔ اگر سنت کو احاطہ تحریر میں نہ بھی لایا جاتا تب بھی سنت معدوم نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ سنت کا تعلق عمل سے ہے اور عمل نسلاً بعد نسلٍ آگے چلتا ہے۔

لہٰذا اس بحث سے معترض پر یہ علمی اور عقلی لحاظ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اس کے اعتراض کی بنیاد کسی ٹھوس حقیقت پر نہیں ہے۔

وضع حدیث کا اعتراض

وضع حدیث (غلط اور من گھڑت حدیث بیان کرنا) کی آڑ میں حدیث کو ماخذ قانون ہونے پر اعتراض کیا گیا ہے۔ یہ انکار خود فریبی پر مبنی ہے۔ وضع حدیث کے فتنے کو راسخ فی العلم علماء اور محدثین نے جس طرح ختم کیا ہے۔ وہ بھی علم الحدیث کا ایک سنہری باب ہے۔ اس کے مطالعہ سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ محدثین نے حق اور باطل کے درمیان ایک ایسی مضبوط دیوار کھڑی کر دی۔ جس کی وجہ سے حق اور باطل آپس میں مل نہیں پاتے ایک قاری پر حق بھی واضح ہو جاتا ہے اور باطل بھی۔

وضع حدیث اور صحابہ کرام

یہ امر مسلمہ ہے کہ صحابہ کرام کے مقدس نفوس سے وضع حدیث کا ناپاک فتنہ نمودار نہیں ہوا۔ صحابہ کرام کا وہ گروہ ہے۔ جس نے صداقت اور اعلائے کلمہ حق کے لیے اپنی جان مال اور عزت قربان

کر دی۔ اپنے وطن اعزہ و اقارب کو خیر باد کہہ دیا سب سے بڑھ کر وہ ایک ایسے مقدس شخص کی صحبت سے فیض یاب ہوئے تھے۔ جو اللہ تعالیٰ کے مظہر اتم تھے۔ وہ کیسے اس شخص پر بہتان طرازی کر سکتے تھے۔ علاوہ ازیں اس مقدس انسان (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) نے واضح طور پر یہ ارشاد فرمایا ہے: وَمَنْ كَذِبَ عَلَيَّ مُتَعَمِّدًا فَلْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ "یعنی جس شخص نے جان بوجھ کر مجھ پر افتراء طرازی کی اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔"

صحابہ کا جھوٹ بولنا تو درکنار وہ تو خلیفہ کو دین اسلام کے خلاف بات کرتے ہوئے دیکھ کر بلا کسی خوف کے ٹوک دیتے تھے۔ جس چیز کو حق سمجھتے تھے وہ کہہ دیتے تھے۔ ایک مرتبہ مروان خلیفہ نے خطبہ کو عید کی نماز پر مقدم کر دیا تو ابوسعید مشہور صحابی نے برملا اس حرکت کو خلاف سنت قرار دیا۔

تاریخ ان امور سے بھری پڑی ہے کہ صحابہ کرام جابر سے جابر خلیفہ کے سامنے حق بات کہنے سے خوف نہیں کھاتے تھے۔ اس قسم کے کردار کے لوگوں سے وضع حدیث کے فتنہ کا نمودار ہونا عادتاً محال ہے۔

حدیث کی صحت پر پرکھ کے لیے علماء کے وضع کردہ اصول

علماء اور ائمہ حدیث موضوع حدیث (من گھڑت حدیث، جھوٹی حدیث) کی پرکھ اور جانچ پڑتال کے لیے ایسے اصول وضع کیے جن کی مدد سے کھوٹ کو اصل سے تمیز کرنا نہایت آسان اور سہل امر ہو گیا۔ جمع حدیث کے ہر مرحلہ کے ساتھ ساتھ انہی اصول کے تحت حدیث کو قبول اور رد کیا جاتا رہا۔ ائمہ حدیث اپنے مکتب میں تلامذہ کو متن حدیث کے درس کے ساتھ ساتھ اصول کی بھی تعلیم دیتے رہے ہیں۔ یہ اصول علمی کتب میں درج ہیں ان تمام پر بحث کرنا ایک تو طوالت کا باعث ہے۔ صرف وہ اصول درج کیے جاتے ہیں۔ جو وضع حدیث کے رد کے لیے ضروری ہیں۔

۱۔ راوی دروغ گوئی اور جھوٹ میں مشہور نہ ہو۔ محدثین نے ایک ایک راوی کے حالات زندگی چھان پھٹک سے حاصل کیے۔ اگر کوئی راوی تقویٰ کے معیار پر نہ اترتا تھا تو اس کی حدیث قبول نہیں کرتے تھے۔

۲۔ حدیث واضع (جھوٹی حدیث گھڑنے والا) نے خود اعتراف کیا ہو۔ جیسا کہ نوح بن عصمہ نے خود اعتراف کیا تھا کہ اس نے قرآن شریف کی ایک ایک سورت کی فضیلت پر جھوٹی احادیث وضع کی ہیں۔

۳۔ راوی کا حال اور وہ وقت جب حدیث کو بیان کر رہا ہے اس کے کذب اور افتراء پر قرینہ ہو۔ جیسا کہ خلیفہ مہدی کے پاس غیاث بن میمون اس وقت آیا جب وہ کبوتر اڑانے میں مشغول تھا۔ جس پر غیاث نے مہدی کو خوش کرنے کے لیے یہ حدیث سنائی۔ لاسبق الا

فی خف او حافر او جناح غیاث نے صرف مہدی کو خوش کرنے کے لیے جناح کا لفظ بڑھا دیا۔

۴۔ راوی کسی ایسے شخص سے حدیث بیان کر رہا ہو۔ جس سے اس کی ملاقات ثابت نہ ہو۔

۵۔ اگر اس قسم کی حدیث ہے کہ اس کا جاننا اور اس پر عمل پیرا ہونا سب پر لازمی ہے۔ مگر اس کا راوی صرف ایک شخص ہو۔

۶۔ حدیث کے الفاظ رکیک اور غیر فصیح ہوں۔ ابن دقیق العید لکھتے ہیں۔ بعض اوقات محدثین حدیث کے الفاظ سن کر حدیث کے موضوع ہونے کا فیصلہ صادر کر دیتے تھے۔

۷۔ حدیث کا متن ایسے مضمون پر مشتمل ہو جو بدیہات کے خلاف ہو اور اس کی تاویل کرنا مشکل ہو۔ مثلاً نوح کے سفینہ نے بیت اللہ کا سات مرتبہ طواف کیا اور مقام ابراہیم پر دو رکعت نماز پڑھی۔

۸۔ حدیث کا متن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ تک کے مشہور تاریخی واقعات کے خلاف ہو۔ مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اہل خیبر پر جزیہ فرض کیا اور ان سے بیگار لینا معاف کر دیا اس وثیقہ پر سعد بن معاذ کی گواہی ثبت ہے۔ اس کو حضرت معاویہ بن ابی سفیان نے تحریر کیا حالانکہ تاریخی طور پر یہ واضح ہے کہ جزیہ کی آیت غزوہ تبوک کے سال نازل ہوئی اس سے پہلے جزیہ کو کیسے مشروع قرار دیا جا سکتا ہے۔ سعد بن معاذ غزوہ خندق میں وفات پا چکے تھے اور حضرت معاویہ فتح مکہ کے دن ایمان لائے تھے۔

۹۔ حدیث صریحاً نصوص قرآن کے مخالف ہو اور اس کی تاویل بھی ناممکن ہو۔

۱۰۔ کوئی حدیث متواتر سنت اور حدیث سے متصادم اور مخالف ہو۔

۱۱۔ چھوٹے چھوٹے اعمال کے بدلہ میں بڑے بڑے ثواب کی امید دلائی گئی ہو۔ معمولی لغزش پر سخت وعید سنائی گئی۔ مثلاً جس نے چاشت کی نماز پڑھی۔ اسے ستر نمازوں کا ثواب ملے گا۔

۱۲۔ عقل کے خلاف ہو۔

۱۳۔ حدیث اجماع صحابہ کے خلاف ہو۔

۱۴۔ وہ راوی جس کو مرض نسیان لاحق ہو۔ عقل بڑھاپے کی وجہ سے ضعیف ہو گئی ہو۔ وہ راوی جس کا حافظہ بہت کمزور ہو۔ اسی طرح وہ راوی جو ہر طرح کے لوگوں کی حدیثیں سن کر قبول کر لیتا ہے اور احتیاط نہ برتتا ہو۔

صداقت حدیث کے پرکھنے کا سب سے بڑا معیار

احادیث کی پرکھ اور صداقت کا سب سے بڑا معیار قرآن مجید ہے۔ قرآن مجید خدائی وعدہ

کے مطابق پوری حفاظت کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ اور یہی شریعت اسلامی کی اصل بنیاد ہے۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس پر حدیث کی ثقاہت پرکھی جاسکتی ہے۔ جو حدیث اس کسوٹی پر پوری اترے گی۔ صحیح دوسری غیر صحیح۔ اس فیصلہ میں اسلام کے کسی فرقہ کو اختلاف نہیں ہے۔ یہی وہ معیار ہے جس کا فیصلہ خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا ہے آپ نے فرمایا ہے کہ میرا قول خدا کے قول کو رد نہیں کرسکتا۔ مگر خدا کا قول میرے قول کو رد کرسکتا ہے۔ (المشکوٰۃ المصابیح)

تیسرا مآخذ اجماع

اجماع کے لغوی معنی

اجماع جمع سے مشتق ہے جس کے معنی اکٹھا کرنا یا اکٹھا ہونا ہے۔

اصطلاحی معنی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی امت کے اہل حل وعقد کا کسی معاملہ میں اتفاق اور اتحاد کر لینے کا نام اجماع ہے۔ (منہاج الاصول للبیضاوی الکتاب الثالث فی الاجماع)

اجماع کی ضرورت واہمیت

گو قرآنی کلیات اور نبوی تشریحات اپنے اپنے رنگ میں جامع ہونے کے باوجود ہر دور کی جزئی اور فروعی مسائل کی تفصیل سے خالی ہیں۔ نئے حالات کے تقاضے کے مطابق ان فروعی مسائل کا حل ضروری ہوتا ہے جیسا کہ حضرت عمر کے دور میں مفتوحہ اراضی کا مسئلہ پیش آیا۔ جب کہ اس سے قبل مفتوحہ اراضی مجاہدین میں بھی تقسیم کی جاتی تھی لیکن ملکی اور قومی حالات کے پیش نظر مشورہ سے الگ راہ متعین کر کے مفتوحہ اراضی کو حکومت کی ملکیت قرار دے دیا گیا۔ یہ فیصلہ بھی قرآن مجید اور تشریحات نبوی کی روح کے مطابق تھا۔ دین اسلام ایک فطرتی اور آسان دین ہے۔ اس لیے ہر دور کے مسائل کو حل کرنے کی راہیں اس میں موجود ہیں اس لیے اسلام نے ہر زمانے کے مجتہدین اور فقہاء کو یہ اجازت دی ہے کہ ملکی مسائل کو قرآن مجید اور تشریحات نبوی کی روشنی میں اپنے مسائل حل کر لیں۔

اجماع کے واجب ہونے کے دلائل

پہلی دلیل: قرآن مجید کی رو سے

قرآن مجید میں آتا ہے: يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ (۵۹:۴) "اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے حاکم

(اولوالامر) ہیں۔

وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَاتَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ وَسَاءَتْ مَصِيْرًا (النساء۴:۱۱۵) "جو شخص اللہ کے رسول کی مخالفت کرے گا۔ جب کہ ہدایت ظاہر ہو گئی اور مومنوں کی راہ ترک کر کے دوسرا راستہ اختیار کرے گا تو ہم اس کا رخ ادھر پھیر دیں گے۔ جدھر وہ چلے اور اسے جہنم میں ڈالیں گے اور برا ٹھکانہ ہے۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ (البقرہ۲:۱۴۳) "اور اسی طرح ہم نے تمھیں درمیانی امت (اعلیٰ امت) بنایا تا کہ تم لوگوں کے لیے سچائی کی گواہی دینے والے ہو۔"

"تنظیم شوریٰ" اجماع کی ایک شکل ہے

اجماع کے بارے میں سب سے زیادہ اہم اور مستند ثبوت اور دلیل تنظیم شوریٰ ہے۔ جس میں تمام دینی اور ملکی امور پر بحث ہوتی ہے اور قرآن اور حدیث کی روشنی میں کسی فیصلہ پر پہنچا جاتا ہے۔ اس کی بنیاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں پڑ گئی تھی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عادت مبارکہ تھی کہ جب کوئی قومی اور ملکی سطح کا کام ہوتا تو صحابہ کرام کو اکٹھا کر کے مشورہ کیا کرتے تھے جیسا کہ جنگ بدر جنگ احد اور جنگ خندق وغیرہ میں آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ کام قرآن مجید کی واضح نص کے تحت کیا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ (آل عمران۳:۱۵۹) "معاملات میں آپ ان سے مشورہ کر لیا کیجیے پھر جب مشورہ کے بعد کسی بات کا عزم کر لیں تو اللہ پر بھروسہ کیجیے۔

یہ آیت اجماع کی اصلیت پر روشنی ڈالتی ہے۔ یہ بات واضح ہوتی ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام سے تمام اہم معاملات میں مشورہ کیا کرتے تھے۔ دوسری جگہ آتا ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (الشوریٰ۴۲:۳۸) "ان کا کام مشورہ سے ہوتا ہے۔"

دوسری دلیل: حدیث کی رو سے

درج ذیل کی احادیث بھی اجماع کی ثبوت میں پیش کی جاتی ہیں۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَجْمَعُ اُمَّتِيْ عَلٰى ضَلَالَةٍ (ترمذی ابواب الفتن) "میری امت ضلالت پر جمع نہ ہو گی۔"

مَارَاٰهُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ (الاشباہ والنظائر القاعدہ السادسة العادة محكمة) "جس چیز کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھی ہے۔"

ترمذی کی حدیث میں يَدُ اللّٰهِ مَعَ الْجَمَاعَةِ یعنی جماعت کے ساتھ اللہ کی تائید اور نصرت ہے۔

اِلْزَمُوْا الْجَمَاعَةَ فَمَنْ شَذَّ مِنَ الْجَمَاعَةِ شَذَّ فِي النَّارِ جماعت کو لازم پکڑ لو کیونکہ جو جماعت سے الگ ہوا آگ میں علیحدہ رہے ہیں۔

تیسری دلیل: ازروئے عمل صحابہ

تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ خلفاء راشدین کسی ملکی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے اکابر صحابہ کو بلاتے ان سے مشورہ لیتے پھر طے شدہ فیصلہ پر عمل کرتے۔ یہ طے شدہ فیصلہ اجتماعی تصور کیا جاتا تھا۔

بغوی نے میمون بن مہران سے روایت کیا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کے سامنے جب مقدمات پیش ہوتے تو وہ کتاب اللہ کے ذریعے ان کا فیصلہ فرماتے۔ اگر کتاب اللہ میں کوئی حکم نہ ملتا تو سنت رسول کے مطابق فیصلہ فرماتے لیکن اگر وہاں بھی کوئی مسئلہ نہ ملتا تو مسلمانوں کو جمع فرماتے اور ان سے معلوم کرتے کہ تمھیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کوئی حدیث معلوم نہیں اگر ان میں سے کسی کو کوئی حدیث معلوم ہوتی تو اسے بیان کرتا اور اگر اس مسئلہ میں کوئی حدیث دست یاب نہ ہوتی تو اہل علم کو جمع فرماتے اور ان سے مشورہ فرماتے جب وہ کسی امر پر اتفاق فرماتے تو حضرت ابوبکرؓ اس کے مطابق فیصلہ فرماتے یہی حضرت عمرؓ کا طریقہ کار تھا جب انھیں کتاب وسنت میں کوئی مسئلہ نہ ملتا تو ابوبکرؓ کے فیصلے پر بھی فیصلہ فرماتے اور اگر ابوبکرؓ کا فیصلہ بھی دست یاب نہ ہوتا تو علمائے صحابہ کو جمع فرماتے اور ان کے متفقہ رائے معلوم کر کے فیصلہ فرماتے جیسا کہ نماز جنازہ میں چار تکبیرات پر اسی طرح تعین ہوا۔ شراب کی حد اسی کوڑے اس طرح معین فرمائی۔ سرزمین عراق کی تقسیم میں بھی یہی طریقہ اختیار کیا گیا۔ حضرت عمرؓ دوسروں کو بھی اسی کی ہدایت فرماتے حتیٰ کہ جو حکم نامہ آپ نے شریح کو تحریر فرمایا اس میں اصول فقہ کے یہ چاروں اصول بالترتیب مندرجہ ہیں۔ جسے امام شعبی نے شریح سے نقل کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں۔

عَنْ شُرَیْحٍ اَنَّهٗ کَتَبَ اِلٰی عُمَرَ لِیَسْئَالَهٗ فَکَتَبَ اَنْ اقْضِ بِمَا فِی کِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ لَمْ یَکُنْ فِی کِتَابِ اللّٰهِ فَبِسُنَّةِ اللّٰهِ فَاِنْ لَمْ یَکُنْ فِی کِتَابِ اللّٰهِ وَلَا فِی سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم فَاقْضِ بِمَا قَضٰی بِهِ الصَّالِحُوْنَ فَاِنْ لَمْ یَکُنْ فِی کِتَابِ اللّٰهِ وَلَا فِی سُنَّةِ رَسُوْلِ اللّٰهِ صلی اللہ علیه وسلم وَلَمْ یَقْضِ بِهِ الصَّالِحُوْنَ فَاِنْ شِئْتَ فَتَقَدَّمْ اَیْ اِجْتَهِدْ بِرَاْیِکَ) وَاِنْ شِئْتَ فَتَاَخَّرْ (اَیْ لَمْ تَجْتَهِدْ) وَلَا اَرَی التَّاَخُّرَ اِلَّا خَیْرًا لَّکَ وَالسَّلَامُ عَلَیْکُمْ (نسائی ج ۲ ص ۳۰۳) شریح نے حضرت عمر کی خدمت میں کچھ سوالات لکھ کر بھیجے حضرت عمرؓ نے انھیں جواب لکھا کہ کتاب کے مطابق فیصلہ کرو۔ اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ میں موجود نہ ہو تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنتہ کے مطابق فیصلہ کرو اور اگر وہ کتاب اللہ میں بھی موجود نہ ہو اور نہ سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں وہ مسئلہ پایا جاتا ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کرو جو نیک لوگوں نے کیا اور اگر وہ مسئلہ کتاب اللہ اور سنت رسول میں نہ ہو اور صالحین نے بھی کوئی فیصلہ نہ کیا ہو تو تیری مرضی ہے چاہے تو آگے بڑھ یعنی اپنی رائے سے اجتہاد کر اور چاہے پیچھے ہٹ جا یعنی کوئی فیصلہ نہ کر اور دوسروں پر چھوڑ دے اور میں

تیرے لیے پیچھے ہٹنا زیادہ پسند کرتا ہوں اور تم پر سلام؟

امام نسائی نے صالحین یعنی صحابہ کبار کے متفقہ فیصلے کو اجماع سے تعبیر فرمایا ہے اور اس حدیث پر یہ سرخی لگائی ہے۔ اَلْحُکْمُ بِاتِّفَاقِ اَهْلِ الْعِلْمِ اتفاق اہل علم کے ساتھ فیصلہ کرنا۔

حضرت عمرؓ کے اس فیصلے کے ساتھ امام نسائی نے عبداللہ بن مسعود کا فیصلہ بھی نقل فرمایا ہے اس کا مفہوم بھی یہی ہے۔

عبداللہ بن مسعود کے فیصلے کو امام نسائی نے عبدالرحمٰن بن یزید اور حریث بن ظہیر کے ذریعہ نقل کیا ہے ہم ذیل میں عبدالرحمٰن بن یزید کی روایت پیش کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں۔

قَالَ اَكْثَرُوْا عَلٰى عَبْدِ اللّٰهِ ذَاتَ يَوْمٍ فَقَالَ عَبْدُ اللّٰهِ اِنَّهٗ قَدْ اَتٰى عَلَيْنَا زَمَانٌ لَسْنَا نَقْضِيْ وَلَسْنَا هُنَالِكَ ثُمَّ اِنَّ اللّٰهَ عَزَّ وَجَلَّ قَدَّرَ عَلَيْنَا اَنْ بَلَغْنَا مَاتَرَوْنَ فَمَنْ عُرِضَ لَهٗ مِنْكُمْ قَضَاءٌ بَعْدَ الْيَوْمِ فَلْيَقْضِ بِمَا فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَاِنْ جَاءَهٗ اَمْرٌ لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ فَلْيَقْضِ بِمَا قَضٰى بِهٖ نَبِيُّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَاِنْ جَاءَهٗ اَمْرٌ لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا قَضٰى بِهٖ نَبِيُّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ فَلْيَقْضِ بِمَا قَضٰى بِهِ الصَّالِحُوْنَ فَاِنْ جَاءَهٗ اَمْرٌ لَيْسَ فِيْ كِتَابِ اللّٰهِ وَلَا قَضٰى بِهٖ نَبِيُّهٗ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَلَا قَضٰى بِهِ الصَّالِحُوْنَ فَلْيَجْتَهِدْ رَاْيَهٗ وَلَا يَقُوْلُ وَاِنِّيْ اَخَافُ فَاِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَ ذٰلِكَ اُمُوْرٌ مُشْتَبِهَاتٌ فَدَعْ مَايُرِيْبُكَ اِلٰى مَالَا يُرِيْبُكَ قَالَ اَبُوْ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ هٰذَا الْحَدِيْثُ حَدِيْثٌ جَيِّدٌ جَيِّدٌ. یعنی عبدالرحمٰن بن یزید کہتے ہیں ایک روز عبداللہ بن مسعود کے پاس لوگوں نے بہت ہجوم کیا عبداللہ نے فرمایا ہم پر وہ زمانہ بھی آیا جب ہم نہ کوئی فیصلہ کرتے تھے اور نہ فیصلہ کرنے کے اہل تھے پھر اللہ تعالیٰ نے ہمارے لیے یہ بات مقدر فرمائی کہ ہم اس منزل پر پہنچے جس پر تم دیکھ رہے ہو تو آج کے بعد جس کے سامنے کوئی مسئلہ درپیش ہو وہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرے لیکن اگر ایسا مسئلہ ہو جس کا ذکر کتاب اللہ میں نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کرے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا لیکن اگر مسئلہ ایسا ہے کہ نہ تو کتاب اللہ میں ہے اور نہ سنت رسول میں تو پھر جو صالحین نے فیصلہ کیا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرے۔ لیکن اگر نہ کتاب اللہ میں ہو اور نہ سنت رسول میں اور نہ صالحینؒ نے اس کے مطابق کوئی فیصلہ کیا ہو تو اپنی رائے سے اجتہاد کرے اور یہ نہ کہے کہ میں فیصلہ کرنے سے ڈرتا ہوں۔ اس لیے کہ حلال بھی ظاہر اور حرام بھی ظاہر اور حلال وحرام کے مابین بہت سے مشتبہ امور ہیں تو تجھے جو شے شک میں ڈالے اسے ترک کر دے اور وہ شے اختیار کر جو مشکوک نہ ہو (امام نسائی فرماتے ہیں یہ حدیث بہت عمدہ ہے)

سعید بن المسیب حضرت علیؓ سے روایت کرتے ہیں وہ فرماتے ہیں میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بعض اوقات ہمارے سامنے ایسے معاملات پیش آتے ہیں جن کا ذکر کتاب وسنت میں موجود نہیں آپ نے فرمایا ایسی صورت میں عالم اور عابد مسلمانوں کو جمع کرو اور ان

سے مشورہ کرو اور کسی ایک کی رائے پر فیصلہ نہ کرو۔

مذکورہ آیات اور احادیث سے یہ صریح معلوم ہوتا ہے کہ جس مسئلہ کا ذکر کتاب اللہ اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں نہ ہو اس میں اجماع سے فیصلہ کیا جائے۔

اجماع کی اقسام

ا۔ اجماع صریح

اس سے مراد یہ ہے کہ وہ تمام علماء جن کا اجتہاد معتبر ہے کسی مسئلہ پر اس طرح متفق اور متحد ہوں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے قول یا فعل کے ذریعہ اپنی رائے کا اظہار کرے۔

اجماع سکوتی

بعض اہل نظر علماء کے اتفاق سے کوئی بات شائع ہو جائے اور دوسرے اہل نظر علماء وفقہاء خاموش رہیں۔

یہ اجماع اسی وقت قابل اعتبار ہوگا جب کہ اظہار رائے کی عام طور پر آزادی ہوگی۔

اجماع کے فیصلوں کا شرعی حکم

اسلام کے قانونی نظام میں اجماع کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ اس کا فیصلہ نہایت مستند اور واجب العمل مانا جاتا ہے اور اس کی مخالفت جائز نہیں ہوتی جیسا کہ اصول میں ہے "جب مجتہدین نے کسی زمانہ میں کسی حکم کا استنباط یا اس پر اتفاق کیا ہو۔ اس زمانہ والوں پر اس کا قبول کرنا واجب ہے۔ اس کی مخالفت جائز نہیں کیونکہ یہ اتفاق اس حکم پر بطور دلیل کے ہے۔" (توضیح تلویح الاجماع)

اجماع کے افراد کا علمی اور عملی حیثیت سے معیار

ا۔ قرآن مجید میں حکمت وبصیرت کا درجہ حاصل ہو۔ صرف ترجمہ وتفسیر بیان کر لینا کافی نہیں۔

۲۔ سنت اور حدیث نبوی پر کامل دسترس رکھتا ہو اور علوم حدیث پر کامل نگاہ ہو۔ روایت اور درایت کے اعتبار سے حدیث کی صداقت پرکھ سکتا ہو۔

۳۔ صحابہ کرام کے حالات زندگی پر اس کی نظر ہو اور ان کے اجماع سے واقف ہو۔

۴۔ قیاس کے ذریعہ استنباط کے اصول اور قواعد معلوم ہوں۔

۵۔ قوم کے مزاج، حالات تقاضوں، عادات و خصائل سے واقف ہونا ضروری ہے۔

۶۔ جدید رجحانات اور تقاضوں سے بخوبی واقف ہو۔

عملی حیثیت

عملی حیثیت سے مراد یہ ہے کہ وہ تقویٰ کی باریک راہوں پر چلنے والے ہوں۔ ماموررات پر عمل کرنے والے ہوں اور منہیات سے مجتنب رہتے ہوں۔

دراصل فسق و فجور بدعات کا اثر انسان کے قلب و عقل پر پڑتا ہے۔ اس کی وجہ سے فراست ایمانی حق و باطل میں تمیز کرنے کی قوت ختم ہو جاتی ہے۔ اس لیے مجتہد کا ماموررات پر عمل کرنا اور منہیات سے باز رہنا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَتَّقُوا اللّٰهَ یَجْعَلْ لَّكُمْ فُرْقَانًا (الانفال ۲۹:۸) ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اگر تم اللہ کا تقویٰ اختیار کرو تو وہ تمھارے لیے حق باطل میں فرق کر دے گا۔

اجماع کی وسعت

اجماع کے دائرہ اور وسعت کے متعلق فقہاء کا اختلاف ہے حضرت امام مالک صرف اهلیان مدینہ (مدینہ کے رہنے والوں) کی رائے کو ہی معتبر سمجھتے تھے۔ حضرت امام احمد بن حنبل اور داؤد ظاہری صحابہ کے اجماع کو معتبر خیال کرتے تھے۔ (اعلام المواقعین ج ۱ص ۲۴)

جمہور علماء کا یہ مذہب ہے کہ اجماع کی حد بندی درست نہیں ہے بلکہ کسی زمانہ میں تمام مجتہدین کا کسی فیصلہ پر اتفاق کر لینا اجماع ہے۔ اس بارہ میں اختلاف ہے کہ آیا اجماع مجتہدین کی اکثریت سے واقع میں آتا ہے۔ یا کل مجتہدین کے اتفاق سے؟ فقہاء کی اکثریت تو یہی کہتی ہے کہ ایک زمانے کے تمام مجتہدین کا ایک رائے پر اتفاق کر لینا ہی اجماع ہے مگر بعض فقہاء یہ کہتے ہیں کہ اکثریت کی رائے سے اجماع واقع ہو جاتا ہے جیسا کہ امام غزالی فرماتے ہیں۔ اِنَّهٗ یَنْعَقِدُ مَعَ مُخَالَفَةِ الْاَقَلِّ ''یعنی اجماع اقلیت کے اختلاف کے باوجود بھی واقع ہو جاتا ہے۔''

کیا اجماع سے اختلاف کرنا معصیت ہے

عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ جس مسئلہ پر اجماع ہو جائے تو اس سے اختلاف کرنا معصیت ہے۔ یہ سراسر غلط ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیانت دارانہ اختلاف رائے کو رحمت قرار دیا ہے دیانت دارانہ اختلاف رائے میں ہی کسی قوم کی ترقی کا راز مضمر ہے۔ ذہنی قوی کی صلاحیتیں اختلاف رائے سے ہی نشوونما پاتی ہیں۔

تنسیخ اجماع

جب اجماع سے اختلاف کرنا جائز ہے تو ایک اجماع دوسرے اجماع کی تنسیخ بھی کر سکتا

ہے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت تو یہ ہے کہ مجلس کوئی فیصلہ صادر کرے تو وہی مجلس دوبارہ دوسرے وقت میں پہلے حکم کو منسوخ کر دے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فقہاء کی دوسری جماعت پہلے فیصلے کے خلاف فیصلہ دے کر منسوخ کر دے۔

چنانچہ فخر الاسلام علی بن محمد البزدوی کی یہی رائے ہے کہ ایک اجماع خواہ وہ قطعی ہو دوسرے اجماع کی رو سے منسوخ ہو سکتا ہے۔ حتی کہ اگر صحابہ کسی فیصلہ پر متفق ہوں اور بعد میں متفقہ طور پر اپنا فیصلہ تبدیل کر دیں تو یہ جائز ہے۔

اجماع کا فیصلہ کسی حد تک زمانہ کے تقاضوں کے مطابق ہوتا ہے۔ حالات اور تقاضے بدلتے رہتے ہیں۔ تو اجماع کے فیصلے میں تبدیلی لازمی آئے گی۔ اگر ایسا اقرار نہ دیا جائے تو اسلامی شریعت انسانوں کے لیے رحمت کی بجائے زحمت بن جائے گی۔ اسلامی قانون کی یہی خوبی ہے کہ اس میں لچک ہے۔ جو لوگ اس کے قائل نہیں ہیں وہ دراصل اسلامی فقہ کو جامد بنانا چاہتے ہیں۔

حضرت عمرؓ کی مثال ہمارے سامنے ہے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں مال غنیمت اور مفتوحہ اراضی کے متعلق اور قانون تھا۔ جب حضرت عمرؓ کے دور میں مفتوحہ ممالک کے اراضی تقسیم کا وقت آیا تو انھوں نے رائے لی۔ آخر کار بڑی بحث و تمحیص کے بعد مفتوحہ اراضی کی تقسیم پہلے قانون سے ہٹ کر کی گئی اور مفتوحہ اراضی حکومت کی ملکیت قرار دی گئی۔ صرف ایک مثال نہیں کئی مثالیں ہیں طوالت کے خوف سے صرف اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ ایک دور کے اجماع کو دوسرے دور کے اجماع سے تبدیل کیا جا سکتا ہے اسی میں امت مسلمہ کی علمی ترقی کا راز مضمر ہے۔

موجودہ زمانہ کا اجماع

اگر کسی خاص خطہ میں کوئی اسلامی حکومت قائم ہو اس کے مجتہدین کسی امر پر اجتہاد کر لیں۔ تو یہ اجماع حجت ہو گا یا نہیں۔

یہ اجماع اس حکومت کے لیے تو حجت ہو سکتا ہے دوسروں پر حجت نہیں ہو سکتا کیونکہ اس اسلامی حکومت نے اپنے حالات کے تقاضوں کے مطابق کوئی رائے دی ہے اور یہ ممکن ہو سکتا ہے دوسرے ملک کے وہ حالات نہ ہوں بلکہ اس کے برعکس ہوں۔

کیا اجماع کتاب وسنت کے کسی نص کو منسوخ کر سکتا

ماضی میں فقہاء کا ایک گروہ بھی تھا جن کا یہ نظریہ تھا کہ اجماع سے کتاب وسنت منسوخ ہو سکتے ہیں۔ جیسا کہ امام ابن تیمیہ نے اپنے فتاویٰ میں ایک گروہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جیسے بعض حنفی

اور مالکی اہل کلام اور فقہاء جیسے عیسٰی بن ابان وغیرہ جو کہتے ہیں کہ اجماع سے کتاب وسنت منسوخ ہو سکتے ہیں۔ پھر امام ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

ہم ان حضرات کی بات کی یہ تاویل کیا کرتے تھے کہ ان کی مراد یہ ہے کہ اجماع سے کسی ناسخ نص کا پتہ چلتا ہے لیکن بعض لوگوں نے ہمیں بتایا کہ وہ لوگ خود اجماع کو ناسخ (کتاب وسنت کو منسوخ کرنا) جانتے ہیں۔ اگر ان کی مراد واقعی یہ ہے تو یہ ایک ایسا قول ہے۔ جس سے مسلمانوں کے لیے جائز قرار پاتا ہے۔ تو وہ اپنے نبی کے بعد اپنے دین میں جو چاہیں تبدیلی کر لیں۔ جیسا کہ نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسٰی نے ان کے علماء کے لیے جائز قرار دیا ہے کہ جس چیز کو حرام ٹھہراتے ہیں۔ وہ کوئی مصلحت سمجھیں اسے حرام قرار دے دیں اور جس چیز کو حلال ہونے میں وہ کوئی مصلحت دیکھیں اسے حلال قرار دے دیں۔ لیکن اسلام میں ایسا نہیں ہو سکتا اور نہ صحابہ کرام اسے اپنے لیے جائز سمجھتے تھے۔ (اصول الفقہ ابن تیمیہ ص ۳۲۸)

اجماع کے اختیارات کی وسعت

متذکرہ الصدر بحث سے یہ بات عیاں ہو گئی ہے کہ ایک اجماع' دوسرے اجماع سے منسوخ ہو سکتا ہے تو پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اجماع' کے اختیارات کی وسعت کیا ہے۔ مختلف فقہاء کے اقوال و آراء سے حسب ذیل امور سامنے آتے ہیں۔

۱۔ زمانہ کے حالات اور تقاضوں کی مناسبت سے نئے قوانین وضع کرنا۔

۲۔ پرانے اجماعی فیصلے جو مصلحت کے تابع تھے اور نئے دور کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ حالات اور مصلحت کے پیش نظر پرانے اجماع میں ترمیم و تنسیخ کرنا۔

۳۔ معاشرتی حالات کے لحاظ سے احکام الٰہی کو مقدم و موخر کرنا۔

۴۔ وہ احکام جو عرب کے مقامی حالات رسم و رواج اور خصائل و عادات کے مطابق نازل ہوئے تھے۔ ان کی روح کو برقرار رکھتے ہوئے جدید حالات اور تقاضوں کے پیش نظر ان احکام کو نئے قالب میں ڈھالنا۔

۵۔ وہ احکام جو وقتی تقاضا اور مصلحت کے تحت ہیں۔ نئے حالات اور تقاضوں کے مطابق ان میں مناسب ترمیم کرنا۔

۶۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب جن احکام میں مختلف الرائے ہیں معقول دلیل کی بناء پر ان میں سے کسی ایک کو ترجیح دینا۔

۷۔ فقہاء کی مختلف رایوں میں وقتی تقاضوں کی مناسبت سے کسی ایک رائے کو ترجیح دینا۔

چوتھا مآخذ قیاس

لغوی اور اصطلاحی مفہوم

قیاس کے لغوی معنی ناپنا یا کسی چیز سے مقابلہ کرنا یا کسی چیز سے مقابلہ کر کے موازنہ کرنا ہے۔ فقہ کی اصطلاح میں دو مسئلوں میں اتحاد علت کی وجہ سے جو حکم ایک مسئلہ کا ہے۔ وہی حکم دوسرے مسئلہ کا قرار دینا۔

اَلْحَقُ اَمْرَ بِاَمْرٍ فِیْ الْحُکْمِ الشَّرْعِیْ لاَتّحادِ بَیْنَھُمَا فِی الْعِلَّةِ ''ایک مسئلہ کا دوسرے مسئلے کے ساتھ شرعی حکم میں مل جانا جب دونوں مسئلوں میں ایک ہی علت پائی جاتی ہو۔''

وضاحت

قیاس کی تعریف کی وضاحت یہ ہے کہ شریعت کے تمام احکام کا دار و مدار مخصوص اغراض اور مصالح پر ہے وہی اغراض اور مصالح ان احکام کی علت ہیں۔ جب ایک حکم کی علت دوسرے حکم میں پائی جائے تو پہلے کا حکم دوسرے پر لگا دیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن مجید میں شراب حرام ہے اور حرمت کی وجہ نشہ ہے۔ اب جو بھی نشہ آور اشیاء ہوں گی۔ ان سب پر شراب کا حکم صادر کر کے حرام قرار دیا جائے گا۔

قیاس کو اسلامی مآخذ ماننے میں اختلاف

قیاس کو فقہ اسلامی (شریعت اسلامیہ) کا ماخذ ماننے میں مذاہب اسلامی میں اختلاف ہے۔ شیعہ امامیہ داؤد ظاہری اور ان کے پیروکار قیاس کو تسلیم نہیں کرتے۔ جبکہ جمہور فقہاء اور شیعہ زیدیہ کے نزدیک قیاس قابل قبول ہے۔ مخالفین قیاس اس کی عدم ضرورت پر حسب ذیل دلائل دیتے ہیں۔

پہلی دلیل

قرآن مجید میں آتا ہے: وَنَزَّلْنَا عَلَیْکَ الْکِتَابَ تِبْیَانًا لِکُلِّ شَیْءٍ (النحل ۸۹:۱۶) ''یعنی ہم نے تجھ پر ایک ایسی کتاب نازل کی ہے۔ جس میں ہر چیز واضح طور پر بیان کر دی ہے۔'' مَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (الانعام ۳۸:۶) ہم نے کتاب میں کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی۔ ''یعنی ہر چیز کا ذکر ہم نے قرآن میں کر دیا ہے۔''

تَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ (یوسف ۱۱۱:۱۲) ''(قرآن مجید میں) ہر چیز کی تفصیل ہے۔''

قیاس کو ماخذ نہ ماننے والے ان آیات کی روشنی میں کہتے ہیں کہ جب قرآن میں تمام امور صراحت کے ساتھ مذکور رہیں تو پھر قیاس چہ معنی دارد۔

دوسری دلیل

مخالفین قیاس کا جواز پیش کرنے والوں کے سامنے یہ حدیث پیش کرتے ہیں۔ اعظھم فتنة علی امتی قوم یقیسون الا مور برایھم فیحلون الحرام الحلال "یعنی میری امت کے لیے سب سے بڑا فتنہ یہ ہوگا کہ بعض لوگ ایسے ہوں گے۔ جو مسائل کا فیصلہ اپنی رائے سے کریں گے۔ وہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام قرار دیں گے۔

جواز قیاس کے لیے دلائل

دلیل اوّل: از روئے قرآن

قرآن مجید میں آتا ہے: وَتِلْکَ الْاَمْثَالُ نَضْرِبُهَا لِلنَّاسِ وَمَا یَعْقِلُهَا اِلَّا الْعَالِمُوْنَ (عنکبوت ۲۹:۴۳) "ہم نے یہ مثالیں لوگوں کے لیے بیان کی ہیں اور انھیں صرف اہل علم ہی سمجھتے ہیں۔

فَاعْتَبِرُوْا یَاُوْلِی الْاَبْصَارِ پس عبرت حاصل کرو اے آنکھوں والو۔

ان آیات میں مسلمانوں کو دنیا کے حالات دیکھ کر نئے مسائل حل کرنے کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تعلیم کے ساتھ حکمت کی تعلیم بھی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی غرض تھی۔ ارشاد الٰہی ہے: وَیُعَلِّمُهُمُ الْکِتَابَ وَالْحِکْمَةَ (۳:۱۵۹) "وہ رسول کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔"

دوسری دلیل: از روئے حدیث

اَنَا اَقْضِیْ بَیْنَکُمْ بَالرَّایِ فِیْمَا لَمْ یُنَزَّلْ فِیْهِ وَحْیٌ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں جن امور سے متعلق وحی نازل نہیں ہوتی ان کا فیصلہ میں اپنی رائے سے کرتا ہوں۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ابن مسعود سے فرمایا: اَقْضِ بِالْکِتَابِ وَالسُّنَّةِ اِذَا وَجَدْتَهُمَا فَاِذَا لَمْ تَجِدِ الْحُکْمَ فِیْهِمَا اِجْتَهِدْ رَایَکَ۔ "یعنی جب تم قرآن اور سنت میں حکم پاؤ تو اس کے مطابق فیصلہ کرو اور قرآن وسنت میں حکم نہ پاؤ تو اپنی رائے سے اجتہاد کرو۔

معاذ بن جبل والی حدیث مشہور ہے کہ جب ان کو یمن کا قاضی مقرر کیا گیا تو ان سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت کیا کہ تم کس طرح فیصلہ کرو گے؟ تو جب معاذ بن جبل نے جواب دیا کہ قرآن کی رو سے پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دریافت کیا اگر وہ حکم قرآن میں نہ پاؤ تو؟ انھوں نے جواب دیا اس وقت سنت کی روشنی میں فیصلہ کروں گا۔ پھر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اگر سنت میں وہ حکم نہ پاؤ تو؟ حضرت معاذ نے جواب دیا اپنی رائے سے۔ اس جواب کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بہت پسند فرمایا اور اجازت دی۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب حجۃ الوداع پر تشریف لے گئے تو آپ سواری پر سوار تھے۔ لوگ آپ سے مسائل دریافت فرماتے۔ ایک حدیث میں آیا ہے۔ عَنْ ابْنِ عَبَّاسٍ اَنَّ رَجُلاً قَالَ رَسُوْلَ اللّٰہِ اِنَّ اَبِیْ اَدْرَکَہُ الْحَجُّ وَھُوَ شَیْخٌ کَبِیْرٌ لَا یَثْبُتُ عَلٰی رَاحِلَتِہٖ وَاِنْ شَدَدْتُہٗ خَشِیْتُ اَنْ یَمُوْتَ اَفَاُحُجُّ عَنْہُ قَالَ اَرَاَیْتَ لَوْ کَانَ عَلَیْہِ دَیْنٌ فَقَضَیْتَہٗ اَکَانَ مُجْزِئًا قَالَ نَعَمْ قَالَ فَحُجَّ عَنْ اَبِیْکَ وَ فِیْ رِوَایَۃٍ قَالَ فَدَیْنُ اللّٰہِ اَحَقُّ۔ ابن عباس سے روایت ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا یا رسول اللہ! میرے باپ پر حج فرض ہو گیا ہے لیکن وہ بہت بوڑھا ہو گیا ہے سواری پر ٹھہر نہیں سکتا اگر میں اسے سواری پر باندھتا ہوں تو مجھے ڈر ہے کہ وہ مر نہ جائے۔ کیا میں اس کی جانب سے حج کر سکتا ہوں آپ نے فرمایا اگر اس پر قرض ہوتا اور تو اسے ادا کرتا تو کیا وہ ادا نہ ہوتا اس نے عرض کیا ضرور ادا ہوتا۔ آپ نے فرمایا تو تو اپنے باپ کی جانب سے حج کر اور ایک روایت میں کہ اللہ کا قرض ادائیگی کے زیادہ لائق ہے۔

ایک اور حدیث میں بجائے باپ کے والدہ کا ذکر ہے اسی طرح ایک واقعہ امام نسائی نے بعد الموت کا بھی ذکر کیا ہے۔

عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ اَمَرَتِ امْرَاءَۃُ سِنَانِ بْنِ سَلَمَۃَ الْجُھَنِیِّ اَنْ یَسْئَالَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنَّ اُمَّھَا مَاتَتْ وَلَمْ تَحُجَّ اَفَیُجْزِیُٔ عَنْ اُمِّھَا اَنْ تَحُجَّ عَنْھَا قَالَ نَعَمْ لَوْ کَانَ عَلٰی اُمِّھَا دَیْنٌ فَقَضَتْہُ عَنْھَا اَلَمْ یَکُنْ یُجْزِیُٔ عَنْھَا فَلْتَحُجَّ عَنْ اُمِّھَا۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ سنان بن سلمہ الجہنی کی بیوی نے سنان کو حکم دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کرے کہ ان کی ماں کا انتقال ہو گیا ہے اور انھوں نے حج نہ کیا تھا تو کیا اگر میں ان کی جانب سے حج کروں وہ کافی ہو جائے گا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کیوں نہیں کیا اگر ان کی ماں پر قرض ہوتا اور وہ اسے ادا کرتی تو کیا ادا نہ ہوتا اس طرح اپنی ماں کی جانب سے حج بھی کرے۔

مذکورہ واقعات میں قیاس کا ایک ہی اصول کام کر رہا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر موقع پر اسی قیاس سے فتویٰ صادر فرما رہے ہیں۔

ایک اور حدیث ہے جس میں لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (اللہ کسی نفس کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔ عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ مَرَّ بِرَجُلٍ وَھُوَ یَطُوْفُ بِالْکَعْبَۃِ یَقُوْدُہٗ اِنْسَانٌ بِخِزَامَۃٍ فِیْ اَنْفِہٖ فَقَطَعَہُ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بِیَدِہٖ فَقَالَ اِنَّہٗ نَذْرٌ ثُمَّ اَمَرَہٗ اَنْ یَقُوْدَہٗ بِیَدِہٖ ابن عباس فرماتے ہیں کہ ان کا گزر ایک ایسے شخص پر ہوا جو خانہ کعبہ کا طواف کر رہا تھا اور اس کی ناک میں ایک نکیل پڑی ہوئی تھی۔ جسے آدمی کھینچ رہا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے وہ نکیل اپنے ہاتھ سے کاٹ دی اور فرمایا یہ نذر ہے پھر کھینچنے والے کو حکم دیا کہ ہاتھ سے کھینچو۔

تیسری دلیل: از روئے اقوالِ صحابہ

تمام صحابہ قیاس کرنے کے بارے میں متفق ہیں حضرت عمر نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو لکھا تھا۔ اَعْرِفِ الْاَمْثَالَ وَالْاَشْبَاہَ وَقِسِ الْاُمُوْرَ عِنْدَکَ یعنی امثال و نظائر کو پہچان اور سمجھ پھر مسائل کو ان پر قیاس کر۔

محاکمہ

دونوں گروہوں کے فقہاء کے دلائل کو سامنے رکھ کر محاکمہ کریں تو وہ فقہاء جو قیاس کرنے کے حامی ہیں۔ وہ صائب اور صحیح نظر آتے ہیں۔ قرآن مجید میں تِبْیَانًا لِّکُلِّ شَیْءٍ (قرآن تمام امور کی وضاحت کرتا ہے اور تَفْصِیْلَ کُلِّ شَیْءٍ (قرآن مجید میں ہر چیز کی تفصیل ہے) کے الفاظ آئے ہیں ان سے مراد یہ ہے کہ قرآن مجید میں تمام قواعد کلیہ اصول دین بیان کر دیے ہیں۔

جہاں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس حدیث کا تعلق ہے کہ ایک وقت آئے گا کہ بعض علماء اپنی رائے سے حلال کو حرام اور حرام کو حلال قرار دیں گے۔ اس حدیث میں صحت مند قیاس کی نفی نہیں کی گئی۔ بلکہ اس رائے اور قیاس کی مذمت کی گئی ہے۔ جو قرآنی اصول کے خلاف ہو گی۔ یعنی قرآن اور حدیث میں واضح طور پر حلال اور حرام چیزوں کا ذکر ہے جو بھی ان کے خلاف قیاس کرے گا وہ قیاس مذموم ہو گا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ جمہور صحابہ تابعین و تبع تابعین اور تمام ائمہ کا یہی فتویٰ ہے کہ قرآن مجید حدیث (سنت) اجماع تینوں شرعی دلائل میں سے کوئی دلیل موجود نہ ہو تو پھر مجتہدین اس مسئلہ پر قیاس کر سکتے ہیں اور ہر زمانہ کے لوگ اس امر پر متفق رہے ہیں۔ بجز چند فرق باطلہ جیسے روافض خوارج اور فرقہ ظاہریہ ان تینوں فرقوں کے مجتہدین کو ائمہ مسلمین کوئی اہمیت نہیں دیتے نہ ان کی کوئی دلیل تسلیم کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قیاس اسلامی فقہ کا ایک اہم ماخذ ہے اور علما نے اس ماخذ کو تسلیم کیا ہے۔

قیاس کے ارکان

۱۔ اصل (مقیس علیہ جس پر قیاس کیا جائے) ۲۔ فرع (مقیس جس چیز کو قیاس کیا جائے) ۳۔ حکم جو قیاس کے بعد لگایا گیا ہے۔ ۴۔ علت وہ مشترک وصف جو اصل اور فرع (مقیس علیہ اور مقیس) میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً شراب اصل ہے۔ بھنگ۔ فرع۔ نشہ وصف مشترک اور حرام حکم ہے۔

شرائط

۱۔ جس اصل اور نص سے علت لی جا رہی ہے اور اس علت کی وجہ سے جو حکم لگایا گیا ہے۔ وہ خاص حالات اور واقعات پر مبنی نہیں ہونا چاہیے۔ مثلاً حدیث میں آتا ہے۔ مَنْ شَھِدَلَہٗ

خزیمۃ فھو حسبہ "یعنی خزیمہ جس کے حق میں گواہی دے وہ اس کے لیے کافی ہے اس سے یہ قانون نہیں بنایا جا سکتا کہ دعویٰ کے ثبوت کے لیے ایک شخص کی شہادت کافی ہے یہ حکم خاص خزیمہ کے لیے ہے۔" (توضیح ص ۳۰۸)

۲۔ علت ایسا وصف ہو جو شرعاً قابل اعتبار ہو اور بالکل واضح اور معین ہو۔ (الاحکام لامدی جلد ۳ ص ۱۲ اور اس کے بعد)

۳۔ جو حکم قیاس سے استنباط کیا جائے اس کی وجہ سے نص کے حکم میں تبدیلی نہ واقع ہونی چاہیے۔

۴۔ جو حکم قیاس سے استخراج کیا جائے اس کی نوعیت نص کے احکام کے ماحصل کی ہونی چاہیے کسی نص کے محض الفاظ پر قیاس کی بنیاد نہیں رکھی جا سکتی (توضیح ص ۳۰۹ مختصر جلد ۲ ص ۲۰۹)

قیاس کا دائرہ وسعت

قیاس کا دائرہ اثر اجماع سے کہیں زیادہ وسیع ہے کیونکہ ایک زمانہ کے تمام فقہاء کا ایک مسئلہ پر متفق ہونا مشکل ہے۔ بخلاف قیاس کے کیونکہ اس میں تمام فقہاء کا اتفاق شرط نہیں بلکہ ہر مجتہد کتاب اور سنت کی روشنی میں ہر مسئلہ میں قیاس کر سکتا ہے۔

کتاب اور سنت میں ہر قسم کی جزئیات اور تفاصیل موجود نہیں ہر زمانہ میں نئے نئے مسائل ابھرتے چلے آ رہے ہیں۔ نئے ابھرنے والے مسائل کا حل ضروری ہے اس لیے نئے پیش آمدہ مسائل کو حل کرنے کے لیے قیاس ضروری ہے اس لیے اسلام نے ہر دور کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے قیاس کا دروازہ کھول دیا ہے حضرت امام شافعی کے شاگرد امام مزنی فرماتے ہیں۔ عہد نبوی سے لے کر ہمارے اس دور تک تمام فقہاء نے زندگی کے ان سارے معاملات میں قیاس سے کام لیا ہے جن کے لیے دینی احکام کے اثبات و اظہار کی ضرورت پڑی اور اس مدت کے تمام علماء کا اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ حق کی نظیر حق ہوتا ہے اور باطل کی نظیر باطل کسی شخص کے لیے یہ زیبا اور جائز نہیں کہ وہ قیاس سے انکار کرے۔ قیاس کا مآل و مفاد اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ان امور میں کتاب و سنت کے متشابہ اور اس کے مثل ہے۔ جس سے کتاب و سنت خاموش ہیں اور جب نظیر حق ہوتا ہے تو قیاس جو حق کا نظیر ہے وہ بھی حق ہوگا (اسلامی قانون نمبر چراغ راہ صفحہ ۲۶۸ جلد اوّل)

معروف

معروف

فقہاء نے معروف کی یہ تعریف کی ہے۔ قول یا عمل میں جمہوری عادت کا نام ہے۔ معروف کا دوسرا نام تعامل اور عادت بھی ہے۔

قرآن مجید نے متعدد معاملات میں معاشرہ کے دستور اور رواج کے مطابق فیصلہ کرنے کا حکم دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ ۲:۱۸۰) (تم پر فرض کیا گیا ہے) والدین اور قرابت داروں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرنا۔

وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ ۲:۲۳۳) اور بچے والے کے ذمے بچوں کی ماؤں کا دستور کے مطابق کھانا اور کپڑا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَنْ كَانَ فَقِيْرًا فَلْيَاْكُلْ بِالْمَعْرُوْفِ (النساء ۴:۶) اور جو غریب ہو تو وہ دستور کے مطابق اپنا خرچ لے۔

ایک اور جگہ ارشاد الٰہی ہے۔ لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَالَمْ تَمَسُّوْهُنَّ اَوْتَفْرِضُوْا لَهُنَّ فَرِيْضَةً مَتِّعُوْهُنَّ عَلَى الْمُوْسِعِ قَدَرُهٗ وَعَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهٗ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوْفِ (البقرہ ۲:۲۳۶) اور اگر تم عورتوں کو اس صورت میں طلاق دو کہ نہ ان کو ہاتھ لگایا اور نہ ان کے لیے متعین مہر مقرر کیا ہو تو ان کے مہر کے باب میں تم پر کوئی گناہ نہیں البتہ ان کو دستور کے مطابق دے دلا کر رخصت کرو۔ صاحب استطاعت اپنی استطاعت کے مطابق اور غریب اپنی استطاعت کے مطابق۔

حدیث میں آتا ہے۔ نَهٰى عَنِ الرُّسُوْمِ الْفَاسِدَةِ وَاَمَرَ بِالصَّالِحَةِ (حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۲۴) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بُری رسموں سے منع فرمایا اور اچھی رسموں کے قبول کرنے کا حکم فرمایا۔ ایک اور موقع پر عبداللہ بن مسعود نے فرمایا۔ مَارَاٰهُ الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ حَسَنٌ وَمَا رَاٰهُ الْمُسْلِمُوْنَ قَبِيْحًا فَهُوَ عِنْدَ اللّٰهِ قَبِيْحٌ یعنی جس کو مسلمان اچھا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی اچھا ہے اور جس کو وہ برا سمجھیں وہ اللہ کے نزدیک بھی برا ہے۔

معروف کی قسمیں

معروف کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ معروف خاص۔ ۲۔ معروف عام۔

معروف خاص

جو کسی خاص علاقہ یا خاص طبقہ میں رائج ہو۔

معروف عام

جو عام لوگوں میں رائج ہو اور کسی خاص طبقہ اور علاقہ کے ساتھ مختص نہ ہو۔

معروف کا شرعی حجت بننے کے لیے حسب ذیل شرائط کا حامل ہونا ضروری ہے۔

عرف قرآن وسنت کے حکم کے خلاف نہ ہو۔

عرف عام ہو یا خاص اگر وہ نص قطعی قرآن اور حدیث کے مخالف ہو تو اس کی چند صورتیں ہیں۔

۱۔ یہ کہ عرف پر عمل کرنے سے نص قطعی کو ترک کرنا لازم آتا ہے تو اس صورت میں عرف کو ترک کیا جائے گا مثلاً کسی علاقے میں ربا اور شراب نوشی لوگوں کا تعامل ہے تو ربا اور شراب نوشی جائز نہیں ہوسکتی کیونکہ یہ دونوں چیزوں کو قطعی نص نے حرام کیا ہے۔

۲۔ دوسری صورت یہ عرف نص قطعی کی عمومیت میں سے کسی ایک جزء کے لحاظ سے مخالف ہو امام ابو یوسف کے نزدیک عرف پر عمل کیا جائے گا کیونکہ عرف میں عمل کرنے سے نص قطعی کو ترک کرنا لازم نہیں آتا۔ نص کے عمومی حکم کو مخصوص کرنا لازم آتا ہے عرف سے نص عام کو خاص کرنا جائز ہے مثلاً حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعض چیزوں کو وزنی شمار کر کے اس کا حکم بیان فرمایا مگر اب وہ کیلی (ناپ سے بیچی جانے والی چیزیں) بن گئی ہیں۔ یا آپ نے کیلی ہونے کی وجہ سے ان کا حکم صادر فرمایا تھا اور اب وہ کسی علاقے میں وزنی بن گئی ہیں تو ان چیزوں کی خرید و فروخت میں عرف کی وجہ سے حکم کی تبدیلی ضروری ہوئی۔ مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے گندم جو اور نمک کو کیلی قرار دیا اور سونا اور چاندی کو وزنی یعنی گندم اور جو کی خرید و فروخت کیل سے کرنی چاہیے اور سونا اور چاندی کو وزن سے اب اگر کسی علاقے میں لوگ سونا چاندی کو کیل کر کے فروخت کریں اور گندم اور جو کو وزن سے یہ عمل حدیث کے خلاف نہ ہوگا کیونکہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد مبارک عرب قوم کے تعامل کے اعتبار سے تھا کیونکہ عرب میں گندم کی بیع وشرا کیل سے کی جاتی تھی اور سونا اور چاندی کی وزن سے۔ اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عرب کے تعامل کے پیش نظر فرمایا تھا۔ پس معلوم ہوا کہ حدیث مذکور کی علت عوام کا تعامل تھا۔ لہٰذا جس جگہ پر یہ تعامل اور عرف تبدیل ہو جائے۔ تو وہاں حدیث کے اعتبار سے مسئلہ بھی تبدیل ہو جائے گا۔

اسی طرح حدیث میں ہر اس چیز کی بیع وشرا کو ناجائز قرار دیا ہے جو بائع کے پاس نہ ہو لیکن لوگوں کے تعامل سے موچی نے جوتے کی بیع موجود نہ ہونے سے پہلے جائز ہے کیونکہ اس صورت میں حدیث کا ترک کرنا لازم نہیں تھا بلکہ حدیث کی تخصیص لازم آتی ہے۔

۳۔ عرف اگر قیاسی حکم کے خلاف ہو تو قیاس چھوڑ کر عرف (رسم و رواج) پر عمل کیا جائے گا خواہ عرف خاص ہو یا عام (مجموعہ رسائل عابدین ص ۱۱۶)

۴۔ اگر عرف کا اختلاف کسی نص قطعی سے نہیں بلکہ علماء نے حکم لوگوں کے تعامل اور عرف کے اعتبار سے دیا تھا لیکن کسی دوسرے زمانہ میں عوام کا تعامل اور عرف تبدیل ہو جاتا تو عرف کے بدل جانے سے حکم میں بھی تبدیلی آ جائے گی کیونکہ وہ حکم مدت عرف کی بقا تک تھا۔ جب عرف میں تبدیلی آ جائے گی تو حکم بھی بدل جائے گا اگر وہ فقیہی جس نے لوگوں کے تعامل کے پیش نظر حکم صادر کیا تھا وہ تبدیل شدہ زمانہ میں ہو تو وہ لازمی طور پر موجود لوگوں کے تعامل کو مدنظر رکھ کر حکم میں تبدیلی کرے گا۔

فقہاء کے احکام میں جو اکثر اختلافات نظر آتے ہیں وہ اسی سبب سے تھے۔ ایک فقیہی نے اپنے دور میں تعامل کو سامنے رکھ کر کوئی فیصلہ دیا۔ جب وہ حالات تبدیل ہو گئے تو دوسرے فقیہی نے اپنے دور کے تعامل کے پیش نظر حکم صادر کرایا۔ دونوں فقہاء کی آراء میں اختلاف لازمی ہے۔

عرف کے اعتبار سے خالص دنیوی قانون کی مقرر کردہ شرائط

۱۔ معقولیت: عرف کا معقول ہونا ضروری ہے اس وجہ سے قانونی مقولہ ہے "رسم بد" قابل منسوخی ہے۔

۲۔ لوگ عرف (رسم و رواج) کو اپنے عقیدہ میں واجب قرار دیتے ہوں اور عرف کو فعل اختیاری کی حیثیت حاصل ہے تو پھر اس عرف کا کوئی اعتبار نہ ہوگا۔

۳۔ عرف کو ملکی قانون موضوع کے مطابق ہونا چاہیے یعنی پارلیمنٹ کے وضع کردہ قانون اور عرف میں مطابقت اور موافقت ہونا ضروری ہے۔

۴۔ عرف کا مدت مدید اور زمانہ دراز تک جاری رہنا ضروری ہے کیونکہ جو عرف مدت مدید سے جاری و ساری ہو تو وہ عرف لوگوں کے اذہان میں راسخ ہو چکا ہوتا ہے اور وہ تمدن اور معاشرت کا حصہ بن چکا ہوتا ہے۔

۵۔ مطابقت قانون: اگر عرف پرانا نہ ہو تو اس میں اور قانون عام میں مغایرت نہیں ہونی چاہیے۔ اس شرط کا تعلق رسم جدیدہ سے ہے (اصول قانون جلد ۱ صفحہ ۲۴۸ تا ۲۵۲ مصنفہ سرجان سائمنڈ)

استحسان

استحسان

لغت میں استحسان کے معنی ہیں کسی چیز کو اچھا سمجھنا لیکن فقہ کی اصطلاح میں تعریف یہ ہے۔

قطع المسئلة عن نظائرها بما هو اقوی.[1]

یعنی کسی مسئلہ کے حکم کو قوی وجہ سے اس کے نظائر سے الگ کر لینا۔

استحسان کی اہمیت اور ضرورت

ہر دور کے تقاضے الگ ہوتے ہیں اور نئے نئے مسائل ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ بسا اوقات تمام تقاضوں اور نئے مسائل کا حل قاعدہ اور قانون میں ملنا مشکل ہو جاتا ہے۔ قیاس اپنی وسعت اثر کے باوجود نئے مسائل کا حل ڈھونڈنے میں ناکام رہتا ہے۔ ان حالات میں فقہاء نے مسلمانوں کی مصلحت کے تقاضوں سے مجبور ہو کر یا ملکی ضرورت کو مدنظر رکھ کر ایک اصول مقرر کر دیا کہ ضرر رساں پہلو ترک کر کے مفید پہلو اختیار کر لیا جائے تاکہ الٰہی حکمت کے ساتھ ہم آہنگی ہو اور بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کا راستہ ہموار ہو سکے۔

حسب ذیل تصریحات سے اس حقیقت پر روشنی پڑتی ہے۔

الاستحسان ترک القیاس والاخذ بما هو اوفق للناس.[2]

استحسان قیاس کو ترک کر کے اس امر کو اختیار کرنے کا نام ہے جو لوگوں کی فلاح و بہبود کا زیادہ ضامن ہو۔

الاستحسان طلب السهولة فی الاحکام فیما یبتلی فیه الخاص والعام.[3] استحسان ان امور میں سہولت طلب کرنا ہے۔ جن میں خاص و عام سب مبتلا ہیں۔

الاخذ بالسعة وابتغاء الدعة.[4] استحسان وسعت کو اختیار کرنے اور فراخی کو طلب کرنے کا نام ہے۔

ان سب تصریحات کا ماحصل یہ ہے کہ فلاح و بہبود کی بناء پر مشکل اور ضرر رساں پہلو کو چھوڑ کر آسان اور راحت والا پہلو اختیار کیا جائے۔ یہ طریقہ الٰہی حکمت کے عین مطابق ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ.[5] اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا.[6] اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے

1۔ کتاب التحقیق۔ 2۔ المبسوط صفحہ ۱۴۵۔ 3۔ المبسوط صفحہ ۱۴۵۔
4۔ المبسوط۔ 5۔ بقرہ ۲:۱۸۵۔ 6۔ بقرہ ۲:۲۸۶۔

زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ خیر دینکم الیسر. (حدیث) تمہارا اچھا دین یسر ہے۔

حضرت علیؓ اور حضرت معاذؓ کو یمن بھیجتے وقت ارشاد فرمایا۔ یسر ولا تعسر اقرب ولا تنفر. لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرنا۔ مشکل میں نہ ڈالنا۔ ان کو قریب لانا اور متنفر نہ بنانا۔

استحسان کی قسمیں

استحسان کی چار قسمیں۔

ا۔ استحسان سنت	۲۔ استحسان اجماع
۳۔ استحسان ضرورت	۴۔ استحسان قیاسی

استحسان ضرورت

''استحسان ضرورت'' اس وقت واقع ہو گا جب کسی حکم پر عمل کرنے سے دشواری پیدا ہوتی ہو اور ضرر رساں اور غیر منصفانہ پہلو زیادہ عیاں ہوں۔ بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود مجروح ہوتی ہو۔ ایسی حالت میں الٰہی حکمت کے مطابق اس حکم کو چھوڑنا ضروری ہے۔ آسانی اور سہولت اور فلاح و بہبود کی خاطر دوسری راہ اختیار کرنا ضروری ہے۔ لیکن یہ ضروری ہے وہ حکم عبادات سے تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ امور دنیا سے تعلق رکھتا ہو۔ ۲۔ مصلحت عامہ شریعت کی منشاء کے مطابق ہو۔

استحسان قیاسی

استحسان قیاسی کبھی ظاہری قیاس کی رو سے کسی مسئلہ کا ایک حکم ہوتا ہے۔ اس پر عمل کرنے سے دشواری پیش آتی ہے یا ضرر رساں ثابت ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں ظاہری قیاس کے خلاف زیادہ قوی اور صحت مند قیاس کی بناء پر کسی دوسرے حکم کو ظاہر کرنے کا نام استحسان قیاسی ہے۔

استحسان سنت

کسی مسئلہ کا قیاسی حکم چھوڑ کر اس کے خلاف اس حکم پر عمل کیا جائے جو سنت میں ثابت ہے۔

استحسان اجماع

کسی مسئلہ کا قیاسی حکم ترک کر کے اس کے خلاف اس کا وہ حکم اختیار کر لیا جائے جس پر اجماع منعقد ہوا ہو۔

استحسان کی یہ دو قسمیں (سنت اور اجماع) درست نہیں اس لیے جو حکم سنت میں موجود ہو اور جس مسئلہ پر اجماع ہو اس کو استحسان نہیں کہا جا سکتا کیونکہ استحسان ظاہری قیاس کو چھوڑ کر اس حکم کو

اختیار کرنے کا نام ہے جو لوگوں کی فلاح و بہبود کا ضامن ہو اور لوگوں کی ضرورتوں کے زیادہ موافق ہو۔ فقہاء یہ اس وقت راستہ اختیار کرتے ہیں جب سنت اور اجماع خاموش ہوں۔

استصلاح یا مصالح مرسلہ

فقہاء کی اصطلاح میں صرف ضرورت اور مصلحت عامہ کو اساس بنا کر مسائل استنباط کرنے کا نام استصلاح یا مصالح مرسلہ ہے۔

تعریف یہ ہے۔ بناء الاحکام الفقهية على مقتضى المصالح المرسلة یعنی مصالح مرسلہ کی اقتضاء پر احکام و مسائل کی اساس قائم کرنا۔

مرسلہ مصالح کی شرائط

فقہاء نے مصالح مرسلہ سے کام لینے کی حسب ذیل شرائط مقرر کی ہیں۔

۱۔ مسئلہ عبادات سے تعلق نہ رکھتا ہو بلکہ امور دنیا سے تعلق رکھتا ہو۔

۲۔ مصلحت عامہ شریعت کی منشاء کے مطابق ہو۔

۳۔ یہ مصالح ان مصالح کے مشابہ ہوں جن کو شریعت میں اولیت حاصل ہو۔
وہ پانچ ہیں۔ ۱۔ حفظ دین۔ ۲۔ حفظ نفس۔ ۳۔ حفظ عقل۔ ۴۔ حفظ نسل۔ ۵۔ حفظ مال۔

۴۔ ان مصالح کے حصول کا یقین کامل ہو۔

۵۔ قومی مصلحت سے ان کا تعلق ہو۔

مصالح مرسلہ سے امام مالکؒ نے زیادہ کام لیا ہے۔

مصالح مرسلہ کے دلائل

۱۔ شریعت اسلامی کی بنیاد ہی بنی نوع انسان کی فلاح پر ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے قانون سازی میں مصلحت عامہ کو خاص ملحوظ رکھا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے۔ مَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّيْنِ مِنْ حَرَجٍ [1] اللہ نے دین میں تمہارے اوپر کوئی تنگی نہیں کی۔
لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔ [2] اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے بڑھ کر تکلیف نہیں دیتا۔
يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ. [3] اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے مشکل میں ڈالنا نہیں چاہتا۔

۲۔ صحابہ کرام بھی مصالح کا اعتبار کرتے تھے۔ مثلاً کتابت قرآن، خلافت کے لیے طریقہ انتخاب، جمعہ کی نماز میں دو اذانیں، اسلامی حکومت کی محکمہ جاتی اور تقسیم وغیرہ۔ ایسے امور تھے

[1] الحج ۲۲:۷۸۔ [2] البقرہ ۲:۲۸۶۔ [3] بقرہ ۲:۱۸۵۔

کہ صحابہ کرام نے محض مصلحت عامہ کے پیش نظر انھیں انجام دیا تھا۔

استدلال

استدلال مصدر ہے اِستَدَلّ سے جس کے معنی ہیں کہ اس نے دلیل تلاش کی اور حاصل کر لی لیکن فقہی اصطلاح میں اس کی تعریف یہ ہے کہ استدلال ایسی دلیل کو کہتے ہیں جو نہ نص ہو۔ نہ اجماع اور نہ قیاس۔ هو دليل ليس بنصٍ ولا اجماع ولا قياس.

استدلال کی اہم اقسام

۱۔ ایک حکم کا دوسرے حکم کے ساتھ بغیر کسی خاص علت کے متعلق ہونا۔ التلازم بين الحكمين من غير تعين علة.

۲۔ استصحاب الحال

استصحاب کے لغوی معنی باقی رکھنے کے ہیں۔ اصطلاحی تعریف یہ ہے کہ اس امر کو تسلیم کر لینا کہ جو حالت پہلے تھی۔ وہ اس وقت تک قائم ہے جب تک اس کے خلاف ثابت نہ کیا جائے۔
مثلاً امام شافعیؒ کے نزدیک مفقود الخبر اس وقت تک زندہ متصور ہو گا۔ جب تک اس کی موت ثابت نہ کی جائے۔ اس وقت تک نہ اس کی جائیداد ورثاء میں تقسیم ہو گی۔ نہ اس کو ایسے مورث کی جائیداد سے محروم رکھا جائے گا۔ جو اس کی غیر حاضری میں فوت ہوا۔

۳۔ استدلال بالقیاس المنطقی

یہ ایسا قول ہے جو چند جملوں سے مرکب ہو جنھیں مان لینے کے بعد اس کے نتیجے کا تسلیم کرنا بھی ضروری ہو جائے۔ جیسے بیع ایک معاملہ ہے اور ہر معاملے کا جزو اعظم رضا مندی ہے۔ دونوں جملوں کی صداقت کو مان لینے کے بعد اس نتیجہ کو بھی تسلیم کرنا ضروری ہے کہ بیع کا جزو اعظم رضا مندی ہے۔

قسم اوّل کی چار قسمیں ہیں

۱۔ جب تعلق دو مثبتہ قضیوں میں ہو۔ مثلاً کہ جو شخص جائز طلاق دینے کا مجاز ہے۔ وہ بطور جائز ظہار بھی کر سکتا ہے۔
۲۔ جب تعلق دو منفی قضیوں میں ہو۔ مثلاً اگر وضو بغیر نیت کے جائز ہے تو تیمم بھی بغیر نیت کے جائز ہے چونکہ تیمم بغیر نیت کے جائز نہیں۔ اس لیے وضو بھی بغیر نیت کے جائز نہیں ہو سکتا یہ حنفیوں کا رد ہے۔
۳۔ جب تعلق ایک مثبت اور ایک منفی قضیہ میں ہو۔ مثلاً جو امر جائز ہے وہ ممنوع یا حرام نہیں ہو سکتا۔

۴۔ جب تعلق ایک منفی اور ایک مثبت قضیہ میں ہو مثلاً جو جائز نہیں وہ ممنوع ہے۔

استدلال کا وسعت اثر

استدلال استنباط شرعی کے لحاظ سے ان تمام استدلالوں پر حاوی ہے جو قیاس کی حد میں داخل نہیں ہوتے قاضی عضد کا مقولہ ہے کہ حنفیوں کا مسئلہ استحسان اور مالکیوں کا مسئلہ مصالح مرسلہ دونوں استدلال کے تحت آ جاتے ہیں۔

اسلام سے ماقبل شرائع

فقہ اسلامی کا ماخذ گزشتہ انبیاء علیہم السلام کی شریعتیں بھی ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اُولٰئِکَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ (الانعام ۶: ۹۰) یہ وہ لوگ ہیں جنھیں اللہ نے ہدایت کی ہے۔ ان کی ہدایت کی پیروی کر۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ ثُمَّ اَوْحَیْنَا اِلَیْکَ اَنِ اتَّبِعْ مِلَّةَ اِبْرَاهِیْمَ حَنِیْفًا ہم نے آپ کو وحی بھیجی کہ آپ ملت ابراہیم کی پیروی کیجیے۔

مسند احمد بن حنبل میں ایک روایت ہے۔ یعمل فی الاسلام بفضائل الجاهلیة یعنی اسلام میں جاہلیت کی اچھی باتوں پر عمل کیا جاتا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا طرز عمل تھا کہ "اگر کسی بات کے متعلق براہ راست وحی نہ آتی تو آپ اہل کتاب کے طور پر طریقوں پر عمل کرنا پسند فرماتے تھے۔"

اسی وجہ سے محدثین نے فرمایا ہے: وان شرع من قبلنا یلزمنا مالم ینقض اللہ بالا نکار. (عینی ۲) یعنی پہلی شریعتوں پر عمل کرنا ضروری ہے۔ جب تک وحی الٰہی کی طرف سے اس پر نکیر نہ کی جائے۔

اسلام سے ماقبل شرائع سے استفادہ زمانہ کے تقاضوں پر مبنی ہے۔ یہ بات مسلمہ ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں ماقبل کی شریعتوں سے استفادہ ہوا ہے۔

تعامل

تعامل سے مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کا عمل ہے۔ فقہاء نے مسائل کے استنباط کے وقت اس سے بہت استفادہ کیا ہے۔ اصحاب وہ لوگ ہیں جنھوں نے براہ راست رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تعلیم حاصل کی ہے۔ ان سے بڑھ کر مزاج شناس نبوت کون ہو سکتا ہے۔ ان کی رائے اور عمل کے مقابلہ میں کسی کی رائے اور عمل کو اہمیت نہیں دی جا سکتی اس وجہ سے فقہاء نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب کے قول و عمل کو فقہ اسلامی کا ماخذ قرار دیا ہے قرآن اور حدیث سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلسَّابِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ۔ (التوبہ ۹:۱۰۰) مہاجرین اور انصار میں سے جو لوگ سبقت کرنے والے سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی اتباع کی۔ ان سب سے اللہ راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔

اس آیت کریمہ میں رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کا جملہ تعامل صحابہ کرام کو ماخذ قرار دینے پر روشنی ڈالتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ فعلیکم بسنتی وسنة الخلفاء الراشدین المهدیین تمسکوا بها وعضوا علیها بالنواجد۔[1] تم لوگ میری سنت اور خلفاء راشدین کی سنت کو لازم پکڑو۔ مضبوطی کے ساتھ اس پر جمے رہو اور مضبوطی کے ساتھ اسے پکڑے رکھو۔

ایک اور روایت ہے۔ وما انا علیه واصحابی۔[2] جس راستہ پر میں اور میرے اصحاب ہیں وہی حق ہے۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود نے ایک موقع پر فرمایا۔

> ”رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اصحاب ہیں۔ جو دل کی نیکی علم کی گہرائی اور تکلف کی کمی میں اس امت کے افضل ترین لوگ ہیں۔ انھیں اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کی صحبت اور اپنے دین کے قائم کرنے کے لیے چن لیا ہے تم لوگ ان کے فضل کو پہچانو۔ ان کے نقش قدم پر چلو اور ان کے اخلاق اور ان کی سیرت کو جہاں تک ہو سکے مضبوطی کے ساتھ پکڑو۔ یہی لوگ ہدایت مستقیم پر ہیں۔“[3]

فقہاء کا مسلک

صحابہ کرام کے تعامل کے بارہ میں فقہاء کا مسلک اصول فقہ میں مذکور ہے۔ یجب اجماعاً فیما شاع فسکتوا مسلمین ولا یجب اجماعاً فیما ثبت الخلاف بینهم۔[4] جو بات تمام صحابہ میں مشہور ہو اور جس کو انھوں نے تسلیم کر لیا ہو۔ اس کا اتباع واجب ہے اور جس میں کچھ اختلاف ہو اس میں واجب نہیں۔

ملکی قانون

فقہ اسلامی کا ماخذ ”ملکی قانون“ ہے۔ تاریخ سے یہ بات واضح ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان قوانین کو معمولی اصلاح کے بعد قبول فرمایا جو عرب میں رائج تھے۔ مثلاً عرب میں

[1] ابو داؤد و ترمذی۔ [2] ترمذی۔
[3] مشکوٰۃ کتاب الاعتصام۔ [4] توضیح وتلویح جلد ۲ صفحہ ۱۷۔

حسب ذیل قوانین رائج تھے۔

۱۔ مدعی سے دعویٰ کے ثبوت کے لیے گواہ طلب کیے جاتے تھے اگر گواہ نہ ہوتے اور مدعا علیہ انکار کرتا تو مدعا علیہ کو قسم دی جاتی تھی۔

اسلامی فقہ کا بھی یہ مسلمہ اصول ہے۔ البینة علی المدعی والیمین علی من انکر. گواہ مدعی کے ذمہ ہیں اور قسم انکار کرنے والے کے ذمہ ہے۔

۲۔ تملیک جائیداد کی مختلف صورتیں تھیں۔ بیع' ہبہ' رہن' اجارہ وغیرہ ان کو قائم رکھا۔

۳۔ بیع کی مختلف شکلیں رائج تھیں۔ بیع سلم' مرابحہ' تولیہ وغیرہ۔

ان میں سے فساد کی تمام صورتوں کو باطل کر دیا اور صحیح صورتوں کو رواج دیا۔

۴۔ وصیت کا دستور۔

۵۔ زمین کو بٹائی پر دینے کا رواج تھا۔

حضرت عمرؓ نے بہت سے قوانین مفتوحہ ممالک کے باقی رکھے۔ مثلاً عراق' شام' مصر کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے بہت حد تک رومی' یونانی اور ایرانی قانون لگان و مال گزاری کو باقی رکھا۔ ظلم و زیادتی کی صورتوں کی اصلاح و ترمیم کر دی۔

عصر حاضر میں اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت

اجتہاد کے لغوی اور اصطلاحی معنی

اجتہاد جھد سے مشتق جس کے معنی ایک شخص کا انتہائی درجہ تک کوشش کرنا ہے لیکن شرعی اصطلاح میں اس انتہائی کوشش کو کہتے ہیں۔ جو ایک مقنن (فقیہ) کتاب اور سنت کی روشنی میں شرعی حکم معلوم کرنے کے لیے کرتا ہے۔

پہلی دلیل: اجتہاد از روئے قرآن مجید

قرآن مجید نے مذہبی اور دنیاوی امور میں عقل سے کام لینے پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (عنکبوت:۶۹) ''جو لوگ ہمارے معاملہ میں جدوجہد کرتے ہیں۔ ہم ان کے لیے اپنی طرف سے اور راستے کھول دیتے ہیں۔ یعنی ان کی مزید ہدایت کریں گے)

كِتَابٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ (ص:۲۹) ''یہ کتاب ہم نے تیری طرف اتاری ہے برکت والی ہے تاکہ وہ اس کی آیتوں پر غور کریں اور تاکہ عقل

والے نصیحت حاصل کریں۔"

اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰی قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا (محمد:۲۴) "تو کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے یا ان دلوں پر ان کے تالے لگے ہوئے ہیں۔

وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی السَّمٰوٰتِ مَا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا مِّنْهُ اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ (جاثیہ:۱۳) "اور جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کو اپنی جانب سے تمھارے کام میں لگا دیا ہے۔ یقیناً اس میں ان لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں جو فکر سے کام لیتے ہیں۔

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ. (نساء:۵۹) "اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور جو تم میں سے صاحب حکومت ہیں ان کی بھی اور اگر کسی امر میں تم (اور صاحب امر) آپس میں جھگڑ پڑو تو اللہ اور رسول کی طرف لوٹا دو اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

اسی طرح ارشاد الٰہی ہے: "کیا تم نہیں سوچتے؟" "کیا تم نہیں سمجھتے" "کیا تم کو عقل نہیں ہے" "ان میں ان لوگوں کے لیے نشانات ہیں جو غور کرتے ہیں۔" "ان میں ان لوگوں کے لیے نشانات ہیں جو سمجھتے ہیں۔" اس کے برعکس وہ جو اپنے قوائے عقلیہ سے کام نہیں لیتے انھیں حیوانات سے تشبیہ دی ہے اور انھیں بہرے گونگے اور اندھے کہا گیا ہے۔ فرمایا وَمَثَلُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا كَمَثَلِ الَّذِیْ یَنْعِقُ بِمَا لَا یَسْمَعُ اِلَّا دُعَآءً وَّ نِدَآءً صُمٌّۢ بُكْمٌ عُمْیٌ فَهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ (البقرہ۲:۱۷۱) "اور ان لوگوں کی مثال جو کافر ہوئے ایک شخص کی مثال کی طرح ہے کہ وہ اسے آواز دے رہا ہو۔ جو بجز پکار اور آواز کے کچھ نہیں سنتا۔ بہرے گونگے اور اندھے ہیں سو وہ عقل سے کام نہیں لیتے۔

پھر فرمایا لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا یَفْقَهُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اَعْیُنٌ لَّا یُبْصِرُوْنَ بِهَا وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا یَسْمَعُوْنَ بِهَا اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (الاعراف۷:۱۷۹) "ان کے دل ہیں جن سے وہ سمجھتے نہیں اور ان کی آنکھیں ہیں لیکن وہ ان سے دیکھتے نہیں اور ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے نہیں۔ وہ چار پایوں کی طرح ہیں بلکہ زیادہ گمراہ ہیں۔"

پھر فرمایا اِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِنْدَ اللّٰهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِیْنَ لَا یَعْقِلُوْنَ (الانفال ۸:۲۲) "اللہ کے نزدیک سب جانداروں سے بدتر وہ بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے۔" پھر فرمایا: اَمْ تَحْسَبُ اَنَّ اَكْثَرَهُمْ یَسْمَعُوْنَ اَوْ یَعْقِلُوْنَ اِنْ هُمْ اِلَّا كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِیْلًا (الفرقان ۲۵:۴۴) "کیا تو خیال کرتا ہے کہ ان میں سے اکثر سنتے ہیں یا عقل سے کام لیتے ہیں۔ وہ صرف چارپایوں کی طرح ہیں۔ بلکہ وہ رستے سے اور بھی دور بھٹکے ہوئے ہیں۔

دوسری دلیل: حدیث کی رو سے اجتہاد کا وجوب

قرآن اور حدیث کی روح کے مطابق قوت فیصلہ (عقل) کو کام میں لایا جائے۔ مندرجہ

ذیل حدیث اسلام میں اجتہاد کی اساس سمجھی جاتی ہے۔ حضرت معاذ بن جبل سے مروی ہے کہ جب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن بھیجا تو فرمایا اگر تمھارے سامنے کوئی فیصلہ پیش آ جائے تو کس طرح فیصلہ کرو گے۔ انھوں نے جواب دیا جو کتاب اللہ میں ہے۔ میں اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ہو۔ انھوں نے کہا جو رسول نے فیصلہ کیا۔ اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا وہ معاملہ اس میں بھی نہ ملے تو پھر کیا کرو گے۔ انھوں نے کہا۔ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہ کروں گا۔ (روی ابو داؤد۔ الترمذی عن معاذ بن جبل)

عقبہ بن عامر سے مروی ہے کہ ایک مرتبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھا۔ آپ کے پاس دو شخص آئے۔ آپ نے فرمایا ان دونوں کے درمیان فیصلہ کرو۔ میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ پر میرے ماں باپ قربان ہوں۔ آپ کے سامنے یہ جرأت نہیں کرسکتا۔ آپ نے فرمایا۔ اجتہاد کرو اگر تم صاحب الرائے ہو تو دس نیکیاں ملیں گی اور اگر خطا کیا تو ایک نیکی۔

تیسری دلیل: وجوب از روئے عمل صحابہ

علامہ سیوطی نے اپنی کتاب تاریخ الخلفاء میں لکھا ہے کہ جب کوئی مسئلہ حضرت ابوبکر کے سامنے پیش ہوتا تو پہلے کتاب اللہ کا تفحص کرتے اگر وہاں سے مسئلہ کا حل نہ ملتا تو سنت رسول کی طرف رجوع کرتے۔ اگر وہاں سے نہ ملتا تو صحابہ کو جمع کرتے اگر کسی کو سنت رسول کا علم ہوتا تو وہ بتا دیتا۔ آپ خدا کا شکر بجا لاتے اگر صحابہ میں سے کسی کو بھی سنت رسول کا علم نہ ہوتا تو پھر بہترین اشخاص کا انتخاب کرتے اور ان سے رائے لیتے اور کثرت رائے سے فیصلہ صادر فرماتے۔ (تاریخ الخلفاء ص ۴۰)

حضرت عمرؓ بھی اس قاعدہ کے پابند تھے۔ جب کوئی اہم مسئلہ درپیش ہوتا جید اور صاحب علم صحابہ کو بلاتے اور ان سے مشورہ کرتے جب کبھی کسی بات میں اختلاف رائے ہوتا تو کثرت پر فیصلہ کیا جاتا تھا۔ علاوہ اس مجلس شوریٰ کے انفرادی طور پر بھی صاحبان علم ہوتے جیسا کہ حضرت عائشہؓ حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن عمرؓ اور دوسرے اس زمانہ کے مجتہدین جن کے اجتہاد اور رائے کو بڑی وقعت اور قدر سے دیکھا جاتا تھا۔ تمام صحابہ صرف ایک شرط سے مشروط تھے کہ نہ تو وہ فیصلہ قرآن مجید کی کسی نص کے خلاف ہو اور نہ حدیث وسنت کے خلاف۔

مجتہدین کے اوصاف

۱۔ مجتہد کے لیے یہ ضروری ہے کہ مزاج شریعت سے اچھی طرح واقف ہو۔ یہ مزاج قرآن مجید اور حدیث پر وسیع اور گہری نظر رکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔

۲۔ مجتہد عاقل بالغ ہو تا کہ وہ قرآن مجید اور حدیث کے منشاء کو سمجھ سکے۔
۳۔ نئے اور ابھرتے ہوئے احوال و حوادث جو جدید احکام وضع کرنے کے مقتضی ہوتے ہیں۔ ان کا جاننا ضروری ہے۔
۴۔ عربی زبان کا ماہر ہو۔
۵۔ اجماعی مسائل سے واقف ہو تا کہ اجتہاد کرتے وقت ہر دور کے مجتہدین کا اجماع اس کے سامنے ہو اور مجتہد فیصلے کرتے وقت ٹھوکر نہ کھائیں کیونکہ پچھلے ادوار کے اجماعی فیصلے کے بعد آنے والے مجتہدین کے لیے چراغ راہ ہیں۔
۶۔ صحابہ اور تابعین کے اقوال جو احکام کے سلسلہ میں ان سے منقول ہیں آگاہ ہو۔
۷۔ فقہاء سلف کے اقوال اور آراء کا علم رکھتا ہو۔
۸۔ ذہین اور تیز فہم ہو تا کہ قیاس کے ذریعہ احکام کے علل اور اسباب معلوم کر سکے۔
۹۔ متقی ہو تا کہ لوگ فتوی پر عمل کرنے کے لیے اس پر اعتماد کر سکیں۔

مجتہدین کے مدارج

۱۔ مجتہد فی الشرع

وہ مجتہدین عظام جو کسی مسلک کے بانی ہوں اور جنھوں نے اجتہاد کرنے کے قواعد وضوابط وضع کیے ہیں۔ مثلاً اہل سنت والجماعت کے چاروں مسالک کے بانی حضرت امام ابوحنیفہ حضرت امام مالک حضرت امام شافعی حضرت امام احمد بن حنبل اور شیعہ مسلک کے بانی حضرت امام جعفر صادق ہیں۔

۲۔ مجتہد فی المذہب

جو کسی مسلک کا مقلد ہو۔ لیکن وہ اپنے امام سے اصولی یا فروعی مسائل میں اختلاف رکھتا ہو۔ مثلاً مذہب حنفی میں امام ابو یوسف اور امام محمد ہیں۔

۳۔ مجتہد فی المسائل

وہ مجتہد مراد ہے جو صرف فروعی مسائل میں اپنے امام سے اختلاف رکھتا ہو۔ مثلاً مذہب شافعی ہیں حضرت امام غزالیؒ اور حنفی میں امام طحاوی۔

۴۔ مجتہد مقید

وہ مجتہد مراد ہے جو اپنے امام کی پوری تقلید کرے۔ اصولی اور فروعی اصول میں اختلاف نہ کرے لیکن یہ ضروری ہے وہ احکام سے کما حقہٗ واقف ہو۔

اجتہادی رائے کی شرعی حیثیت

اجتہاد ایک رائے ہے جو کتاب اور سنت کے اشارات پر مبنی ہوتی ہے۔ اس کی حیثیت نص کی نہیں اس میں غلطی کا بھی امکان ہے اجتہادی رائے سے اختلاف کی بناء پر کسی کو کافر و فاسق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کسی بزرگ فقیہی نے اختلاف کی بناء پر کسی کو کافر قرار نہیں دیا۔

مسلمانوں میں تقلید اور جمود کی وجوہات

چوتھی صدی کے بعد مسلمانوں میں تقلید اور جمود کا دور شروع ہوتا ہے۔ سقوط بغداد کے بعد تمام سنی فقہاء اس بات پر متفق ہو گئے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے علماء کے اجتہادی قوتوں پر جمود آ گیا۔ انھوں نے مفصل اور طویل کتب کے مختصرات اور مختصرات کی شرح لکھنے پر اکتفا کیا۔ مختلف فقہی مسالک کے مقلد اکابر علماء پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اپنے اپنے امام کی فقہ کی تقلید کی اور یہی وہ دور ہے جس میں علم کی روشنی مدہم ہونا شروع ہوئی۔ بدعات اور خرافات نے معاشرہ میں جگہ لے لی اور شریعت کی اصل روح مفقود ہو گئی۔

ا۔ معتزلہ کی تحریک اور اس کے بداثرات سے بچنے کی کوشش

عباسیہ دور میں اعتزال (عقلیت پسندی) کی تحریک اٹھی اس وجہ سے بے شمار غیر اسلامی مباحث چھڑ گئے۔ (مثلاً خلق قرآن کا مسئلہ حدیث کا مقام وغیرہ) ایک طرف علماء ربانی نے معتزلہ علماء کے دلائل و براہین سے مقابلہ کیا اور ان کے غلط دلائل قرآن اور سنت کی روشنی میں رد کیے۔ دوسری طرف اسلامی معاشرہ کو ان بحثوں کے بدنتائج سے بچانے کے لیے ضابطہ قانون سخت بنا دیا۔ یونانی علوم کی روشنی میں اسلامی مسائل اور مباحث کو حل کرنے کی سعی اور کوشش کو بری نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اس طرح فقہاء کے اجتہادی قوتیں مردہ ہونے لگیں۔

۲۔ سقوط بغداد اور سیاسی انتشار

بغداد پر ہلاکو خان کے حملے سے فقہاء اور علماء مایوسی کا شکار ہو گئے۔ اس حالت قنوطیت نے علماء کی قوت فکریہ کو سلب کر لیا اور وہ اپنے دور کے مسائل کو علمی اور عملی لحاظ سے حل کرنے کی بجائے مختلف فقہی مسالک کے پیروکار بن گئے اور ان کی فقہوں کو پڑھانے میں اپنی عمریں صرف کر دیں اور نئے مسائل حل کرنے کی طرف توجہ نہ دی۔

۳۔ تصوف کے اثرات

سیاسی انحطاط کی وجہ سے اسلام کے سیاسی، معاشرتی اور اقتصادی گوشے بالکل سرد پڑ گئے اور

علماء نے زندگی کے ظاہری پہلوؤں سے بالکل بے اعتنائی برت لی۔ جلوت سے خلوت میں چلے گئے۔ گوشہ نشینی میں زندگی بسر کرنے کو ترجیح دی۔

۴۔ عصری تقاضوں سے بے خبری

جب علماء نے عملی زندگی چھوڑ کر گوشہ نشینی اختیار کر لی تو وہ عصری تقاضوں سے بالکل غافل ہو گئے۔ نئے ابھرتے ہوئے تقاضوں سے بے خبری کی وجہ سے علماء میں اجتہاد کی صلاحیت نہ رہی۔

۵۔ وضعی قوانین کی مداخلت

مغرب کے لادینی اثرات کی وجہ سے مسلمان حکومتوں نے اپنے اجتماعی اور سیاسی زندگی کے ہر گوشے میں وضعی قوانین داخل کر لیے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اسلامی معاشرہ قرآن اور سنت کی روح سے معرّیٰ ہو گیا اور اسلامی قانون کا تعلق عملی زندگی سے منقطع ہو گیا۔

۶۔ علماء کی تنگ نظری

اسلامی معاشرہ مختلف فقہی گروہوں میں بٹ گیا۔ اس تقسیم نے ان کے اندر تعصب بلکہ عناد اور دشمنی کے جذبات پیدا کر دیے۔ ہر گروہ نے صداقت اور حقانیت کو اپنے مسلک کے اندر خیال کیا اور دوسرے فقہاء کی اجتہادی آراء کو صرف ترک ہی نہ کیا بلکہ لغو قرار دیا۔ جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ علماء کے اندر وسعت نظر اور ژرف نگاہی ختم ہو گئی اور اجتہاد کی اہلیت ختم ہو گئی۔

۷۔ اخلاق کی پستی

فقہاء اور علماء اخلاقی پستی کا شکار ہو گئے۔ وہ بادشاہوں کے دربار سے وابستہ ہو گئے ان کی رضا جوئی کے لیے فتویٰ دینے لگے۔ لوگ ان کی دین فروشی کی وجہ سے ان سے متنفر ہو گئے اور اپنے گزرے ہوئے فقہاء کی تقلید میں بھلائی سمجھی۔ حقیقت یہ ہے کہ جس آدمی کے اخلاق ہی قابل اعتماد نہ ہوں۔ دین کے بارہ میں اس پر بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

۸۔ اسلامی علم کا زوال

سیاسی انحطاط کے ساتھ ہی اسلامی علوم کا زوال شروع ہو گیا۔ ایسے لوگوں کا پیدا ہونا کم ہو گیا۔ جو اجتہاد کے ذریعہ نئے مسائل کو حل کرنے کی اہلیت رکھتے ہوں۔ اس سے علم فقہ کی ترقی رک گئی۔ علماء کے اجتہادی قوتوں کے سوتے خشک ہو گئے۔

اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے

عصر حاضر میں یہ بات کھل کر سامنے آ گئی ہے کہ یہ خیال سراسر غلط اور بے بنیاد ہے کہ

اجتہاد کا دروازہ بند ہے۔ قرآن مجید نے عقل کو استعمال کرنے کی اجازت دی۔ صحابہ کرام نے ملکی مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتہاد سے کام لیا۔ تابعین نے اجتہاد کا دامن تھامے رکھا۔ قرآن مجید کے اسرار و رموز کو سمجھا اور قرآن اور حدیث کی روشنی میں مسائل حل کیے۔ بعد میں آنے والی نسلوں نے ابھرتے ہوئے مسائل کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں حل کیا۔ فقہاء نے بھی اندھی تقلید سے منع فرمایا۔ ابن قیمؒ نے ابوحنیفہؒ اور ابویوسفؒ سے روایت کی ہے: لَا يَحِلُّ لِاَحَدٍ اَنْ يَّقُوْلَ بِقَوْلِنَا حَتّٰى يَعْلَمَ مِنْ اَيْنَ قُلْنَا "کہ کسی کو یہ جائز نہیں کہ وہ ہمارے قول کی پیروی کرے جب تک وہ یہ جان نہ لے کہ ہم نے کس بناء پر کہا ہے۔"

حضرت امام مالک حضرت امام شافعی اور حضرت احمد بن حنبل سب اس امر پر متفق ہیں کہ اندھی تقلید ٹھیک نہیں ان فقہاء کا عمل خود اس امر پر دلیل ہے کہ اجتہاد کا دروازہ کھلا ہے۔ اگر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہوتا تو یہ بزرگ ہستیاں کبھی بھی اجتہاد سے کام نہ لیتیں۔ یہ تمام بزرگ ایک دوسرے کے بعد گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنے پیش رووں سے علمی اختلاف کیا اور زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق مسائل کو حل کیا اجتہاد قانون سازی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اگر اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا جائے تو شریعت اسلامی ملکوں کے ایک زحمت کا موجب بن جائے گی۔ اجتہاد کا دروازہ بند کرنا ذہنی پستی کی علامت ہے۔ مسلمان علمی پستی کا اس وقت شکار ہوئے جب انھوں نے اجتہاد اور حریت فکر پر پابندی عائد کر دی۔

دور حاضر میں اجتہاد کی اہمیت و ضرورت

متذکرہ الصدر بحث سے یہ بات عیاں ہوگئی ہے کہ اجتہاد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے دور سے لے کر سقوط بغداد تک جاری رہا۔ اس کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا لیکن اس تاریک دور میں بھی بعض ممالک میں ایسے نامور علماء فقہاء اور فلاسفہ پیدا ہوئے۔ جنھوں نے اسلام کو فلسفیانہ انداز میں پیش کیا۔ اجتہاد پر زور دیا۔ جس سے تفقہ کی شمع جلتی رہی۔ ان نامور علماء و فلاسفہ میں سے امام رازی ابن سینا' ابن رشد' ابن طفیل' کندی' فارابی' امام ابن تیمیہ' امام ابن قیم محقق طوسی شاہ ولی اللہ محدث دہلوی خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

قریب کے ماضی دور میں بڑی بڑی نامور ہستیاں پیدا ہوئی ہیں۔ جنھوں نے مسلمانوں کو محض تقلید پسندی سے نکالنے کی کوشش کی اور نئے ابھرتے ہوئے مسائل کو حل کرنے کے لیے اجتہاد کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا۔ ان میں سے علامہ جمال الدین افغانی مفتی عبدہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین علی شریعتی مولوی چراغ علی' مولانا عبید اللہ سندھی' سید امیر علی علامہ عنایت اللہ مشرقی، علامہ محمد اقبال شامل ہیں۔ گو ان تمام صاحب نظر اشخاص کے نظریات سے بکلی اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔ جہاں بھی مذکورہ اشخاص کے

خیالات میں زیغ اور کجی آئی تو مقلدین نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں اس غلط خیال کو رد کیا۔

مذکورہ مفکرین کے نظریات پر طوالت کے خوف سے بحث نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال ان مفکرین نے اجتہاد کی ضرورت اور اہمیت پر زور دیا ہے۔ آج اجتہاد کی اہمیت اور ضرورت پر زور دیا جاتا ہے تو یہ ان کے روشن افکار کی وجہ ہے ہندوستان میں مولانا احمد رضا اور علماء دیوبند نے علم فقہ کی خدمت کی اور مسئلہ اجتہاد کو آگے بڑھایا۔

موجودہ دور کے نئے مسائل

ا۔حکومت میں عوام کی شراکت۔ ۲۔عوام کے حقوق و فرائض۔ ۳۔ عورت کی امور زندگی میں شمولیت اور اس کا دائرہ کار۔ ۴۔ مسئلہ ربو۔ ۵۔ سرمایہ داری اور جاگیرداری نظام اور اس کی تحدید۔ ۶۔ بیرونی غیر مسلم طاقتوں کا تغلب اور بعض اسلامی ممالک کے ہوائی اڈوں پر قبضہ۔ ۷۔ جہادی قوتوں کو منظم کرنا۔ ۸۔ بین الاقوامی مالیاتی اداروں کا اسلامی ممالک پر اقتصادی غلبہ اور اس سے نجات کی راہیں۔ ۹۔ تعلیمات قرآن کے فروغ کا ٹھوس منصوبہ۔ ۱۰۔ مخالفان اسلام کے اعتراضات کے جوابات۔ ۱۱۔ کرایہ اور بٹائی جائز ہے یا ناجائز۔ ۱۲۔ سب سے اہم مسئلہ امریکہ اور عالم اسلام ہے اس وقت صورت حال یہ ہے کہ خلیج کے علاقے میں قریباً ۲۰ ہزار بحری اور بری اور فضائی فوج تعینات ہیں۔ بحرین میں امریکی سنٹرل کمانڈ کے بحری بازو کا ہیڈ کوارٹر ہے۔ قطر میں فضائیہ کا ایک حصہ مقیم ہے۔ ترکی میں امریکی فضائی قوت کا ایک مرکز ہے۔ سعودی عرب میں بری فوج کا ایک موثر حصہ برسر عمل ہے پاکستان کے ہوائی اڈے امریکہ کے پاس ہیں۔ افغانستان اور عراق پر بین الاقوامی اصولوں کو نظر انداز کر کے تسلط جما لیا ہے اور عالم اسلام کی سب سے بڑی دولت ''تیل'' پر قابض ہے۔ سستے داموں ''عربی دولت'' کو یورپ کے کارخانوں میں استعمال کر رہا ہے۔ نیز دیگر علاقائی اور بین الاقوامی مسلم ممالک کے مسائل وغیرہ۔ مذکورہ مسائل میں سے بعض مسائل بین الاقوامی ہیں اور بعض علاقائی بہرحال یہ تمام مسائل اسلامی حکومتیں مل بیٹھ کر ہی حل کر سکتی ہیں۔

مسائل کے حل کی راہیں

ا۔ حل کرنے کے لیے جرأت دانشمندی اور قرآن اور حدیث سے قلبی لگاؤ ضروری ہے۔

۲۔ جن مسائل میں ائمہ یا ان کے شاگردوں کے متفقہ اجتہادات موجود ہوں۔ انھیں من وعن اپنا لیا جائے۔

۳۔ جن امور میں ائمہ اور ان کے شاگردوں میں اختلاف اجتہاد ہے وہاں زمانہ کی ضرورت کی مطابق کسی ایک رائے کو ترجیح دی جائے۔

۴۔ جن امور میں ائمہ نے کوئی اجتہاد نہ کیا ہو۔ وہاں ائمہ کے ہی مقرر کردہ قواعد وضوابط کے تحت استنباط مسائل کیے جائیں۔
۵۔ جہاں ائمہ میں اختلاف ہو وہاں استحسان اور مصالح مرسلہ کے تحت مسائل کو حل کیا جائے (استحسان اور مصالح مرسلہ فقہ اسلامی کے دو ماخذ ہیں۔ ان دونوں اصطلاحوں کا مفہوم یہ ہے کہ مسئلہ کو قرآن اور حدیث کی روشنی میں معاشرہ کی بہتری اور بھلائی میں حل کیا جائے)

مسائل کے حل کے لیے فقہ کی تشکیل نو کرنا پڑے گی۔ جب تک فقہ کی تشکیل نو نہیں ہوگی۔ مسائل حل نہیں ہوں گے۔ فقہ کی تشکیل نو کے لیے یہ ضروری ہے کہ فقہ قدیم کے پورے پھیلاؤ پر تحقیق نظر دوڑائی جائے اور کوشش کی جائے تاکہ اس کی اصل بنیادوں' مصادر اور اصول کا پتہ چل سکے۔ پھر اس پھیلاؤ کو سامنے رکھ کر نئی فقہ کی بنیاد ڈالی جائے اور اس نئی فقہ کی روشنی میں تمام مسائل حل کیے جائیں۔

دوم۔ فقہ کی تشکیل نو کے لیے یہ ضروری ہے کہ کتاب وسنت کی وہ تصریحات اور مقامات جو فقہی اہمیت رکھتے ہیں۔ ان کو ان تمام فروع سے الگ کر کے ایک جگہ جمع کر لیا جائے۔ پھر اس کے بعد ان تصریحات کی روشنی میں اصلی ماخذوں پر فقہ جدید کی تدوین کی جائے۔

سوم۔ جس طرح فقہاء نے قرآن مجید اور حدیث کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے کلیات بنائے تھے یہ تقریباً سو کے لگ بھگ ہیں۔ نئے مسائل کے حل کے لیے اسی طرح کے نئے کلیات بھی بنائے جاسکتے ہیں۔ پھر ان کلیات پر مسائل کو چسپاں کر کے حل کر لیا جائے۔ کوئی قوم ترقی نہیں کر سکتی۔ جب تک اس کے پاس ایک ایسا دستور ہو۔ جو وقت کے تقاضوں کے مطابق نئے مسائل کو حل کر سکے۔ ورنہ قوم زمانہ کی رفتار کے مطابق نہ چل سکے گی اور قوم پیچھے رہ جائے گی۔ زمانہ کے تقاضا کے مطابق نیا آئین اجتہاد کی روشنی میں ہی بنایا جاسکتا ہے۔

اجتہاد کا جاری رہنا اس لیے بھی ضروری ہے تاکہ علماء اور دانشور قوم کو حالات کے مطابق چلا سکیں۔

اجتہاد کی ایک اہم ضرورت

ایک مسلم معاشرہ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات کے مطابق زندگی بسر کرے۔ اگر کسی معاملہ میں خدا اور اس کے رسول کی تعلیمات میں کوئی واضح حکم نہ ہو تو پھر اسلامی روح کے مطابق درپیش مسئلہ کو حل کر کے اس پر عمل کیا جائے تو اس طرح مسلم معاشرہ اسلام کی تعلیمات سے وابستہ رہے گا۔ اگر اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا گیا تو مسلم معاشرہ نئے مسائل کو اسلام کی روشنی میں نہ حل کر کے اسلامی تعلیمات سے دور ہو جائے گا۔ اسلامی تعلیمات سے دور ہونا گھاٹے اور خسران کا راستہ ہے۔

اصول فقہ امامیہ

فرقہ امامیہ کے فقہ کے چار اصول ہیں۔ کتاب اللہ' سنت' اجماع اور عقل۔

قرآن مجید

فرقہ امامیہ کے نزدیک قرآن مجید کی وہی حیثیت ہے جو اہل سنت والجماعت کے نزدیک ہے۔ چنانچہ الکافی میں امیر المومنین حضرت علیؓ کی روایت ابوعبداللہ سے مروی ہے۔ حضرت امیر فرماتے ہیں۔

''اے لوگو! اللہ نے تمھارے پاس اپنا رسول بھیجا اور تم پر اپنی کتاب حق کے ساتھ نازل کی حالانکہ تم کتاب اللہ اور اس کے نازل کرنے والے سے' رسول اور اس کے بھیجنے والے سے یکسر ناآشنا تھے۔ اس قرآن میں عہد گزشتہ کا علم ہے اور قیامت تک کے لیے آنے والی باتوں کا علم ہے۔ تمھارے معاملات و مسائل کا حکم ہے جن میں تم اختلاف کرتے ہو' ان کا بیان ہے۔''

سنت

سنت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اقوال و افعال اور آثار ائمہ معصومین شامل ہیں۔ فرقہ امامیہ کے نزدیک سنت نبویہ متواترہ کا منکر کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہے۔

فرقہ امامیہ بھی سنت کی صحت کی کسوٹی قرآن مجید کو ہی ٹھہراتے ہیں۔ چنانچہ الکافی میں ہے:

''ابوعبداللہ سے مروی ہے کہ جو حدیث قرآن مجید کے مطابق نہ ہو وہ مردود ہے۔''

اجماع

اہل سنت والجماعت اور فرقہ شیعہ دونوں نے اجماع کو اصل فقہ ٹھہرایا ہے لیکن دونوں کے مفہومات الگ الگ ہیں۔ اہل سنت والجماعت کا نقطہ نظر اجماع کے متعلق پہلے گزر چکا ہے یہاں صرف فرقہ شیعہ کے دو گروہوں زیدیہ اور امامیہ کے نقطہ ہائے نظر بیان کیے جاتے ہیں۔

زیدیہ

اس فرقہ کے ہاں کسی زمانہ میں علماء مجتہدین کا کسی امر پر متفق ہو جانے کا نام اجماع ہے۔ یہ لوگ خوارج کو دائرہ اسلام سے خارج سمجھتے ہیں۔ ان کا اجتہاد قابل قبول نہیں۔

زیدیہ کے ہاں اجماع کی تین صورتیں ہیں:

۱۔ کسی امر پر فقہاء اور مجتہدین کا اتفاق کر لینا۔ اس کا نام اجماع عام ہے۔

۲۔ کسی مسئلہ پر عترت رسول کا اتفاق کر لینا۔ اس کا نام اجماع خاص ہے۔

۳۔ تمام امت کا کسی مسئلہ پر اتفاق کر لینا۔ یہ صورت باقی دونوں صورتوں سے ارفع ہے۔

امامیہ

فرقہ امامیہ کے نزدیک کسی جماعت کا کسی مسئلہ پر اتفاق کر لینے کا نام اجماع ہے لیکن یہ ضروری ہے کہ وہ اتفاق امام معصوم کی رائے سے ہم آہنگ ہو۔ اگر غیر امامیہ کسی مسئلہ پر اتفاق کر جائیں تو ان کے نزدیک اسے اجماع نہیں کہا جائے گا۔ فرقہ امامیہ کا حجیت اجماع پر اتفاق ہے۔ ایسے علماء بہت کم ہیں جو اجماع کو حجت نہیں مانتے۔

اجماع کی تین اقسام ہیں:

۱۔ اجماع صریح: جس مسئلہ پر جملہ طوائف اسلامیہ کا اتفاق ہو جائے اس کو اجماع صریح کہا جائے گا اگر یہ اجماع واقع ہو جائے تو حجت قطعی ہے۔

۲۔ اجماع سکوتی: کسی مسئلہ پر امت کے فقہاء کی ایک جماعت اتفاق کر لیتی ہے لیکن اس کے خلاف کوئی اور آواز بلند نہیں ہوتی تو اس اجماع کو اجماع سکوتی کا نام دیا جائے گا۔

۳۔ اجماع کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی مسئلہ پر فقہاء کا اختلاف ہو جائے تو تیسری رائے پیدا کرنا جائز نہیں ہے۔ مثلاً بھائیوں کی موجودگی میں میراث جد پر صحابہ کا اختلاف ہے۔ بعض نے جد کو تیسرے اور بعض نے چھٹے حصہ کا وارث ٹھہرایا ہے۔ بعض نے جد کو ہی وارث ٹھہرایا ہے اور بہن بھائیوں کو محروم کر دیا ہے۔ اب جد کی توریث پر تو اتفاق ہے لیکن صرف حصہ میں اختلاف ہے۔ ان دونوں کے مقابلہ پر تیسری رائے جادہ صواب سے ہٹی ہوئی ہو گی' وہ ناقابل قبول ہو گی۔

عقل

امامیہ کے نزدیک کتاب اللہ' سنت اور اجماع کے بعد عقل کا درجہ آتا ہے۔ ان کا یہ دعویٰ ہے کہ حضرت امام جعفر صادق کا مسلک ہے کہ جہاں کتاب اللہ' سنت اور اجماع سے کوئی مسئلہ حل ہوتا ہوا نظر نہ آئے تو وہاں عقل سے کام لے کر اس مسئلہ کو حل کر لینا چاہیے۔ لیکن اس کے ساتھ یہ شرط ضروری ہے کہ وہ مسئلہ احکام عملیہ سے متعلق ہو۔

فرقہ امامیہ کے بھی دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو ائمہ کے اقوال سے آگے نہیں جاتا' وہ واقفیہ کہلاتا ہے۔ دوسرا گروہ وہ ہے جو اجتہاد سے کام لے کر مسئلہ کو حل کر لینا ضروریات دین میں سے سمجھتا ہے۔ جہاں نص نہ ہو وہاں اجتہاد سے کام لیتے ہیں۔ یہ گروہ اصولی کہلاتا ہے۔ ان کے نزدیک اصل اصول تو کتاب اور سنت ہی ہیں لیکن کتاب اللہ اور سنت کسی مسئلہ کے حل کرنے میں صامت ہوں

تو وہاں عقل سے کام لینا چاہیے۔

اجتہاد

اثنا عشریوں میں اجتہاد کے بارہ میں دو مسلک ہیں۔ ایک مسلک اثنا عشری اخباری ہے۔ وہ اجتہاد کے قائل نہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ ائمہ معصومین نے جو فقہی ورثہ چھوڑا ہے وہ کافی ہے۔ وہ ان سے تجاوز نہیں کرتے۔ اس مسلک کے پیروکار بہت کم ہیں۔

دوسرا مسلک اصولیوں کا ہے۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ نئی ابھرتی ہوئی ضرورتوں کو پیش نظر رکھ کر قرآن اور حدیث کی روشنی میں اجتہاد کیا جا سکتا ہے۔ کتاب المیز ان میں لکھا ہے کہ محققین نے کہا ہے کہ علماء کو اجتہاد کے ذریعے احکام وضع کرنے کا حق حاصل ہے کیونکہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وارث ہیں۔

مجتہد کے لیے حسب ذیل شرائط ہیں:۔

۱۔ عربی زبان پر عبور رکھتا ہو۔

۲۔ علم کلام سے گہری واقفیت رکھتا ہو۔

۳۔ قرآن مجید کا پورا پورا علم رکھتا ہو۔

۵۔ اجماعی مسائل کا علم رکھتا ہو۔

۶۔ مسئلہ کے استنباط و استخراج کا درک رکھتا ہو۔

۷۔ ذہین ہو تا کہ کسی چیز کے حسن و قبح کو بخوبی جان سکے۔

۸۔ مذہب امامی کے فقہی اختلافات سے پوری واقفیت رکھتا ہو۔

۹۔ مجتہد کا امامی اور عادل ہونا ضروری ہے۔

شیعہ اثنا عشری کے نزدیک ہر زمانہ میں ایک مجتہد عالم کا ہونا ضروری ہے' جس کی تقلید سب پر واجب ہے۔ مذہب اثنا عشری کے ہاں اصول دین میں تقلید نہیں ہے۔ صرف فروع دین میں ہے۔

اسلامی فقہ میں ارتقاء کی صلاحیت ہے

اس امر میں ذرا شک و شبہ نہیں ہے کہ اسلامی فقہ میں ارتقاء کی صلاحیت موجود ہے۔ اس میں ہر زمانہ کے مسائل اور ضرورتوں کا حل موجود ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور مسعود میں دیکھتے ہیں کہ جو بھی مسئلہ سامنے آتا تھا آپ اس کو حل کرتے۔ اس کے بعد خلفاء راشدین کا دور آیا۔ فتوحات بڑھیں' نئے نئے مسائل سامنے آئے۔ خلفاء نے صاحب رائے صحابہ کے مشوروں سے قرآن اور سنت کی روشنی میں ان کو حل کیا۔ جوں جوں زمانہ بڑھتا گیا۔ زندگی کے مسائل اور ضرورتیں

بڑھتی گئیں اور فقہاء نے بھی اپنی اجتہادی قوتوں کو بروئے کار لا کر ان مسائل کے حل ڈھونڈے۔ اگر ہم فقہاء کے اجتہادات پر غور کریں تو کسی کا اجتہاد بھی روح اسلام سے خالی نہیں ہے۔ وہاں اسلامی فکر کار فرما نظر آتی ہے خواہ مالکی مسلک ہو خواہ حنبلی، خواہ شافعی، خواہ حنفی، خواہ شیعہ فرقہ کی فقہ تمام مسالک اور مذاہب کی بنیاد قرآن اور سنت پر ہی ہے۔ اسلامی فقہ کی تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ ہمارے فقہاء نے اپنے اپنے زمانہ کے حالات اور ضروریات کو پیش نظر رکھ کر مسائل کا حل قرآن اور سنت کے دامن میں ڈھونڈا ہے۔

اسی طرح اسلامی فقہ میں ارتقاء کی صلاحیت ان قانونی کتب سے بھی ملتی ہے جو فقہاء کی ذہنی کاوشوں کے نتیجہ نے لکھی گئیں اور ان کتب سے بھی ملتی ہے جو مختلف ممالک نے مدون کی ہیں۔

اسلامی فقہ میں ارتقاء کی صلاحیت کا سب سے بڑا سبب اجتہاد ہے۔ اجتہاد کا مطلب ہی یہ ہے کہ اسلامی معاشرہ کو جو نئے نئے مسائل پیش آئیں، جن کے بارہ میں قرآن اور سنت میں واضح حکم نہ ملتا ہو۔ ان مسائل کو اسلام کی روح کو مدنظر رکھ کر حل کیا جائے۔ اجتہاد کی وجہ سے اسلامی فقہ میں ارتقاء اور حرکت پائی جاتی ہے۔

اسلامی فقہ میں حرکت کا دوسرا سبب مصلحت ہے۔ انسانی زندگی کا دائرہ بہت ہی وسیع ہے۔ زندگی کے بے شمار شعبوں میں قرآن نے مداخلت نہیں کی، تاکہ مسلمان معاشرہ کے مصالح کو مدنظر رکھ کر قانون بنالیں۔

اسلامی فقہ کی خصوصیات

اسلامی فقہ اپنے محاسن اور خصوصیات کی وجہ سے دنیا کے تمام دساتیر سے مکمل اور اعلیٰ ہے۔ اسلامی قانون ایک فرد کے معاملہ سے لے کر بین الاقوامی معاملات تک پھیلا ہوا ہے اور ہر طبقہ کی تہذیب اور ترقی کا ضامن ہے۔ چند ایک خصوصیات درج کی جاتی ہیں:

۱۔ اسلامی قانون کی بنیاد ذاتی حساسات اور افکار کے بجائے وحی پر رکھی گئی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ يُّوْحٰى (النجم ۵۳:۳'۴) اور وہ خواہش نفس سے نہیں بولتا یہ صرف وحی ہے جو اس کی طرف کی جاتی ہے اس وجہ سے اس بنیاد کو ھدی للناس کہا ہے۔ وحی پر بنیاد ہونے کی وجہ سے ہی اسلامی فقہ میں استحکام اور دوام پایا جاتا ہے۔

۲۔ اسلامی قانون بہت سادہ اور سہل ہے اور انسانی فطرت کے عین مطابق ہے۔ جس وجہ سے انسانی فطرت اسلامی قانون سے متنفر نہیں ہوتی۔

۳۔ اسلامی قانون معاشرہ سے برائیوں کو جڑ سے اکھاڑتا ہے اور عدل و انصاف کو قائم کرتا ہے۔

۴۔ اسلامی قانون کی بنیاد مساوات اور اخلاق پر ہے۔

۵۔ اسلامی قانون عقل کے معیار پر پورا اترتا ہے۔

۶۔ اسلامی قانون ملک کی عمدہ رسوم اور رواج کے خلاف نہیں جاتا' جس وجہ سے اسلامی قانون میں وسعت پیدا ہو جاتی ہے۔

۷۔ اسلامی قانون میں لچک ہے اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالا جا سکتا ہے۔

۸۔ اسلامی فقہ میں بہت وسعت ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام آزادی رائے اور اجتہاد کو وقعت کی نظر سے دیکھتا ہے۔

۹۔ اسلامی قانون عورت' غلام' ذمی غرض کہ معاشرہ کے ہر طبقہ کے انسانوں کے حقوق کی نگہداشت کرتا ہے۔

۱۰۔ اسلامی قانون صرف ملک کی سرحدوں کی حفاظت اور امن کو برقرار رکھنے کے لیے جہاد کو فرض قرار دیتا ہے۔

۱۱۔ اسلامی قانون معاشرہ سے برائی کو یک لخت ختم نہیں کرتا' بلکہ تدریجاً ختم کرنے کی تعلیم دیتا ہے تاکہ انسان کی طبیعت قانون سے یک لخت بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے۔

۱۲۔ اسلامی قانون میں اقتدار اعلیٰ کا مالک صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور خلیفہ (سربراہ) اسلامی قانون کو نافذ کرنے کا ذریعہ۔

۱۳۔ اسلامی قانون میں توازن اور اعتدال پایا جاتا ہے۔ جہاں ایک طرف اخلاق کا بلند ترین نصب العین پیش نظر رکھا گیا ہے تو دوسری طرف تو انسان کی کمزوریوں کو بھی سامنے رکھا جاتا ہے۔ ایک طرف معاشرتی فلاح کو سامنے رکھا گیا ہے تو دوسری طرف انفرادی ضرورتوں کو بھی پوری اہمیت دی گئی ہے۔ الغرض اسلامی قانون افراط اور تفریط سے پاک ہے۔

۱۴۔ اسلامی قانون میں وحی الٰہیہ پر مبنی ہونے کی وجہ سے وحدت و یکسانی پائی جاتی ہے۔ یہ ایک ایسا وصف ہے جس کے بغیر قانون کا اصلی مقصد یعنی عدل و انصاف کا قیام پورا نہیں ہو سکتا۔

اسلامی فقہ پر بیرونی اثرات

پہلا اثر

آج کل تمام دنیا ایک کنبہ کی شکل اختیار کر گئی ہے جس وجہ سے تمام ممالک ایک دوسرے سے متاثر ہو رہے ہیں۔ اسلامی ممالک جہاں اور گوشوں میں مغربی ممالک سے متاثر ہوئے ہیں وہاں اسلامی فقہ پر بھی اثر پڑا ہے۔ اس وجہ سے ہر اسلامی ملک میں تین قسم کے گروہ نظر آتے ہیں۔

ایک گروہ وہ ہے جو مغربی قانون سے اتنا متاثر اور مسحور ہے کہ وہ اپنے گھر کی قیمتی لاثانی بضاعت کو ہی بھول گیا ہے۔ وہ اپنے ملک میں مغربی قوانین کے رنگ میں قانون نافذ کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ وہ مغربی قوانین یا اس سے مشابہ قانون میں ہی ملک کی ترقی پنہاں خیال کرتا ہے۔

دوسرا گروہ وہ ہے جو اسلام کے قانون سے اتنا متنفر نظر تو نہیں آتا' نہ اس سے پہلو تہی کرتا ہے۔ ہاں اسلام نے جو سیاست' معیشت اور معاشرت میں حدود و مقرر کی ہیں ان کو زمانہ حاضرہ کے تقاضوں کے تحت بدلنا اور توڑنا چاہتا ہے۔

تیسرا گروہ ان علماء کا ہے جو قرآن اور سنت کے تمام احکام کو نہ بدلنے والے اور دائمی سمجھتا ہے اور ان میں کسی ترمیم اور اضافہ کو جائز قرار نہیں دیتا۔

پس مغربی قوانین کا سب سے پہلا اثر یہ ہوا ہے کہ علماء میں انتشار اور افتراق پیدا ہو گیا ہے۔

دوسرا اثر

مغربی قوانین کا اسلامی فقہ پر دوسرا اثر یہ پڑا ہے کہ اسلامی ممالک کے قوانین کی بنیاد عملاً ...یت پر ہے جو اسلام کی تعلیم کے سراسر خلاف اور غلط ہے۔ اس کا یہ نتیجہ نکلا ہے کہ اسلامی ممالک ...ہاد کی لڑی میں پروئے نہیں گئے۔ اختلاف اور افتراق کا شکار ہو گئے ہیں۔ اگر اسلامی ممالک کے ...انین کی بنیاد اسلام ہوتی تو تمام اسلامی ممالک ایک دوسرے کے مفاد کی پاسداری اور حفاظت کرتے ...ئے نظر آتے لیکن اس کے برعکس اسلامی ممالک ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں ...تمام اسلامی ممالک بڑی بڑی طاقتوں کی گود میں پڑے ہوئے ہیں۔

...سرا اثر

اسلامی قانون کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اصول میں اعتدال پایا جاتا ہے۔ لیکن جو قوانین اسلامی ممالک میں رائج ہیں' وہ افراط اور تفریط کے شکار ہیں۔ یا تو وہ سرمایہ داری کا ہیں یا اشتراکیت کا۔ یہ دونوں نظام اسلامی قانون کی روح کے منافی ہیں۔ سرمایہ داری نظام میں ...ں فرد کو حد سے زیادہ آزادی دے رکھی ہے اور اشتراکی نظام میں فرد بالکل مجبور اور بے بس ہے۔

...وتھا اثر

اسلامی قانون کی نظر میں صدر مملکت اور ایک عامی برابر ہیں۔ اگر دونوں کا کسی امر پر جھگڑا ہو جائے تو قاضی رئیس مملکت کو جواب دینے کے لیے بلائے گا۔ لیکن مغربی قانون کا یہ اثر ہے کہ صدر ...کت کورٹ کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ قانون رئیس مملکت کے ...ع ہے نہ کہ رئیس مملکت قانون کے تابع۔

پانچواں اثر

اسلامی قانون کی رُو سے حاکم اعلیٰ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے لیکن مغربی قوانین میں حاکم اعلیٰ عوام ہیں اور وہی طاقت کا سرچشمہ ہیں۔ مغربی قوانین کے زیر اثر اسلامی ممالک میں مروجہ قوانین عوام کو حاکم اعلیٰ اور طاقت کا سرچشمہ بناتے ہیں۔

گو اسلام جمہوریت کا قائل ہے لیکن اسلام اس جمہوریت کا قائل نہیں جو مغربی ممالک میں رائج ہے۔

چھٹا اثر

مغربی قوانین نے مذہب کو سیاست سے الگ سمجھا ہے لیکن اسلامی قانون سیاست اور مذہب دونوں پر حاوی ہے' جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: الاسلام والسلطان اخوان توأمان لا یصلح واحد منهما الا لصاحبه فالاسلام اسٌ والسلطان حارس. مالا اسٌ له یهدم وما لاحارس له ضائع. یعنی اسلام اور حکومت دو جڑواں بھائی ہیں۔ دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے کے بغیر درست نہیں ہو سکتا۔ پس اسلام ایک عمارت کی طرح ہے حکومت اس کی نگہبان ہے۔ جس عمارت کی بنیاد نہ ہو وہ گر جاتی ہے جس کا نگہبان نہ ہو وہ غیروں کے ہاتھ سے مٹ جاتا ہے۔

مغربی قوانین کا یہی اثر ہوا ہے کہ اسلامی ممالک میں بھی مذہب کو سیاست سے الگ تصور کیا جاتا ہے۔

ساتواں اثر

مغربی قوانین خاص طور پر اشتراکی قانون کا اسلامی ممالک کے قوانین پر یہ اثر ہے کہ قانون پر سیاست کا غلبہ ہے۔ سب سے بڑی مثال قانون پر سیاسی غلبہ کی روس میں ہے جہاں قانون سیاست کے چنگل میں پھنسا ہوا ہے۔ فلورنسکی (Florinsky) اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ روس کے نقطہ نظر کے مطابق عدلیہ اور قانون حاکم طبقہ کے آلہ کار ہوتے ہیں۔ ججوں کی آزادی کا اندازہ اس امر سے لگایا جاتا ہے کہ وہاں یہ تصور موجود ہے کہ ایک طرف ججوں اور دوسری طرف قانون ساز اداروں اور حکومت کے دوسرے محکموں کے درمیان کسی اختلاف کا امکان ہی نہیں ہونا چاہیے۔[1]

اسلامی ممالک میں بھی عملاً یہی ہو رہا ہے۔ عدالتیں حکمرانوں کے اشاروں پر فیصلہ دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی ممالک کی سیاست میں استحکام نہیں ہے۔ یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ جب تک قانون کی حکومت نہ ہو' نہ ملک میں امن قائم ہو سکتا ہے اور نہ دنیا میں۔ بین الاقوامی قانون پر بھی سیاست کا اثر ہے' جس کا نتیجہ یہ ہے کہ کمزور طاقتیں بڑی طاقتوں کے نیچے پس رہی ہیں۔

---

[1] فلورنسکی صفحہ ۶۳۔

اسلامی قانون کی تشکیل جدید کے تقاضے

اسلامی قانون کی تشکیل جدید اور اس کے نفاذ کے لیے چند ایک تقاضے ہیں جن کو پورا کرنا نہایت ہی ضروری ہے۔ جب تک وہ پورے نہیں ہوتے اس وقت تک نہ تو اسلامی قانون کی تشکیل ہو سکتی ہے اور نہ نافذ کیا جا سکتا ہے۔

فقہ عصری تقاضوں کو پورا کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس لیے مدونین قانون کو اپنے سامنے پوری فقہ اسلامی رکھ کر کتاب اور سنت کی روشنی میں اجتہاد سے کام لینا چاہیے۔ اس طریقہ سے کسی کو بھی اعتراض کرنے کی گنجائش نہ رہے گی کہ اس پر دوسری فقہ زبردستی لاگو کی گئی ہے۔ اگر کسی ایک مسلک پر قانون کی تدوین کی بنیاد رکھی جائے گی تو دوسرے مذاہب اور مسالک کے پیرو کے اندر اضطراب کی لہر دوڑ جائے گی' جس کے نتیجہ میں ملک میں بدامنی اور بے چینی پیدا ہو جائے گی۔

۲۔ مسلمان علماء تین گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ قدامت پسندوں کا ہے' وہ پرانی روایات اور پرانے علمی سرمایہ پر ہی تکیہ لگا کر کوئی مزید بحث کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ وہ اپنے پیش رو فقہاء کے اجتہاد کو ہی مسلمانوں کی دینی اور دنیوی ضروریات کے لیے کافی سمجھتا ہے۔ اس کے برعکس ایک تجدد پسندوں کا گروہ ہے۔ وہ اپنے ماضی سے ہٹ کر نئے ابھرتے ہوئے مسائل کا حل قرآن اور حدیث کی روشنی میں کرنا چاہتا ہے۔

یہ دونوں گروہ راہ اعتدال سے ہٹے ہوئے ہیں۔ اگر پہلے گروہ کے نظریہ پر عمل کیا جائے تو مسلمان اپنی پرانی فقہ میں عصری تقاضوں کا حل نہیں پاتے۔ اگر تجدد پسند گروہ کے نقش قدم پر چلا جائے تو رابطہ ماضی سے منقطع ہو جائے گا۔ تجدد پسند فقہاء اپنی خواہش کے مطابق جو چاہیں گے اجتہاد کریں گے۔

راہ اعتدال یہ ہے کہ اپنے گزرے ہوئے فقہاء کے علمی سرمایہ سے پورا فائدہ اٹھایا جائے' تاکہ ہمارا حال ماضی سے منقطع نہ ہو۔ پھر قرآن اور سنت کی روشنی میں نئے مسائل کو حل کیا جائے۔

۳۔ مملکتی بورڈ کا قیام: اسلامی ممالک میں فقہاء کا دارا مملکتی بورڈ ہونا چاہیے کہ جب کوئی نیا مسئلہ پیش آئے تو وہ قرآن اور سنت کی روشنی میں حل کرے۔ اگر بورڈ اپنے اجتہاد کو ملک کے اندر شائع کر دے تو بہتر ہے تاکہ بحث و تمحیص کے بعد مسئلہ کا حل نکھر کر سامنے آ جائے۔ جس فیصلہ پر کثرت رائے ہو اس کو قانونی حیثیت دے دی جائے۔ حدیث میں آتا ہے: لا تجمع امتی علی الضلالۃ۔ یعنی میری تمام امت ایک غلط مسئلہ پر جمع نہیں ہو سکتی۔

۴۔ بین الاسلامی بورڈ کا قیام: رسل و رسائل کی ترقی نے تمام دنیا کو ایک لڑی میں پرو دیا ہے۔ اس وجہ سے ہر ملک دوسرے ملک کے سیاسی' معاشرتی اور اقتصادی حالات سے متاثر ہوتا ہے۔ بناء بریں تمام اسلامی ممالک میں فقہ اسلامی کا ادارہ قائم ہونا چاہیے' جو اسلامی ممالک کے پیش آمدہ حالات کو مدنظر رکھ کر اجتہاد کرے۔ اس سے نہ صرف اسلامی فقہ ترقی کرے گا۔ بلکہ اس سے تمام اسلامی ممالک میں اتحاد کا رشتہ زیادہ سے زیادہ مضبوط ہو جائے گا۔

۵۔ اسلامی قانون کی تدوین کرتے وقت یہ ضروری ہے کہ کتاب اور سنت کی جن تعبیروں پر مسلمان اعتماد رکھتے ہیں انہی تعبیروں پر ضابطہ قانون کی بنیاد رکھی جائے۔ اگر نئی تعبیروں سے کام لیا گیا تو لوگ اس ضابطہ قانون کو قبول کرنے کی طرف مائل نہیں ہوں گے۔

۶۔ نظام تعلیم کی اصلاح: ہمارا موجودہ نظام تعلیم فقہ اسلامی کی تشکیل جدید کے لیے موزوں نہیں ہے کیونکہ ہمارا نظام تعلیم طلبہ کے اذہان کو اسلامی بنانے کی بجائے مغربی بناتا ہے جب تک لوگوں کے ذہن تیار نہ ہوں اس وقت تک اسلامی قانون کبھی رائج نہیں ہو سکے گا۔

۷۔ عوام کی اصلاح: اسلامی فقہ کی تشکیل اور اس کے نفاذ سے قبل مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی اصلاح نہایت ضروری ہے اگر اسلامی قانون کی تشکیل کر بھی لی جائے اور حکومت اس کے نفاذ کا تہیہ بھی کر لے تو عین ممکن ہے کہ عوام کی بے عملی اور بے راہ روی نفاذ میں حائل ہو۔

اسلامی جماعتوں پر افسوس ہے کہ اسلامی قانون کی تشکیل اور اس کے نفاذ کا مطالبہ تو زوروں سے کرتی ہیں لیکن معاشرہ کی اصلاح کی طرف ان کی توجہ ہے ہی نہیں۔ اگر تمام مذہبی جماعتیں اپنے فروعی اختلافات کو ختم کر کے معاشرہ کی اصلاح کا بیڑا اٹھا لیں تو ہمارے ملک میں بہت جلد صحت مند بنیادوں پر ذہنی انقلاب برپا ہو جائے گا۔ اس فضا میں اسلامی قانون کا نفاذ نہ صرف آسان ہو گا بلکہ وہ فضا خود زبان حال سے تقاضا کرے گی کہ یہاں اسلامی قانون کا نفاذ ضروری ہے۔

۸۔ مغربی تہذیب کی بیخ کنی: مغربی تہذیب نے ہمارے ذہنوں کو اسلام سے بیگانہ کر دیا ہے۔ اس وجہ سے مغرب زدہ لوگ اسلام اور اس کے قانون کو داستان پارینہ خیال کرتے ہیں۔ جب تک مغرب کے اس زہریلے اثر کو ختم نہیں کیا جاتا اس وقت تک اسلامی قانون کی تشکیل جدید کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

قرآن' حدیث اور فقہ کے مدارج میں اختلاف

اور

اس کا صحیح حل

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدین اور بنوامیہ کے اوائل دور میں مسلمانوں میں قرآن' حدیث اور فقہ کے مدارج میں کسی کو اختلاف نہ تھا۔ سب کا اس امر پر اتفاق تھا کہ قرآن مجید تمام ہدایات اور تمام اسلامی علوم کا سرچشمہ ہے۔ کسی مسئلہ کے اختلاف کے وقت پہلے قرآن کی طرف رجوع کیا جاتا۔ دوسرا درجہ سنت کا تھا۔ سنت سے میری مراد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی فعلی روش ہے جو اپنے اندر تواتر کا رنگ رکھتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود کام کیا' پھر صحابہ نے کیا اور اسی پر کاربند رہے۔ پھر صحابہ نے اپنی اولاد کو وہ عمل سکھایا۔ اسی طرح نسلاً بعد نسلٍ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ عمل ہم تک پہنچ گیا۔ اگر حدیث کی کتب اس عمل کو الفاظ کی صورت میں محفوظ نہ رکھتیں تب بھی وہ عمل ہم تک پہنچ جاتا۔ یہی سنت قرآن مجید کی عملی تفسیر ہے۔

تیسرے درجہ پر حدیث ہے۔ حدیث سے مراد وہ آثار ہیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قصوں کے رنگ میں بیان کیے تھے۔ گو ان کی حفاظت کا سلسلہ آپ کی زندگی میں ہی شروع ہو گیا تھا اور بنوعباس کے عہد میں تدوین کے آخری مراحل طے کر لیے تھے۔ الفاظ کو یاد رکھنے میں غلطی کا امکان ہے' مگر صحابہ نے نہایت ہی دیانت داری سے کام لے کر اس امانت کو اپنی نسلوں تک پہنچا دیا۔ بایں ہمہ وہ احادیث کا ذخیرہ ظنی ہے ان میں تواتر کا رنگ نہیں ہے۔

چوتھے درجہ پر فقہاء کی آراء کو جگہ دیتے تھے۔

جب مسلمانوں میں چار فقہی مسالک رائج ہو گئے تھے۔ قرآن' سنت' حدیث اور فقہ کے مدارج میں افراط اور تفریط نے جگہ لے لی چونکہ عوام کم علمی کی وجہ سے تقلید پر مجبور ہوتے ہیں۔ سوء قسمت سے ہر چار مسالک (حنفی' مالکی' شافعی' حنبلی) میں ایک غالیوں کا گروہ پیدا ہو گیا۔ وہ ائمہ کے اجتہاد کو حدیث پر فوقیت دینے لگا۔ یہ مقولہ مشہور ہے: "ایں حدیث صحیح است اما مذہب ما ایں نیست۔ یعنی یہ حدیث تو صحیح ہے مگر ہمارا یہ مذہب نہیں ہے۔ حالانکہ ائمہ کے واضح الفاظ ہیں کہ جب کوئی صحیح حدیث مل جائے جو ہمارے اجتہاد کے خلاف ہو تو حدیث پر عمل کرو۔ اس قسم کے غالی فرقہ نے فقہاء کے اقوال پر حدیث کو مقدم کیا۔

مقلدین کی اس روش کے نتیجہ میں ایک غیر مقلدین یا اہل حدیث کا گروہ پیدا ہو گیا۔ یہ گروہ اس کورانہ تقلید کا سخت مخالف تھا۔ ان لوگوں نے زمانہ کے حالات کے مطابق اجتہاد کرنے کو لازمی قرار دیا' تاکہ نئے پیدا ہونے والے مسائل کو حل کیا جائے۔ دوم ائمہ کی آراء پر حدیث کو مقدم کیا۔ اس گروہ میں بھی ایک وقت میں غلو آ گیا۔ وہ قرآن کریم کی آیات پر احادیث کو مقدم کرنے لگے۔ یہ غلو پہلے غلو سے بھی بدتر تھا۔

اس گروہ کے رد میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا جو اپنے آپ کو اہل قرآن کہتے ہیں' جنھوں نے تمام احادیث صحیحہ کو (نعوذ باللہ) ایک جھوٹ کا انبار قرار دے دیا۔ اپنی ناقص فہم کی بناء پر قرآن مجید کی عجیب وغریب تاویلات کرنا شروع کر دیں۔ غرض کہ مقلدین نے ائمہ کے اقوال کو حدیث پر مقدم کیا' اہل حدیث نے حدیث کو قرآن پر مقدم ٹھہرایا اور اہل قرآن نے احادیث صحیحہ کو رد کر دیا۔

اسلامی نقطہ نگاہ سے قرآن' سنت' حدیث اور فقہ میں صحیح مدارج یہ ہیں:

اوّلیت قرآن مجید کو حاصل ہے' کیونکہ وہ خدا کا کلام ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی ظاہری اور باطنی حفاظت اپنے ذمہ لی ہوئی ہے۔ قرآن مجید ہمارے ہاتھوں میں قطعی اور یقینی ہے۔ اس کی قطعیت پر بے شمار خارجی اور اندرونی شواہد موجود ہیں۔

دوسرا درجہ سنت کا ہے۔ کیونکہ اس میں تواتر کا رنگ پایا جاتا ہے۔ ہر نسل نے آنے والی نسل کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل پہنچا دیا اور کسی مرحلہ پر انقطاع نہیں پایا جاتا۔

تیسرا درجہ حدیث کا ہے کیونکہ وہ ظنی ہیں۔ ظن حق اور یقین کے مقابل پر گرا ہوا ہے:

اِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا. یعنی ظن حق کے مقابل پر کچھ نہیں۔

چوتھا درجہ فقہاء کی آراء کا ہے۔ انسان کی عقل محدود ہے۔ وہ غلطی کر سکتی ہے۔ اس وجہ سے ادنیٰ درجہ کی حدیث کو بھی انسانی رائے پر اوّلیت حاصل ہو گی۔

چند کلیات قانون

فقہاء نے قواعد کلیہ کی یہ تعریف کی ہے حکم کلی ینطبق علی جمیع جزئیاتہ یعنی ایسا حکم کلی جو اپنے تمام جزئیات پر حاوی ہو۔

فقہاء مجتہدین نے قرآن مجید اور احادیث کی روشنی میں قانون سازی کے لیے ایسے ایسے کلیے بیان کر دیے ہیں جن کی رو سے قانون سازی میں آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ کچھ اہم کلیے درج کیے جاتے ہیں۔

ا۔ عدم حرج

الیسر رفع الحرج والمشقۃ تجلب التیسیر. نرمی کی جائے اور تنگی دور کی جائے۔

مشقت اس امر کی مقتضی ہے کہ آسانی پیدا کی جائے۔

ایسا قانون وضع نہ کیا جائے جو تکلیف کا موجب ہو اور اس پر عمل کرنا دشوار ہو۔ اس سے معاشرہ میں بدنظمی اور قانون شکنی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے:۔ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔[1] یعنی اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اتنی تکلیف نہیں دیتا جس کو وہ برداشت نہ کر سکے۔

يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ.[2] اللہ تعالیٰ تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے وہ تمھارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ بعثت بالحنیفیة السمحة میں سہل مذہب لے کر مبعوث ہوا ہوں۔

احب الدین الی اللہ الحنیفیة السمحة یعنی اللہ کا پسندیدہ دین وہ ہے جو سیدھا اور آسان ہو۔

۲۔ قلت تکلیف

عدم حرج کا لازمی نتیجہ قلت تکلیف ہے۔ جب قانون وضع کیے جائیں تو وہ ایسے نہیں ہونے چاہئیں کہ لوگوں کی ہمتیں ان قوانین پر عمل کرنے سے جواب دے دیں۔ نہ وہ اس قسم کے قانون ہوں جو لوگوں کے مزاج کے منافی ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ لا ضرر ولا ضرار فی الاسلام یعنی اسلام میں نہ تو کسی کو تکلیف دیتا ہے اور نہ خود تکلیف اٹھاتا ہے۔ (دار قطنی)

فقہاء نے کہا۔ الضرر یزال نقصان دور کیا جائے۔

۳۔ تدریج

قرآن مجید نے عرب قوم سے ان برائیوں کو جن میں وہ مدت سے مبتلا تھے۔ تدریجاً دور کیا اگر ان برائیوں کو یک لخت دور کرنے کا حکم دیا جاتا تو اسلامی اجتماعی زندگی میں بدنظمی اور انتشار پیدا ہو جاتا تو اللہ تعالیٰ نے نہایت ہی پر حکمت طریقے سے بری رسومات اور برائیوں کو تدریجاً حرام قرار دیا تاکہ مسلمانوں کو ان کے چھوڑنے میں کسی قسم کی تکلیف نہ ہو۔

شراب کو حرام کیا تو تدریجاً جوا حرام کیا تو تدریجاً قرآن مجید کا یہ انداز مجتہدین کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ کسی برائی کو دور کرنے کے لیے قانون بنائیں تو پہلے اس بری رسم کے بد مضرات اور نتائج سے

---

[1] بقرہ ۲۸۶۔ [2] البقرہ ۲:۱۸۵۔

لوگوں کو آگاہ کریں۔ اس کے بعد اس رنگ میں برائی کے استیصال کے لیے قانون بنائیں۔ جن سے معاشرہ میں اضطراب اور بے چینی پیدا نہ ہو۔ لوگ آسانی سے اس حکم پر حکم کرنے کو تیار ہو جائیں۔

۴۔ نسخ

نسخ کے دو مطلب ہیں ایک تو یہ کہ پہلا حکم بالکل ختم کر دیا جائے۔ دوم حالات کے مطابق پہلے حکم میں کسی قسم کی ترمیم و توضیح کر دی جائے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَۃٍ اَوۡ نُنۡسِهَا نَاْتِ بِخَیۡرٍ مِّنۡهَاۤ اَوۡ مِثۡلِهَا. (البقرہ ۲:۱۰۶)

ہم اپنے پہلے احکام میں سے کوئی حکم منسوخ نہیں کرتے یا فراموش ہونے نہیں دیتے جب تک اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم نازل نہ کر لیں۔

یہاں نسخ سے مراد یہ نہیں ہے کہ قرآن کی کسی آیت نے دوسری آیت کو منسوخ کر دیا ہے۔ اس جگہ آیت سے مراد پہلی شرائع ہیں۔ جیسا کہ ابوبکر جصاص نے احکام القرآن میں لکھا ہے:۔ انما الذکر فیھا من النسخ فانما المراد به نسخ الشرائع الانبیاء المتقدمین آیت میں نسخ کا ذکر ہے اس سے مراد سابق انبیاء علیہم السلام کی شریعتوں کا نسخ ہے۔

ابو مسلم اصفہانی کی بھی یہی رائے ہے۔

یہ آیت مجتہدین کو یہ تعلیم دیتی ہے۔ قانون وضع کرتے وقت وہ ملکی حالات کے پیش نظر وہ پہلے کے وضع کیے ہوئے قانون بدل سکتے ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں۔ نسخ کی دوسری قسم یہ ہے کہ مصلحت کی رعایت سے یا فساد کے اندیشہ سے کوئی حکم دیا جائے۔ پھر ایسا زمانہ آ جائے کہ اس میں یہ مقصود نہ رہ جائے تو وہ حکم بدل جائے گا۔"[1]

۵۔ الضرورات تبیح المحظورات یعنی ضرورت ممنوع چیزوں کو مباح کر دیتی ہے۔ مثلاً انتہائی بھوک کی حالت میں جان بچانے کے لیے حرام چیز وغیرہ کھانا جائز ہے فقہاء نے اس اصول پر یہ حد بندی عائد کی ہے کہ جو چیز ضرورت کی بناء پر جائز ہوگی۔ اسی کی مقدار سے اس کا اندازہ کیا جائے گا۔ چنانچہ بھوکے کو اس سے زیادہ حرام چیز کا استعمال جائز نہیں ہے۔ جتنی سے اس کی جان بچ جائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَیۡکُمُ الۡمَیۡتَةَ وَالدَّمَ وَلَحۡمَ الۡخِنۡزِیۡرِ وَمَاۤ اُهِلَّ بِهٖ لِغَیۡرِ اللّٰهِ فَمَنِ اضۡطُرَّ غَیۡرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَاۤ اِثۡمَ عَلَیۡهِ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ. اس نے تم پر صرف مردار اور خون اور سور کا گوشت اور وہ جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لیے پکارا جائے حرام کیا ہے۔ مگر جو شخص مضطر ہو جائے نہ خواہش کرنے والا ہو اور نہ حد سے گزرنے والا تو اس پر کوئی گناہ نہیں بے شک اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ صفحہ ۱۱۲۔

۶۔ نقصان کو نقصان سے دور نہ کیا جائے

اَلضَّرَرُ لَا یُزَالُ بِالضَّرَرِ یعنی نقصان دوسرے نقصان سے دور نہ کیا جائے مثلاً ایک بھوکے کی جان کو بچانے کی غرض سے دوسرے بھوکے کا کھانا کھا لینا جائز نہیں۔

۷۔ عام نقصان کی خاطر خاص نقصان برداشت کیا جائے

یتحمل الضرر الخاص لاجل دفع الضرر العام یعنی عام نقصان کی خاطر خاص نقصان برداشت کیا جائے۔ مثلاً قومی اور ملکی مفاد کو ذاتی اور شخصی مفاد پر ترجیح دینا۔ جب تاجر چیزوں کی قیمتوں کو بڑھا دیں تو حکومت نرخ مقرر کرنے کی مجاز ہے۔

۸۔ بڑے نقصان کو چھوٹے نقصان کے ذریعہ دور کیا جائے

اعظم ضرراً یزال بالاخف. یعنی بڑے نقصان کو چھوٹے نقصان کے ذریعہ دور کیا جائے۔ مثلاً کسی نے لکڑی وغیرہ غصب کر کے اپنی عمارت میں لگا لی تو اگر عمارت کی قیمت زیادہ ہے اور اس کے نکالنے سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔ تو عمارت کو گرا کر مستغیث کو لکڑی واپس کرنا ضروری نہ ہوگا بلکہ لکڑی کی قیمت مستغیث کو دلا دی جائے قیمت ادا کرنے کے بعد وہ مالک ہو جائے گا۔

۹۔ جب دو خرابیوں کا تعارض ہو جائے تو کم خرابی کو قبول کیا جائے

اذا تعارض مفسدتان روعی اعظمها ضرراً بارتکاب خفها جب دو خرابیوں کا مقابلہ ہو تو بڑی خرابی سے بچنے کے لیے چھوٹی خرابی کا ارتکاب گوارا کیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص زخمی ہے وہ نماز پڑھنا چاہتا ہے۔ اگر وہ سجدہ کرتا ہے تو اس کا زخم بہنے لگتا ہے اگر سجدہ نہ کرے تو نہیں بہتا اس صورت میں حنفیہ یہ کہتے ہیں وہ شخص بیٹھ کر نماز پڑھ لے۔ رکوع اور سجدہ کو اشارہ سے ادا کر لے۔

۱۰۔ مفاسد کو دور کرنا مصالح حاصل کرنے سے زیادہ مقدم ہے

درء المفاسد اولی من جلب المصالح. یعنی مصالح حاصل کرنے سے زیادہ مقدم مفاسد دور کرنا ہے شریعت اسلامی میں نیک کام بجالانے سے زیادہ برائیوں سے بچنے پر زور دیا گیا ہے چنانچہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اذا امرتکم بشئی فاتوا منه ما استطعتم و اذا نهیتم عن شئی فاجتنبوه.[1] جب میں تمھیں کسی بات کا حکم دوں تو جس قدر طاقت رکھتے ہو اس کے کرنے کی کوشش کرو اور جب کسی امر سے روکوں تو اس سے رک جاؤ۔

۱۱۔ اذا تعارض المانع و المقتضی یقدم المانع.[2] جب مانع اور مقتضی کا تعارض ہو تو مانع

۱۔ الاشباہ والنظائر صفحہ ۶۲۔ ۲۔ الاشباہ والنظائر صفحہ ۸۴۔

کو مقدم سمجھا جائے۔

یعنی جب کسی حالت میں اس کے روکنے والے اور چاہنے والے دونوں اسباب موجود ہوں تو روکنے والے اسباب کے حکم پر عمل کیا جائے گا۔ مثلاً کسی شخص پر دو زخم لگے ایک عمداً جو قصاص کو ضروری قرار دیتا ہے۔ دوسرا خطا جس سے قصاص واجب نہیں تو اس صورت میں قصاص واجب نہ ہوگا بلکہ دیت واجب ہوگی۔

۱۲۔ الحاجة تنزل منزل الضرورة عامة او خاصة یعنی احتیاج ضرورت کے قائم مقام ہو جاتی ہے۔ چاہے وہ عام ہو یا خاص۔ مثلاً احتیاج کی وجہ سے بیع سلم اور اہل پیشہ سے معاملہ میں اگرچہ شے موجود نہیں ہوتی لیکن اس اصول کے مطابق وہ جائز ہے۔

اسی طرح ایک ضرورت مند کو بلا سودی قرض نہ مل سکے تو سودی قرض لینا جائز ہے۔

۱۳۔ اذا اجتمع الحلال والحرام غلب الحرام. یعنی جب حلال اور حرام دونوں جمع ہوں تو حرام کو غلبہ ہوگا۔ مثلاً اگر مردار کی چربی گھی کے ساتھ مل جائے تو اس کا استعمال جائز نہیں ہے۔

۱۴۔ تصرف الامام علی الرعیة منوط بالمصلحت. یعنی عوام کے معاملات میں رئیس مملکت کے تصرفات مصلحت پر مبنی ہونے چاہئیں۔ لیکن امام مفاد عامہ کا فیصلہ کرنے میں آزاد نہیں وہ فیصلہ شریعت کے منافی نہیں ہونا چاہیے۔ جیسا کہ فقہ کی کتب میں ہے۔

ویجب علی الامام ان یتق اللّٰہ و یصف الی کل مستحق قد رحاجته من غیر زیادة فان قصر فی ذلک کان اللّٰہ حسیبا[1] امام پر واجب ہے کہ وہ اللہ سے ڈرتا رہے اور ہر مستحق کی ضرورت کو پورا کرے۔ دوسرے کی حق تلفی کر کے کسی کو ضرورت سے زیادہ نہ دے۔ اگر اس میں کوتاہی کرے گا تو وہ اللہ کے سامنے جواب دہ ہوگا۔

لم ینفذ امره شرعا الا اذا وافقه فان خالفه لم ینفذ.[2] امام کا حکم شرعاً جبھی نافذ ہوگا کہ وہ خلاف شریعت نہ ہو ورنہ حکم نافذ نہ ہوگا۔

۱۵۔ الولایة الخاصة اقوی من الولایة العامة. ولایت خاصہ ولایت عامہ سے زیادہ قوی ہے۔ حکومت کو عمومی حیثیت سے انتظام و انصرام کا حق حاصل ہے لیکن جن لوگوں کو خصوصی حیثیت سے انتظام کا حق حاصل ہے انھیں حکومت پر ترجیح ہوگی مثلاً۔

۱۔ ولی کی موجودگی میں حاکم یتیم اور یتیمہ کا نکاح نہیں کر سکتا۔

۲۔ مقتول کا ولی قاتل سے دیت لینے کا حق رکھتا ہے۔ لیکن حاکم کو کوئی اختیار حاصل نہیں۔

۱۶۔ الامور بمقاصدها یعنی کام مقصد کے لحاظ سے دیکھے جاتے ہیں مثلاً دشمن میدان جنگ

---

[1] الاشباہ والنظائر از زیلعی صفحہ ۸۸۔ [2] الاشباہ والنظائر صفحہ ۸۸۔

میں مسلمانوں کو آگے رکھ کر ڈھال بنانا چاہے تو اس صورت میں مسلمانوں پر حملہ کر کے دشمن تک پہنچنے میں کوئی حرج نہیں۔
انگور وغیرہ کا شیرہ شراب کے لیے نہ ہو بلکہ تجارت اور سرکہ بنانے کے لیے ہو تو جائز ہے۔

۱۷۔ اس قاعدہ کا تقاضا یہ ہے کہ جب نیت اور ظاہر میں اختلاف ہو تو نیت معلوم ہو جانے کے بعد اسی کے مطابق فیصلہ ہو گا۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے۔ **انما الاعمال بالنیات**۔ یعنی اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔

۱۸۔ **الیقین لا یزول بالشک**۔ یعنی یقین شک سے زائل نہیں ہوتا۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:۔
اذا وجد احدکم فی بطنہ فاشکل علیہ اخرج منہ شئی ام لا فلا یخرجن من المسجد حتی یسمع صوتا او یجد ریحا[1] جب کوئی اپنے پیٹ میں قراقر محسوس کرے اور یہ پتہ نہ چل سکے کہ وضو توڑنے والی چیز پائی گئی ہے یا نہیں تو جب تک آواز نہ سنے یا بدبو محسوس نہ کرے اس وقت تک وضو کرنے کے لیے مسجد سے نہ نکلے یعنی جب تک یقین نہ ہو جائے اس وقت تک عمل نہ کرے۔
کیونکہ پہلے کی حالت پر یقین ہے اور دوسری حالت میں شک ہے اس وجہ سے یقینی حالت کو شک کی وجہ سے ختم کرنے کا حکم نہیں ہے۔ **لان الشک الطاری لایرفع حکم الیقین السابق** یعنی بعد میں پیش آنے والا شک پہلے کے یقین کے حکم کو نہیں ختم کرتا۔

۱۹۔ **من شک فعل شیئا ام لا فالا صل انہ لم یفعل**۔ یعنی جس کو کسی عمل کرنے اور نہ کرنے میں شک ہو تو اصل نہ کرنا مانا جائے گا۔
اسی طرح **من تیقن الفعل وشک فی القلیل والکثیر فتعمل علی القلیل**۔ یعنی اگر کسی عمل کے کرنے کا یقین ہے لیکن اس میں کمی اور بیشی میں شک ہے تو کمی پر عمل کیا جائے گا۔
مثلاً کسی نماز پڑھنے یا نہ پڑھنے میں شک ہو تو دوبارہ پڑھنے کا حکم ہو گا اگر رکعت کی تعداد میں شک ہو تو کم تعداد صحیح سمجھی جائے گی۔
ماثبت بیقین لایرتفع الا بالیقین یعنی جو بات یقین سے ثابت ہو اس کو یقین ہی ختم کر سکتا ہے۔

۲۰۔ **الاصل العدم** اصل عدم ہے۔ مثلاً بیوی نے خاوند پر نان نفقہ کا دعویٰ کیا اور شوہر نے ادائیگی کا اقرار کیا یا قرض دار نے قرض کی ادائیگی کا اقرار کیا۔ قرض خواہ نے انکار کیا تو

[1] مسلم شریف۔

عورت اور قرض خواہ کا قول قابل اعتبار مانا جائے گا کیونکہ اصل عدم ہے لیکن جہاں اصل صفات پائی جائیں وہاں یہ اصول ہوگا الاصل الوجود یعنی اصل وجود ہے۔ مثلاً کسی شخص نے جانور جوان سمجھ کر خرید کیا پھر بیچنے والے اور خرید کرنے والے میں اختلاف رونما ہوگیا تو بیچنے والے کا قول معتبر ہوگا کیونکہ جوانی صفات اصلیہ میں سے ہے۔ لیکن واضح دلیل سے اس کے خلاف ثبوت مل جائے تو مشتری کا قول معتبر ہوگا۔

۲۱۔ الاصل اضافة الحادث الی اقرب اوقاته. یعنی حادثہ کی نسبت قریب وقت کی طرف ہو گی۔ مثلاً مطلقہ عورت کا دعویٰ ہے کہ مجھے خاوند نے مرض الموت میں طلاق دی تھی۔ اس کی وراثت میں میرا حق ہے۔ ورثاء نے کہا کہ مرض سے پہلے طلاق دی تھی۔ اس لیے وراثت میں حق نہیں تو اس اصول کی رو سے عورت کے قول کو معتبر سمجھا جائے گا۔

۲۲۔ الحدود تندری بالشبهات یعنی حدیں (مقررہ سزائیں) شبہ کی وجہ سے ساقط ہو جاتی ہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ ادروا الحدود عن المسلمین ما استطعتم فان وجدتم للمسلم مخرجا فخلوا سبیله فان الامام ان یخطی فی العفو خیر من ان یخطی فی العقوبة. (ترمذی) یعنی جہاں تک ممکن ہو سکے۔ مسلمانوں کو مقررہ سزاؤں سے بچاؤ۔ اگر ثبوت نہ ملنے کی وجہ سے چھوڑنے کی گنجائش نکل سکتی ہو تو چھوڑ دو کیونکہ حاکم کا معافی میں غلطی کرنا سزا میں غلطی کرنے سے کہیں زیادہ بہتر ہے۔

حد کی طرح قصاص بھی شبہ سے ساقط ہو جاتا ہے۔ فقہاء نے کہا ہے: القصاص کالحدود فی الدفع بالشبهة فلا یثبت الابما تثبت به الحدود. (الاشباہ والنظائر ص ۹۳) یعنی قصاص (جان کے بدلے جان) حدود کی طرح ہے۔ جس طرح وہ شبہ سے ختم ہو جاتا ہے اسی طرح یہ بھی۔ اس کا ثبوت بھی اسی طرح ہوتا ہے۔ جس طرح حدود (مقررہ سزائیں) کا ثبوت ہوتا ہے۔

۲۳۔ الاصل فی الاشیاء الاباحة. اشیاء میں اصل اباحت ہے۔ اس اصول کا تعلق صرف ان امور سے ہے جن کے بارے میں شریعت کا کوئی فیصلہ نہیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ الحلال بین والحرام بین وبینهما امور مشتبهات (بخاری) حلال کا حکم بھی واضح ہے اور حرام کا بھی اور ان دونوں کے درمیان کچھ ایسے امور ہیں جو مشتبہ ہیں۔

اس اصول کی رو سے کسی مشتبہ امر کے متعلق قطعی دلیل سے کوئی فیصلہ نہ کیا جا سکے تو اباحت کا حکم دیں گے۔ ابوبکر جصاص نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا ہے۔ ان الاشیاء علی الاباحة مما لا یحظره العقل فلا یحرم شیٔ الا ماقام دلیله.[1] جن چیزوں سے عقل نہ روکے وہ سب مباح

[1] احکام القرآن جلد ۱ صفحہ ۳۰۔

ہیں۔ البتہ جن کی حرمت پر دلیل قائم ہو وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

۲۴۔ التعزیر یثبت مع الشبهه. یعنی تعزیر شبہ کے ساتھ ثابت ہو جاتی ہے۔ تعزیر سے مراد وہ سزائیں جو نظم و نسق قائم رکھنے کے لیے سیاستاً اور اصلاحاً دی جاتی ہیں۔

الکفارات تثبت معها. یعنی کفارے بھی شبہ کے ساتھ ثابت ہوتے ہیں۔

۲۵۔ العادة محکمة یعنی عادت فیصلہ کرنے والی بنائی گئی ہے۔

عادت کی دو قسمیں ہیں۔ ۱۔ کلی عادت۔ ۲۔ بدلنے والی عادت۔

کلی عادت کی تعریف یہ ہے۔

العوائد العامة لا تختلف بحسب الاعصار والاحصار والاحوال کالاکل والشرب والفرح والحزن والنوم والیقظة والمیل الی الملائم والنفور عن المنافر و تناول الطیبات والمستلذات واجتناب المولمات والخبائث وما اشبه ذالک۔[1] وہ عادتیں جو کسی زمانہ اور کسی مقام میں بدلتی نہیں ہیں۔ جیسے کھانا پینا غم خوشی سونا جاگنا پسندیدہ چیزوں کی طرف رغبت بری چیزوں سے نفرت، پاکیزہ اور لذیذ چیزوں کا استعمال ضرر رساں اور گندی چیزوں سے پرہیز اور جو چیزیں ان کے مشابہ ہیں۔ وہ سب کلی عادات میں شمار ہوں گی۔

اس قسم کی عادات کے متعلق فقہاء کا یہ نظریہ ہے کہ چونکہ یہ طبعی اور فطری ہیں اس وجہ سے ان میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔

بدلنے والی عادت یہ ہے۔ العوائدالتی تختلف باختلاف الاعصار والامصار والاحوال کهیات اللباس والمسکن واللین فی الشدة والشدة فیه والبطیٔ والسرعة فی الامور والاناء ة والاستعجال وما کان نحو ذالک۔[2]

وہ عادات جو زمانہ مقامات اور حالات کے لحاظ سے تبدیل ہوتی رہتی ہیں۔ جیسے لباس کی وضع قطع، مکان کی بناوٹ، سختی میں نرمی اور نرمی میں سختی کام میں عجلت و تاخیر سنجیدگی متانت اور جلد بازی وغیرہ۔ اس قسم کی عادات کے متعلق فقہاء کا یہ نظریہ ہے کہ حالات اور زمانہ اور مقامات کے لحاظ سے ان میں فیصلہ ہوگا ایک جگہ کا حکم دوسری جگہ والوں پر مسلط نہیں کیا جا سکتا اس سے تنگی اور دشواری پیدا ہو گی۔

۲۶۔ الاجتهاد لا ینقض بالاجتهاد. یعنی ایک اجتہاد دوسرے اجتہاد سے نہیں ٹوٹتا۔ کیونکہ اجتہاد اپنے زمانہ کے حالات کے مطابق کیا جاتا ہے۔ حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اس وجہ اجتہاد میں تبدیل آئے گی۔

حضرت عمرؓ نے کئی مسائل میں اجتہاد سے حضرت ابوبکرؓ کے حکم کے خلاف فیصلہ کیا لیکن ان کے حکم کو باطل نہیں ٹھہرایا۔

۱۔ الموافقات صفحہ ۲۹۷۔ ۲۔ الموافقات صفحہ ۲۹۷۔

۲۷۔ التابع تابع. تابع کا حکم تابع ہی کا رہے گا۔ مثلاً پیٹ کا بچہ جانور کی بیع میں شامل ہو گا۔ علیحدہ اس کی بیع اور ہبہ وغیرہ صحیح نہیں ہے۔
راستہ وغیرہ سب زمین کی بیع میں داخل ہوں گے۔ انھیں الگ کر کے بیع کرنا درست نہیں۔ التابع یسقط المتبوع، یعنی متبوع کے ساقط ہونے سے تابع ساقط ہو جائے گا۔ جب فرض نماز جنوں وغیرہ کی وجہ سے ساقط ہو گئی تو سنتیں بھی ساقط ہو جائیں گی۔ یسقط الفرع اذا سقط الاصل یعنی اصل ساقط ہو جانے سے فرع ساقط ہو جاتی ہے۔

۲۸۔ لا ینسب الی ساکت قول لکن السکوت فی معرض الحاجة بیان. یعنی خاموش کی طرف کسی بات کی نسبت درست نہ ہو گی۔ لیکن خاموشی بوقت ضرورت اظہار شمار ہو گا۔ مثلاً کوئی شخص کسی غیر کو اپنے مال میں تصرف کرتا ہوا دیکھے اور خاموش رہے تو یہ خاموشی اجازت پر محمول نہ ہو گی۔

۲۹۔ الاجتہاد لا یعارض النص. یعنی اجتہاد نص صریح کے خلاف نہیں ہوتا جس معاملہ میں نص صریح موجود ہو۔ اس میں اجتہاد کی اجازت نہیں ہے اگر کوئی اجتہاد نص صریح کے خلاف ہے تو وہ جائز نہیں ہے۔

۳۰۔ لا ینبغی الحکم علی الموہوم خصوصاً فیما یکون الواجب فیه الاخذ بالاحتیاط. یعنی موہوم بات کا فیصلہ دینا مناسب نہیں بالخصوص جہاں احتیاط پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۳۱۔ حرمة الملک باعتبار حرمة المالک. یعنی ملکیت کی حرمت کا اعتبار مالک کی حرمت کے اعتبار سے ہے۔ اس کلیہ کی رو سے وہ جانور جو چرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔ دوسرا شخص اس کو پکڑ لے تو وہ اس کا مالک نہ ہو گا کیونکہ جانور میں مالک بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔ مالک موجود ہے۔ اس وجہ سے اس کی ملکیت ہی وہ جانور سمجھا جائے گا۔

۳۲۔ الثابت بالعرف کالثابت بالنص. یعنی عرف و رواج سے جو بات ثابت ہو وہ نص سے ثابت ہونے کی مثل ہے۔

۳۳۔ ان البناء علی الظاهر فیما یتعذر الوقوف علی حقیقة جائز. یعنی جب اصل حقیقت پر پہنچنا دشوار ہو۔ اس میں ظاہری حالت پر فیصلہ کرنا جائز ہے۔

۳۴۔ مجرد الخبر لا یصلح حجة. محض خبر حجت بننے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

۳۵۔ الثابت بالبیعة کالثابت کالمعاینة. شہادت سے جو چیز ثابت ہو۔ آنکھوں دیکھی چیز کی طرح ثابت ہے۔

۳۶۔ خبر الواحد لا تنفک من الشبهة. خبر واحد شبہ سے خالی نہیں ہوتی۔

۳۷۔ یسقطة اعتبار دلالة الحال اذا جاء التصریح بخلافها. حالت کی دلالت کا اعتبار نہ ہوگا۔ جب صراحت اس کے خلاف موجود ہو۔

۳۸۔ ماحرم اخذه حرم اعطائه. جس کا لینا حرام ہے اس کا دینا بھی حرام ہے۔

۳۹۔ ماحرم فعله حرم طلبه. جس فعل کا کرنا حرام ہے۔ دوسرے سے اس کا مطالبہ بھی حرام ہے۔

۴۰۔ الاصل فی الکلام الحقیقة. یعنی کلام کا اصل یہ ہے کہ الفاظ کے حقیقی معنی مراد لیے جائیں۔ ہاں اگر حقیقت پر عمل کرنا محال ہو تو مجاز پر عمل کیا جائے گا۔ مثلاً ایک شخص جس کے پوتے بھی ہیں اور اپنا مکان وقف علی الاولاد کرتا ہے تو اس کے مرنے کے بعد پوتوں کو کوئی حصہ نہیں ملے گا کیونکہ لفظ اولاد کے حقیقی مصداق میں پوتے داخل نہیں ہیں۔

۴۱۔ المطلق یجری علی اطلاقه اذا لم یقم دلیل التقید او دلالة. یعنی کلام دراصل مطلق ہی ہوتا ہے۔ جب تک اس میں کوئی قید صراحۃً یا دلالۃً موجود نہ ہو۔ مثلاً جس وکیل کو غیر مشروط طور پر مال فروخت کرنے کا اختیار دیا جائے تو وہ اپنے موکل کے مال کو مناسب قیمت پر فروخت کر سکتا ہے۔ ہاں اگر موکل اپنی طرف سے قیمت مقرر کر دے تو وکیل اس مال کو کم قیمت پر فروخت نہیں کر سکتا۔

۴۲۔ الحکم یتبع المصلحة الراجحه. حکم راجح مصلحت کے تابع ہے یعنی جن امور کا فائدہ نقصان پر غالب ہو۔ ان کے اختیار کرنے کا حکم ہے اور جن امور میں برائی کے عناصر اچھائی کے عناصر پر غالب ہوں تو شریعت انھیں حرام قرار دیتی ہے۔ شراب جوا وغیرہ کو اسی اصل کے تحت حرام قرار دیا گیا ہے۔

۴۳۔ سبیل الکسب الخبیث التصدق به اذا تعذر الرد علی صاحب الحق. یعنی ناجائز طریقے سے کمایا ہوا مال اگر حق دار کو واپس نہ کیا جا سکے تو خیرات کر دینا چاہیے۔

۴۴۔ ما اجتمع محرم و مبیح الا غلب المحرم. یعنی جب حلال و حرام جمع ہو جائیں تو حرام

چیز غالب ہوتی ہے اگر شکار میں سدھائے ہوئے اور بے سدھائے ہوئے کتے دونوں شریک ہو جائیں تو شکار حرام ہو جائے گا۔

۴۵۔ الاصل فی الاشیاء الاباحۃ حتی یدل الدلیل علی عدم الاباحۃ. اشیاء میں اصل چیز اباحت ہے جب تک کہ کسی چیز کے مباح نہ ہونے کی کوئی دلیل موجود نہ ہو۔

اس اصل کی دلیل یہ آیت ہے۔ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا یعنی جو کچھ زمین پر ہے وہ سب اللہ نے تمھارے لیے پیدا کیا ہے۔

۴۶۔ الخراج بالضمان. یعنی کسی چیز کا نفع اسی کا حق ہے جو اس کے بقاء اور اس کے نقصان کا ضامن ہے۔ اس کلیہ کی بنیاد اس حدیث پر ہے کہ ایک آدمی نے ایک غلام خریدا وہ اس کے پاس ایک مدت تک رہا۔ پھر اس نے اس غلام میں عیب پایا اور اسے واپس کرنے لگا۔ غلام کے سابق مالک نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مقدمہ دائر کیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غلام واپس کرا دیا سابق مالک نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس نے اپنے قبضے کے دوران میں اس غلام سے فائدہ حاصل کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا۔ الخراج بالضمان. نفع سے استفادہ ذمہ داری کی بناء پر ہے۔

۴۷۔ اذا برا الاصیل برا الکفیل. جب اصیل بری الذمہ ہوا تو ضامن بھی بری الذمہ ہوگا۔

۴۸۔ اذا اجتمع المباشر و المتسبب اضیف الحکم الی المباشر. یعنی جب کسی کام میں کام کرنے اور سبب بننے والا دونوں جمع ہو جائیں تو کام کی نسبت کرنے والے کی طرف ہو گی۔ سبب بننے والے کی طرف نہ ہو گی مثلاً ایک شخص نے راستہ میں کنواں کھودا ہے۔ دوسرے شخص نے کسی کو اس کنوئیں میں گرا دیا ہے تو گرانے والا ہلاک کرنے کا ضامن ہے۔ اگر کسی شخص نے چور کی راہنمائی کی اور اس نے چوری کر لی تو چور ضامن ہوگا۔

۴۹۔ ذکر بعض مالا یتجزی کذکر کلہ. یعنی جس چیز کے ٹکڑے نہ ہوسکیں تو اس کے بعض حصے کو ذکر کرنا کل کے ذکر کے مثل ہے مثلاً نصف طلاق کہنے سے ایک طلاق ہو گی۔

۵۰۔ من استعجل الشیء قبل اوانہ عوقب بحرمانہ. جس شخص نے وقت سے پہلے کسی چیز کے حصول میں جلد بازی کی تو اس کو اس سے محرومی کی سزا دی جائے گی۔ مثلاً قاتل وراثت

سے اس وجہ سے محروم ہوتا ہے۔

۵۱۔ من اخرا الشیی بعد اوانه فلیتامل فی الحکم. جس شخص نے وقت کے بعد کسی چیز کو مؤخر کیا تو حکم میں غور فکر کرنا چاہیے۔ مثلاً کسی شخص نے مرض الموت میں وراثت سے محروم کرنے کی غرض سے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں تو وہ ترکہ سے محروم نہ ہو گی۔

۵۲۔ لا عبرۃ بالظن البین خطائه. اس گمان کا اعتبار نہیں کیا جائے گا۔ جس کا غلط ہونا ظاہر ہو۔ مثلاً کسی شخص نے پانی کو ناپاک سمجھ کر وضو کر لیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ پاک تھا تو وضو جائز ہے۔

فقہ کی کتب میں کم و بیش ۱۰۰ قواعد ملتے ہیں ان میں سے کچھ بیان کر دیے گئے ہیں تاکہ پڑھنے والے کے سامنے اسلامی قانون کی خوبیاں آ جائیں قواعد وضع قوانین کے لیے بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب بنیاد عمدہ اور مضبوط ہو گی تو عمارت لامحالہ اچھی ہو گی۔

قواعد کلیہ کے مشہور مصنف تاج الدین سبکی شافعی ہوئے ہیں۔ ان کے بعد جلال الدین سیوطی ہوئے ہیں۔ آپ شافعی المذہب تھے۔ اس موضوع پر ان کی مشہور کتاب الاشباہ والنظائر ہے۔ امام سیوطی کے بعد مشہور مصنف زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم ہوئے ہیں۔ آپ نے فقہ حنفی پر کتب تصنیف کی ہیں۔ قواعد پر ان کی کتاب ''الاشباہ والنظائر'' مشہور ہے۔

اقسام قانون

قانون کی دو قسمیں ہیں۔
فوجداری قانون۔دیوانی قانون۔

حدود

یہ لفظ حد کی جمع ہے جس کے معنی ہیں روک' تقید' امتناع' الحاجز بین الشیئین (دو چیزوں کے درمیان امتیاز کرنے کے ہیں) فقہ میں لفظ حدود ان جرائم کی سزا کے لیے بولا جاتا ہے۔ جن کا ذکر قرآنِ مجید اور حدیث میں آتا ہے۔

تعزیرات

تعزیر کی جمع ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ منع کرنا' باز رکھنا' ملامت کرنا' پھر یہ لفظ تنبیہہ اور تادیب کے لیے بھی استعمال ہونے لگا۔ فقہ کی اصطلاح میں یہ لفظ ان سزاؤں پر استعمال ہوتا ہے جو حاکم وقت کے منشاء پر چھوڑ دی گئی ہوں۔

حد اور تعزیر میں فرق

۱۔ حد کو حق اللہ کہا جاتا ہے۔ اس میں بندہ کوئی تصرف نہیں کر سکتا اور تعزیر کو حق العبد کہا جاتا ہے۔ کیونکہ بندہ اسے معاف کر سکتا ہے۔ زیادتی و کمی بھی' موقعہ حالات اور جرم کی نوعیت کے اعتبار سے سزا کی نوعیت بدلی جا سکتی ہے۔

۲۔ حد نابالغ پر واجب نہیں ہے۔ مگر تعزیر جاری کی جا سکتی ہے۔ ان الحد لا یجب علی الصبی والتعزیر شرع علیہ۔[1]

۳۔ شک کی حالت میں حد کا اجرا ساقط ہو جاتا ہے۔ مگر تعزیر کا اجرا شک کے باوجود جائز ہے۔ ان الحدید یدرأبالشبہات والتعزیر یجب معھا۔[2]

۴۔ حد صرف امام یا قائم مقام امام وقت جاری کر سکتا ہے۔ تعزیر کے لیے یہ قید نہیں۔ وان الحد مختص بالامام والتعزیر یفعلہ الزوج والمولیٰ وکل من رأی احداً یباشر المعصیۃ۔[3]

۱۔ ردالمختار ج ۳ ص ۲۴۵۔ ۲۔ ردالمختار ج ۳ ص ۲۴۵۔ ۳۔ ردالمختار ج ۳ ص ۲۴۵۔

حد میں سزا مقرر ہوتی ہے۔ اس میں کمی بیشی نہیں کی جاسکتی۔ تعزیر میں سزا مقرر نہیں ہے اور حالات اور جرم کی نوعیت کے اعتبار سے سزا معاف بھی کی جاسکتی ہے اور کمی بیشی بھی کی جاسکتی ہے۔

احمد اور ابوداؤد میں حضرت عائشہ کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اقیلوا ذوی الھیئات من عشراتھم الا الحدود (سنن نسائی سنن بیہقی، سبل السلام ج ۴ ص ۵۲، الاحکام السلطانیہ ص ۲۳۸) صاحب اقتدار حدود کے سوا دیگر لغزشوں میں درگزر سے کام لیں۔

والتعزیر لیس فیه تقدیر بل هو مفوض الی رأی القاضی لانه المقصود منه الزجرو احوال الناس فیه مختلفة.[1]

حد میں کسی قسم کی سفارش جائز نہیں جب کہ تعزیر کی صورت میں حاکم کے پاس معاملہ لے جانے سے پہلے اور بعد میں سفارش کی جاسکتی ہے مسند احمد میں صفوان بن امیہ کا واقعہ ہے جب ان کی چادر مسجد سے چوری ہوئی تو ان کا مقدمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس آیا تو آپ نے چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم فرمایا تو صفوان سفارش کے لیے آئے اور دعویٰ سے دست بردار ہونے لگے تو حضور نے فرمایا میرے پاس مقدمہ لانے سے پہلے آپ نے ایسا کیوں نہ کیا اسی طرح فاطمہ نامی بنی مخزوم کی عورت پر چوری کا مقدمہ تھا اس کے ہاتھ کاٹنے کی حد جاری کی گئی تو اسامہ قریش کی طرف سے سفارش کرنے کے لیے گئے تو سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اقرار کر کے رجوع کر لینا حد میں اثر انداز ہوتا ہے مگر تعزیر میں نہیں حدود نافذ کرنے کے سبب اگر کوئی نقصان ہو جائے تو وہ رائیگان ہوگا۔ مگر جب تعزیر میں نقصان ہو جائے تو جمہور کے نزدیک بدل دینا واجب ہے۔ کیونکہ حضرت عمرؓ نے ایک عورت کو خوف زدہ کیا اور اس کے حمل کا اسقاط ہو گیا تو آپ نے دیت دی۔ (الاحکام السلطانیہ ۳۶/۲۳۸، فقہ السنہ ج ۲ ص ۵۹) مگر امام ابو حنیفہ اور امام مالک کی رائے یہ ہے کہ تعزیر کے سبب ہونے والا نقصان رائیگاں ہے کیونکہ دونوں کی اجازت شارع نے دی ہے۔ (ملاحظہ کیجئے ابن عابدین ج ۴ ص ۶۰، الاحکام السلطانیہ ۳۶/۲۳۸، فقہ السنہ ج ۲ ص ۵۹، سبل السلام ج ۴ ص ۵۱)

تعزیر اور تادیب میں فرق

بعض فقہاء کہتے ہیں کہ تعزیر ایسے گناہ کی سزا کو کہتے ہیں جس میں حد نہیں لگائی جاتی اور تادیب اس سے عام ہے یہ گناہ اور بغیر گناہ کے بھی کی جاسکتی ہے۔ جیسے والد اپنے بیٹے، خاوند اپنی بیوی اور آقا اپنے غلام کو کسی معمولی لغزش پر ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے اس کو تادیب کہا جاتا ہے۔ بعض فقہاء کا یہ کہنا ہے کہ بغیر گناہ کے سزا دینے کو تادیب کہتے ہیں۔ جیسے باپ بیٹے، آقا غلام، خاوند اور بیوی کے درمیان ہو سکتی ہے اور اس کے علاوہ جو سزا ہے وہ تعزیر ہے بعض فقہاء کے نزدیک تعزیر اور تادیب میں کوئی فرق نہیں۔

1. رد المختار علی ہامش الدر المختار ج ۳ صفحہ ۲۴۷

یہی آخری نظریہ درست ہے کیونکہ ان کے درمیان فرق کرنے کے لیے کوئی دلیل مضبوط نہیں۔

اسلام میں تعزیری سزاؤں کا اصول

اسلام میں تعزیری سزا کا قانون عدل و انصاف پر مبنی ہے اور انسانی فطرت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ غیر جانبدارانہ قانونی عدل و انصاف کے ساتھ رحم کے تقاضے اور مجرم کی اصلاح کو سامنے رکھتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ.[1]

بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔ پھر جو کوئی معاف کر دے اور اصلاح کرے اس کا اجر اللہ پر ہے۔ وہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا۔ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ.[2] پس جو کوئی تم پر زیادتی کرے تم اس کو اسی کے مطابق سزا دو جو اس نے تم پر کی ہے۔ وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَا عُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ.[3] اگر تم انھیں بدلہ دو تو اتنا دو جتنی تمھیں تکلیف دی گئی اور اگر تم صبر کرو تو وہ صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔

ان آیات سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ سزا کا اصل مقصد انصاف اور اصلاح ہے۔ اگر معاف کر دینے سے اصلاح ہوتی ہو تو معاف کرنا بہتر ہے اور اگر معاف کرنے سے معاشرہ میں بگاڑ اور فساد ہوتا ہو تو سزا دینا ضروری ہے۔

مختلف جرموں کی سزائیں

قتل کی سزا

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِى الْقَتْلٰى اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْاُنْثٰى بِالْاُنْثٰى فَمَنْ عُفِىَ لَهٗ مِنْ اَخِيْهِ شَىْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوْفِ وَاَدَآءٌ اِلَيْهِ بِاِحْسَانٍ ذٰلِكَ تَخْفِيْفٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ فَمَنِ اعْتَدٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَلَهٗ عَذَابٌ اَلِيْمٌ وَلَكُمْ فِى الْقِصَاصِ حَيٰوةٌ يّٰۤاُولِى الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ.[4]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو مقتولوں کے بارے میں تم پر قصاص مقرر کیا گیا ہے۔ قاتل آزاد ہو تو آزاد ہی مارا جائے غلام ہو تو غلام اور عورت ہو تو عورت مگر جس کو اپنے بھائی کی طرف سے کچھ معافی دی گئی ہے تو عمدگی سے پیروی کرنی چاہیے اور نیکی کے ساتھ اسے ادا کیا جائے۔ یہ تمھارے

1۔ الشوریٰ ۴۲: ۴۰۔ 2۔ البقرہ ۲: ۱۹۴۔
3۔ النحل ۱۶: ۱۲۶۔ 4۔ البقرہ ۲: ۱۷۸، ۱۷۹۔

ب کی طرف سے آسانی اور مہربانی ہے۔ پھر جو کوئی اس کے بعد زیادتی کرے اس کے لیے دردناک عذاب ہے اور تمھارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ اے عقل والو! تاکہ تم بچے رہو۔

اس آیت کریمہ میں حسب ذیل احکام ہیں:

۱۔ قصاص یعنی قاتل کو قتل کی سزا دی جائے۔

۲۔ آزاد قتل کرے تو اس کے بدلہ آزاد قاتل کو ہی قتل کیا جائے اگر غلام قتل کرے تو غلام قاتل کو قتل کیا جائے اور عورت قتل کرے تو عورت قاتل کو قتل کیا جائے۔

۳۔ اگر وارث خون بہا پر راضی ہو جائے تو دیت کا لے لینا جائز ہے۔

قتل بغیر عمد کی سزا

قتل بغیر عمد کی سزا خون بہا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: مَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ اَنْ يَّقْتُلَ مُؤْمِنًا اِلَّا خَطَاءً وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا خَطَاءً فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهَا اِلَّا اَنْ يَّصَّدَّقُوْا فَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَّكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ وَاِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ فَدِيَةٌ مُّسَلَّمَةٌ اِلٰى اَهْلِهٖ وَتَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ مُّؤْمِنَةٍ۔[1]

اور کسی مومن کو شایان نہیں کہ وہ مومن کو قتل کرے مگر غلطی سے اور جو کوئی غلطی سے کسی مومن کو مار ڈالے تو ایک مومن غلام آزاد کرے اور خون بہا دے جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے۔ سوائے اس کے کہ وہ معاف کر دیں۔ پھر اگر مقتول ایسے لوگوں سے ہو جو تمھارے دشمن ہیں اور وہ مومن ہو تو ایک مومن غلام آزاد کرنا چاہیے اور اگر ایسے لوگوں سے ہو کہ تم میں اور ان میں معاہدہ ہے تو خون بہا دینا چاہیے۔ جو اس کے وارثوں کے سپرد کیا جائے اور ایک مومن آزاد کیا جائے۔

اس آیت کریمہ سے حسب ذیل احکام مستنبط ہوتے ہیں:

۱۔ قتل بغیر عمد کی سزا مومن غلام آزاد کرنا اور وارثوں کو خون بہا دینا ہے۔

۲۔ دشمن قوم (جو اسلامی حکومت سے برسر جنگ ہو) سے کوئی مسلمان قتل ہو جائے تو اس کی سزا ایک مومن غلام آزاد کرنا ہے۔

۳۔ اگر معاہد قوم کے کسی شخص کو غلطی سے قتل کر دیا ہے تو مقتول کے ورثاء کو دیت دینا ہے اور ایک غلام آزاد کرنا ہے۔

ڈاکہ کی سزا

ڈاکو زنی کی سزا کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

---

[1] النساء ۴: ۹۲۔

اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْہِمْ وَاَرْجُلُہُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِکَ لَہُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَہُمْ فِی الْاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ۔[1]

ان کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور ملک میں فساد پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں صرف یہی ہے کہ وہ قتل کیے جائیں یا صلیب پر مارے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف اطراف سے کاٹے جائیں یا ان کو قید کیا جائے۔ یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں ان کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اس آیت کریمہ میں چار قسم کی سزائیں بیان فرمائی ہیں:

۱۔ جو لوگ ڈاکے کے ساتھ قتل بھی کرتے ہیں ان کو قتل کیا جائے۔

۲۔ جو قتل و غارت کے ساتھ ملک میں فساد برپا کرتے ہیں انھیں صلیب پر لٹکایا جائے تا کہ ان کی سزا کی تشہیر ہو۔

۳۔ جو لوگ ڈاکہ کے ساتھ لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹتے ہیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹنے کا حکم ہے۔

۴۔ جو لوگ محض ڈرا دھمکا کر مال لوٹتے پھرتے ہیں انھیں قید کرنے کا حکم دیا ہے۔ یُنْفَوْا فِی الْاَرْضِ کے معنی قید لیے گئے ہیں۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ اور احمد بن حنبلؒ نے ان الفاظ کے معنی قید ہی لیے ہیں۔

چوری کی سزا

سرقہ کی سزا کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے: وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَۃُ فَاقْطَعُوْٓا اَیْدِیَہُمَا جَزَآءًۢ بِمَا کَسَبَا نَکَالًا مِّنَ اللّٰہِ وَاللّٰہُ عَزِیْزٌ حَکِیْمٌ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِہٖ وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰہَ یَتُوْبُ عَلَیْہِ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ۔[2]

اور چور مرد اور چور عورت سو ان دونوں کے ہاتھ کاٹ دو یہ اس کی سزا ہے جو انھوں نے کیا ہے اللہ کی طرف سے عبرت ناک سزا اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔ پھر جو شخص اپنے ظلم کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو اللہ اس پر رحمت سے توجہ کرے گا اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔

ہمارے اس دور میں قطع ید کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ نے تو قطع ید کے معنی ہاتھ کاٹنے کے لیے ہیں۔ دوسرے گروہ نے قطع ید کے مجازی معنی بھی لیے ہیں یعنی ہاتھ روک دینا۔ یہ گروہ کہتا ہے کہ قطع کا لفظ روکنے کے معنی میں عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے مثلاً: تَقْطَعُوْنَ السَّبِیْلَ سے

1۔ المائدہ ۵: ۳۳۔ 2۔ المائدہ ۵: ۳۸، ۳۹۔

مراد رستہ کا روکنا ہے نہ کہ رستہ کا کاٹنا۔ اسی طرح قطع رحم بھی مجازی معنی میں استعمال ہوا ہے اور قطع لِسانَہ کے معنی میں اسے خاموش کر دیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شاعر نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خلاف ہرزہ رسائی کی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا۔ اقطعوا عنی لسانہ میری طرف سے اس کی زبان کاٹ دو یعنی اسے خاموش کرو۔ یہاں زبان کاٹنے سے مراد زبان روکنا ہے۔

اسی طرح قطع' ید کا معنی یہ ہے کہ چور کے ہاتھ سے معاشرہ کو امن میں لایا جائے خواہ قید کر کے اس کا ہاتھ روک دیا جائے خواہ ہاتھ کاٹ کر روک دیا جائے۔

اگر دونوں آیات پر غور کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے۔ قطع ید کی سزا انتہائی سزا ہے یعنی اگر چور توبہ اور اصلاح نہ کرے اور عادی ہو جائے جس کی وجہ سے معاشرہ کا امن خطرے میں پڑ جائے تو اس چور کی سزا یقینی قطع ید (ہاتھ کاٹنا) ہے۔ نئی تحقیقات نے بھی یہ بات واضح کر دی ہے کہ چور کے دماغ میں چوری کی عادت ایک نیا مرکز چوری کا بنا دیتی ہے۔ جس کا تعلق ہاتھ سے ہوتا ہے۔ ہاتھ کے کٹنے سے وہ مرکز بھی ختم ہو جاتا ہے اور عادت دور ہو جاتی ہے۔

ہاں ایسا چور جس نے کسی مجبوری کے تحت چوری کی ہے اور عادی مجرم نہیں ہے یا کسی معمولی چیز کی چوری کی ہے تو چور کو اصلاح کا موقع دینا چاہیے۔ چور کو اس معمولی چوری کے بدلے حاکم حالات کے مطابق سزا دے سکتا ہے۔ مثلاً قید کر دے یا کوئی اور سزا تجویز کر دے۔

آئمہ مجتہدین کے اجتہاد سے بھی یہی بات ثابت ہے چوری کی سزا میں حد بندی کر دی ہے مثلاً امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دس درہم اور امام شافعیؒ کے نزدیک دینار کے چوتھے حصے سے کم کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں۔ جس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہاتھ کاٹنے کی سزا کسی خاص حد تک پہنچ کر شروع ہوتی ہے۔ سورہ مائدہ کی آیت ۳۹ سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ چور کو توبہ اور اصلاح کا موقع دیا جائے اور آغاز جرم میں ہی اس کو انتہائی سزا نہ دی جائے۔

زنا کی سزا

الزَّانِيَةُ وَالزَّانِيْ فَاجْلِدُوْا كُلَّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا مِائَةَ جَلْدَةٍ وَلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلْيَشْهَدْ عَذَابَهُمَا طَائِفَةٌ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ.[1] زنا کرنے والی عورت اور زنا کرنے والے مرد کا حکم یہ ہے کہ ان دونوں میں سے ہر ایک کو سو کوڑے لگاؤ اور ان پر مہربانی تمہیں اللہ کے حکم کی تعمیل سے نہ روکے۔ اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان لاتے ہو اور چاہیے کہ ان کی سزا کے وقت مومنوں کی ایک جماعت موجود ہو۔

زنا کی سزا کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے۔ ہمارے اس دور کے بعض علماء کا یہ خیال

[1] النور ۲۴:۲

ہے کہ مرد یا عورت شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ ہر حالت میں زنا کی سزا صرف سو دُرّے ہے۔ رجم یعنی سنگ ساری نہیں۔ احادیث میں شادی شدہ مرد یا عورت کو زنا کی پاداش میں رجم کی سزا مذکور ہے۔ وہ سورہ نور کے نزول سے قبل کا حکم ہے۔ جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رواج سابق کے مطابق حکم دیا تھا۔ دوسری شریعت میں زنا کی سزا رجم تھی۔ سورہ نور کی مذکورہ بالا آیات نے دوسری شریعت کے حکم کو منسوخ کر دیا اور قرآن مجید کی کسی آیت میں رجم کی سزا مذکور نہیں ہے۔

جمہور علماء کا گروہ کہتا ہے اگر زانی محصن (شادی شدہ) ہے اسے سنگ سار کیا جائے یہاں تک کہ وہ مر جائے اگر محصن نہیں آزاد ہے اسے سو دُرے اگر غلام ہے پچاس دُرے لگائے جائیں۔

رجم کی سزا میں زانی کے محصن ہونے سے مراد یہ ہے' وہ آزاد عاقل و بالغ اور مسلمان ہو اور اس نے آزاد عورت کے ساتھ مباشرت صحیحہ کی ہو اور وہ دونوں محصن ہوں۔

حدیث میں آتا ہے۔ خُذُوْا عَنِّی قَدْ جَعَلَ اللّٰہُ لَھُنَّ سَبِیْلاً اَلْبِکْرُ بِالْبِکْرِ جَلْدُ مِائَۃٍ وَتَغْرِیْبُ عَامٍ وَالثَّیِّبُ بِالثَّیِّبِ اَلْجَلْدُ والرجمُ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی) مجھ سے یہ تعلیم حاصل کرو اللہ نے ان کے لیے رستہ پیدا کیا ہے۔ کنوارے مرد عورت زنا کریں تو انھیں سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی ہے اور شادی شدہ مرد عورت زنا کریں تو ان کی سزا سو کوڑے اور سنگ ساری ہے۔

فتاویٰ عالمگیری کی عبارت یہ ہے۔

وجب الحد ان کان الزانی محصنا رجمۃ بالحجارۃ حتی یموت واحصان الرجم ان یکون حراً عاقلاً بالغاً مسلماً قد تزوج امراۃ حرۃ نکاحا صحیحا و دخل بھا وھما علی صفۃ الاحصان کذافی الکافی. وان کان غیر محصن فحدہ مائۃ جلدۃ ان کان حراً وان کان عبدا جلدہ خمسین بامر الا مام۔[1]

وَاِذَا وَجَبَ الْحَدُّ وَکَانَ الزَّانِی مُحْصِنًا رَجَمَہٗ بِالْحِجَارَۃِ حَتّٰی یَمُوْتَ لِاَنَّہٗ عَلَیْہِ الصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ رَجَمَ مَاعِزاً وَقَدْ اَحْصَنَ (الھدایہ) جب حد زنا واجب ہو اور زانی محصن ہو اس کو سنگ سار کریں۔ یہاں تک کہ وہ مر جائے (حد زنا میں شادی شدہ کا سنگ سار کرنا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ثابت) کیونکہ آپ نے ماعز کو سنگ سار کیا کیونکہ وہ محصن تھا۔

جرم قذف (اتہام لگانا) کی سزا

شریعت میں قذف کے معنی زنا کی تہمت لگانا ہے۔ زنا کے جھوٹے الزام کی سزا شریعت اسلامی میں اسی کوڑے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے؛

[1] فتاویٰ عالمگیری جلد ۲ کتاب الحدود صفحہ ۱۵۱۔۱۵۲۔

وَالَّذِيْنَ يَرْمُوْنَ الْمُحْصَنٰتِ ثُمَّ لَمْ يَاْتُوْا بِاَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَاجْلِدُوْهُمْ ثَمٰنِيْنَ جَلْدَةً وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ.[1]

اور جو لوگ پاک دامن عورتوں پر تہمت لگائیں پھر چار گواہ نہ لائیں تو انہیں اسی کوڑے لگاؤ اور ان کی گواہی کبھی قبول نہ کرو اور وہی نافرمان ہیں۔

اسی کوڑوں کی سزا حر (آزاد) کے لیے ہے اگر غلام ہے تو اسے چالیس کوڑے لگانے کا حکم دے۔

شراب خوری

قرآن مجید میں شراب خوری کے لیے سزا کا کوئی ذکر نہیں لیکن احادیث سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عہد نبوی میں کوئی متعین سزا نہ تھی۔ صرف پٹائی کا حکم صادر فرمایا کرتے تھے کوئی ہاتھ سے مارتا کوئی جوتے سے کوئی کوڑے سے اور کوئی کھجور کی شاخ سے۔ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت ہے کہ ایک شرابی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں لایا گیا اس کا جرم ثابت تھا آپ نے صحابہ کو فرمایا: اِضْرِبُوْهُ فَقَالَ اَبُوْ هُرَيْرَةَ فَمِنَّا الضَّارِبُ بِيَدِهٖ وَالضَّارِبُ بِنَعْلِهٖ وَالضَّارِبُ بِثَوْبِهٖ. (بخاری کتاب الحدود) یعنی اس کی پٹائی کرو۔ ہم میں سے کوئی ہاتھ سے مارنے لگا کوئی اپنے جوتے سے کوئی اپنے کپڑے سے۔

حضرت انسؓ سے روایت ہے۔ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ جَلَدَ شَارِبَ الْخَمْرِ بِالْجَرِيْدِ وَالنِّعَالِ حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شرابی کو چھڑی اور جوتوں سے مارا۔ مذکورہ احادیث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ شرابی کو چھڑی جوتوں یا دیگر اشیاء کے مارنے سے تعداد کا کوئی تعین نہیں ہوتا۔ ضربات غیر معین ہو جاتی ہیں لہٰذا شرابی کی سزا تعزیر ہے۔

زہری کی روایت ہے۔ اِنَّ النَّبِيَّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَفْرِضْ فِي الْخَمْرِ حدًا وَاِنَّمَا كَانَ يَاْمُرُ مَنْ يَحْضُرُهُ اَنْ يَضْرِبُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ حَتّٰى يَقُوْلَ لَهُمْ اِرْفَعُوْا. (ابو داؤد) یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شراب سے متعلق کوئی حد مقرر نہیں کی آپ حاضرین کو فرمایا کرتے تھے اسے ہاتھوں سے مارو وہ اسے مارتے رہتے یہاں تک کہ فرماتے بس کرو۔

خلفاء کے عہد میں سزا

حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی دور میں شراب نوشی کی سزا چالیس کوڑے تھی۔ جب مقدمات زیادہ آنے لگے تو حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کو جمع کیا۔ غور وفکر کرنے کے بعد متفقہ طور پر اسی کوڑے طے پائے۔

جرم لواطت کی سزا

قرآن میں آتا ہے:

---

[1] النور ۲۴:۴۔

اَللّٰذَانِ یَاتِیٰنِھَا منکم فَاٰذُوْھُمَا. تم میں سے جو دو مرد بے حیائی کا ارتکاب کریں تو ان دونوں کو سزا دو۔

ابو مسلم اصفہانی کے نزدیک یہ آیت جرم لواطت کے متعلق ہے۔ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک لواطت میں سزا نہیں دی جائے گی' تعزیر کی سزا ہو گی یا اسے قید خانہ میں ڈالا جائے۔ جب تک کہ وہ توبہ نہ کرے امام ابو یوسف اور امام محمد کے نزدیک وہ حد کی سزا کا مستوجب ہو گا۔ اگر شادی شدہ ہے تو سنگ سار کیا جائے اگر شادی شدہ نہیں تو کوڑے لگائے جائیں۔ اگر اس نے لواطت کا فعل اپنے غلام یا لونڈی یا اپنی بیوی سے کیا ہے تو اس پر اجماع ہے کہ اسے حد کی سزا نہیں ہو گی۔ اگر مرتکب لواطت کا عادی ہے تو امام اسے قتل کر دے۔ مرتکب محصن ہو یا غیر محصن عربی عبارت یہ ہے:

لو وطی امراۃ فی دبرھا او لا ط بغلام لم یحد عند ابی حنیفۃ و یعزرو یورع فی السجن حتی یتوب و عندھما یحدحد الزنافیجلد ان لم یکن محصناً ویرجم ان کان محصناً ولو فعل ھذا لعبدہ او امتہ او زوجتہ بنکاح صحیح او فاسد لا یحد اجماعاً کذافی الکافی ولو اعتاد اللواطۃ یقتُلُ الامام محصنا کان او غیر محصن کذافی فتح القدیر۔[1]

کنز العمال کے مذکورہ حوالہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ لواطت کے بارے میں تین نظریات ہیں۔ ۱۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک ہم جنسی کی سزا تعزیر ہے۔ اصلاح کے لیے قید میں ڈال دیا جائے۔ امام یوسف اور محمد کے نزدیک ہم جنسی کی سزا حد زنا کی طرح ہے۔ صاحب کافی کا قول ہے کہ اگر مجرم عادی ہو تو امام اس کو قتل کر دے خواہ وہ مومن ہے یا غیر مومن صاحب فتح قدیر کا بھی یہی مسلک ہے۔

حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ سب سے پہلے لواطت کا مجرم حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں لایا گیا حضرت عمرؓ نے نوجوانانِ قریش کو حکم دیا کہ اس سے ہم نشینی ترک کر دو۔

قرآن مجید کا لفظ فَاٰذُوْھُمَا (دونوں کو سزا دو) عام ہے۔ کسی قسم کی سزا تجویز نہیں کی۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے۔ حالات کے مطابق حاکم اس جرم کی سزا تجویز کر سکتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عائشہؓ کی روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اسلامی معاشرہ میں جوں جوں یہ جرم ترقی کرتا چلا گیا سزا سخت ہوتی چلی گئی ہے۔

حمادیہ میں ہے۔ اگر مرد مرد کے ساتھ یا مرد عورت کے ساتھ یا عورت عورت کے ساتھ یا مرد خواجہ سرا یا مخنث یا نامرد یا لڑکے کے ساتھ چپٹ بازی کرے تو تعزیر واجب ہوتی ہے۔ اس میں حد نہیں ہے۔

[1] کنز العمال جلد ۳ صفحہ ۹۹۔

دوسری قسم

دیوانی قانون

دیوانی معاملات کے لیے پانچ امور کا ہونا ضروری ہے:

ا۔ معاہدات

فریقین میں معاہدہ ہوتا ہے مثلاً بیع کا' رہن کا' حوالہ کا' کفالہ کا' ضمانت وغیرہ کا۔

۲۔ امر دعویٰ

جب کسی ایک فریق کی طرف سے معاہدہ کی خلاف ورزی ہوتی ہے تو عدالت میں دعویٰ دائر کیا جاتا ہے۔

۳۔ جواب دعویٰ

عدالت میں مدعا علیہ دعویٰ کا جواب دیتا ہے۔

۴۔ شہادت

مقدمات کا دار و مدار شہادت پر ہے۔ فریقین اپنے اپنے حق میں شہادتیں پیش کرتے ہیں۔

۵۔ فیصلہ

قاضی دعویٰ جواب دعویٰ اور شہادتیں سن کر فیصلہ کرتا ہے۔

امر اوّل کے مطابق قرآن مجید میں آتا ہے کہ جب کوئی معاملہ کرو تو اس کو ضبط تحریر میں لے آیا کرو اور دستاویز پر گواہوں کی شہادت بھی لے لیا کرو۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ وَلْيُمْلِلِ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْـًٔا فَاِنْ كَانَ الَّذِيْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاۗءِ اَنْ تَضِلَّ اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَاۗءُ اِذَا مَا دُعُوْا وَلَا تَسْـَٔـمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا

اِلٰی اَجَلِہٖ ذٰلِکُمْ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰہِ وَاَقْوَمُ لِلشَّھَادَۃِ وَاَدْنٰی اَلَّا تَرْتَابُوْا۔[1]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو جب تم آپس میں مقررہ وقت کے لیے قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لو اور چاہیے کہ تمھارے درمیان لکھنے والا عدل کے ساتھ لکھے اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے۔ جیسا اللہ نے اسے سکھایا ضرور لکھ دے اور چاہیے کہ وہ جس پر حق ہے لکھائے اور وہ اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرے اور اس سے کچھ کمی نہ کرے پھر اگر وہ شخص جس پر حق ہے کم عقل یا ضعیف ہو یا لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ لکھوائے اور دو گواہ اپنے مردوں میں سے گواہی کے لیے بلا لیا کرو۔ پھر اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ان گواہوں میں سے ہوں جن کو تم پسند کرو۔ تا کہ اگر ایک بھول جائے تو ایک ان دونوں میں سے دوسری کو یاد دلائے اور گواہ جب بلائے جائیں انکار نہ کریں اور اس کے وقت تک اسے لکھنے میں کاہلی نہ کرو تھوڑا ہو یا بہت یہ اللہ کے نزدیک بہت انصاف کی بات ہے اور گواہی کو بہت مضبوط کرنے والی ہے اور اس سے بہت قریب ہے کہ تم شک میں نہ پڑو۔

معاہدہ کی پابندی کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَوْفُوْا بِالْعَھْدِ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا۔[2] عہد پورا کرو یقیناً عہد کے متعلق پوچھا جائے گا۔

وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا۔[3] عہد کو پکا کرنے کے بعد مت توڑو۔

امر دوم کے متعلق ارشاد الٰہی ہے:

وَلَا تَاْکُلُوْا اَمْوَالَکُمْ بَیْنَکُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِھَا اِلَی الْحُکَّامِ لِتَاْکُلُوْا فَرِیْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ۔[4]

اور اپنے مالوں کو آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور نہ ان کے ذریعہ حاکموں تک پہنچو تا کہ لوگوں کے مال کا ایک حصہ گناہ کے ساتھ کھا جاؤ۔ حالانکہ تم جانتے ہو۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا ہے کہ جو لوگ جھوٹے دعوے دائر کرتے ہیں وہ گنہگار ہیں۔

امر سوم کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَا تَسْتَوِی الْحَسَنَۃُ وَلَا السَّیِّئَۃُ اِدْفَعْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِیْ بَیْنَکَ وَبَیْنَہٗ عَدَاوَۃٌ کَاَنَّہٗ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ۔[5] اور نیکی اور بدی برابر نہیں بدی

1. البقرہ ۲:۲۸۲۔ 2. بنی اسرائیل ۱۷:۳۴۔ 3. النحل ۱۶:۹۱۔
4. البقرہ ۲:۱۸۸۔ 5. حم سجدہ ۴۱:۳۴۔

کو بہت اچھے طریق سے دور کر۔ پھر تو دیکھے گا کہ وہ شخص کہ تجھ میں اور اس میں دشمنی ہے گویا وہ دل ہنوز دوست ہے۔

اس آیت کریمہ میں جواب دعویٰ کے متعلق نہایت ہی عمدہ اصول وضع کر دیا ہے وہ یہ کہ جواب دعویٰ کے لیے نیک راستہ اختیار کرنا چاہیے۔

امر چہارم کے متعلق ارشاد الٰہی ہے: وَاَقِيْمُوا الشَّهَادَةَ لِلّٰهِ.[1] گواہی کو اللہ کے لیے درست ادا کرو۔

وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ وَمَنْ يَّكْتُمْهَا فَاِنَّهٗ اٰثِمٌ قَلْبُهٗ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ عَلِيْمٌ.[2] اور گواہی نہ چھپاؤ اور جو شخص چھپاتا ہے یقیناً اس کا دل گنہگار ہے اور اللہ تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے۔

امر پنجم کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ.[3] جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو عدل و انصاف کے ساتھ کرو۔

دیوانی قوانین

طوالت سے بچنے کے لیے دیوانی قوانین کی فہرست حوالوں کے ساتھ درج کر دی جاتی ہے۔

لین دین کے قوانین

۱۔	قرضہ جات ضبط تحریر میں لائے جائیں۔	بقرہ ۲:۲۸۲
۲۔	دستاویز پر گواہیاں	بقرہ ۲:۲۸۲
۳۔	گواہوں کا فرض۔	بقرہ ۲:۲۸۲
۴۔	گواہ اور کاتب کو تنگ نہ کیا جائے۔	بقرہ ۲:۲۸۳
۵۔	شہادت نہ چھپائی جائے	بقرہ ۲:۲۸۳
۶۔	رہن	بقرہ ۲:۲۸۳
۷۔	وصیت کے احکام	بقرہ ۲:۱۸۰۔ مائدہ ۵:۱۰۶
	وقف کے احکام	بخاری کتاب الوصایا باب ۲۹ الوقف للغنی والفقیر والضعیف۔

معاشرہ کے متعلق قوانین

منگنی کے احکام	بقرہ ۲:۲۳۵
نکاح کی عمر	النساء ۴:۶

۱۔ الطلاق ۶۵:۲۔ ۲۔ البقرہ ۲:۲۸۳۔ ۳۔ النساء ۴:۵۸۔

حق مہر	النساء۴:۶' النساء۴:۴' النساء۴:۲۰' ۲۱:۲۳'۲۴'۲۵' مائدہ ۵:۵

شغار یعنی باہمی تبادلہ کی شادی

عرب میں یہ رواج تھا کہ ایک شخص اپنی لڑکی یا بہن یا وہ جس کی تولیت اس کے سپرد ہے۔ کسی دوسرے کے نکاح میں دے دیتا اور اس کے بدلہ میں اس کی بیٹی یا بہن وغیرہ سے نکاح کرتا' دونوں فریق مہر نہ دیتے تھے' رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس نکاح کو ناجائز قرار دیا ہے۔

نکاح کا اعلان	النساء۴:۲۴'۲۵' مائدہ ۵:۵
نکاح میں ولی یا سرپرست	اس بارہ میں آئمہ فقہا کا اختلاف ہے فقہ حنفی بغیر ولی کے نکاح جائز قرار دیتا ہے (ہدایہ جلد ا صفحہ ۲۹۳) شیعوں کا بھی یہ نقطہ نگاہ ہے (محمڈن لا امیر علی) امام مالک اور امام شافعی دونوں کا یہ مسلک ہے کہ ولی کی اجازت ضروری ہے۔
زوجین کے مساوی حقوق ہیں	البقرہ۲:۲۲۸
مرد کو کچھ برتری حاصل ہے۔	البقرہ۲:۲۲۸' النساء۴:۳۴
برتری کی وجہ	النساء۴:۳۴
محرمات نکاح	النساء۴:۲۳
کثیر الازدواجی	النساء۴:۳
اگر میاں بیوی کے درمیان جھگڑا ہو جائے تو ان کے درمیان صلح کرانی چاہیے۔	النساء۴:۳۵
طلاق	النساء۴:۳۵
طلاق کیسے دی جائے (طلاق طہر میں دی جائے)	بقرہ۲:۲۲۲
ایک دفعہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے علم میں یہ بات لائی گئی کہ ابن عمر نے اپنی بیوی کو حالت حیض میں طلاق دی ہے تو آپ نے اس طلاق کو ناجائز قرار دیا۔	البقرہ ۲۵:۲۲۸' البقرہ۲:۲۳۴ الطلاق :۲۸
طلاق منسوخ ہو سکتی ہے۔	البقرہ۲:۲۲۸
عدت گزر جانے کے بعد دوبارہ نکاح	البقرہ۲:۲۳۲

طلاق بائن تیسری طلاق کے بعد نکاح حرام ہے۔	البقرہ۲:۲۳۰
ہاں صرف ایک صورت ہے کہ وہ عورت کسی دوسرے شخص سے نکاح کرے اور وہ بھی ناکام ثابت ہو اور خاوند طلاق دے دے تب پہلا خاوند شادی کر سکتا ہے۔	
ایلاء	سورہ بقرہ۲:۲۲۶، ۲۲۷
ظہار	المجادلہ۱:۲
لعان	النور۲۴:۶-۹
خلع	البقرہ۲:۲۲۹
متبنیٰ کے امتناع کا حکم	احزاب۳۳:۴، ۵
میراث و ترکہ	النساء۴:۷
تقسیم قرض اور وصیت کی ادائیگی کے بعد ہو	النساء۴:۷
مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر	النساء۴:۱۱
لڑکے اور لڑکی کا حصہ	النساء۴:۱۱
صرف لڑکیاں وارث ہوں تو کتنا حصہ	النساء۴:۱۱
با اولاد میت کے ماں باپ کا حصہ	النساء۴:۱۱
بے اولاد میت کے ماں باپ کا حصہ	النساء۴:۱۱
میت کے بہن بھائی ہوں تو ماں کا حصہ	النساء۴:۱۱
اولاد نہ ہو تو شوہر کا حصہ	النساء۴:۱۲
اولاد نہ ہو تو شوہر کا حصہ	النساء۴:۱۳
اولاد نہ ہو تو بیوی کا حصہ	النساء۴:۱۳
اولاد ہو تو بیوی کا حصہ	النساء۴:۱۳
ایک بہن یا بھائی ہو تو ہر ایک کا حصہ	النساء۴:۱۲
ایک سے زیادہ ہوں تو کتنا حصہ	النساء۴:۱۲
سگی بہن کا حصہ	النساء۴:۱۷۶

دو بہنیں وارث ہوں تو کتنا حصہ	النساء۴:۱۷۶
کئی بہن بھائی ہوں تو مرد کا حصہ	النساء۴:۱۷۶
یتیم کے متعلق احکام ان کے مال نہ کھاؤ	الانعام:۱۵۲
ان کے اچھے مال سے برا مال نہ بدل لو	النساء۴:۲
رہائش اور مال مشترک رکھ سکتے ہو	البقرہ۲:۲۲۰
مال بقدر ضرورت خرچ کرو	النساء۴:۶
مال دار ان کے مال سے حق الخدمت نہ لے	النساء۴:۶
مفلس حق الخدمت لے سکتا ہے	النساء۴:۶
نا سمجھی کے زمانہ تک مال ان کو نہ دو	النساء۴:۵
عقل و شعور آنے کے بعد مال ان کے حوالے کر دو	النساء۴:۶
مال گواہوں کی موجودگی میں دو	النساء۴:۶

اسلامی قانون کی تدوین کے مراحل

اور دور حاضر میں اسلامی قانون سازی

اسلامی قانون سازی مختلف ادوار میں سے گزری ہے ہر دور میں نئے ابھرتے ہوئے ملکی مسائل کی وجہ سے اجتہاد کو ترقی ہوتی گئی اور نئے نئے ماخذ قانون سازی کے لیے اختیار کیے گئے۔ فقہاء کی علمی کاوشیں اب اسلامی دنیا کے لیے مشعل راہ ہیں۔

فقہ اسلامی کی تدریجی ارتقاء کو حسب ذیل ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

پہلا دور۔ عہد نبوت

اسلامی قانون سازی کا یہ پہلا دور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ابتداء رسالت یعنی ۶۱۰ء سے لے کر ۶۳۲ء پر ختم ہوا۔ اس دور میں قانون سازی کا اصل سرچشمہ قرآن مجید تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تمام سیاسی، اقتصادی، معاشرتی اور مذہبی مسائل قرآن کریم کی روشنی میں حل فرماتے۔ چونکہ اس دور میں اجتماعی زندگی بہت سادہ تھی اس وجہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اجتماعی زندگی کے تمام مسائل اصولی اور دستوری رنگ میں تعلیم فرما دیے۔

اس دور میں اسلامی قانون سازی کے صرف دو ماخذ تھے۔ قرآن اور سنت رسول جیسا کہ

معاذ بن جبل والی حدیث ظاہر کرتی ہے۔ صحابہ کرام خود اجتہاد سے کام شاذ ہی لیتے تھے۔ تمام صحابہ اپنے مسائل رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔

دوسرا دور۔ خلفاء راشدین کا عہد خلافت

اس دور میں فتوحات کی کثرت کی وجہ سے اجتماعی زندگی میں بے شمار نئے مسائل ابھر آئے ان مسائل کو حل کرنے کے لیے خلفاء راشدین کا یہ طریقہ تھا کہ پہلے اس مسئلہ کو قرآن مجید سے تلاش کرتے۔ اگر وہاں سے واضح حکم نہ ملتا تو سنت رسول سے حل کرتے۔ اگر سنت سے کوئی حکم نہ ملتا تو خلفاء راشدین صاحب علم اور صاحب رائے حضرات کے سامنے مسئلہ پیش کرتے اور اسلام کی روح کو دیکھ کر مسئلہ کو حل کرتے۔ جیسا کہ علامہ سیوطی نے اپنی کتاب تاریخ الخلفاء کے باب ابوبکر میں لکھا ہے کہ جب کوئی مسئلہ حضرت ابوبکر کے سامنے پیش ہوتا تو قرآن مجید کی طرف رجوع کرتے اگر وہاں سے فیصلہ مل جاتا تو اس کے مطابق فیصلہ فرما دیتے۔ اگر وہاں سے فیصلہ نہ ملتا تو سنت رسول کے مطابق جس کا انھیں علم ہوتا فیصلہ صادر فرما دیتے۔ اگر وہاں سے بھی کوئی چیز نہ ملتی تو صحابہ کو جمع کرتے اور ان سے دریافت کرتے کہ آیا اس قسم کے معاملہ میں ان کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کسی فیصلہ کا علم ہے۔ اس طرح صحابہ کرام کی ایک جماعت ان کے اردگرد جمع ہو جاتی اگر کسی کو علم ہوتا تو وہ بیان کر دیتا اگر کسی کو فیصلہ کا علم نہ ہوتا تو صاحب الرائے کو جمع کرتے۔ ان سے استصواب کرتے اور کثرت رائے کے مطابق فیصلہ صادر کر دیتے۔

اس دور میں مسائل کو حل کرنے کے لیے دو چیزوں کا اضافہ ہوا۔ اجماع اور رائے۔ اس دور میں فقہ کا تعلق عملی اور واقعاتی امور سے تھا۔ نظری مسائل کی طرف صحابہ کرام کی نظر نہیں اٹھتی تھی۔

اس دور میں صحابہ کرام کے دوران فروعی اختلافات شروع ہو گئے تھے۔

جس کے اسباب حسب ذیل تھے۔

۱۔ قرآن مجید کے سمجھنے میں اختلاف۔

۲۔ حدیث کی لاعلمی کی وجہ سے فتووں میں اختلاف۔

۳۔ حدیث کے قبول کرنے میں اختلاف۔

۴۔ مسلم شیرازہ تین گروہوں اہل سنت والجماعت شیعان علی اور خوارج میں بٹ جانے کی وجہ سے فقہی مسائل میں اختلاف لازمی تھا۔

تیسرا دور۔ بنوامیہ:۔

یہ دور حضرت امیر معاویہؓ کی حکومت ۴۱ھ سے شروع ہو کر دوسری صدی ہجری کی ابتداء تک۔

ممتد ہے۔ فقہ کی ترتیب اور تدوین کا پورا مواد مکمل ہو جانے کی وجہ سے اس دور کو فقہ کا تاسیسی دور کہا جاتا ہے۔ اس دور کی امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اسلامی معاشرہ گروہ بندی میں تقسیم ہو چکا تھا۔ ہر گروہ فقہی مسائل میں اپنے ہی ائمہ کی رائے کو ترجیح دیتا تھا اور انہی کی طرف رجوع کرتا تھا۔

۲۔ احادیث کی روایت عام ہو چکی تھی اور بڑے بڑے شہروں میں احادیث کی تعلیم کے مراکز قائم ہو چکے تھے۔ تابعین کی ایک ایسی جماعت تیار ہو چکی تھی جو علمی میدان میں صحابہ کی جگہ لے سکے۔ اس جماعت میں غیر عرب بھی شامل تھے۔ بعض مورخین کا خیال ہے کہ اسلامی قانون سازی میں عجمیوں کا زیادہ حصہ ہے۔ اگر زیادہ نہ بھی مانا جائے لیکن یہ بات ماننی پڑے گی کہ غیر عرب علماء نے اسلامی علوم کی ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔

۳۔ فقہی مسائل کو حل کرنے میں دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ احادیث کو سامنے رکھ کر فتوی صادر کرتا تھا۔ اس گروہ کا مرکز حجاز تھا۔ ان کا دائرہ تنگ اور محدود تھا دوسرا گروہ اجتماعی مسائل کو عقل کی روشنی میں حل کرتا۔ ان کا مرکز عراق تھا۔

اس دور میں کثرت سے اجتماعی اور تمدنی مسائل ابھر آئے تھے۔ اس وجہ سے قیاس، استحسان اور استصلاح کی نئی اصطلاحوں نے جنم لیا اور ثانوی ماخذ قرار دیے گئے۔

۴۔ تدوین حدیث اور وضع حدیث کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے تمام گورنروں کو حکم بھیجا کہ حدیث نبوی تلاش کر کے انھیں جمع کیا جائے۔

۵۔ اس دور میں فقہاء کے فتاوی پر سرکاری دباؤ ڈالا جانے لگا۔ فقہاء نے فتوے حاکموں کے زیر اثر دیے۔ جس وجہ سے فتاوی میں بددیانتی شامل ہو گئی۔ خصوصاً یزید کی خلافت اور حضرت امام حسین کی شہادت کے بارے میں فقہاء اور علماء نے دیانت داری کا دامن کو چھوڑ دیا تھا اور ایسے بھی فقہاء تھے جنھوں نے حق کا دامن نہیں چھوڑا تھا۔

چوتھا دور

یہ دور علم فقہ کی ترقی کا سنہری دور کہلاتا ہے۔ اس دور میں علم فقہ ایک فن کی شکل اختیار کر گیا۔ اصول فقہ پر کتب لکھی جانے لگیں۔ جلیل القدر فقہاء اس دور کی پیداوار ہیں۔ یہ دور دوسری صدی ہجری (مطابق آٹھویں صدی عیسوی) کے اوائل میں شروع ہوا۔ چوتھی صدی ہجری (دسویں صدی عیسوی) کے وسط میں ختم ہوا۔

اس دور میں مجتہدوں کے اجتہادات وجود میں آ گئے۔ فتاوی اور فیصلوں کی کثرت ہو گئی۔ اس کثرت کی وجہ سے عدالتوں کا کام مشکل ہو گیا کیونکہ ایک قاضی کے سامنے کئی کئی مجتہدین کی ارا

سامنے ہوتی تھیں۔ ان آراء میں ہم آہنگی بھی نہ تھی تو عوام کو قانون کی تدوین کی ضرورت کا احساس ہوا اور حکومت نے بھی اس کی ضرورت کا احساس کیا۔

تاریخ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے عربی زبان کے مشہور ادیب ابن مقفع (م ۱۴۴ھ) نے اس ضرورت کو محسوس کیا۔ اس نے خلیفہ ابو جعفر منصور کے سامنے تدوین فقہ کی تجویز پیش کی اور ابو جعفر کی توجہ اس کی طرف دلائی۔ "اور ان اسلامی ممالک کے متعلق امیر المومنین کو جس مسئلہ پر خاص طور پر غور کرنا ہے وہ یہ فقہی اختلافات کا مسئلہ ہے جو اب اس حد تک پہنچ چکا ہے کہ اس کو نظر انداز کرنا ممکن نہیں رہا ہے اور مسئلہ کا حل اگر امیر المومنین پسند فرمائیں گے تو یہ ہو سکتا ہے کہ امیر المومنین ایک حکم جاری فرمائیں کہ تمام احکام اور فیصلے ایک کتاب کی صورت میں مرتب کر کے امیر المومنین کے سامنے پیش کیے جائیں اور ساتھ ہی ہر گروہ اپنے اپنے نقلی و عقلی دلائل بھی جو وہ اپنے نقطہ نظر کی تائید میں اپنے پاس رکھتا ہے پیش کر دے۔ پھر امیر المومنین اس پورے ذخیرہ پر نظر ڈال کر ہر معاملہ میں اپنی رائے ظاہر فرمائیں اور عدالتوں کو اس کے خلاف فیصلے کرنے سے روک دیں اس طرح وہ منتشر احکام اور فیصلے جو رطب و یابس ہر قسم کی چیزوں پر مشتمل ہیں ایک مدون ضابطہ کی شکل اختیار کر لیں گے اور یہ مجموعہ غلط چیزوں سے پاک ہو گا۔ اس طرح تمام بلاد اسلامیہ ایک ہی ضابطہ قانون کے تحت آ جائیں گے اور توقع ہے کہ اللہ تعالیٰ امیر المومنین کی رائے اور فیصلہ پر تمام امت کو متفق کر دے گا۔"

چنانچہ ۱۴۸ھ میں ابو جعفر منصور حج کے لیے گیا تو اس نے امام مالکؒ سے یہ خواہش کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو تمام ممالک اسلامیہ میں ان کی فقہ پر مجتمع ہونے کے لیے حکم جاری کر دے لیکن امام صاحب نے اس رائے سے اتفاق نہ کیا۔ انھوں نے فرمایا ہر فرقہ اپنے اپنے ائمہ اور فقہاء پر اطمینان رکھتے ہیں۔ ان کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔

ابو جعفر حضرت امام مالکؒ کے اس جواب سے اس وقت تو خاموش رہا لیکن دل میں یہ خیال جم چکا تھا کہ حضرت امام مالک کے ہاتھوں اسلامی قانون کی تدوین کروائی جائے چنانچہ ۱۶۳ھ میں جب وہ پھر حج کے لیے گیا تو اس نے اپنی رائے بڑے زور سے امام مالکؒ کے سامنے پیش کی اور اپنا نقطہ نظر بھی امام صاحب کے سامنے رکھا اس نے کہا کہ:

"اے ابو عبداللہ (امام مالک کی کنیت ہے) آپ علم فقہ کو اپنے ہاتھ میں لیجیے اور اس کو الگ الگ ابواب کی صورت میں مدون کر ڈالیے۔ عبداللہ بن عمر کے تشددات، عبداللہ بن عباس کی رخصتوں اور عبداللہ بن مسعودؓ کی انفرادیات سے بچتے ہوئے ایک ایسا ضابطہ مدون کیجیے جو خیر الامور اوسطہا کے اصول پر مبنی ہو اور جو ائمہ اور صحابہؓ کے فتووں اور مسائل کا مجموعہ ہو۔ اگر آپ نے یہ خدمت انجام دے دی تو ان شاء اللہ آپ کی فقہ پر ہم مسلمانوں کو مجتمع کر دیں گے اور اپنی تمام مملکت میں اس کو جاری کر

کے اعلان کر دیں گے کہ کسی صورت اس کی خلاف ورزی نہ کی جائے۔"

حضرت امام مالک نے خلیفہ ابو جعفر منصور کی اس خواہش کے پیش نظر موطا مرتب کی۔ لیکن وہ اس بات پر راضی نہ ہوئے کہ حکومت کے زور سے قانون کی حیثیت دے دی جائے۔ تاریخ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے خلیفہ ہارون الرشید نے بھی امام صاحب سے اس رائے کا اظہار کیا تھا لیکن امام صاحب نے اتفاق نہ کیا اس دور کی امتیازی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ تمدن کی وسعت۔ اس وجہ سے نئی نئی ضرورتیں، نئے نئے مسائل ظاہر ہوئے اور علم فقہ نے خوب ترقی کی۔

۲۔ علم کی وسعت۔ یونانی علوم کی ترویج و اشاعت نے غور و فکر کے انداز ہی بدل ڈالے واقعاتی فقہ نظری فقہ میں بدل گئی۔ فقہاء نے فکر کے گھوڑے دوڑائے۔ پیش نہ آنے والے مسائل کو بھی زیر بحث لائے اس وجہ سے فروعی اختلافات زیادہ نمودار ہوئے۔

۳۔ تدوین حدیث کا کام اس دور میں مکمل ہوا۔

۴۔ جرح و تعدیل کا فن اس دور میں مدون ہوا۔

۵۔ اصول فقہ کی تدوین ہوئی۔

انحطاط اور تقلید کا دورہ

چوتھی صدی کے بعد تقلید کا رجحان عام ہو گیا علم فقہ کی ترقی رک گئی۔ سقوط بغداد کے بعد تمام سنی فقہاء اس بات پر متفق ہو گئے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہو گیا ہے۔ اس وجہ سے علماء کی اجتہادی قوتوں میں جمود آ گیا۔ انھوں نے مفصل اور طویل کتب کے مختصرات اور مختصرات کی شروع لکھنے پر اکتفا کیا۔ یہی وہ دور ہے جس میں علم کی روشنی مدہم ہونا شروع ہوئی تھی۔ بدعات اور خرافات نے معاشرہ میں جگہ لے لی اور شریعت کی اصل روح مفقود ہو گئی۔ فقہ میں تقلید اور جمود کے وجوہات پر بحث پہلے گزر چکی ہے۔ اس وجہ سے یہاں اعادہ کی ضرورت نہیں۔

بیداری کا دور

موجودہ دور میں جمود کو توڑنے کے ملیے دنیا کے مختلف مسلمان ممالک میں بیداری کی لہریں اٹھیں۔ حقیقت میں جن کے پیچھے امام ابن تیمیہ اور ابن قیمؒ ہیں۔ یہ حنبلی مدرسہ فکر سے تعلق رکھتے تھے۔ بارھویں صدی ہجری میں محمد عبدالوہاب نے مسلمانوں کے علمی اور اجتہادی جمود کو حرکت میں بدلنے کی کوشش کی۔ انیسویں صدی میں مصر میں سیّد جمال الدین افغانی اور شیخ محمد عبدہٗ اور ان کے تلامذہ خاص طور پر سید محمد رضا نے مسلمانوں کو قرآن اور سنت کی طرف مائل کیا اور اندھی تقلید کے خلاف جہاد کیا۔

انہی بزرگوں کے اثر سے شیخ الازہر محمد المصطفیٰ المراغی نے اصلاح و ارشاد کا کام شروع کیا۔ حضرت شیخ نے اگست ۱۹۳۷ء میں بمقام ہیگ منعقد ہونے والی بین الاقوامی کانفرنس میں ایک جماعت کو بھیجا تا کہ وہ قانون کا تقابلی مطالعہ کرے۔ اس نمائندہ جماعت نے یہ ثابت کیا کہ شریعت اسلامی ایک مستقل قانون ہے۔ جو عصر جدید کے تقاضوں کو بخوبی پورا کر سکتا ہے اس کانفرنس نے بھی جماعت کے ساتھ موافقت کی کہ اسلامی قانون میں اتنی لچک ہے کہ وہ عصر جدید کے تقاضوں کو پورا کر سکتی ہے۔ اسی طرح شیخ المراغی کی زیر قیادت ایک مجلس قائم ہوئی۔ جس کا نصب العین یہ تھا کہ رفتار زمانہ کے مطابق ایک ایسا آئین بنایا جائے جو صرف ایک مذہب کی تقلید کی قید و بند سے آزاد۔ مصر میں تحریک وطنی شرعی بھی اس لیے اٹھی تھی تا کہ ملک میں قانون سازی کی بنیاد شریعت اسلامی پر رکھی جائے۔ اسی طرح تحریک الاخوان کا مقصد بھی اسلامی شریعت کے نفاذ کا تھا۔ تحریک کے قائدین نے اس مقصد عالیہ کے لیے اپنی جانیں قربان کیں۔ ایک قیمتی دینی ادب پیدا کیا جس نے مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا کی ہے۔ قائدین میں سے حسن البناء اور سید قطب خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

ہندوستان میں حضرت مجدد الف ثانی نے جمود سے تصادم کیا۔ ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ، تفہیمات، عقد الجید میں کورانہ تقلید اور جمود کے خلاف لکھا۔ ان کی وفات کے بعد ان کی اولاد صالح نے اس مشکل کام کو آگے بڑھایا۔

موجودہ دور میں مذہبی بیداری پیدا کرنے کے لیے ادارہ ندوۃ العلماء دارالعلوم دیوبند تحریک علی گڑھ نے خاص حصہ لیا یہ تمام تحریکات تحریک ولی اللہی کے چشمہ سے کسی نہ کسی رنگ میں فیض حاصل کرتی ہیں۔

ادارہ ندوۃ العلماء

ندوۃ العلماء ۱۸۹۴ء میں لکھنؤ میں قائم ہوا۔ اس کے حسب ذیل مقاصد تھے۔

۱۔ نصاب تعلیم کی اصلاح' علوم دین کی ترقی' تہذیب اخلاق اور شائستگی اطوار۔

۲۔ علماء کے باہمی نزاع کا رفع اور اختلافی مسائل کے رد و کد کا پورا انسداد۔

۳۔ عام مسلمانوں کی اصلاح و فلاح اور اس کی تدابیر مگر سیاسی اور ملکی معاملات سے علیحدہ۔

۴۔ ایک عظیم الشان اسلامی دارالعلوم کا قیام۔ جس میں علوم و فنون کے علاوہ عملی صنائع کی بھی تعلیم ہو۔

۵۔ محکمہ افتاء کا قیام (موج کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام ایم اے ص ۱۸۷) اس ادارہ کے قیام کے محرک مولوی عبدالغفور صاحب ڈپٹی کلکٹر تھے اور اس خیال کی تکمیل مولوی سید محمد علی صاحب کانپوری نے کی۔

اس ادارہ کے مشہور علماء مولانا شبلیؒ سید سلیمان ندویؒ مولانا عبدالسلام سید نجیب اشرف مولوی ابوظفر ہو گزرے ہیں۔ جن پر اسلامی دنیا فخر کرتی رہے گی۔ مولانا ابوالکلام آزاد بھی کچھ عرصے اس ادارہ کے ساتھ منسلک رہے ہیں۔

دارالعلوم دیوبند

اس ادارہ کی ابتداء تحریک آزادی سے دس سال بعد ۳۰ مئی ۱۸۶۷ء کو ہوئی اس مبارک خیال کے محرک مولوی فضل الرحمان مولوی ذوالفقار علی اور ملا محمد محمود تھے دیوبند کی مسجد چھتا میں تعلیم شروع ہوئی تھی (سوانح عمری مولانا محمد قاسم مرتبہ مولانا محمد یعقوب نانوتوی ص ۲۱)

جب تعلیم حاصل کرنے کے لیے کثرت سے طلباء آنا شروع ہوئے تو ۱۲۹۳ھ میں ایک نئی عمارت کا سنگ بنیاد رکھا گیا آج اس مدرسے کے احاطہ میں مختلف ضرورتوں کے لیے بے شمار عمارتیں ہیں۔ اس ادارہ سے ہزاروں طلبہ مذہبی تعلیم حاصل کر کے نکلے ہیں جنھیں قرآن حدیث اور فقہ کی اشاعت کی ۱۹۱۲ء میں علامہ سید رضا ندوہ کے سالانہ جلسے کی تقریب پر ہندوستان آئے تو دیوبند تشریف لے گئے۔ آپ نے اس مدرسہ کے متعلق فرمایا "اگر میں اس دارالعلوم کو نہ دیکھتا تو ہندوستان سے نہایت مایوس ہو کر واپس جاتا۔ اس دارالعلوم نے مجھ کو بتادیا ہے کہ ہندوستان میں ابھی علوم عربیہ اور تعلیمات مذہبی اعلیٰ پیمانے پر ہیں۔" (موج کوثر مصنفہ شیخ محمد اکرام ایم اے ص ۲۱۰)

اس ادارہ کے مشہور علماء مولانا رشید احمد گنگوہی (م ۱۳۲۳ھ) مولانا محمد قاسم نانوتوی (م ۱۲۹۷ھ) مولانا محمود الحسن (م ۱۹۲۰ء) مولانا انور شاہ صاحب (م ۱۹۳۱ء) مولانا اشرف علی تھانوی (م ۱۹۴۳ء) سید حسین مدنی (۱۹۷۷ء) مولوی عبدالحق دہلوی مصنف تفسیر فتح المنان (م ۱۳۰۷ھ) مولوی ثناء اللہ امرتسری (م ۱۹۴۸ء) ہو گزرے ہیں۔ جنھوں نے اپنی تحریر اور تقریر کے ذریعہ اسلامی علوم کے ٹمٹماتے ہوئے چراغ کو روشن کیا۔

علی گڑھ تحریک

اس تحریک کے بانی سرسید تھے۔ جن کے مقاصد مسلمانوں کو تعلیم کی طرف رغبت دلانا کورانہ تقلید سے باز رکھنا اور اجتہاد سے ملی مسائل کو حل کرنا' سیاسی لحاظ سے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنا اور مسلمانوں کو اخلاق کے زیور سے آراستہ کرنا تھا۔

یہ تحریک اپنے بانی سرسید (م ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ء) اور اس کے رفقاء کار مولوی چراغ علی (م ۱۸۹۵ء) محسن الملک (م ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ء) خواجہ الطاف حسین حالی اور وقار الملک نواب مولوی مشتاق حسین کی شبانہ روز کوششوں سے اپنی عروس مقاصد کو حاصل کرنے میں کامیاب رہی ہے۔

ایرانی دائرہ المعارف میں سر سید کے متعلق لکھا ہے کہ اپنے جاہل ملک اور متعصب عوام کی جو خدمات انھوں نے کی ہے گزشتہ سو سال میں کسی نے ایران کی نہیں کی۔ کاش کہ ایران اپنے سارے محی الملت اور محی الدعا کی جگہ ایک سید احمد خان پیدا کر دے۔

جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی مرحوم و مغفور نے اپنے چند دوسرے رفقاء کی رفاقت میں ڈالی تھی۔ یہی زمانہ تحریک خلافت اور عدم تعاون کا تھا۔ مولانا محمد علی صاحب تحریک خلافت میں زعماء علی گڑھ کو شامل کرنے کے لیے علی گڑھ گئے۔ سوائے چند طلبہ کے اکابرین شامل نہ ہوئے۔ مولانا نے اپنے حامی طلبہ کے ساتھ جامعہ ملیہ اسلامیہ کی بنیاد علی گڑھ میں رکھی۔ لیکن ۱۹۲۵ء میں دہلی منتقل ہوگئی جہاں اجمل خان مرحوم ڈاکٹر انصاری مرحوم اور ڈاکٹر ذاکر حسین جیسی عظیم ہستیوں کا تعاون حاصل ہوگیا۔

ادارہ کو ایسے اساتذہ مل گئے۔ جنھوں نے معمولی مشاہروں پر قومی خدمت سرانجام دی تھی۔ تصنیف و تالیف کے لیے اردو اکاڈمی قائم ہوئی۔ جس کے زیر اہتمام نہایت ہی عمدہ کتب زیور طباعت سے آراستہ ہو کر منصہ شہود پر آئیں۔ اداروں کے علاوہ ہندوستان میں چند ایسی ہستیاں پیدا ہوئیں۔ جن کے دینی ادب نے مسلمانوں کو بیدار کیا ان میں سے سیّد امیر علی تھے۔ سید صاحب اپنے دور کی عظیم علمی شخصیت تھے۔ پہلے ہندوستانی تھے جو پریوی کونسل کے لیے منتخب کیے گئے۔ ۱۸۷۶ء میں سنٹرل محمڈن ایسوسی ایشن کی بنیاد رکھی۔ اس انجمن نے مسلمانوں کی بہت خدمت سرانجام دی۔

سیّد صاحب نے فقہ اسلامی پر بہت محنت اور عرق ریزی سے دو ضخیم جلدیں لکھی ہیں پرسنل محمڈن بھی انہی کے علمی فکر کا نتیجہ ہے۔ تاریخ اسلام پر ایک نہایت عمدہ اور جامع کتاب لکھی ہے گو سید صاحب عقیدۃً شیعہ ہیں لیکن تعصب سے ہٹ کر حضرت عمر کی دل کھول کر تعریف کی ہے۔ آپ کی سب سے عمدہ اور ان کے نام کو حیات جاوداں بخشنے والی کتاب ''سپرٹ آف اسلام'' ہے یہ اسلام کی تعلیمات پر بہترین کتاب ہے۔ یہ کتاب ان چند کتب میں سے ایک ہے۔ جس نے یورپ کو اسلام کی صحیح روح اور تصویر سے آگاہ کیا ہے اسلام کے خلاف اعتراضات کے مدلل جوابات دیے ہیں۔ ایک انگریز مستشرق نے اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے ''اسلام کی اس سے بہتر تصویر کھینچنا ناممکن ہے اور جو کچھ اسلام کے حق میں کہا جا سکتا ہے امیر علی نے کہہ دیا۔ اس بات سے تو ہم متفق ہیں کہ مستقبل میں بھی اس مضمون پر اس سے بہتر کتاب کوئی نہیں لکھی جائے گی۔ لیکن یہ صحیح ہے کہ آج تک اس موضوع پر اس پایہ کی اور کتاب کوئی نہیں لکھی گئی اور جہاں تک اسلام اور دوسرے مذاہب کا موازنہ اور اسلام کے خلاف اعتراضات کے جوابات کا تعلق ہے اس سے زیادہ جامع اور مدلل کتاب آج تک

نہ کسی عرب نے لکھی ہے نہ ترک نے۔ نہ مصری نے اور سید امیر علی کا یہ کارنامہ ایسا ہے جس پر برصغیر کے تمام مسلمان فخر کر سکتے ہیں۔ (موج کوثر مصنفہ محمد اکرام کوثر ایم اے ص ۱۷۴)

دوسری تاریخ ساز اور علمی شخصیت ابوالکلام آزاد ہے۔ مولانا نے گھر میں ہی تعلیم حاصل کی۔ عربی فارسی اور اردو تینوں زبانوں پر عبور حاصل تھا۔ ذہانت اور فطانت کا یہ عالم تھا گیارہ سال کی عمر میں ماہوار گلدستہ اشعار موسومہ نیرنگ عالم شائع کیا۔ جو آٹھ ماہ تک جاری رہا۔ پھر پندرہ سال کی عمر میں لسان الصدق کے نام سے ایک سالہ جاری کیا۔ شبلی کی دعوت پر کچھ عرصہ ندوۃ العلماء سے منسلک رہے۔ ۱۹۱۲ء میں کلکتہ سے الہلال شائع کیا اس رسالہ کے جاری کرنے کا واحد مقصد مسلمانوں میں قرآن مجید کی تعلیمات کی اشاعت تھی۔ قرآن مجید کے متعلق مدلل اور جامع مضمون لکھے۔ مولانا کی بے شمار علمی یادگاریں ہیں۔

ان میں سے سب سے بلند مقام نامکمل تفسیر ترجمان القرآن کو حاصل ہے۔ سیاست کی پرخار وادی میں گھس جانے کی وجہ سے اس مبارک کام کو سرانجام نہ دے سکے۔ اگر آپ سیاست کو ہی اپنا اوڑھنا بچھونا نہ بناتے بلکہ کچھ وقت تفسیر کو مکمل کرنے کے لیے بچا لیتے تو اپنے بعد نہایت عمدہ قیمتی علمی ورثہ چھوڑ جاتے۔ مولانا نے مسلمانوں کو جھنجوڑا۔ ان کے جمود میں حرکت پیدا کی۔ ان کی زوردار علمی تحریروں نے اجتہادی دروازہ کھولا اور مسلمانوں کو دور حاضر کے تقاضوں کے مطابق قدم اٹھانے کی تلقین کی۔

تیسری شخصیت ڈاکٹر محمد اقبال کی ہے ڈاکٹر محمد اقبال ہندوستان کی ان عظیم ہستیوں میں سے ایک ہستی ہیں۔ جنھوں نے مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی انتھک کوشش کی۔ دراصل ان کی کوششوں کا نتیجہ ہی پاکستان معرض وجود میں آتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے توحید اور رسالت کو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں انقلاب پیدا کرنے کی بنیاد ٹھہرایا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کی سچی معرفت اور رسول سے عشق ہی تمام برائیوں سے دور رہنے اور نیکیوں کی طرف مائل ہونے کا حقیقی روپ ہے۔ یہی وہ اصول انسان کو قنوطیت کی تاریک وادی سے نکال کر رجائیت کی بلند ترین چوٹی پر لا کھڑا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر محمد اقبال کے انقلابی پیغام کی ایک بڑی خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے مسلمانوں کے لیے قرآن مجید کو سرچشمہ ہدایت قرار دیا۔ ڈاکٹر صاحب اس دور میں ان ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ جنھوں نے مسلمانوں کے ذہنی اور علمی جمود کو حرکت میں بدلا۔ نئے مسائل کے حل کے لیے اجتہاد پر زور دیا اور مسلمانوں کی بیداری میں اقبال کا بہت حصہ ہے۔

مولوی چراغ علی

مولوی چراغ علی صاحب ہندوستان کے ان دانشوروں میں شامل تھے۔ جنھوں نے اسلام کی ترویج اور اشاعت میں خاص حصہ لیا۔ مولوی صاحب سرسید کے ہم خیال اور ہم عصر تھے۔ علم وفضل اور عمیق مطالعہ کے لحاظ سے سرسید سے کہیں بڑھے ہوتے تھے۔ مگر ان میں کوئی کمی تھی تو وہ لیڈرشپ کی تھی۔ اگر قائدانہ صلاحیت کے مالک ہوتے تو سرسید ان کے پیروکاروں میں سے ہوتے۔

مولوی صاحب عربی، فارسی، عبرانی، کالڈی، لاطینی، یونانی اور انگریزی زبانیں جانتے تھے۔ مطالعہ کا از حد شوق تھا کوئی لمحہ بھی مطالعہ سے خالی نہ جاتا تھا۔ ان کی زیادہ تصانیف مخالفین اسلام کے اعتراضات کے جوابات پر مشتمل ہیں۔

مولوی صاحب نے دو اہم کتب انگریزی زبان میں لکھیں۔ جن کا ترجمہ تحقیق الجہاد اور اعظم الکلام فی ارتقاء الاسلام کے نام سے اردو میں شائع ہو چکی ہیں۔

یہ دونوں کتب مخالفین کے دو اہم اعتراضات کے رد میں لکھی گئی ہیں۔ ایک اعتراض اسلام پر یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام بزور شمشیر پھیلا اس کے رد میں مولانا نے تحقیق الجہاد لکھی۔ جس میں یہ ثابت کیا گیا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی جنگیں مدافعانہ تھیں۔ دوسرا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ اسلام انسانی ترقی کا مانع ہے۔ مولوی صاحب نے یہ ثابت کیا کہ اسلام کی تعلیم سے انسان ہر قسم کی ترقی کر سکتا ہے اپنے خیال کی تائید میں مغربی مصنفین کے لیے بے شمار حوالے دیے ہیں۔

تیسری کتاب ریفارمز انڈر دی مسلم رول" ہے۔ اس کتاب میں مولوی چراغ علی نے یہ ثابت کیا ہے۔ اسلام دنیاوی ترقی کا مانع نہیں ہے بلکہ وہ طریقے بھی بتائے۔ جن پر چل کر مسلمان ہر قسم کی ترقی کر سکتا ہے۔

یہ اس دور کی کتب ہیں جب مسلمانوں کے اندر قنوطیت چھائی ہوئی تھی۔ دنیاوی ترقی کی طرف ان کی توجہ ہی نہیں تھی۔ ہمتیں پست ہو چکی تھیں۔ عزائم مردہ ہو چکے تھے۔ مولوی صاحب نے یہ کتب لکھ کر مسلمانوں کو جگایا اور ان کو بھولا ہوا سبق یاد دلایا کہ اسلام ہر قسم کی ترقی کا ضامن ہے۔ اگر ان کتب کو اس زمانہ کی فضا کو سامنے رکھ کر دیکھا جائے تو یہ مسلمانوں کے لیے روشنی کا مینار ہیں۔

مولوی صاحب ۱۸۹۵ء میں وفات پائی۔

مولانا عبید اللہ سندھی

مسلمانوں کی بیداری میں مولانا عبید اللہ سندھی کا نام ہمیشہ صف اوّل کے مشاہیر میں شامل ہو گا۔ مولانا سکھ گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بارہ سال کی عمر میں مولوی عبید اللہ نے کتاب تحفۃ الہند پڑھی

اور اسلام کی صداقت میخ کی طرح دل میں گڑ گئی۔ اس کے بعد شاہ اسماعیل شہید کی کتاب تقویۃ الایمان پڑھی۔ اور اسلام قبول کر لیا اور تحفۃ الہند کے مصنف کے نام پر اپنا نام اختیار کیا۔ پہلے سندھ گئے اور حضرت حافظ محمد صدیق بھر چونڈی والے کی خدمت میں حاضر ہوئے اور بیعت کی۔ سندھ اور بہاول پور کی عربی درس گاہوں میں ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ۱۸۸۸ء میں دیوبند پہنچے۔ مولانا محمود اور رشید احمد صاحب گنگوہی سے حدیث پڑھی۔ تکمیل تعلیم کے بعد سندھ چلے آئے۔ ۱۹۰۱ء میں مولانا راشد اللہ صاحب کے تعاون سے پیر جھنڈا میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ ۱۹۰۹ء میں مولانا محمود الحسن نے دیوبند میں کام کرنے کی دعوت دی۔ چار سال تک درس و تدریس کا سلسلہ جاری رکھا۔ ۱۹۱۳ء میں دہلی آئے اور نظارۃ المعارف قائم کیا۔ جس کے قیام کا مقصد وحید جدید تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن مجید کی تعلیم سے روشناس کرانا تھا۔

اسی دوران واقعہ بلقان اور طرابلس رونما ہوا۔ جس نے آپ کی طبیعت پر بہت اثر ڈالا اور سیاست کی پرخار وادی میں کود پڑے۔ ۱۹۱۵ء میں کابل چلے گئے اور سات سال کابل میں رہے۔ ۱۹۲۲ء میں ماسکو گئے۔ ماسکو سے انگورہ گئے اور مصطفےٰ کمال پاشا کے مذہبی اور معاشرتی انقلاب کا بنظر غور مطالعہ کیا۔ تین سال تک ترکی میں رہے۔ وہاں سے اٹلی اور سوئٹزر لینڈ ہوتے ہوئے ۱۹۲۴ء میں حجاز پہنچے اور تیرہ سال تک علمی سرگرمیاں جاری رکھیں۔ ۷ مارچ ۱۹۳۹ء کو حجاز سے واپس ہندوستان آ گئے اور دیوبند کا رخ کیا۔ صرف ایک ہفتہ قیام کے بعد دہلی تشریف لے گئے اور جامعہ ملیہ سے منسلک ہو گئے۔ اپنے سفر میں یورپ کی تمدنی ترقی کو دیکھ چکے تھے۔ جس سے ان کی اثر پذیر طبیعت بہت متاثر ہوئی۔ مولانا نے فلسفہ ولی اللہی اور مغرب کے ان اصولوں پر اپنی دعوت کی بنیاد رکھی۔ جن کی وجہ سے یورپ نے ترقی کی۔ پروفیسر محمد سرور صاحب مرحوم مدیر رسالہ فکر و نظر نے مولانا کی دعوت فکر پر خاصہ لکھا ہے جن کو پڑھ کر ایک قاری آسانی سے سمجھ سکتا ہے کہ مولانا نے اپنے فکر کی بنیاد فلسفہ ولی اللہی پر رکھی۔

جب مولانا نے ہندوستان کی سرزمین پر اس پیغام کی آواز بلند کی تو کوتاہ اندیش علماء نے اس پیغام کی بھرپور مخالفت کی۔ بھلا مولانا سندھی جیسا آہنی عزم انسان اس مخالفت کی کب پرواہ کر سکتا تھا۔ آخر مولانا مسلم قوم کو بیداری کی شاہراہ پر گامزن کرتے ہوئے ۱۹۴۴ء میں اس جہاں سے رحلت فرما گئے۔

آج اسلامی ممالک اس امر کا شدید احساس کر رہے ہیں کہ وہ یورپ کا مقابلہ سائنس کی ترقی سے ہی کر سکتے ہیں۔ یہ احساس مولانا کے پیغام کا اعادہ ہے۔

مولانا مودودی صاحب

مسلمانوں کی بیداری میں مولانا کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ گو مولانا روایتی علماء کی صف میں آتے ہیں۔ علم کلام میں ابوالحسن اشعری کے پیروکار ہیں۔ اس وجہ سے کسی خاص علم کلام کے حامل نہیں۔ مولانا نے ساری عمر مسلمانوں کی بیداری میں اپنا قلم رواں رکھا۔ ان کے بعض نظریات سے علماء نے اختلاف بھی کیا ہے۔ اختلاف تو دنیا کے تمام علماء سے ہوتے رہے ہیں لیکن تاریخ اس بات پر شاہد ناطق ہے کہ مولانا نے جو دینی ادب پیدا کیا ہے اس سے مسلمانوں میں دینی بیداری کی لہر پیدا ہوئی ہے۔ مولانا عبدالوہاب نجدی اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تحریکات سے متاثر نظر آتے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ مولانا انہی قائدین کی تحریکات میں موجودہ دور کے تقاضوں کے مطابق رنگ بھر کر آگے بڑھے ہیں تو بجا ہوگا۔ جماعت اسلامی اب ان کے نظریات کو لے کر مسلمانوں کو بیدار کرنے میں مصروف عمل ہے۔

فقہ کا آخری دور

اس دور میں عظیم الشان اقتصادی اور تمدنی انقلاب رونما ہوا ہے' جس وجہ سے معاشرہ میں بے شمار نئے نئے مسائل ابھر آئے ہیں۔ ان کا حل پہلے فقہاء کی آراء میں نہیں ملتا۔ اس وجہ سے تجدد پسند علماء نے مسائل کو حل کرنے کے لیے آواز بلند کی' اجتہاد سے کام لیا گیا اور مختلف اسلامی ممالک میں قانون اسلامی رنگ میں ڈھالا جانے لگا۔

ہندوستان

گیارہویں صدی ہجری میں اورنگ زیب عالمگیر نے اپنی تخت نشینی کے چار سال بعد مقدمات اور متنازعہ فیہ امور کو شریعت اسلامی کی روشنی میں تصفیہ کرنے کے لیے فقہ کی ایک جامع کتاب مرتب کرنے کا ارادہ کیا۔ اس اہم کام کی تکمیل کے لیے تمام ملک کے علماء کا ایک بورڈ بنایا' جس کے صدر شیخ نظام الدین برہان پوری تھے۔ اس بورڈ نے آٹھ سال کی محنت شاقہ کے بعد حنفی مذہب کے مطابق عبادات' مناکحات' معاملات اور عقوبات سے متعلق چھ جلدوں پر مشتمل ایک جامع کتاب مرتب کی۔ جو فتاوی ہندیہ یا فتاوی عالمگیری کے نام سے مشہور ہے۔ فارسی اور انگریزی زبان میں بھی ترجمے ہو چکے ہیں۔

مصر

بیسویں صدی کے ربع اول میں اسلامی قانون کو زمانہ حال کے مطابق ڈھالنے کی ایک تحریک جاری ہوئی۔ اس تحریک میں مصر کو اولیت حاصل ہے۔ مصر میں شخصی قانون کی تدوین کا کام

سب سے پہلے ۱۹۱۵ء میں شروع ہوا' جس کے لیے چاروں مذاہب کے علماء پر مشتمل ایک بورڈ بنایا گیا۔ اس بورڈ نے چھ سال کی محنت شاقہ کے بعد ایک مسودہ قانون مرتب کیا۔ جب وہ مسودہ زیور طبع سے آراستہ ہوا تو ہر طرف سے اعتراضات کی بوچھاڑ شروع ہو گئی اور حکومت نے اسے بحیثیت قانون نافذ کرنے کا خیال ترک کر دیا۔

۱۹۲۰ء میں حکومت مصر نے پھر ایک کمیشن مقرر کیا' جس میں شیخ الازہر شیخ المراغی' رئیس المحکمۃ العدلیۃ الشرعیۃ شیخ فتح اللہ سلیمان اور مفتی مصر شیخ عبدالمجید سلیم وغیرہ شامل تھے۔ اس کمیشن نے اسی سال عائلی قانون سے متعلق اپنی سفارشات پیش کر دیں جن کو بحیثیت قانون نافذ کر دیا۔

اس قانون سے قبل مصر میں ضابطہ تنظیم عدالت ہائے شرعیہ مجریہ ۱۹۱۰ء کی دفعہ ۲۸۰ کی رو سے امام ابوحنیفہ کے مفتی بہ اقوال پر عمل درآمد ہوتا تھا۔ مگر بعد میں قانون نمبر ۲۵ مجریہ ۱۹۲۰ء کی رو سے دفعہ مذکور میں ترمیم کر دی گئی کہ نان ونفقہ' عدت' مفقود الخبر شوہر کی مدت جیسے مسائل کا فیصلہ امام مالکؒ اور امام شافعیؒ کے مذاہب کے مطابق کیا جائے۔

۱۹۲۹ء میں حکومت مصر نے ایک اور قانون منظور کیا۔ جس میں طلاق بحالت نشہ اور طلاق جبریہ کو باطل اور طلاق بالکفایہ کو غیر نافذ قرار دیا گیا۔ الاطلاق دینے والے کی نیت طلاق ہو۔ نیز سوائے طلاق قبل دخول' خلع اور تین طلاقوں کے جن کی تکمیل تین طہروں میں کی گئی ہو۔ ہر طلاق کو طلاق رجعی قرار دیا گیا۔ نیز خاوند کے ایک سال سے زائد مفقود الخبر ہونے یا تین سال سے زائد قید کی صورت میں بیوی کو طلاق کا حق دیا گیا۔ نسب اولاد' نفقہ عدت' مہر' حضانت وغیرہ کے بارہ میں بھی اسلامی قانون کی ضابطہ بندی کی گئی۔

مصر کے مدنی قانون کے لیے پہلی کمیٹی ۱۹۳۶ء میں' دوسری کمیٹی ۱۹۳۸ء میں اور تیسری کمیٹی ۱۹۳۸ء کے آخر میں ڈاکٹر عبدالرزاق سنہوری بیگ کی زیر قیادت بنائی گئی۔ اس کمیٹی نے دو سال کی محنت شاقہ اور عرق ریزی کے بعد مدنی قانون کی تدوین کی۔

۱۹۴۳ء میں قانون میراث اور ۱۹۴۶ء میں قوانین وقف و وصیت مرتب کیے گئے جن کے بعض احکام حنفی مسلک سے مختلف تھے۔

عراق

عراق کی وزارت انصاف نے ۱۹۵۹ء میں ''لائحۃ الاحوال الشخصیۃ'' کے نام سے ایک قانون منظور کیا جو نکاح' طلاق' نسب اولاد' حضانت' وصیت اور میراث کے احکام پر مشتمل ہے۔ اس قانون کو مرتب کرتے وقت دوسرے ممالک کے شخصی قوانین اور بالخصوص مصری قانون کو پیش نظر رکھا ہے۔

ٹیونس

ٹیونس میں شخصی قانون ''مجلۃ الاحوال الشخصیہ'' کے نام سے مرتب کیا گیا۔ یکم جنوری ۱۹۵۷ء کو اس کا ملک میں نفاذ ہوا۔ اس قانون میں حنفی اور مالکی فقہ کا امتزاج پایا جاتا ہے۔

مراکش

مراکش میں شخصی قانون ''مدونہ الاحوال الشخصیہ'' کے نام سے مرتب ہوا۔ دوسرے اسلامی ممالک کے شخصی قانون کو پیش نظر رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔

اُردن

اُردن میں شخصی قانون ''حقوق العائلۃ الاردنی'' کے نام سے مرتب ہوا۔ یہ مجموعہ احکام بھی دوسرے اسلامی ممالک کے شخصی قوانین کو سامنے رکھ کر مرتب کیا گیا ہے۔

سنگاپور

۴ اگست ۱۹۵۷ء کو مسلم آرڈیننس نافذ کیا گیا۔ جس کے تحت شرعی عدالتیں قائم کی گئیں۔

شام

۱۹۴۹ء میں ایک جدید دستور وضع ہوا جس کی توثیق ۵ ستمبر ۱۹۵۰ء کو ہوئی۔ اس دستور کی رو سے ملک کا نظام حکومت جمہوری پارلیمنٹ قرار پایا۔ شخصی آزادی اور بنیادی حقوق اور جمہوری اصول کی وضاحت کر دی گئی۔ رئیس مملکت کا دین اسلام قرار پایا اور قانون سازی کا سرچشمہ شریعت اسلامی کو ٹھہرایا۔ ۱۰ جون ۱۹۴۸ء میں قانونِ شہادت جاری ہوا۔

۱۹۴۹ء میں وزیر عدالت استاد اسعد کورانی کی صدارت میں ایک کمیٹی بنائی گئی اور تین اہم قوانین، قانون مدنی، قانون تجارت اور قانون تعزیرات صادر ہوئے۔ یہ تمام قوانین جزوی ترمیم کے ساتھ مصری، لبنانی اور عراقی قوانین سے ماخوذ ہیں۔

قانون مدنی میں ۱۱۳۰ دفعات ہیں۔ قانونی تجارت ۶۷۷ دفعات پر مشتمل ہے۔ قانون تعزیرات ۷۵۶ دفعات پر مشتمل ہے۔

۱۷ ستمبر ۱۹۵۳ء کو قانون الاحوال الشخصیہ کے نام سے مرتب ہوا۔

ترکیہ

سلطنت ترکی میں ۱۸۳۹ء کی اصلاحی تحریک کے نتیجہ میں بے شمار تبدیلیاں رونما ہوئیں۔ ان

میں سے ایک تبدیلی اسلامی قوانین کے تحفظ و بقاء کے لیے مجلہ احکام عدلیہ کی تدوین ہے۔

۱۸۶۹ء میں مغربی ممالک کی قانون سازی کی طرز پر سلطان ترکی نے دیوانی قانون مرتب کرنے کے لیے احمد جودت پاشا کی زیر نگرانی میں ایک کمیٹی تشکیل کی' تاکہ وہ ایک ایسی کتاب مدون کرے جو باضابطہ ہو۔ سہل الماخذ ہو۔ اختلافات سے پاک ہو۔ مفتٰی بہ اقوال پر مشتمل ہو۔ ہر ایک کے لیے اس کا مطالعہ آسان ہو۔ چنانچہ کتاب کی تدوین ۱۸۷۶ء میں مکمل ہوئی۔ سلطان ترکی کے حکم سے مجلۃ الاحکام العدلیہ کے نام سے شائع ہوا۔ یہ مجلہ بیع' اجارہ' کفالت' تحویل' رہن' امانت' ہبہ' غصب و اتلاف' شفعہ، شراکت کارندگی' وکالت' صلح و ابراء' اقرار' دعویٰ' شہادت وتحلیف اور قضاء سے متعلق ۱۸۵۱ دفعات پر مشتمل ہے۔ ۱۹۲۶ء تک اس مجلہ کو قانونی حیثیت حاصل رہی۔ کمال اتاترک کے لائے ہوئے انقلاب کے بعد ۱۹۲۶ء میں مجلہ کو منسوخ کر دیا۔

مجلہ میں عبادات اور تعزیرات کے مسائل بیان نہیں ہوئے۔ اس میں صرف تمدنی زندگی کے معاملات پر بحث ہے۔

۱۹۱۷ء میں قانون نکاح اور طلاق وضع کیا جو حقوق العائلہ کے نام سے شائع ہوا۔ اگرچہ یہ قانون حنفی مذہب کے مطابق ہے لیکن نکاح بالجبر' طلاق بالجبر اور طلاق بحالت نشہ کے مسائل مالکی مسلک کے مطابق بیان کیے گئے ہیں۔

لبنان

۹ نومبر ۱۹۴۳ء کو فرانسیسی اقتدار سے نجات پا کر دنیا کے نقشہ پر آزاد حکومت کی صورت میں ابھرا۔ شخصی معاملات کی نگرانی کے لیے شرعی عدالتیں کام کر رہی ہیں۔ سنی عدالتوں کا دستور العمل امام ابوحنیفہؒ کی آراء اور حکومت عثمانی کا عائلی دستور ہے۔ جعفری عدالتوں میں حضرت امام جعفر صادق ؒ کی آراء پر عمل کیا جاتا ہے۔

پاکستان

۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان دنیا کے نقشہ پر آزاد سلطنت کی صورت میں اُبھرا۔ قائداعظم کے فرمودات و ارشادات کی روشنی میں حکومت پاکستان نے دستور پاکستان کی تدوین کے سلسلہ میں اسلامی نظریات کی سفارشات کے لیے "تعلیمات اسلامی بورڈ" قائم کیا' جس کے صدر ڈاکٹر محمد حمید اللہ صاحب پروفیسر انٹرنیشنل لاء کالج پیرس مقرر کیے گئے۔ ڈاکٹر صاحب کے مستعفی ہو جانے کے مولوی سید سلیمان ندوی مرحوم صدر بنائے گئے جو تاحیات اس کے صدر رہے۔

۱۹۴۹ء میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی نے قرارداد مقاصد منظور کی' جس کی رُو سے

پاکستان پر اللہ کی حاکمیت کے اصول کو تسلیم کیا۔

۴ اگست ۱۹۵۵ء کو سات افراد پر مشتمل ایک "عائلی قانون کمیشن" مقرر کیا' جس کے صدر ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی وفات کے بعد ۲۷ اکتوبر ۱۹۵۵ء کو پاکستان کے سابق چیف جسٹس عبدالرشید اس کمیشن کے صدر نامزد ہوئے۔ اس کمیشن نے اپنی رپورٹ جون ۱۹۵۶ء میں حکومت کو پیش کی' جو ۳۰ جون ۱۹۵۶ء کے گزٹ میں شائع کی گئی۔ علماء کی سخت تنقید کے سبب اس رپورٹ کو ایک عرصہ تک قانون کی شکل نہ دی جا سکی۔

۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو اسلامی جمہوریہ پاکستان کا پہلا دستور نافذ ہوا۔ دستور کی دفعہ ۱۹۸ کی رُو سے یہ قرار دیا گیا کہ اس ملک میں کوئی ایسا قانون نافذ نہیں ہو سکتا جو قرآن اور سنت کی تعلیمات کے منافی ہو۔ ساتھ ہی اس امر کا بھی اظہار کیا گیا کہ موجودہ قوانین کو قرآن اور سنت کے مطابق ڈھالا جائے۔ ۲۲ مارچ ۱۹۵۷ء کو ایک اسلامی قانون کمیشن کے قیام کا اعلان کیا گیا' جس کے صدر سپریم کورٹ کے سابق جج جناب جسٹس محمد شریف صاحب مقرر ہوئے۔ دستور پاکستان ۱۹۵۷ء کی دفعہ ۱۹۷ کے تحت صدر مملکت کو اس امر کا اختیار دیا گیا کہ وہ ایک اسلامی تحقیقاتی ادارہ کی تشکیل کرے جو مسلم معاشرے کو اسلامی خطوط پر چلانے میں مدد و معاون ہو۔ پاکستان کا یہ دستور ۷ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو فوجی انقلاب کے نتیجہ میں کالعدم قرار دے دیا گیا اور ملک میں مارشل لاء نافذ ہو گیا اور تمام اختیارات کی باگ ڈور کمانڈر انچیف محمد ایوب خاں نے سنبھال لی۔

۱۵ جولائی ۱۹۶۱ء کو عائلی قانون کمیشن کی سفارشات کی روشنی میں ملک میں عائلی قوانین آرڈیننس نافذ کر دیا گیا' جس کی رُو سے نکاح کی رجسٹری لازمی قرار دی گئی۔ دوسری شادی کے لیے حکومت کے مقرر کردہ ادارے کی اجازت لازمی قرار دی گئی۔ طلاق کو بھی نتیجۃً طلاق رجعی کے حکم میں داخل کر دیا گیا۔ اس کے عدم نفاذ کے لیے یونین کونسل کے چیئرمین کو طلاق کی اطلاع دینے کے بعد تین ماہ کی مدت مقرر کر دی گئی۔

وراثت کے باب میں یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ میں وارث قرار دیا گیا۔ مہر کی ادائیگی کے متعلق یہ وضاحت کر دی گئی کہ اگر نکاح نامہ میں مہر کی ادائیگی کے متعلق کوئی وضاحت نہ ہو تو کل مہر' مہر معجل قرار دیا جائے گا۔

عائلی قوانین پر علماء نے بہت کچھ لکھا ہے۔ امین اصلاحی کا تبصرہ نہایت ہی عمدہ اور مدلل ہے۔

۱۹۶۲ء میں پاکستان کا دوسرا دستور نافذ ہوا' جس میں یہ تسلیم کر لیا گیا کہ ملک میں کوئی قانون قرآن اور سنت کے خلاف نہ ہو۔ دستور کی دفعہ ۹۹ میں صدر مملکت کو اسلامی نظریہ کی مشاورتی کونسل کی تشکیل کا اختیار دیا گیا' تا کہ یہ کونسل مسلمانوں کو زندگی اسلام کے مطابق ڈھالنے کی ترغیب

دے۔ نیز یہ بھی جائزہ لے کہ کوئی مجوزہ قانون قرآن اور سنت کے خلاف تو نہیں۔ اسلامی مشاورتی کونسل کے چیئرمین علامہ علاء الدین صدیقی رئیس شعبہ اسلامیات پنجاب یونیورسٹی کو مقرر کیا گیا۔ صاحب موصوف اسلام پر نہایت ہی گہری نظر رکھتے ہیں اور اتحاد بین المسلمین کے زبردست حامی اور موید ہیں۔ ۱۹۷۳ء میں ذوالفقار علی بھٹو کے دور وزارت عظمیٰ میں جمہوری پارلیمانی دستور بنایا گیا۔ جس میں صدر اور وزیراعظم کا مسلمان ہونا، پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام، مسلمان کی تعریف، اسلامی قوانین کی تدوین اور اسلامی نظریہ حیات کی ترویج کی دفعات شامل کی گئیں۔ نئے اسلامی قوانین تیار کرنے اور مروجہ قوانین کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لیے اسلامی مشاورتی کونسل کے قیام کا اعلان کیا گیا۔

مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی

دستور مذکور کی دفعہ ۲۰۷ کی رُو سے ادارہ تحقیقات اسلامی کے نام سے ایک ایسا ادارہ قائم کرنے کا اختیار دیا گیا ہے جو اسلام سے متعلق عمدہ لٹریچر پیدا کرے جو مسلم معاشرے کو اسلامی بنیادوں پر قائم کرنے میں مدد دے سکے۔ اس ادارہ کے پہلے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن مقرر کیے گئے۔ ڈاکٹر صاحب علماء سے بعض نظریات سے اختلاف کی وجہ سے اس عہدہ سے مستعفی ہو گئے۔ یہ ادارہ کافی اسلامی کتب شائع کر چکا ہے۔ فکر ونظر کے نام سے ایک ماہانہ رسالہ جاری ہے جس کی ادارت مشہور صحافی اور عالم دین پروفیسر محمد سرور صاحب مرحوم کے سپرد کی گئی۔ اس ادارہ کے زیر اہتمام جدید انداز پر اسلامی قوانین کا مجموعہ مولوی تنزیل الرحمان ایم اے ایل ایل بی نے مدون کیا ہے۔ یہ مجموعہ قوانین اسلام دس جلدوں پر مشتمل ہے۔

باب چہارم

اعضائے حکومت

ا۔ مقنّنہ (مجلس وضع قوانین)

۲۔ عاملہ

۳۔ عدلیہ

(مجلس وضع قوانین)

(بائی لاز)

حکومت کے تین اہم شعبے ہیں:

ا۔ (مجلس وضع قوانین) مقننہ

ب۔ عاملہ اور

ج۔ عدلیہ

ان میں مقننہ یا مجلس قانون ساز (Legislature) سب سے اہم ہے۔ ہر حکومت کو قوانین اور قواعد وضوابط بنانے پڑتے ہیں۔ تاکہ وہ شہریوں اور عمال کے لیے ایسی راہیں متعین کر دیں جن پر چل کر قوم اور ملک کے فلاحی کام انجام دے سکیں۔ دستور کے بغیر کسی حکومت کا نظام چل ہی نہیں سکتا۔

طلوع اسلام کے وقت قوانین کا سرچشمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات تھی۔ آپ کی وفات کے بعد خلفائے راشدین کا یہ طریقہ تھا کہ جب کوئی قومی یا انفرادی مسئلہ پیش آتا تو صاحب الرائے صحابہ کو بلاتے؛ ان کے سامنے مسئلہ پیش کرتے تو وہ خلیفہ کے فرض قانون سازی میں قانونی مشیر ہوتے اور ضمنی قوانین (بائی لاز) وضع کرتے۔

ارکان مجلس وضع ضمنی قوانین کا انتخاب

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدین کے طرز عمل سے یہ بات ثابت ہے کہ مجلس کی تشکیل انتخاب (Election) اور چناؤ (Selection) دونوں طرح سے ہوتی تھی۔

وفد ہوازن کے واقعہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مہاجرین اور انصار سے فرمایا کہ اپنے نمائندے منتخب کرے۔ ان کے ذریعہ اپنی مرضی سے مجھے مطلع کرو۔ اس طرح نمائندوں کا انتخاب مجلس قانون ساز کے لیے سند ہے۔

حضرت عمرؓ کے عہد میں جو وفود آتے تھے وہ عوام کے ہی منتخب شدہ نمائندے ہوتے تھے۔

ان تاریخی واقعات سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ارکان مجلس کا انتخاب عوام کی رائے سے جائز ہے۔

مجلس قانون ساز کے فرائض و حقوق

فرائض

۱۔ کتاب و سنت اور تعامل صحابہ کی روشنی میں حسب ضرورت ایسے قوانین وضع کریں جو قوم اور ملک کی فلاح کے ضامن ہوں۔

۲۔ جو بھی قانون وضع کرنا ہو۔ مفاد عامہ و ریاست کو مدنظر رکھ کر وضع کیا جائے اس پر آزادانہ غور و فکر ہو۔

۳۔ خلیفہ (سربراہ) کے افعال و کردار کی کڑی نگرانی کرے۔ اگر خلیفہ جادہ مستقیم سے ہٹنے لگے تو اس کو راہ ہدایت پر آنے کا مطالبہ کرے۔

۴۔ اگر خلیفہ (سربراہ) راہ ہدایت پر نہیں آتا تو بوقت ضرورت اس کو الگ کر دے۔

حقوق

۱۔ مجلس کے ہر رکن کو خلیفہ (سربراہ) اور دیگر عمال حکومت کے افعال اور پالیسی پر تنقید کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

۲۔ اگر خلیفہ (سربراہ) مجلس کے مشورہ کے بغیر کوئی قانون نافذ کرنا چاہے تو مجلس کے ہر رکن کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ خلیفہ (سربراہ) سے مشاورت کا مطالبہ کرے۔

۳۔ اگر مجلس عوام کی رائے سے ایک میعاد معینہ کے لیے وجود میں آئی ہے تو خلیفہ (سربراہ) کو کسی قسم کا یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ مجلس کو برخاست کرے۔ ہاں اس میعاد کے گزرنے کے بعد وہ مجلس خود بخود برخاست ہو جائے گی۔

۴۔ اراکین کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ بیت المال کے حسابات کی جانچ پڑتال کرنے کے لیے کمشن مقرر کریں یا خلیفہ (سربراہ) سے حساب دینے کا مطالبہ کریں۔

مجلس کی صدارت

خلفائے راشدین کی سنت سے یہ بات ثابت ہے کہ خلفائے راشدین خود صدارت فرمایا کرتے تھے لیکن یہ مسئلہ حالات اور زمانہ کے تقاضوں سے تعلق رکھتا ہے۔

قانون سازی کا طریقہ

۱۔ مسودہ قانون یا تو حکومت کی طرف سے پیش ہوگا یا مجلس کے ارکان کی طرف سے پیش ہوگا۔

۲۔ ہر رکن غیر جانب داری اور خلوص سے اس تجویز پر غور وفکر کرے گا۔
۳۔ مجلس کے ہر رکن کو پیش کردہ تجویز پر تقریر کرنے کا حق حاصل ہے خواہ وہ حکومت کے خلاف کرے یا حکومت کی موافقت میں۔
۴۔ مجلس اگر ضرورت سمجھے تو اہم مسائل کے بارہ میں ارکان مجلس کے علاوہ دوسرے صاحب الرائے اصحاب سے بھی رائے لے سکتی ہے۔
۵۔ مخصوص مسائل پر غور وخوض کرنے کے لیے کمیٹیاں بھی بنائی جا سکتی ہیں۔
۶۔ عوام کی مشکلات اور مصائب خلیفہ (سربراہ) یا قائم مقام خلیفہ تک پہنچانا اس مجلس کے دائرہ عمل میں شامل ہے۔
۷۔ اگر خلیفہ (سربراہ) یا عمال اسلام کے کسی حکم کی خلاف ورزی کرتے ہیں تو اس مجلس کا یہ فرض ہے کہ وہ خلیفہ یا عمال سے جادہ ہدایت پر چلنے کا مطالبہ کرے۔
۸۔ ضمنی قانون کثرت رائے سے منظور کیا جائے گا۔
۹۔ کوئی ضمنی قانون اسلام کی روح کے منافی منظور نہیں ہوگا۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗٓ اُولٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ.[1] اور جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں۔ وہ ذلیل ترین لوگوں میں شامل ہیں۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْکٰفِرُوْنَ.[2] اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

عاملہ یا انتظامیہ

حکومت کا اہم صیغہ (Organ) عاملہ یا انتظامیہ (Exective) ہے۔ اس کا کام ملک میں قوانین کو نفاذ کرنا اور مقننہ اور عدلیہ کے احکام کو عملی جامہ پہنانا ہے۔

لفظ عاملہ دو معنوں پر مشتمل ہے۔ وسیع معنی کے اعتبار سے اس جماعت کو کہتے ہیں جو حکومت کے تمام ادنیٰ اور اعلیٰ حکام پر مشتمل ہو۔ اس صورت میں حکومت کے تمام ملازمین جو انتظامی امور کی دیکھ بھال اور نگرانی کرتے ہیں۔ مجموعی طور پر عاملہ یا انتظامیہ (Exective) کہلاتے ہیں۔ گلکرائسٹ کہتا ہے:

> ''وسیع معنی میں عاملہ میں حکومت کے تمام حکام شامل ہیں۔ سوائے ان حکام کے جو قانون بناتے ہیں یا اس کی تشریح کرتے ہیں۔''

[1] المجادلہ۔ ۲۰۔ [2] المائدہ: ۴۴۔

محدود معنی کے اعتبار سے عاملہ سے مراد رئیس مملکت ہے۔ مثلاً شاہ انگلستان۔

عاملہ کی تنظیم کے اصول

عاملہ کی تنظیم کے چند اصول ہیں۔ انہی اصولوں پر اس کی کامیابی کا دار و مدار ہے۔ وہ اصول حسب ذیل ہیں:

عاملہ کی تنظیم اس طرح کی جائے جس سے عاملہ میں اتحاد یک جہتی' ایک دوسرے پر اعتماد اور حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہو جائے۔ عاملہ کا اہم فرض پاس شدہ قوانین کا نفاذ کرنا ہے۔ اگر اختیارات اراکین مجلس عاملہ میں برابر تقسیم کر دیے جائیں تو بحث ومباحثہ میں کافی وقت صرف ہوگا اور اراکین میں یک جہتی اور اتحاد کا رشتہ ٹوٹ جانے کا قوی احتمال ہے۔ اس وجہ سے اختیارات کا سرچشمہ ایک ہو۔ پھر کام کی آسانی کے لیے کچھ اختیارات دوسرے عمّال کو دے دیے جائیں تاکہ وہ خوش اسلوبی سے کام سر انجام دے سکیں۔ عہد نبوی میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گوتمام اختیارات کا مرکز تھی۔ لیکن اس کے باوجود اختیارات عمّال اور کارندوں میں تقسیم کر دیے گئے تھے۔ مقدمات کا فیصلہ کرنے کے لیے مختلف اصحاب مقرر کیے گئے۔ زکوٰۃ اور دیگر ذرائع آمدن کی وصولی کے لیے عامل مقرر کیے گئے بعض مہمات پر صحابہ سے اہل اور مستحق شخص کو متعین کیا جاتا تھا وغیرہ۔ آپ کی وفات کے بعد خلفاء راشدین کا دور تھا۔ کام کی سہولت کے لیے انھوں نے عمّال کو اختیارات سونپ دیے تھے۔

اسلام میں خلیفہ کی ذات بہت اہم ہے لیکن خلیفہ کی ذات قانون سے بالانہیں ہے۔ اس کو قانون کے دائرہ میں رہ کر ہی اپنے اختیارات استعمال کرنے ہوتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ[1] اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر (حاکم) کی اطاعت کرو اور اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ۔

اس آیت کریمہ میں اولی الامر (حاکم) کو اختیارات کا سرچشمہ قرار دیا ہے' ہاں اگر عوام یہ سمجھیں کہ اولی الامر (خلیفہ) اپنے اختیارات سے تجاوز کر رہا ہے اور جھگڑے کی صورت پیدا ہو جائے تو اس جھگڑے کو اللہ اور اس کے رسول کے احکام کی روشنی میں دور کیا جائے۔ اللہ اور رسول کے الفاظ قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اسلام قانون کی بالادستی کا حامی ہے۔ ارشاد

1۔ النساء ۴:۵۹۔

الٰہی ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ یُحَادُّوْنَ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اُوْلٰٓئِکَ فِی الْاَذَلِّیْنَ۔[1] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں۔ وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

اس وجہ سے جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے اپنے ایک خطبہ میں فرمایا: فان انا احسنت فاعینونی وان انازغت فقومونی۔[2] اگر میں نیکی کروں یعنی شریعت محمدی کا پیروکار ہوں تو میری مدد کرنا اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔

اسلام میں امیر کا منصب بڑی اہمیت کا حامل ہے امیر کے تقرر پر بہت زور دیا گیا ہے۔ اس کو بھی دستور کی حدود کے اندر ہی کام کرنا ہوگا۔ اگر وہ ان حدود کو پھاندنے کی کوشش کرے تو عوام کا فرض ہے کہ اس کو جادہ صواب پر لے آئیں اگر پھر بھی دستور کو ردی کے چار ورق سمجھتا ہو اور اپنے آپ کو دستور کے مطابق نہیں ڈھالتا اور اپنی مرضی کے مطابق دستور میں تبدیلی لانے کی کوشش کرتا ہے تو اس کو اس کے عہدہ سے الگ کر دیں۔

۲۔ عمال کو مرکز کی طرف سے اتنے اختیارات ضرور ملنے چاہئیں کہ وہ احسن طریق پر فرائض سرانجام دے سکیں۔ اگر مجلس عاملہ کو اختیارات حاصل نہیں تو سلطنت کے امور خوش اسلوبی سے انجام نہیں دے سکے گی۔ لیکن اتنے بھی اختیارات نہیں دے دینے چاہئیں کہ وہ عوام پر ظلم کرنا شروع کر دے۔

۳۔ عاملہ کی میعاد کم سے کم اتنی ہونی چاہیے کہ وہ اس عرصہ میں حکومت کے انتظام میں پوری دل چسپی لے سکے اور اپنے منصوبوں کو عملی جامہ پہنا سکے۔

۴۔ امیر (سربراہ صفت) کا انتخاب عوام کی کثرت رائے سے ہونا چاہیے۔ انتخاب صاف شفاف ہونا چاہیے بغیر انتخاب کے کسی اندرونی یا بیرونی طاقت کے ذریعہ حکومت پر قبضہ کرنا ناجائز اور حرام ہے جیسے کہ سورۃ النساء کی آیت ۵۸ میں اولی الامر مِنکُمْ کے الفاظ آئے ہیں کہ امیر تمھیں میں سے ہونا چاہیے یعنی عوام کی مرضی سے امیر کا دورانیہ حکومت مقرر ہونا چاہیے۔

انتظامیہ کے اہم صیغے

خلیفہ (سربراہ) سلطنت کے تمام معاملات کی تنہا دیکھ بھال نہیں کر سکتا۔ اس وجہ سے سلطنت کے معاملات کی دیکھ بھال اور حکومت کا نظام چلانے کے لیے حکومت کو مختلف محکموں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور ان محکموں کو چلانے کے لیے عملہ مقرر کر دیا جاتا ہے۔

۱۔ المجادلہ ۵۸: ۲۰۔

۲۔ کتاب الاموال لابی عبیدہ صفحہ ۳۶۶۔

محکمہ تعلیم

اسلامی حکومت کے تمام محکموں میں سب سے اہم محکمہ تعلیم ہے کیونکہ تعلیم نبوت کے اوّلین مقاصد میں سے ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔[1] یقیناً اللہ نے مومنوں پر احسان کیا جب اس نے انھیں میں سے ایک عظیم الشان رسول بھیجا جو ان پر اس کی آیتیں پڑھتا ہے اور انھیں پاک کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ۔[2] کہہ دیجئے کہ علم والے اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں: طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ۔ یعنی ہر مسلمان مرد اور عورت پر علم حاصل کرنا واجب ہے۔

محکمہ تبلیغ

تبلیغ اسلام اسلامی حکومت کا اہم فریضہ ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ۔[3] تم بہترین امت ہو جو سارے انسانوں کے فائدہ کے لیے پیدا کی گئی ہو۔ تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

هُوَ الَّذِىْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔[4] وہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور حق کے ساتھ بھیجا تاکہ اس کو کل دینوں پر غالب کرے۔

اظہار دین کے لیے محکمہ تبلیغ کا ہونا ضروری ہے۔

محکمہ دفاع

ملک کی سرحدوں کی حفاظت کے لیے فوج تیار کی جائے جو ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح ہو۔ سرحدوں کی حفاظت کے بغیر کوئی ملک قائم نہیں رہ سکتا۔ ارشادِ الٰہی ہے: وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ۔[5] اور جو کچھ طاقت اور گھوڑوں کے

---

[1] آل عمران ۳:۱۶۴۔ [2] الزمر ۹:۔ [3] آل عمران ۳:۱۱۰۔
[4] التوبہ ۹:۳۳۔ [5] الانفال ۸:۶۰۔

سرحدوں پر باندھ رکھنے سے ہو سکے۔ ان کے لیے تیار رکھو۔ تم اس کے ساتھ اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو خوف زدہ رکھو۔

خُذُوْا حِذْرَكُمْ اِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا. اور اپنے بچاؤ اور احتیاط کو لیے رہو۔ یقیناً اللہ نے کافروں کے لیے ذلت آمیز عذاب تیار کر رکھا ہے۔ محکمہ دفاع کے تین اہم شعبے ہیں۔ بری فوج' بحری فوج اور ہوائی فوج۔

ہر اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ اپنی فوج کو جدید ترین اسلحہ سے لیس کرے۔

صیغہ امن وحفاظت (محکمہ پولیس)

جس طرح سرحدوں کی حفاظت کے لیے فوج ضروری ہے۔ اس طرح داخلی امن کے لیے پولیس ہونی ضروری ہے۔ جو عوام کی چوروں' رہزنوں اور اوباشوں سے حفاظت کرے۔

قرآن مجید میں بیت اللہ کے متعلق آتا ہے: وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا.[1] اور جو وہاں داخل ہوا' امن والا ہو گیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا کی: رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا[2] اے میرے رب اس شہر کو امن والا بنا۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ ملک میں امن قائم کرنا حکومت کا اہم فرض ہے۔ اس فرض کی ادائیگی کے لیے ایک محکمہ ہونا ضروری ہے۔

سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے رات کی چوکیداری کے لیے محکمہ قائم کیا تھا۔ پھر حضرت علیؓ نے اپنے عہد خلافت میں باقاعدہ پولیس کا نظام قائم کیا۔ اس محکمہ کے سب سے بڑے افسر کو "صاحب شرطہ" کہا جاتا تھا۔

صیغہ امن وحفاظت کے سلسلہ میں جیل خانوں کا انتظام ضروری ہے اگر کوئی عوام کے امن کو برباد کرنے کی کوشش کرے تو اس کو سزا کے طور پر الگ رکھا جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں رہزنوں کے متعلق یہ الفاظ آئے ہیں:

اَوْ يُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ.[3] اس سے حبس اور قید مراد ہے۔

---

1. آل عمران ۳: ۹۷۔ 2. البقرہ ۲: ۱۲۶۔
3. المائدہ ۵: ۳۳۔

صیغہ امور خارجہ

بیرونی حکومتوں سے باضابطہ تعلقات قائم رکھنے کے لیے محکمہ امور خارجہ کا ہونا ضروری ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صلح حدیبیہ کے بعد اسلامی حکومت کی طرف سے بیرونی حکومتوں کی طرف سفراء بھیجے اسی طرح دوسری حکومتوں کی سفارتیں آپ کی خدمت میں آئیں۔ خلفائے راشدین بھی خیر سگالی کا پیغام دے کر بیرونی طاقتوں کی طرف سفراء بھیجا کرتے تھے۔

محکمہ مالیات

مالیات کا صحیح نظام آمد اور خرچ میں توازن حکومت کا ایک اہم عنصر ہے۔ یہ محکمہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں ہی قائم ہو گیا تھا۔ بیت المال کی مضبوطی پر ہی حکومت کی ترقی کا دار و مدار ہے۔ اس صیغہ کی آمد اور صرف پر آئندہ میں بحث آئے گی۔

محکمہ ترقیاتِ عامہ

جس میں پلوں اور سڑکوں کی تعمیر اور دیگر رفاہی امور شامل ہیں۔

محکمہ برید (ڈاک)

یعنی محکمہ مواصلات اور رسل و رسائل عربوں نے ڈاک کا نظام قیصر و کسریٰ کی حکومتوں سے اخذ کیا تھا۔ اسلام میں سب سے پہلے ڈاک کا محکمہ امیر معاویہؓ نے قائم کیا اس وقت وہ شام کے گورنر تھے۔

محکمہ خوراک

اس محکمہ کے ذمہ عوام کی خوراک ہوتی ہے۔

محکمہ ٹکسال

دنیا کا سب کاروبار لین دین سکہ کے ذریعہ ہوتا ہے اس لیے سکہ کا محکمہ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ یہ محکمہ باقاعدہ عبدالملک نے رائج کیا۔ اس نے غیر ملکی سکہ کی جگہ اپنا سکہ رائج کر دیا اور دمشق میں دارالضرب (ٹکسال) قائم کی۔ یہ سکے سونے اور چاندی کے ہوتے تھے اور اپنی سلطنت میں دوسرے تمام سکے ممنوع قرار دے دیے۔ اس دور میں ہر حکومت کا اپنا سکہ ہے۔

محکمہ امور داخلہ

یہ محکمہ ملک کے اندرونی معاملات سے تعلق رکھتا ہے۔

محکمہ شکایات عامہ

انصاف اور عدل کو قائم رکھنے کے لیے اور عمال کو اپنے اختیارات کی حدود سے آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے یہ محکمہ نہایت ہی ضروری ہے۔ خلفائے راشدین کے دور میں یہ طریقہ تھا کہ لوگ حج کے موقع پر خلیفہ کے سامنے اپنی شکایات بیان کیا کرتے اور اسی وقت اس کی تحقیقات کا حکم دے دیا جاتا تھا۔ اگر کسی عامل کی طرف سے زیادتی ہوتی تو اس کو شکایت کرنے والے کے سامنے سزا دی جاتی تھی۔

محکمہ عدلیہ

تفصیل آگے آئے گی۔

محکمہ مردم شماری

سلطنت کے اندر رہنے والوں کی تعداد معلوم کرنے کے لیے یہ محکمہ بہت ہی ضروری ہے۔

محکمہ آبادکاری

جب کافروں نے مسلمانوں کو یہ دھمکی دی کہ ہم تم کو اپنی زمین سے نکال دیں گے تو یہ آیت نازل ہوئی: وقال الذین کفروا لرسلھم لَنُخرِ جنکم من ارضنا او لتعودن فی ملتنا فاوحی الیھم ربھم لنھلکن الظالمین ولنسکننکم الارض من بعدھم ذالک لمن خاف مقامی وخاف وعید. کافروں نے اپنے رسولوں سے کہا کہ ہم تم کو اپنی زمین سے نکال دیں گے یا تم ہمارے مذہب میں شامل ہو جاؤ۔ پس اللہ تعالیٰ نے ان کی طرف وحی کی کہ ہم ظالموں کو تباہ و برباد کر دیں گے اور پھر ان کے ہلاک ہونے کے بعد اس سرزمین میں تم کو آباد کریں گے۔ یہ وعدہ ان لوگوں کے لیے ہے جو میرے سامنے کھڑے ہونے سے ڈریں اور میری وعید سے ڈریں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہجرت کرنے کے بعد سب سے پہلا کام مسلمانوں کو آباد کرنے کا کیا تھا اور مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتہ مواخات قائم کر دیا۔ جس سے مہاجرین کی آبادکاری کا مسئلہ حل ہو گیا۔

محکمہ احتساب و نگرانی

عمال کے اعمال کی نگرانی اور احتساب کے لیے محکمہ احتساب و نگرانی ضروری ہے۔

امام ابو یوسفؒ خلیفہ ہارون الرشید کو اس نوشتے میں جو کتاب الخراج کا سرنامہ ہے ہدایت کرتے ہیں:

”بہتر یہ ہے کہ آپ نیکوکار، پاکیزہ دامن اور قابل اعتماد افراد کی ایک جماعت

ملک میں پھیلائیں جو شہروں اور قریوں میں جا کر عمال ریاست اور ان کی کارگزاریوں کی تفتیش کرے پھر جب آپ کو کسی والی یا حاکم کے بارے میں یہ اطمینان ہو جائے کہ وہ ظلم یا تعدی اور دست درازیاں کرتا ہے۔ رعایا کی دیکھ بھال کے بارے میں آپ کے ساتھ بدعہدی کرتا ہے' سرکاری اموال کا غبن کرتا ہے یا حرام خوری پر اتر آیا ہے یا اس کے چال چلن میں خرابی پیدا ہوگئی ہے تو اس کے بعد آپ کے لیے اسے بطور حاکم استعمال کرنا رعیت کے کسی کام کا ذمہ دار بنانا یا اسے امور مملکت میں شریک کرنا حرام ہے بلکہ ایسے بدنیت شخص کو آپ کیفر کردار تک پہنچائیں اور اسے ایسی سخت سزا دیں کہ دوسرے جو ابھی تک ان خرابیوں سے ملوث نہیں ہوئے ہیں۔ اسے دیکھ کر عبرت پذیر ہوں۔ البتہ مظلوم اور بے گناہ کی آہوں سے آپ بچتے رہیں۔ ان کی وہ دعائیں بارگاہ ایزدی میں مستجاب و مقبول ہیں۔''[1]

پھر رقم طراز ہیں:

''ہو سکتا ہے کہ خبر رساں رعیت کے خلاف عمال سے ساز باز کرلیں اور عمال کی بدمعاملگیوں پر پردہ پوشی کریں یا اس کے برعکس عمال اور حکام سے بگڑ جائیں اور ان پر خلاف واقعہ الزامات لگا دیں۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ آپ ہر شہر اور ہر علاقے میں سے عادل اور ثقہ لوگوں کو ڈھونڈیں اور خبر رسانی اور اطلاعات کا کام ان کے سپرد کریں اور آپ انھیں پیشگی متنبہ کر دیں کہ وہ رعیت کی کسی بات کو یا حکام کے کسی فعل کو آپ سے چھپا کر نہ رکھیں جو خبریں آپ تک پہنچائیں۔ ان میں کسی قسم کی مبالغہ آرائی نہ کریں۔ اسکے بعد جو آپ کی ہدایات پر عمل نہ کریں۔ انھیں کیے کا مزہ چکھائیں۔ جب تک علاقوں کے اندر اطلاعات بہم پہنچانے والے اور خبر رسانی کرنے والے معتمد اور صادق القول لوگ نہ ہوں نہ کسی قاضی یا کسی حاکم کے بارے میں موصول ہونے والی اطلاع پر صاد کرنا درست نہیں ہے۔''[2]

محکمہ صنعت و حرفت

دنیاوی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے محکمہ صنعت و حرفت بہت اہمیت رکھتا ہے۔

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے۔ داؤد علیہ السلام زرہیں بناتے تھے۔ اور اپنے ہاتھ سے روزی کماتے تھے۔ بقیہ

1۔ الخراج ابو یوسف صفحہ ۷۳۔ 2۔ الخراج صفحہ ۱۱۴'۱۱۵۔

وَعَلَّمْنَاهُ صَنْعَةَ لَبُوسٍ لَّكُمْ لِتُحْصِنَكُم مِّن بَأْسِكُمْ [1]

اور ہم نے اسے تمھارے لیے زرہ بنانی سکھائی تا کہ تمہاری لڑائی میں تمہاری حفاظت کرے۔

وَأَلَنَّا لَهُ الْحَدِيدَ أَنِ اعْمَلْ سَابِغَاتٍ وَقَدِّرْ فِي السَّرْدِ [2]

ہم نے ان کے لیے لوہے کو نرم کر دیا کہ فراخ زرہیں بناؤ اور ان کے بنانے میں اندازہ نگاہ رکھو۔

کتب فقہ میں صنعت وحرفت کی تعلیم وتحصیل مسلمانوں پر فرض کفایہ بیان کی ہے۔ چند محکموں کا ذکر کیا گیا ہے حالات کے مطابق جتنے چاہیں محکمے تشکیل دیے جا سکتے ہیں لہٰذا تقسیم کے لیے محکمہ جات کا بنانا بہت اہم ہے۔

سرکاری ملازمین کی ذمہ داریاں اور اوصاف

اسلام میں سرکاری مناصب کا تصور

اسلام مناصب کو ایک امانت قرار دیتا ہے اور یہ امانت اس کے سپرد کی جائے جو اس کے اہل ہوں۔ قرآن مجید میں آتا ہے:

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا. [3]

حدیث اور تاریخی آثار سے اس امر کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت ابو ذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھے بھی حکومت کا کام سپرد کیا جائے۔ آپ نے جواب دیا۔ انھا امانۃ. اے ابو ذرؓ یہ امانت ہے۔ [4]

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں جو شخص حکومت کی ذمہ داریوں کو مناسب صورت میں تقسیم نہیں کرتا وہ اللہ رسولؐ اور مسلمانوں کے حق میں اور ان کی امانت میں خیانت کرتا ہے۔ [5]

لہٰذا اسلامی نقطہ نگاہ سے سرکاری مناصب حصول جاہ اور کسب دنیا کے لیے نہیں ہوتے جو شخص جاہ وحشمت اور کسب دنیا کے لیے خواہش کرتا ہے تو وہ اس عہدہ کا اہل نہیں۔ خلیفہ کو چاہیے کہ وہ اس قسم کے آدمی کو وہ عہدہ نہ دے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ روایت کرتے ہیں قَالَ دَخَلْتُ عَلَى النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَنَا وَرَجُلَانِ مِنْ بَنِي عَمِّي فَقَالَ أَحَدُهُمَا يَا رَسُولَ اللَّهِ أَمِّرْنَا عَلَى بَعْضِ مَا

---

1. الانبیاء ۲۱:۸۰۔ 2. سبا ۳۴:۱۰۔۱۱۔ 3. النساء ۴:۵۸۔
4. کتاب الاموال امام ابو عبید قاسم بن سلام ص ۴۔ 5. ایضاً صفحہ ۴:۵۔

وَلّٰکَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَقَالَ الْاٰخرُ مِثْلَ ذٰلِکَ فَقَالَ اِنَّا وَاللّٰہِ لَا نُوَلِّی ھٰذَا العمل اَحَداً اَسْئَالَہٗ اَوْ احداً حَرَصَ عَلَیْہِ (تیسیر الوصول) کہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور میرے ساتھ میرے دو چچیرے بھائی بھی تھے تو ان میں سے ایک نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ ہم کو کسی ملک کا حاکم بنا دیجئے۔ ان ممالک میں سے جو خدا نے آپ کو دیے ہیں اور دوسرے نے بھی ایسی خواہش کا اظہار کیا تو آپ نے فرمایا خدا کی قسم ہم ایسے شخص کو حاکم نہیں مقرر کرتے جو اس کی درخواست کرے یا اس کی حرص کرے۔[1]

عَنِ عَبْدِ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَا عَبْدَ الرَّحْمٰنِ بْنِ سَمُرَةَ لَا تَسْئَلِ الْاِمَارَةَ فَاِنَّکَ اِنْ اُعْطِیْتَھَا عَنْ غَیْرِ مَسْئَلَةٍ اُعِنْتَ عَلَیْھَا وَاِنْ اُعْطِیْتَھَا عَنْ مَسْئَلَةٍ وُکِلْتَ عَلَیْھَا. (بخاری ومسلم باب الامارة)

حضرت عبدالرحمٰنؓ بن سمرة فرماتے ہیں کہ مجھ سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اے عبدالرحمٰن تم کبھی امارت کی خواہش نہ کرنا اس لیے کہ اگر تم کو بغیر خواہش اور طلب کے امیر بنا دیا گیا تو اللہ کی جانب سے تمہاری مدد اور اعانت کی جائے گی اور تمہاری درخواست پر تم کو امارت دی گئی تو اس کا سارا بوجھ تم ہی پر ڈال دیا جائے گا۔[2]

ابوذرؓ سے روایت ہے کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپ مجھے کوئی خدمت نہیں دیتے تو آپ نے میرے کندھے پر ہاتھ مار کر فرمایا۔ اے ابوذر! تم ایک ناتواں آدمی ہو اور یہ ایک امانت ہے اور اس سے قیامت کے دن بجز شرمندگی اور پشیمانی کے اور کچھ حاصل نہیں۔ بجز اس شخص کے جو اس کو عمدہ طور پر انجام دے اور اس کے متعلق تمام حقوق کو ادا کرے۔ (مسلم اور ابوداؤد اس کے راوی ہیں)

اور دوسری روایت میں یہ مذکور ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ابوذر! میں تم کو ناتواں پاتا ہوں اور میں تمھارے لیے وہی بات پسند کرتا ہوں جو میں اپنے لیے پسند کرتا ہوں۔ دو آدمیوں پر بھی حاکم مت بنو اور یتیم کے مال کے متولی مت بنو اور ابوداؤد کی ایک روایت میں مذکور ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ عرافت ایک ضروری چیز ہے اور لوگوں کو عریف کی سخت ضرورت ہے لیکن عریف لوگ دوزخ میں ہوں گے۔ تیسیر الوصول)

سرکاری مناصب پر تقرری کے لیے الامثل فالامثل (خوب سے خوب تر) کا اصول ہونا چاہیے۔ یعنی ان لوگوں کی تقرری کی جائے جو معاشرہ میں بہترین لوگ ہوں۔ ایک قول ہے جس نے مسلمانوں کے کسی گروہ کا ایسے شخص کو قائد بنا دیا کہ اس گروہ میں اس سے زیادہ بہتر شخص موجود ہے اس نے اللہ اور اس کے رسول سے اور عام مسلمانوں سے غداری کی۔[3]

---

[1] تیسیر الوصول۔ [2] بخاری۔ مسلم باب الامارہ۔ [3] الحسبة فی الاسلام ابن تیمیہ ص ۶۔

کارکنوں کی ذمہ داریاں اور اوصاف

تمسک بالکتاب والسنۃ

اسلامی حکومت کا تمام نظام کتاب اللہ و سنت رسول کے گرد گھومتا ہے۔ اس وجہ سے اسلامی حکومت کے ہر رکن کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے تمام فیصلوں میں قرآن مجید اور سنت رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو سامنے رکھے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُوْنَ.[1] اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تو ایسے لوگ کافر ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰئِكَ فِي الْاَذَلِّيْنَ.[2] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

وفات کے قریب مسلمانوں کو ہدایت فرمائی: اِنِّي تَرَكْتُ فِيْكُمْ اَمْرَيْنِ اِنْ تَمَسَّكْتُمْ بِهٖ لَنْ تَضِلُّوْا كِتَابَ اللّٰهِ وَسُنَّتِي. (بخاری) یعنی میں تمہارے درمیان دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں۔ جب تک تم انھیں پکڑے رکھو گے گمراہ نہ ہو گے۔ وہ اللہ کی کتاب اور میری سنت ہے۔

عمل

وہ حکام اسلامی نظام کی مشینری کے اچھے پرزے نہیں بن سکتے جو اپنے اعمال و کردار میں حسن و خوبصورتی نہیں رکھتے۔ معاشرہ کو درست نہیں رکھتے معاشرہ کو درست رکھنے کے لیے حکام کا نیک نمونہ نہایت ضروری ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ.[3] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو۔ تم کیوں وہ بات کہتے ہو جو کرتے نہیں۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: ان الناس لا یزالون مستقیمین ما استقامت لھم ائمتھم و ھداتھم. لوگ اس وقت تک سیدھی راہ پر قائم رہیں گے جب تک ان کے حکام اور راہنما سیدھے راستہ پر رہیں گے۔

حضرت علیؓ حضرت عمرؓ کو فرماتے ہیں: انک عففت فعففت رعیتک ولو رتعت لرتعت.[4] آپ خود دیانت دار ہیں۔ اس لیے آپ کی رعایا بھی دیانت دار ہے۔ اگر آپ خود بددیانت ہوتے تو لوگ بھی بددیانت بن جاتے۔

---

[1] مائدہ ۵:۴۴۔ [2] المجادلہ:۲۰۔

[3] الصف ۶۱:۲۔ [4] الفاروق عمر مصنفہ محمد حسین ہیکل۔

عدل اسلامی حکومت کی ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اس وجہ سے حکام کا عادل ہونا بہت ضروری ہے۔ جس حکومت کی رعایا عدل و انصاف سے محروم ہے۔ وہ حکومت کبھی بھی قائم نہیں رہ سکتی۔ اس کی تباہی کے ایام قریب ہوتے ہیں۔

قرآن مجید نے عدل قائم کرنے پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ[1] اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

"قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں جگہ دے گا جن میں ایک شخص امام عادل ہوگا۔"[2]

حضرت ابوبکرؓ اپنی حکومت کا بنیادی مقصد ان الفاظ میں بیان فرماتے ہیں: ان اقواکم عندی الضعیف حتی اخذلہ بحقه وان اضعفکم عندی القوی حتی اخذ منه الحق.[3] یعنی تمھارے زبردست لوگ میرے نزدیک اس وقت تک کمزور ہیں جب تک میں ان سے ان پر واجب شدہ حق نہ لے لوں اور تمھارے کمزور لوگ میرے نزدیک اس وقت طاقت ور ہیں۔ جب تک کہ میں ان کا غصب شدہ حق واپس نہ دلا دوں۔

عوام کی خیر خواہی اور ان پر شفقت

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

مَامِنْ عَبْدٍ اسْتَرْعَاهُ اللّٰهُ رَعِيَّةً فَلَمْ يَحُطْهَا بِنَصِيْحَةٍ اِلَّا لَمْ يَجِدْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ[4] کوئی شخص نہیں جسے اللہ کی رعیت کا حاکم بنائے اور وہ خیر خواہی کے ساتھ اس کی نگہبانی نہ کرے مگر وہ جنت کی خوشبو نہ پائے گا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نیک اور مشفق حاکم کے حق میں دعا اور بدخواہ حاکم کے بارے میں بددعا کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

اللھم من ولی من امر امتی شیئا فشق علیھم فاشقق علیه ومن ولی من امر امتی شیئا فرفق بھم فارفق به.[5] اے اللہ جو شخص میری امت کے لوگوں کے کسی معاملہ کا ذمہ دار بنایا جائے اور وہ ان کو مشقت میں ڈالے تو تُو بھی اسے مشقت میں ڈال اور جو ان کے ساتھ نرمی کا معاملہ کرے تو تُو بھی اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کر۔

---

1. النساء ۴:۵۸۔ 2. بخاری۔ 3. کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۳۶۶۔
4. بخاری ۹۴:۸۔ 5. صحیح مسلم۔

نرمی یا بردباری

نرمی اور بردباری ایسا خلق ہے جو حاکم کو عوام کی نظر میں محبوب بنا دیتا ہے۔ اللہ کی صفت حلیم "(بردبار) ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ[1] یقیناً ابراہیمؑ بردبار نرم دل اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔

اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرماتا ہے: فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ[2] سو اللہ کی رحمت سے تو ان کے لیے نرم ہے اور اگر تو سخت کلام سخت دل ہوتا تو تیرے اردگرد سے بکھر جاتے پس ان کو معاف کر اور ان کے لیے بخشش مانگ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے:

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کی بہتری چاہتا ہے تو ان پر سنجیدہ اور بردبار لوگوں کو حاکم بناتا ہے اور ان کا مال فیاض لوگوں کی تحویل میں دیتا ہے اور جب کسی قوم کو آزمائش میں مبتلا کرتا ہے تو ان پر سفیہوں اور اجڈھوں کو مسلط کر دیتا ہے' اور ان کا مال بخیلوں کے قبضہ میں دے دیتا ہے۔ خبردار! جو شخص میری امت میں سے کسی منصب پر مامور ہوا اور اس نے لوگوں کی ضروریات پوری کرنے میں نرمی سے کام لیا اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے دن اس کے ساتھ نرمی برتے گا اور جو شخص لوگوں کی ضروریات کے درمیان دربان کی دیوار کھڑی کرے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت کے دن اس سے حجاب کرے گا۔"

حضرت عمرؓ نے خلیفہ ہونے کے بعد یہ دعا فرمائی:

"اے اللہ میں سخت دل ہوں مجھے نرم کر دے' میں کمزور ہوں' مجھے مضبوط کر دے' میں بخیل ہوں مجھے سخی کر دے۔"

تنقید کی حوصلہ افزائی

اسلامی حکومت کے عمال کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ نکتہ چینی کی حوصلہ افزائی کریں تاکہ ان کی کمزوریاں اور خامیاں کھل کر ان کے سامنے آ جائیں۔ اس کا ایک فائدہ تو یہ ہے کہ حکام اپنی

[1] ہود ۱۱:۷۵۔ [2] آل عمران ۳:۱۵۹۔

اصلاح کی طرف توجہ کریں گے دوم' عوام کے اندر محاسبہ کرنے کی جرأت پیدا ہو جائے گی۔ سوم' عوام اور حکام کے درمیان ایک رابطہ قائم رہے گا۔ چہارم' حکام کج روی سے بچے رہیں گے۔ پنجم' قانون شکنی کا دروازہ مسدود ہو جائے گا۔

حضرت ابوبکرؓ نے جو سب سے پہلا خطبہ دیا وہ یہ تھا: **فان انا احسنت فاعینونی وان انازغت فقومونی**. پس اگر میں نیکی کروں تو میری مدد کرو اور اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دو۔

صحابہ کرام نے جواب دیا: "ہم نیزوں کی انیوں سے سیدھا کر دیں گے۔"

حضرت عمرؓ کے عہد کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک بدو نے اس وقت اٹھ کر اعتراض کیا جب حضرت عمرؓ خطبہ دینے کے لیے کھڑے ہوئے:

"حضرت حسن بصری سے روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمرؓ سے کہا اے عمرؓ! اللہ سے ڈرو۔ اس جملہ کو کئی بار دہرایا ایک دوسرے شخص نے اس کو ٹوکا کہ اب بس کرو۔ بہت ہو چکا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ان کو کہنے دو کہ اگر یہ ہم کو یہ باتیں نہ کہیں تو ان میں کوئی خوبی نہیں اور اگر ہم ان کی نصیحتوں کو قبول نہ کریں تو ہم میں کوئی خوبی نہیں۔[1]

ایک دفعہ عوام کے حقوق و فرائض بیان کرتے ہوئے فرمایا:

"اور تم میرے نفس کے مقابل میں میری مدد اس طرح کر سکتے ہو کہ مجھے بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو۔ نیز خدا نے تمہاری جو ذمہ داری مجھ پر ڈالی ہے۔ اس کے بارہ میں میری خیر خواہی کرتے رہو۔"[2]

غصہ سے احتراز

قرآن مجید میں آتا ہے: **وَالْكَاظِمِينَ الْغَيْظَ وَالْعَافِينَ عَنِ النَّاسِ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ.**[3]
جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں اور اللہ نیکی کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں:

"ایک افسر اور حاکم کی بردباری سے زیادہ اللہ کو کسی کی بھی بردباری اور نرمی پسند نہیں ہے اور نہ اس کی بردباری اور نرمی سے زیادہ کسی کی بردباری اور نرمی کا فائدہ وسیع اور عام ہے اسی طرح ایک حاکم اور افسر کی طیش مزاجی اور جہالت سے زیادہ اللہ کے نزدیک کسی کی طیش مزاجی اور جہالت مبغوض نہیں ہے اور نہ اس کی طیش مزاجی اور جہالت سے زیادہ کسی کی جہالت اور طیش مزاجی کا ضرر عام ہے۔ جو شخص لوگوں کے درمیان سلامتی کی روش اختیار کرتا ہے وہ اوپر

1۔ کتاب الخراج صفحہ ۷۔ 2۔ الفاروق عمرؓ صفحہ ۹۲۔ 3۔ آل عمران ۳:۱۳۴۔

(اللہ) سے سلامتی اور عافیت کا انعام پاتا ہے۔"[1]

باہمی اعتماد

دنیا کے تمام کام باہمی اعتماد سے چلتے ہیں۔ اگر ایک دوسرے کا اعتماد اٹھ جائے تو معاشرتی زندگی اجیرن ہو جائے گی۔ اس وجہ سے سرکاری ملازمین کے لیے باہمی اعتماد بہت ضروری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

فَاِنْ اَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِى اؤْتُمِنَ اَمَانَتَهٗ.[2] اگر تم میں سے ایک شخص دوسرے کا اعتماد کرتا ہے تو جس پر اعتماد کیا گیا ہے۔ اسے چاہیے کہ وہ اس اعتماد کو نبھائے اور اس امانت کو ادا کرے۔

سازشوں سے احتراز

ملازمین کو ایک دوسرے کے خلاف سازشیں نہیں کرنی چاہیں۔ اس سے محبت، الفت اور اتحاد کا رشتہ ختم ہو جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَلَا يَحِيْقُ الْمَكْرُ السَّيِّئُ اِلَّا بِاَهْلِهٖ.[3] بری تدبیر (سازش) کا وبال صرف اس کے کرنے والے ہی پر پڑتا ہے۔

باہمی تعاون

نظم ونسق صرف باہمی تعاون سے ہی چل سکتا ہے۔ حکام حکومت کی مشینری کے کل پرزے ہوتے ہیں اگر ان کے درمیان باہمی تعاون کا رشتہ ختم ہو جائے تو حکومت کی مشینری بالکل جامد ہو جائے گی اور نظام حکومت معطل ہو کر رہ جائے گا۔ اس وجہ سے حکام کا باہمی تعاون از حد ضروری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى.[4] نیکی اور تقویٰ پر ایک دوسرے سے تعاون کرو۔

عوام کی خبر گیری

حکومت کا اہم مقصد ہی عوام کی خبر گیری اور ان کے دکھ درد کو دور کرنا ہے۔ اگر کوئی حکومت اس مقصد میں ناکام رہتی ہے تو وہ عوام کی حکومت نہیں۔ اسلامی حکومت کے حکام کا اہم فرض یہ ہے کہ وہ عوام کے حالات معلوم کرتے رہیں اور ان کے مصائب اور دُکھ درد کو دور کرتے رہیں۔

۱۔ حضرت عمرؓ کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک رات آپ اپنے غلام اسلم کو ساتھ لے کر مدینہ سے باہر نکل گئے ایک خیمہ دیکھا تو ادھر کا رخ کیا قریب پہنچے تو معلوم ہوا کہ ایک عورت درد زہ میں مبتلا ہے اور تکلیف سے تڑپ رہی ہے۔ حضرت عمرؓ نے اس سے حال دریافت کیا تو

۱۔ کتاب الخراج صفحہ ۷۔ ۲۔ البقرہ ۲:۲۸۳۔

۳۔ فاطر ۳۵:۴۳۔ ۴۔ مائدہ ۵:۲۔

اس نے جواب دیا کہ میں ایک بدوی عورت ہوں اور میرے پاس اس وقت کوئی ایسی چیز موجود نہیں جو اس موقع پر کام آ سکے۔ حضرت عمرؓ یہ سن کر واپس گھر آئے اور اپنی بیوی ام کلثوم بنت ابی طالب سے فرمایا اللہ کی مہربانی سے ثواب حاصل کرنے کا ایک عمدہ موقع ہاتھ آ گیا ہے کیا اس کے لیے تیار ہو۔ اس کے بعد واقعہ بیان کیا وہ اس خدمت کے لیے فوراً تیار ہو گئیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنی پیٹھ پر آٹے کی بوری لادی اور کچھ روغن ساتھ لیا اور ام کلثوم نے وہ ضروری چیزیں بھی ساتھ لیں جو ولادت کے سلسلہ میں کام آتی ہیں اور میاں بیوی اس بدو کے خیمہ کے پاس پہنچ گئے۔ ام کلثوم خیمہ کے اندر چلی گئیں اور حضرت عمرؓ خیمہ کے باہر بیٹھ کر بدو سے باتیں کرنے لگے۔ غریب بدو کو کچھ علم نہیں کہ وہ کس سے باتیں کر رہا ہے۔ اتنے میں اندر سے حضرت ام کلثوم نے فرمایا کہ امیر المومنین اپنے ساتھی کو فرزند کی بشارت سنا دیجئے۔ اب بدو کو یہ علم ہوا کہ یہ امیر المومنین ہیں وہ حیران رہ گیا اور معذرت کرنے لگا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو تشفی دی اور ضرورت کی چیزیں دے کر وہاں سے رخصت ہوئے۔

۲۔ ایک روز رات کو گشت میں حضرت عمرؓ نے کسی بچہ کے رونے کی آواز سنی۔ اس کی ماں کو مخاطب کر کے فرمایا اے عورت اللہ سے ڈر اور اس بچہ سے اچھا سلوک کر۔ تھوڑی دیر کے بعد اس بچہ کے رونے کی آواز دوبارہ آئی۔ پھر عورت سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ رات کے آخری حصہ میں بچہ پھر روتا ہوا سنائی دیا۔ اب کے حضرت عمرؓ نے قریب ہو کر غصہ کے ساتھ فرمایا تو کتنی بری ماں ہے تیرا بچہ رات بھر روتا رہا۔ عورت نے جواب دیا میں اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں مگر یہ مانتا نہیں۔ حضرت عمرؓ نے دریافت کیا تو اس کا دودھ کیوں چھڑا رہی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ دودھ اس لیے چھڑا رہی ہوں کہ جب تک بچہ دودھ نہیں چھوڑتا اس وقت تک عمرؓ اس کا وظیفہ مقرر نہیں کرتا؟ دریافت فرمایا کہ تیرے بچے کی عمر کیا ہے؟ اس نے کہا اتنے مہینے۔ حضرت عمرؓ نے یہ سن کر فرمایا تیرا برا ہو اس قدر جلدی نہ کر۔ اس کے بعد صبح کی نماز سے فارغ ہو کر مسلمانوں کی طرف متوجہ ہوئے اور آبدیدہ ہو کر فرمایا عمرؓ کا برا ہو کہ اس نے مسلمانوں کے کتنے بچوں کو ہلاک کیا۔ اس کے بعد فوراً آپ نے منادی کرا دی کہ لوگ اپنے بچوں کے دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کریں اب ہر بچہ کا وظیفہ مقرر کر دیا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اگر میں زندہ رہا تو تمام ملک کا دورہ کروں گا اور رعایا کے حالات معلوم کروں گا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ لوگوں کی بعض ضروریات ایسی ہیں جو مجھ تک

پہنچ نہیں پاتیں لوگ خود مجھ تک آ نہیں سکتے اور عمال ان کی ضروریات کو میرے علم میں نہیں لاتے۔ (شرح نہج البلاغہ ابن ابی حدید)

سرکاری مال کی حفاظت

حکام سرکاری مال کے محافظ و نگران ہوتے ہیں۔ ان کا اہم فریضہ ہے کہ وہ سرکاری مال کی حفاظت کریں مشہور روایت ہے کہ ایک مرتبہ حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کو دیکھا کہ بھاگے ہوئے مدینہ سے چلے جا رہے ہیں۔ حضرت علیؓ ملے اور دریافت فرمایا امیر المومنین اس دھوپ میں کہاں بھاگے جا رہے ہیں؟ فرمایا بیت المال کا ایک اونٹ کھو گیا ہے اس کو تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ حضرت علیؓ نے یہ سن کر فرمایا: قد تعبت الخلفاء بعدک. آپ نے اپنے بعد آنے والوں کو تھکا دیا۔

امیر اور مامور میں مساوات

اسلام انسانی مساوات کا علمبردار ہے اور کسی امیر کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے تئیں دوسروں سے بڑا خیال کرے اور دوسروں پر ترجیح دے۔ تاریخ اسلام کا یہ مشہور واقعہ ہے کہ فتوحات عراق کے سلسلہ میں ایک جگہ مقامی باشندوں نے فوج کے قائد حضرت ابو عبیدہؓ کی خدمت میں خاص کھانا بطور تحفہ بھیجا اور یہ کہلایا کہ یہ خاص ہدیہ صرف آپ کے لیے ہے۔ انھوں نے دریافت کیا کہ تم نے تمام فوج کی اس قسم کی ضیافت کی ہے۔ انھوں نے جواب دیا نہیں۔ یہ سن کر حضرت ابو عبیدہؓ نے ان کی ضیافت قبول کرنے سے انکار کر دیا اور فرمایا: لا حاجة لنا فیه بئس المرء ابو عبیدة ان صحب قوماً من بلادهم واهرقوا دماء هم دونه او لم یهریقوها. فاستأثر علیهم بشئ یصیبه لا واللہ لا یاکل مما افاء اللہ علیهم الامثل ما یاکل اوساطهم.[1] یعنی ہمیں اس کی ضرورت نہیں ہے۔ ابو عبیدہ سے زیادہ برا آدمی کون ہوسکتا ہے جو اپنی قوم کے لوگوں کو ان وطن سے لے کر آئے اور وہ اس کے حکم پر اپنا خون بہائیں اور جب مال غنیمت ہاتھ آئے تو وہ کسی چیز میں ان کے اوپر اپنے آپ کو ترجیح دے۔ خدا کی قسم یہ بندہ خدا کے اس بخشے ہوئے مال میں سے صرف وہی کھائے گا جو دوسرے لوگ کھائیں گے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ.[2] کہ مومن بھائی بھائی ہیں۔
وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَمْشِ فِي الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ.[3] اور لوگوں سے بے رخی نہ کر اور نہ زمین میں اکڑتا ہوا چل۔ اللہ تعالیٰ کسی خود پسند شیخی خورے کو پسند نہیں کرتا۔

---

1. الفاروق عمر تالیف محمد حسین ہیکل جلد ۲ ص ۱۱۲۔ 2. الحجرات ۴۹:۱۰ 3. لقمان ۳۱:۱۸

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ اَخْوَانًا (بخاری) تم اللہ کے بندے اور بھائی بھائی بن جاؤ۔

اِنَّ الْعِبَادَ کُلُّھُمْ اِخْوَۃٌ۔ (احمدٗ ابو داؤد) کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

حضرت عمرؓ نے ایک مرتبہ حج کے موقعہ پر تمام عمال کو جمع کیا اور عام لوگوں سے دریافت کیا کہ تم میں سے کسی کو کسی عامل کے خلاف شکایت ہے۔ راوی کہتا ہے کہ اتنے مجمعے میں سے صرف ایک آدمی کھڑا ہوا اور اس نے شکایت کی کہ امیرالمومنین! آپ کے عامل نے مجھے سو کوڑے مارے ہیں۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے اسے اجازت دی کہ وہ عامل سے اپنا بدلہ لے لے یہ سن کر حضرت عمرؓ دبن العاص بولے کہ امیرالمومنین اگر آپ نے حکام کے خلاف شکایت سننے کا دروازہ کھول دیا تو ان کے لیے یہ چیز ناگوار ہوگی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی بات نہ مانی اور فرمایا کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنی ذات کو قصاص کے لیے پیش فرماتے دیکھا تو ان لوگوں سے کیوں کر قصاص نہ دلواؤں۔ آخر مدعی نے خود ہی دوسو دینار لے کر قصاص معاف کر دیا۔

اقربا نوازی سے احتراز

اپنے عہدے سے ناجائز طور پر فائدہ اٹھا کر اقرباء نوازی حکام کی بدترین خصلت ہے وہ حاکم نہ تو اللہ کے ہاں سرخرو ہو سکتا ہے اور نہ عوام میں پسندیدہ نگاہ سے دیکھا جا سکتا ہے جو حکومت کے خرچ پر اقرباء نوازی کرتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے بعد میں ہونے والے جانشین کے انتخاب کے لیے جو مجلس شوریٰ تشکیل کی اس کے ارکان کو سب سے پہلے یہ ہدایت فرمائی کہ وہ خلیفہ بن جانے کے بعد اپنے اقربا کو دوسرے مسلمانوں کی گردنوں پر سوار نہ کر دیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

انشدک اللہ یا علی ان ولیت من امور الناس شیئًا ان تحمل بنی ھاشم علی رقاب الناس انشدک اللہ یا عثمان ان ولیت من اموز الناس شیئا ان تحمل بنی معیط علی رقاب الناس انشدک اللہ یا سعدان ولیت من امور الناس شیئاً ان تحمل اقاربک علی رقاب الناس۔ اے علیؓ میں تجھے اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کے معاملہ میں کوئی ذمہ داری تم پر ڈال دی جائے تو تم بنی ہاشم کو لوگوں کی گردنوں پر سوار کرنے کی کوشش نہ کرنا اور اے عثمانؓ میں تجھے اللہ کا واسطہ دے کر کہتا ہوں۔ اگر تیرے ہاتھ میں مسلمانوں کے امور کی باگ ڈور آ جائے تو تم بنی معیط کو لوگوں کی گردنوں پر لادنے کی کوشش نہ کرنا اور اے سعد میں اللہ کا واسطہ دے کر یہ کہتا ہوں۔ اگر تم مسلمانوں کے امور بنا دیے جاؤ تو اپنے اقرباء کو لوگوں کی گردن پر لادنے کی کوشش نہ کرنا۔

حاجب (دربان) سے احتراز

حکام حکومت کو یہ چاہیے کہ وہ عوام کی مشکلات سننے کے لیے ہر وقت اپنے دروازے کھلے

رکھیں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: عَنْ عَمرِو بنِ مُرَّةَ قَالَ سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ مَامِنْ اِمَامٍ يُغْلِقُ بَابَهُ دُوْنَ ذَوِى الْحَاجَةِ وَالْخَلَّةِ وَالْمَسْكَنَةِ اِلاَّ اَغْلَقَ اللّٰهُ اَبْوَابَ السَّمَاءِ دُوْنَ خَلَّتِهِ وَحَاجَتِهِ وَمَسْكَنَتِهِ. (ترمذی) یعنی عمر بن مرہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سنا آپ نے فرمایا کہ جو امیر ضرورت مندوں حاجت مندوں اور مسکینوں کے لیے اپنے دروازے بند رکھے گا۔ اللہ تعالیٰ اس کی ضرورت اور حاجت کے دن اس کے لیے آسمان کے دروازے بند کر دے گا۔

ہدیے اور تحفے قبول کرنے سے احتراز

سرکاری حکام کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ عوام سے ہدیے قبول کریں۔ کیونکہ رشوت پیش کرنے اور قبول کرنے کے لیے ایک چور دروازہ ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

هَدَايَا الْعُمَّالِ غُلُوْلٌ. (احمد معجم اوسط للطبرانی) عمال کا ہدیہ قبول کرنا خیانت ہے۔

بخاری، مسلم اور ابو داؤد تینوں کتب احادیث میں یہ روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قبیلہ ازد پر ایک صاحب کو تحصیل دار مقرر کیا۔ جب وہ اپنے کام سے فارغ ہو کر واپس آیا تو حساب دیتے ہوئے کہا کہ یہ بیت المال کا حصہ ہے اور یہ مجھے تحفہ کے طور پر ملا ہے۔ اس کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خطبہ دیا اور فرمایا بعض لوگوں کو محصل کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور جب وہ کام سے فارغ ہو کر واپس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہ حصہ بیت المال کا ہے اور یہ مجھے ہدیہ کے طور پر ملا ہے اگر یہ بات صحیح ہے تو وہ اپنے گھروں میں کیوں نہ بیٹھے رہے اور وہیں ان کے پاس ہدیے آ جاتے۔

رشوت لینے سے احتراز

رشوت انسان کو حق اور عدل کی راہ سے بہت دور لے جاتی ہے۔ ظلم اور بے انصافی کے دروازے کھولتی ہے۔ اس وجہ سے اسلام رشوت لینے سے منع فرماتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلرَّاشِى وَالْمُرْتَشِى كِلاَهُمَا فِى النَّارِ. یعنی رشوت دینے اور رشوت لینے والا دونوں دوزخی ہیں۔

حضرت ابو ہریرۃؓ کی ایک روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الرَّاشِى وَالْمُرْتَشِى فِى الْحُكْمِ.[1] یعنی فیصلوں میں رشوت دینے اور لینے والے پر خدا کی لعنت ہے۔

1. احمد، ابو داؤد، ترمذی۔

حضرت ثوبان سے روایت ہے۔

اَلرَّاشِی وَالْمُرْتَشِی وَالرَّائِشِی یَعْنِی الَّذِی یَمْشِی بَیْنَهُمَا۔[1] یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے رشوت دینے والے رشوت لینے والے اور رشوت دلانے والے یعنی اس شخص پر جو بیچ میں دلالی کرتا ہے لعنت کی ہے۔

جھوٹ نہ بولے

جھوٹ تمام برائیوں کی جڑ ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے اس ام الآثام سے بچنے کی بار بار تلقین کی ہے۔ اسلامی حکومت کے کارکن کے لیے یہ لازم ہے کہ وہ جھوٹ نہ بولے اور صداقت کو اپنا شعار بنائے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ۔[2] جھوٹ بات سے بچو۔

وَلَا تَلْبِسُوْا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ۔[3] اور سچ کو جھوٹ کے ساتھ نہ ملاؤ۔

ثابت قدمی

حاکم کو ثابت قدم، مستقل مزاج اور بلند ہمت ہونا چاہیے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاصْبِرْ عَلٰی مَا اَصَابَکَ اِنَّ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ۔[4] اور جو کچھ تم پر مصیبت آئے اس پر صبر کر یہ ہمت کے کاموں میں سے ہے۔

ذاتی کاروبار کی ممانعت

اسلامی حکومت میں کسی ملازم کو ذاتی کاروبار کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ ایک وجہ تو یہ ہے کہ کارکن اپنے فرائض سے غافل رہے گا اور اس کی توجہ اپنی تجارت کی طرف لگی رہے گی۔ دوم: طبعی طور پر اپنی تجارت کو فروغ دینے کے لیے اپنے عہدے کا ناجائز فائدہ اٹھائے گا۔ حضرت ابوہریرہؓ کے متعلق مذکور ہے کہ ان کے پاس بہت مال و دولت جمع ہو گئی۔ یہاں تک کہ ان کے پاس گھوڑوں کی کئی نسلیں جمع ہو گئیں اور ان کی منتشر اراضیات یک جا ہو گئیں اور تجارت خوب چمک اٹھی۔ حضرت عمرؓ کو معلوم ہوا تو آپ نے فرمایا حضرت! اس مال میں سے آپ اپنا راس المال اور اپنی تنخواہ رکھ لیں اور باقی ساری دولت بیت المال میں جمع کرا دیجیے۔[5]

شرخ فتنے کا استیصال

حضرت عمرؓ اپنے کوفہ کے عامل کو لکھتے ہیں:

---

1 رواہ احمد۔ 2 الحج ۲۲:۳۰۔

3 البقرہ ۲:۴۲۔ 4 لقمان ۳۱:۱۷۔ 5 الادارۃ الاسلامیۃ بکر وعلی۔

"میرا خیال ہے کہ اگر میں تجھے لکھوں کہ فلاں آدمی کو ایک بکری دے تو تو مجھے لکھے گا کہ نر ہو یا مادہ۔ اگر میں لکھوں کہ کوئی ایک دے دے تو، تو پھر یہ پوچھے گا کہ چھوٹی ہو یا بڑی۔ اگر میں جواب دوں کوئی ایک ہو تو پھر خط لکھ بھیجے گا کہ بھیڑ ہو یا بکری۔ جب میں نے ایک بار لکھ دیا کہ ایسا کر تو اپنی صواب دید پر اس کی تعمیل کر میری طرف بار بار رجوع کرنے کی ضرورت نہیں۔"

دین کی تعلیم

اسلامی حکومت کا اصل مقصد دین اسلام کی اشاعت کرنا اور تعلیم دینا ہے۔ اس وجہ سے اسلامی حکومت کے عمال کا صرف یہ فرض نہیں ہے کہ وہ دفتری کاموں میں ہی مقید ہو کر رہ جائیں بلکہ ان کا ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ لوگوں کو دین اسلام سکھائیں۔

حضرت عمرؓ نے ایک خطبہ میں فرمایا: **اللّٰھُمَّ انی اشھدک علی امراء الامصار فانی انما بعثتھم لیعلموا الناس دینھم ومنة نبیھم و یعدلوا علیھم و یقسموا فَیئھُمْ بینھم و یرفعوا الی ما اشکل علیھم من امرھم.** اے اللہ میں تجھ کو اپنے عمال پر گواہ ٹھہراتا ہوں۔ میں نے ان کو صرف اس لیے مقرر کیا ہے کہ وہ لوگوں کو ان کا دین اور ان کے نبی کی سنت سکھائیں اور ان کے اندر عدل قائم کریں، اور فی تقسیم کریں اور اگر ان کو کوئی مشکل پیش آ جائے تو میرے سامنے پیش کر دیں۔

اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے اغراض بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ۔[1] رسول انھیں خدا کی آیات پڑھ کر سناتا ہے ان کو گناہوں کی میل سے پاک صاف کرتا ہے انھیں کتاب سکھاتا ہے اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی ایک غرض تعلیم دین اسلام ہے۔ اس وجہ سے اسلامی حکومت کے ہر کارکن پر یہ فرض ہے کہ لوگوں کو دین اسلام سکھائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے عمال کو جو نامہ مبارک[2] لکھے تھے ان میں بھی عمال کو دین کی تعلیم دینے کی طرف توجہ دلائی ہے۔

---

[1] آل عمران ۳: ۱۶۴۔ [2] ابن ہشام جلد ۴ صفحہ ۲۴۱۔

عدلیہ

حکومت کا تیسرا صیغہ عدلیہ (قضا) (Judiciary) ہے۔ قضا اس فیصلے کو کہتے ہیں جو بااختیار ادارے کی طرف بطور حکم فیصل صادر ہو۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں: ''قضا ایک فرض اور محکم ذمہ داری ہے اور ایک قانون ہے واجب العمل (المبسوط السرخسی ج ۱۶ص ۶۰) ابن ہمام حنفی فرماتے ہیں۔ قضا وہ ادارہ ہے جو نزاعی مقدمات کا فیصلہ دیتا ہے۔'' (فتح القدیر جلد ۶ صفحہ ۳۵۶)

محمود بن محمد بن عرنوس فرماتے ہیں۔ حکومت کے مقرر کردہ بااختیار ادارے کی طرف سے کتاب وسنت اور احکام شرعیہ کی روشنی میں لوگوں کے تنازعات کا تصفیہ کرنے اور مقدمات فیصلے کرنے کا نام قضا ہے۔ (تاریخ القضاء فی الاسلام)

اس صیغہ کا یہ کام ہوتا ہے کہ صیغہ مقننہ نے جو قوانین بنائے ہیں اور انتظامیہ نے جو قوانین بنائے ہیں اگر ان کی کوئی شخص خلاف ورزی کرتا ہے تو اسے سزا دی جائے اور عدل قائم کرے۔ عدلیہ (قضا) کا یہ بھی فرض ہے کہ وہ دیکھے کہ آیا قانون پر صحیح معنوں میں عمل ہوتا ہے یا نہیں اور قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا ملی ہے یا کہ نہیں۔

اسلام بلا تفریق مذہب وملت عدل وانصاف کو حکومت کا اہم فرض قرار دیتا ہے اور اسی پر سوسائٹی اور حکومت کی بقا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ۔[1] اور ہم نے اپنے رسولوں کو کھلی نشانیاں دے کر بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور عدل وانصاف کے احکام اتارے تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَیْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ۔[2] اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو۔

وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى۔[3] اور جب تم بات کہو تو انصاف سے کام لو چاہے وہ تمہارا قریبی عزیز ہی کیوں نہ ہو۔

اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ۔[4] یقیناً اللہ انصاف اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى۔ (المائدہ) عدل قائم کرو کیونکہ وہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

---

[1] الحدید ۵۷:۲۵۔ [2] النساء ۴:۵۸۔ [3] الانعام ۶:۱۵۲۔ [4] نحل ۱۶:۹۰۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عادل کی بڑی فضیلت بیان کی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ قیامت کے دن جب کہ خدا کے سایہ کے سوا کوئی دوسرا سایہ نہ ہوگا۔ سات شخصوں کو خدا اپنے سایہ میں جگہ دے گا جن میں سے ایک امام عادل ہوگا۔[1]

محاکم عدلیہ

عدالت عالیہ مرافعہ

اسلامی ریاست کی سب سے بڑی عدالت مرافعہ ہے۔ اس عدالت کا قاضی اکبر امام ہوتا ہے۔

اس عدالت کا ذکر قرآن مجید میں واضح ہے: ارشاد الٰہی ہے: یَا دَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَۃً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ.[2] اے داوٗد ہم نے تجھے زمین میں حاکم بنایا ہے سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر۔

فَاحْکُمْ بَیْنَھُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰہُ وَلَا تَتَّبِعْ اَھْوَاءَ ھُمْ عَمَّا جَاءَ کَ مِنَ الْحَقِّ.[3] اے رسول! ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔

ایک اعرابی کا قول ہے۔ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ اَقْضِ بَیْنَنَا الخ.[4] اے رسول اللہؐ ہمارے درمیان فیصلہ کرو۔

خلفائے راشدین کے عہد میں خلفاء مقدمات کا فیصلہ کیا کرتے تھے۔

مصنف المبسوط رقم طراز ہیں: کَانَ رَسُوْلُ اللّٰہِ یَقْضِی وَالْخُلَفَاءُ بَعْدَہٗ. پہلے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فیصلے کیا کرتے تھے بعدہٗ آپ کے خلفاء۔[5]

مصنف عمدۃ القاری لکھتا ہے: اَوْلَی النَّاسِ بِالْقَضَاءِ الْخَلِیْفَۃُ.[6] سب لوگوں سے زیادہ حق دار فیصلہ کرنے کا خلیفہ ہوتا ہے۔

۲۔ عدالت عالیہ وزارت عدل

صیغہ عدل کا وزیر اس عدالت کا جج ہوتا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد خلافت میں وزارت عدل کا قلم دان حضرت عمرؓ کے ہاتھ میں تھا۔ سنن کبریٰ بیہقی میں لکھا ہے لما ولی ابوبکر ولی عمر القضاء.[7]

---

[1] بخاری۔ [2] ص ۳۸:۲۶۔ [3] المائدہ ۵:۴۸۔
[4] عمدۃ القاری عینی جلد ۱۱ صفحہ ۲۱۹۔ [5] المبسوط جلد ۱۶ صفحہ ۸۶۔
[6] عمدۃ القاری عینی جلد ۶ صفحہ ۱۱۔ [7] سنن کبریٰ بیہقی جلد ۱۰ صفحہ ۹۵۔

جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے قضاء کی وزارت حضرت عمرؓ کو سپرد کی۔

جب حضرت عمرؓ خلیفہ ہوئے تو اس عہدہ پر عبداللہؓ بن مسعود کو مقرر فرمایا تھا۔[1] دور عباسیہ میں "محکمہ عدلیہ کی مطلق العنان وزارت قاضی ابو یوسفؒ کے حوالے کی گئی تھی (امام ابو حنیفہؒ کی سیاسی زندگی از مولانا مناظر احسن گیلانی صفحہ ۳۴۸) قاضی یحییٰ بن اکثم مامون کے زمانے میں اس کے قاضی القضاۃ اور وزیر تھے۔ (تاریخ القضاۃ فی الاسلام از محمد بن محمود بن عرنوس صفحہ ۹۸)

۳۔ یہ عدالت صوبہ کی سب سے بڑی اور آخری عدالت ہوتی ہے۔

عہد فاروقی میں شریح بن الحارث بصرہ کی عدالت عالیہ کے قاضی تھے۔[2]

حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ عہد فاروقی میں بصرہ کی عدالت عالیہ کے قاضی تھے۔[3]

عہد فاروقی میں امیر معاویہؓ شام کے صوبہ کے قاضی تھے۔[4]

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز کے عہد خلافت میں ولایت بصرہ کی عدالت عالیہ کے قاضی موسیٰ بن انس تابعی تھے۔[5]

۴۔ عدالت فوق العادہ (اسپیشل ٹریبونل) یہ عدالت خاص حالات میں خاص معاملات کے متعلق قائم ہوتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں اس قسم کی عدالتوں کی مثالیں موجود ہیں۔ سنن کبریٰ بیہقی میں لکھا ہے۔

بعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم العمال والقضاۃ وکذلک الخلفاء بعدہ.

یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمال اور قاضی بھیجے اس طرح آپ کی وفات کے بعد خلفاء نے بھی۔[6]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں ابو عبیدہؓ بن الجراح نجران کی عدالت کے قاضی مقرر ہوئے۔ اس طرح حضرت علیؓ حضرت معاذ بن جبلؓ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ عدالت یمن کے قاضی مقرر ہوئے تھے۔[7]

ابتدائی عدالتیں

۱۔ عدالت صلح۔

۲۔ عدالت اصلاح بین الناس۔

۳۔ عدالت تحکیم۔

---

[1] سنن کبریٰ بیہقی جلد ۱۰ صفحہ ۶۵۔ [2] عمدۃ القاری جلد ۱۱ صفحہ ۳۹۷۔ [3] المبسوط السرخسی جلد ۱۶ صفحہ ۲۰۔

[4] سنن کبریٰ بیہقی جلد ۱۰ صفحہ ۶۵۔ [5] عمدۃ القاری جلد ۱۱ صفحہ ۳۸۷۔

[6] عمدۃ القاری جلد ۱۱ صفحہ ۳۹۱۔ [7] سنن کبریٰ بیہقی جلد ۱۰ صفحہ ۸۶۔

۴۔ عدالت حاکمہ ابتدائیہ۔

ا۔ عدالت صلح

قاضی عہدہ کے اعتبار سے اس امر پر مامور کیا جاتا ہے کہ وہ سب سے پہلے مقدمہ کے فریقین کو صلح کی طرف مائل کرے۔

۲۔ عدالت اصلاح بین الناس

قانونی دعاوی سننے کے بعد جب عدالت فریقین میں صلح کرانے میں ناکام ہو جاتی ہے تو پھر یہ عدالت نزاعی مقدمات کو مصالحت کے اصول پر فیصلہ کرتی ہے۔ اس مقصد میں قانون سے پورا کام لیتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ.[1] پس ان کے درمیان عدل سے صلح کرا دو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ.[2] مومن بھائی بھائی ہیں سو اپنے بھائیوں کے درمیان صلح کرا دو۔

۳۔ عدالت تحکیم

(ثالثی) یہ عدالت فریقین کی مرضی کے مطابق ثالث مقرر کرتی ہے۔ پھر وہ ثالث فریقین کا دعویٰ اور جواب دعویٰ سن کر فیصلہ کر دیتے ہیں۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَابْعَثُوْا حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا اِنْ يُّرِيْدَا اِصْلَاحًا.[3] ایک ثالث خاوند کی طرف سے مقرر کرو اور ایک ثالث عورت کی جانب سے اگر یہ دونوں اصلاح کرنا چاہیں۔

امیر المومنین حضرت عمرؓ اور حضرت ابی بن ابی کعبؓ کا مقدمہ حضرت زیدؓ بن ثابت کی عدالت تحکیم میں پیش ہوا تھا۔[4]

۴۔ عدالت حاکمہ ابتدائیہ

مقدمہ کی قانونی سماعت کرنے والی پہلی عدالت ہے۔

عدالت حاکم مصر

ہر ضلع میں اس قسم کی عدالت ہوتی ہے۔ شدید سزاؤں کے مقدمات کے فیصلے صرف اسی عدالت میں ہوتے ہیں۔ ابتدائی عدالت ان کا فیصلہ نہیں کر سکتی۔

---

1. الحجرات ۴۹: ۹۔
2. الحجرات ۴۹: ۱۰۔
3. النساء ۴: ۳۵۔
4. المبسوط للسرخسی جلد ۱۶ صفحہ ۸۲۔

یہ وہ عدالت کی قسمیں ہیں جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دور سے ثابت ہیں۔ زمانے کے نئے تقاضوں کے مطابق عدالتوں کا ڈھانچہ بدلہ جا سکتا ہے۔ لیکن عدالت کی رو سے انصاف ہر حالت میں برقرار رہنا چاہیے۔ اگر کسی نظام عدالت سے عدل و انصاف قائم نہ ہو رہا ہو تو وہ نظام قرآن کی رو سے باطل ہو گا۔

شہادت سے رجوع

اگر گواہ اپنی گواہی سے پھر جائے تو اس کی شہادت کا شرعی اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اس کا یہ بیان عدالت میں ہونا چاہیے۔

قضاۃ کے تقرر کے اختیارات اور طریقہ

اسلامی قانون میں قاضی کے تقرر کے اختیارات خلیفہ (سربراہ مملکت) کو حاصل ہیں چاہے وہ خود کرے یا اپنے کسی نائب کے ذریعہ سے اس تقرر کو عمل میں لائے۔

حضرت عمرؓ نے مصر کے قضاۃ کے تقرر کے اختیارات مصر کے گورنر حضرت عمروؓ بن العاص کو سونپ دیے تھے۔

خلیفہ ہارون الرشید کے عہد میں قاضیوں کے نصب وعزل کے تمام اختیارات قاضی القضاۃ حضرت امام ابو یوسف کے ہاتھ میں تھے۔

قاضی کی نامزدگی پر سیر حاصل تبصرہ کرتے ہوئے علامہ ماوردی لکھتے ہیں اور تمام عہدوں کی طرح قضاۃ کے تقرر کی بھی دو صورتیں ہیں۔ اگر نامزدگی بالمشافہ ہو رہی ہے تو نامزدگی زبانی الفاظ سے ہو گی اور غیر موجودگی میں خط و کتابت کے ذریعہ سے ہو سکتی ہے۔ اعلان تقرر میں صریح الفاظ بھی استعمال ہونے چاہئیں۔

نامزدگی میں یہ ضروری ہے کہ صدر مملکت قاضی سے دستور اور قانون کی وفاداری کا حلف لے اور اس میں اس کے اختیارات اور فرائض کی وضاحت بھی ضروری ہے۔

ججوں (قاضیوں) کا تقرر بھی ہر ملک اپنے حالات کے پیش نظر کر سکتا ہے لیکن جس کے ہاتھ میں بھی جج کا تقرر ہو وہ میرٹ پر کرے کیونکہ عدالتی انصاف سے ہی ملک میں استحکام پیدا ہوتا ہے۔

عدلیہ کی آزادی

قاضی فیصلہ جات کرنے میں بالکل آزاد ہے خلیفہ یا کسی اور بااثر کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ اسے کسی فیصلے پر مجبور کرے بلکہ وہ اسے کسی مقدمہ کی دوبارہ سماعت کے لیے بھی مجبور نہیں کر سکتا۔

القاضی اذا قضی فی حادثة فی الحق ثم امر السلطان ان یسمع هذه الحادثة ثانیا بمشهد من العلماء لا یفترض علی القاضی ذلک۔[1] قاضی جب کسی مقدمہ میں کوئی فیصلہ کر

[1] باب خامس کتاب اداب القاضی۔

چکے اس کے بعد سلطان اُسے حکم دے کہ وہ اس مقدمہ کی دوبارہ سماعت علماء کے سامنے کرے تو اس حکم کا ماننا قاضی کے لیے ضروری نہیں۔

اسلامی حکومت میں قاضی اپنے دائرہ اختیارات میں یہاں تک آزاد ہے کہ وہ خلیفہ کو اپنی عدالت میں بلا سکتا ہے اور اس کے خلاف قاضی کی عدالت میں مقدمہ دائر کیا جا سکتا ہے اور خلیفہ بلاچون و چرا عدالت میں حاضر ہوگا۔

قاضی کی شرائط

۱۔ مسلمان ہو: اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا. یعنی اللہ نے مسلمانوں پر کافروں کو کوئی اختیار نہیں دیا اس کی وجہ یہ ہے کہ قاضی شریعت اسلامی کے تحت فیصلے کرنے کا پابند ہے۔ اس لیے یہ بات واضح ہے کہ شریعت اسلامی سے دلچسپی صرف مسلمانوں کو ہی ہو سکتی ہے۔

امام ابو حنیفہؒ کہتے ہیں کہ غیر مسلم اپنے ہم مشربوں کے فیصلے کر سکتے ہیں۔ دور حاضر میں امام ابوحنیفہ کا مسلک ہی زیادہ دقیع ہے۔

۲۔ مرد ہو بالغ ہو: نابالغ پر کوئی حکم واجب نہیں ہے۔ عورتیں قاضی نہیں ہو سکتیں۔ احناف کے نزدیک عورتیں بھی قاضی بن سکتی ہیں چونکہ ماوردی شافعی مذہب کا فقیہہ ہے اس وجہ سے امام شافعیؒ کے مسلک کے مطابق عورتوں کے عہدۂ قضاء پر فائز ہونے کو ناجائز قرار دیتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ عورت کو جج بنانے میں کوئی قباحت نہیں اور احناف کا مسلک زیادہ درست ہے۔

۳۔ ذہین و فطین ہو: معاملات کی تہہ تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

۴۔ عادل ہو: عدالت سے مراد یہ ہے کہ وہ صادق القول امین پاک دامن اور پرہیزگار شبہات سے محفوظ و مصئون خوشی و ناخوشی کی حالت میں یکساں قابل اعتماد ہو۔

۵۔ قاضی کی قوت سامعہ اور قوت باصرہ میں کسی قسم کا نقص نہ ہو تاکہ مقدمہ کی سماعت میں خلل واقع نہ ہو۔

۶۔ قاضی مجتہد اور اصول شرعیہ سے واقف ہو تاکہ مقدمات کا کتاب الہیہ اور سنت رسول کی روشنی میں فیصلے کر سکے۔

۷۔ آزاد ہو۔

۸۔ حرص اور لالچ سے نفرت کرنے والا ہو۔

قاضی کے اوصاف' عدالت کے آداب و ضوابط

۱۔ قاضی عدالت کے فرائض اس یقین کامل کے ساتھ انجام دے کہ خدا اس کو دیکھ رہا ہے۔

۲۔ عدالت کا کام وقار کے ساتھ کرنا چاہیے السرخسی رقم طراز ہیں۔
فلمجالس القضاء من المهابة و الحشمة[1] عدالت کے لیے وقار لازمی ہے۔
۳۔ فریقین میں برابر کا معاملہ کرے کسی ایک فریق کو کسی رنگ میں بھی دوسرے فریق پر فوقیت نہ دے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: سَوِّی بین الخصمین فی لحظک و لفظک. یعنی حرکات وسکنات اور گفتگو میں فریقین کے ساتھ برابر کا سلوک کرو۔
۴۔ قاضی کو غرباء اور باہر سے آنے والوں کے مقدمات کی سماعت پہلے کرنی چاہیے۔
۵۔ مقدمات کے فیصلے تنہائی میں نہ کرے۔ اس سے بدگمانیاں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔
۶۔ قاضی عدالت میں نہ خود کسی کو سلام کرے اور نہ کوئی دوسرا اس کو سلام کرے۔
۷۔ تحفے قبول نہ کرے، فقہاء فرماتے ہیں:
"حاکم عدالت کسی کا تحفہ قبول نہ کرے سوائے اس رشتہ دار یا دوست کے جو اہل مقدمہ میں سے نہ ہو اور شروع سے اس کی عادت تحفہ بھیجنے کی ہو۔"
۸۔ قاضی کو غصہ کے عالم میں عدالت کا کام نہیں کرنا چاہیے۔ ابوبکرؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:
"کوئی حاکم دو آدمیوں کے معاملہ میں غصہ کی حالت میں فیصلہ نہ دے۔"[2]
۹۔ عورتوں اور مردوں کی سماعت الگ الگ ہونی چاہیے۔ مصنف المبسوط لکھتے ہیں۔
للقاضی ان یقدم النساء.[3] یعنی قاضی کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عورتوں کو مقدم رکھے۔
۱۰۔ فریقین کو قاضی کے سامنے بیٹھنا چاہیے۔ ابو داؤد نے عبداللہؓ بن زبیر سے روایت کی ہے۔
قضی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الخصمین یقعد ان بین یدی الحاکم.
۱۱۔ قاضی فریقین میں سے کسی ایک فریق کو گھر یا تنہائی میں ملنے یا گفتگو کرنے کی اجازت نہ دے۔
۱۲۔ قاضی صرف ظاہری حالت کے مطابق فیصلہ دے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے۔ امرت ان احکم بالظاھر واللہ یتولی السرائر یعنی مجھے صرف ظاہری حالت کے مطابق فیصلہ دینے کا حکم دیا گیا ہے۔ بھیدوں اور اندرونی حالات کا علم صرف اللہ کو ہے۔
۱۳۔ عدالت میں رویہ نرم رکھنا چاہیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذؓ بن جبل کو ہدایت فرمائی۔ یسرا و لا تنفرا۔[4]
۱۴۔ مدعی اور مدعا علیہ دونوں کے بیانات پوری توجہ کے ساتھ سن کر فیصلہ کرنا چاہیے۔ رسول کریم

[1] المبسوط جلد ۱۶ صفحہ ۶۶، ۶۷۔ [2] فتح الباری جلد ۱۳ صفحہ ۱۱۷۔
[3] المبسوط جلد ۱۶ صفحہ ۸۰۔ [4] عمدۃ القاری جلد ۱۱ صفحہ ۴۰۔

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ کو یمن بھیجتے ہوئے نصیحت فرمائی۔ فاذا جلس بین یدک الخصمان فلا تقضی حتی تسمع کلام الاخر کما سمعت کلام الاول فانه احری ان یتبین لک وجه القضاء۔ یعنی جب تیرے سامنے فریقین بیٹھ جائیں تو اس وقت تک فیصلہ نہ کرنا جب تک پہلے فریق کی طرح دوسرے فریق کا بیان بھی نہ سن لے کیونکہ صحیح فیصلہ کرنے کے لیے یہی طریقہ مناسب ہے۔

۱۵۔ قاضی مقدمہ کی پیشی اور شہادتیں گزارنے کے لیے ایک تاریخ مقرر کر دے اگر تاریخ مقرر پر مدعی گواہ نہ لائے تو اس کے خلاف فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن انصاف کا یہ تقاضا ہے کہ مدعی سے دریافت کر لیا جائے کہ گواہ کیوں حاضر نہیں ہوئے اگر وجوہ معقول ہوں تو دوبارہ گواہ پیش کرنے کا موقع دیا جائے۔

۱۶۔ قاضی گواہ سے دریافت کرے کہ وہ کیا گواہی دینا چاہتا ہے اور کسی گواہ پر قاضی اثر نہ ڈالے۔

۱۷۔ قاضی ہمیشہ عدل پر ثابت قدم رہے۔ کسی حالت میں بھی اس کا پاؤں نہ ڈگمگائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ۔[1] اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو۔

۱۸۔ قاضی کو فیصلہ تردد کی حالات میں نہیں کرنا چاہیے۔ کہیں شبہہ کے مواقع آ جائیں تو فیصلہ میں توقف کرے خوب غور وفکر کرے اگر قاضی کو انصاف میں شک کا خیال گزرے تو وہ مقدمہ کسی دوسری عدالت میں بھیج دے۔

۱۹۔ قاضی جنبہ داری اور اقرباء پروری سے کام نہ کرے۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا۔[2] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو انصاف پر قائم ہونے والے اللہ کے لیے گواہی دینے والے رہو۔ گو معاملہ تمہاری اپنی ذات یا ماں باپ اور قریبیوں کے خلاف ہو۔ اگر کوئی امیر ہو یا غریب تو اللہ دونوں کا تمہاری نسبت زیادہ خیر خواہ ہے سو تم خواہش کی پیروی نہ کرو تاکہ عدل کر سکو اور اگر تم پیچ دار بات کرو یا (حق سے) اعراض کرو تو یقیناً جو تم کرتے ہو اللہ اس سے خبردار ہے۔
وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى۔[3] اور جب تم مقدمہ کا فیصلہ کرو تو انصاف سے کرو خواہ قریبی رشتہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

۱۔ النساء ۴:۵۸۔ ۲۔ النساء ۴:۱۳۵۔ ۳۔ الانعام ۶:۱۵۲۔

۲۔ قاضی سزا اس وقت تک نہ دے جب تک کہ اس کو حتمی یقین نہ ہو جائے کہ گواہیاں ہر لحاظ سے شک وشبہ اور جھوٹ سے خالی ہیں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا:
"جب تک کسی شخص کے خلاف ایسے آدمی گواہی نہ دیں گے جن کی دیانت اور عدالت ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک ہو اس وقت تک اس پر کوئی تعزیر قائم نہ کی جائے گی۔
۳۔ قاضی کی تنخواہ مقرر ہونی چاہیے تاکہ وہ رشوت لینے پر مجبور نہ ہو۔ حضرت عمرؓ نے عامل مصر کو لکھا کہ جب تم کسی شخص کو قضا کا عہدہ تفویض کرو تو اس کی تنخواہ مقرر کرو تاکہ اس کے اخراجات زندگی اسے رشوت لینے پر مجبور نہ کریں۔
۴۔ تمام فیصلے حق اور انصاف کے مطابق ہوں جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَهُمْ عَمَّا جَاءَكَ مِنَ الْحَقِّ۔[1] پس تو لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے کر اور اس قانون حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔ إِنَّ الَّذِينَ يُحَادُّونَ اللَّهَ وَرَسُولَهُ أُولَئِكَ فِي الْأَذَلِّينَ۔[2] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین (حق اور انصاف) کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

قاضی کے اختیارات وفرائض

تاریخ اسلامی میں فیصل تنازعات ومقدمات کے علاوہ خلفاء وامراء نے قاضی کو کچھ مزید بھی اختیارات دے رکھے تھے۔ علامہ ابوالحسن ماوردی نے انھیں دس شقوں میں تقسیم کیا ہے جن کی تلخیص بیان کی جاتی ہے۔

۱۔ تنازعات کے فیصلے کرنا۔
۲۔ جب کسی شخص کا حق اقرار یا گواہی کے ذریعہ مدعا علیہ پر ثابت ہو جائے اسے اس کا حق دلوانا۔
۳۔ نابالغ بچوں اور مرفوع القلم لوگوں کے اموال کی حفاظت کرنا۔ اسی طرح دیوالیہ اور سفیہ لوگوں کے معاملات وتصرفات پر پابندی عائد کرنا تاکہ وہ اپنی سفاہت کی وجہ سے مستحقین کے حقوق کو برباد نہ کر دیں۔ لاوارث اور غیر موجود لوگوں کے اموال کی حفاظت کرنا قاضی کے فرائض میں شامل ہے۔
۴۔ اموال یتامیٰ کی حفاظت کرنا۔
۵۔ اوقاف کی نگرانی۔

---
[1] المائدہ ۵: ۴۸۔ [2] المجادلہ ۵۸: ۲۰۔

۶۔ وصایا کا نفاذ ان کی شرائط کے مطابق۔

۷۔ بیوہ عورتوں کے ولی نہ ہوں تو ان کے نکاح کے بارے میں کفو کی نگرانی کرنا۔

۸۔ حدود جاری کرنا۔

۹۔ راستوں اور مکانات کے بارے میں ناجائز، فضول اور غیر قانونی تعمیرات کی نگرانی کرنا۔

۱۰۔ گواہوں اور امینوں کی منظوری دینا، نائبوں کو مقرر کرنا، قوی اور ضعیف، معزز اور وضیع کے درمیان عدل و مساوات قائم کرنا۔

ضابطہ شہادت

عدالت میں اثبات دعویٰ کو بڑی اہمیت حاصل ہے کیونکہ حدیث میں آتا ہے۔ لَوْ یُعْطَی النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعٰی نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَاَمْوَالَهُمْ۔ (مسلم) یعنی اگر لوگوں کے دعویٰ کے مطابق ہی فیصلے کر دیے جائیں تو عدالتوں میں خون اور مال کے بہت سے دعویٰ دائر کر دیے جائیں گے۔ پس عدالت میں دعویٰ کو ثابت کرنا اس لیے ضروری ٹھہرتا ہے کہ لوگ بے بنیاد دعاوی عدالتوں میں نہ کرنے شروع کر دیں۔

پس اثبات دعویٰ کا یہ مطلب ہے کہ دلیل و براہین کے ذریعہ دعویٰ کو حد یقین تک پہنچا دیا ہے۔ اثبات دعویٰ کے لیے حسب ذیل ذرائع و وسائل ہیں:

۱۔ بینہ

بینہ سے مراد ہر وہ ذریعہ اور وسیلہ ہے جس کے ذریعہ حق اور باطل میں تمیز ہو جائے اور حق کھل کر سامنے آ جائے۔ ابو داؤد کی ایک روایت میں ہے۔ اَلْبَیِّنَةُ عَلَی الْمُدَّعِی وَالْیَمِیْنُ عَلَی الْمُدَّعٰی عَلَیْهِ۔ یعنی اثبات دعویٰ کے لیے مدعی گواہ لائے اور مدعا علیہ پر حلف فرض ہے۔ گواہ کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی یہ ہدایت ہے کہ جب گواہ واقعہ کو سورج کی طرح روشن دیکھے تو شہادت دے۔ ورنہ نہ دے۔

۲۔ یمین (قسم)

مدعی اگر مدعی علیہ کے الزام سے انکار کرتا ہے تو اس سے حلف لیا جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَوْ یُعْطَی النَّاسُ بِدَعْوَاهُمْ لَادَّعٰی نَاسٌ دِمَاءَ رِجَالٍ وَاَمْوَالَهُمْ وَلٰکِنَّ الْبَیِّنَةَ عَلَی الْمُدَّعِی وَالْیَمِیْنُ عَلَی الْمُدَّعٰی عَلَیْهِ۔ اگر لوگوں کے حقوق محض دعویٰ کی بناء پر دے دیے جائیں تو بہت سے لوگ لوگوں کے خون اور مال کے مدعی ہو جائیں اس لیے مدعی اثبات دعویٰ

کے لیے گواہ لائے اور مدعی علیہ انکار کی صورت میں حلف اٹھائے۔

کتب احادیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے حلف کے الفاظ بھی مروی ہیں۔

ابن عباس سے روایت ہے کہ آپ نے ایک آدمی سے فرمایا:

احلف باللّٰہ الذی لا الہ الا ھو مالہ عندک شیٔ. یعنی تو حلف اٹھا کہ اللہ کی قسم جس کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اس کی کوئی چیز میرے پاس نہیں ہے۔

۳۔ قیافہ شناسی

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیافہ شناسی کی شہادت کو اعتبار کا درجہ دیا تھا۔ معتبر روایت ہے کہ حضرت اسامہؓ اور حضرت زیدؓ دونوں ایک چادر میں سوئے ہوئے تھے اور پاؤں کھلے تھے۔ آپ نے پاؤں کو دیکھ کر فرمایا یہ دونوں باپ بیٹا ہیں۔

حضرت اسامہ کالے رنگ کے تھے اور حضرت زید سفید رنگ کے تھے اس لیے لوگوں کو ان کے نسب میں شک تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے قیافہ سے اس اشتباہ کو رفع کر دیا۔

قیافہ شناسی کا فن عرب میں بہت رائج تھا ابن قیتبہ نے لکھا ہے کہ قیافہ شناسی صرف پاؤں کے نشان دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ گزرنے والا مرد ہے یا کہ عورت۔

۴۔ فراست

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بعض ایسے مقدمات بھی منقول ہیں جن میں آپ نے صرف فراست اور قرائن کی بناء پر فیصلہ صادر فرما دیا۔

۵۔ قسامت

قسامت کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی جگہ کوئی لاش ملے اور اس کے قاتل کا پتہ نہ چلے تو اس جگہ کے کچھ لوگوں سے اس کے بارے میں بریت کی قسم لی جائے۔

مسلم اور بخاری میں روایت ہے کہ ایک انصاری عبداللہ بن سہیل اور اس کا چچا زاد بھائی محیصہ بن مسعود خیبر گئے اور ان ایام میں خیبر کے یہود اور مسلمانوں کے درمیان صلح تھی۔ یہ دونوں اصحاب کسی ضرورت کے تحت ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ اتنے میں عبداللہ بن سہیل کو کسی نے قتل کر کے ایک کنویں میں پھینک دیا۔ چنانچہ خیبر کے یہود پر اس قتل کا الزام لگایا گیا مقتول کے بھائی نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر واقعہ بیان کیا۔ آپ نے ان لوگوں سے فرمایا کیا تم قسم کھا کر کہہ سکتے ہو کہ فی الواقع یہود نے عبداللہ کو قتل کیا ہے انھوں نے کہا ہم کیوں کر قسم کھا سکتے ہیں جب کہ قتل ہمارے سامنے نہیں ہوا۔ اس پر آپ نے فرمایا تو پھر یہود میں سے

پچاس اشخاص حلف اٹھائیں گے۔ انھوں نے کہا یا رسول اللہ! وہ تو مسلمان نہیں ہیں ہم ان کی قسم کیسے قبول کر لیں۔ اس پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے زکوٰۃ کے اونٹوں میں سے سو اونٹ دیت کے طور پر ان کو دیے۔

۶۔ قرعہ اندازی

بعض صورتوں میں قرعہ اندازی سے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فیصلے صادر فرمائے۔ ایک مرتبہ ایک سواری کے جانور پر دو آدمیوں نے اپنا دعویٰ کیا اس پر آپ نے حکم دیا کہ قرعہ ڈال کر معلوم کیا جائے کہ کون حلف اٹھائے۔

اثبات دعویٰ کے یہ ذرائع اور وسائل اپنے اپنے موقع محل پر استعمال کیے جائیں گے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص کسی کو قتل کر دے' قاضی کے سامنے مقدمہ پیش ہو تو قاضی قرعہ اندازی شروع کر دے۔ آیا اس نے قتل کیا ہے یا کہ نہیں۔

گواہ کے قانونی اوصاف

عادل ہونا:

قانون کی نظر میں گواہ کے چند اوصاف ہیں۔ جن کا ہونا بہت ضروری ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاَشْهِدُوْا ذَوَی عَدْلٍ مِنكُمْ یعنی اپنے میں سے دو عادل گواہ بناؤ۔[1]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے: لَا تَجُوزُ شَهَادَةُ خَائِنٍ وَلَا خَائِنَةٍ وَلَا زَانٍ وَلَا زَانِيَةٍ وَلَاذِی غِمرٍ عَلٰی اَخِیهِ. (ابو داؤد) یعنی خائن اور خائنہ اور زانی اور زانیہ کی شہادت جائز نہیں ہے اور نہ اس شخص کی شہادت ایسے شخص کے حق میں جائز ہے' جس سے اس کی عداوت ہے۔

اس طرح ترمذی میں روایت ہے کہ جس شخص کو کوئی حد لگ چکی ہے یا جو شخص پہلے کسی گواہی میں جھوٹا ثابت ہو چکا ہے۔ ان کی شہادت درجہ اعتبار تک نہیں پہنچتی اور اس طرح گھر والوں کے حق میں ان کے نوکروں وغیرہ کی گواہی بھی درست نہیں اور نہ کسی ایسے رشتہ دار یا دوست کی گواہی جائز ہو گی جس کے متعلق یہ گمان ہو کہ وہ جانبداری سے کام لے گا۔

ہدایہ جلد ثالث میں لکھا ہے۔

"باپ کے حق میں بیٹے کی گواہی' بیٹے کے حق میں باپ کی گواہی' بیوی کی گواہی خاوند کے حق میں اور خاوند کی گواہی بیوی کے حق میں' غلام کی شہادت آقا کے حق میں اور اجیر کی گواہی مستاجر کے متعلق قبول نہیں کی جائے گی۔"

---

[1] النور ۲۴:۴۔

جو لوگ کسی مسلمان پر زنا کا الزام لگا کر ثابت نہیں کر سکے تو ان کی گواہی معتبر نہیں ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَقْبَلُوْا لَهُمْ شَهَادَةً اَبَدًا وَاُولٰئِكَ هُمُ الْفَاسِقُوْنَ.[1] اور ان کی گواہی قبول نہ کرو اور وہی فاسق ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تہمت اور زنا کے حکم میں دوسرے کبائر بھی شامل کیے ہیں۔ ان کے مرتکب کی گواہی قبول نہیں کی جائے گی اسلام نے گواہی کے لیے عقل، بلوغت، قوت حافظہ، گویائی، عدالت اور غیر مہتم ہونے کی شرائط عائد کی ہیں۔

شہادت کی اقسام

۱۔ تواتر: وہ لسانی شہادت ہوتی ہے جب دعوی کے اثبات کے لیے اتنے آدمی گواہی دیں۔ جن کی نسبت عقل یہ باور نہ کر سکے کہ ان سب نے مل کر غلط بیانی سے کام لیا ہے۔

۲۔ احاد: جو شہادت اس قسم کے تواتر سے خالی ہو۔

۳۔ اقرار: جب مدعی علیہ اس دعوی کی نسبت جو اس کے خلاف کیا گیا ہے جو اس کی شہادت اور تصدیق کر دے تو یہ عمل اقرار کے نام سے موسوم ہونے لگے گا۔

دستاویزی شہادت

عدالت میں دستاویزی شہادت بھی قابل قبول ہے لیکن اس شہادت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ جعل کے شبہ سے خالی ہو۔

۱۔ النور ۲۴:۴۔

باب پنجم

اسلامی مملکت کے اوصاف

حکومتِ الٰہیہ کا قیام

اسلامی حکومت کا پہلا وصف دنیا میں حکومت الٰہیہ قائم کرنا ہے۔ قرآن مجید میں خدا کی حکومت کو حکم کے لفظ سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔[1] حکم دینے کا اختیار صرف اللہ کو ہی حاصل ہے۔

لَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا. یعنی خدا کی حکومت میں کوئی دوسرا شریک نہیں۔

فَالْحُكْمُ لِلّٰهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيْرِ. [2] یعنی حکومت کا منصب صرف اللہ تعالیٰ کے ہی لیے ہے جو بلند اور بڑا ہے۔

خدا کی حکومت اس دنیا میں کس طرح قائم ہوسکتی ہے۔ اس کا جواب اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں دیتا ہے کہ اس کے نازل کردہ قانون کو دنیا میں نافذ کیا جائے۔

ارشاد الٰہی ہے: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ. [3] سو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا ہے اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗٓ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ. [4] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ. [5] ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان اتارا تاکہ لوگ انصاف پر قائم رہیں۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ. [6] اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ

---

1. یوسف ۱۲: ۴۰۔ 2. المومن ۴۰: ۱۲۔ 3. المائدہ ۵: ۴۸۔
4. المجادلہ ۵۸: ۲۰۔ 5. الحدید ۵۷: ۲۵۔ 6. المائدہ ۵: ۴۵۔

قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں پس وہ ظالم ہیں۔

يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ اِنْ كُنْتُمْ تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ۔[1]

اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی اطاعت کرو پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف لے جاؤ اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان لائے ہو۔

اس آیت کریمہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔

۱۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ضروری ہے۔

۲۔ صاحب امر کی اطاعت اس وقت ضروری ہے جب وہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کے تابع ہو۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: لاَ طَاعَةَ فِي مَعْصِيَةٍ اِنَّمَا الطَّاعَةُ فِي الْمَعْرُوْفِ۔[2] معصیت میں کوئی فرمانبرداری نہیں اطاعت صرف معروف میں ہے۔

عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ السَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيْمَا اَحَبَّ وَكَرِهَ اِلَّا اَنْ يُّؤْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ فَاِنْ اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلاَ سَمْعَ وَلاَ طَاعَةَ۔[3] ہر مسلمان مرد پر سمع و طاعت لازم ہے۔ خواہ رضا مندی سے کرے یا ناپسندیدگی سے تاوقتیکہ اس کو گناہ کا حکم نہ دیا جائے پھر اگر گناہ کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے اور نہ اطاعت۔

لاَ طَاعَةَ الْمَخْلُوْقِ فِيْ مَعْصِيَةِ الْخَالِقِ۔ یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کے لیے کوئی اطاعت نہیں ہے۔

جب حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نائب ہونے کی حیثیت سے مسجد نبوی میں تمام لوگوں کے سامنے اس امر کا اقرار کیا۔ ایها الناس انما انا متبع ولست بمبتدع فان انا احسنت فاعينوني وان انا زغت فقوموني۔[4] اے لوگو! میں احکام اسلام کا پیرو ہوں اور کسی بدعت کا موجد نہیں ہوں۔ اگر احکام اسلامی کے مطابق زندگی بسر کروں تو میری مدد کرو اگر کجی اختیار کروں تو سیدھا کرو۔

صحابہ کرام نے جواب دیا اگر آپ نے اسلامی احکام سے ہٹ کر کوئی اور راہ اختیار کی تو ہم تیروں کی انیوں سے آپ کو سیدھا کریں گے۔

۱۔ النساء ۴: ۵۹۔ ۲۔ بخاری ۲/۱۰۶۱۔ ۳۔ بخاری مسلم باب الجہاد۔

۴۔ کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۳۶۶۔

حضرت سلمانؓ فرماتے ہیں: ان الخلیفۃ ھو الذی یقضی بکتاب اللّٰہ ویشفق علی الرعیۃ شفقۃ الرجل علی اھلہ فقال کعب الاحبار صدق.[1] خلیفہ وہ ہوتا ہے جو قرآن کے مطابق فیصلہ کرے اور رعیت پر اس طرح شفقت کرے جس طرح ایک شخص اپنے اہل و عیال پر شفقت کرتا ہے۔ کعب احبار نے سنا تو کہا سلمان نے سچ کہا ہے۔

دوسرا وصف اتحاد

اگر مذاہب عالم اور دنیاوی تحریکات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ ملی اور بین الاقوامی اتحاد کا علمبردار صرف اسلام ہی ہے۔

یہودی کہتے ہیں: نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰہِ وَاَحِبَّآؤُہٗ یعنی ہم خدا کے بیٹے اور اس کے محبوب ہیں اور ہم ہی اس کی روحانی تعلیمات کے حقیقی وارث ہیں۔

یہودیوں کا یہ نظریہ ہے کہ یہودی وہی ہے جو یہود قوم میں پیدا ہوا ہو۔ دوسری قوم کا کوئی فرد یہودی نہیں بن سکتا صرف یہودیوں میں ہی نبی اور رسول آتے رہے ہیں۔ باقی تمام اقوام عالم روحانی تعلیم سے محروم ہیں۔

یہ نظریہ اتحاد کے سراسر منافی ہے اور نسل انسانی کو ایک پلیٹ فارم پر کبھی جمع نہیں ہونے دے گا۔

عیسائیوں کی کتاب مقدس انجیل میں لکھا ہے کہ ”میں بنی اسرائیل کی گم شدہ بھیڑوں کے سوا کسی اور کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ (متی ۲۴/۱۵) اور اپنے حواریوں کو یہ ہدایت کی کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا (متی باب ۱۰ آیت ۵) اور اپنے شاگردوں کو یہ تلقین بھی کی کہ پاک چیز کتوں کو نہ دو اور اپنے موتی سوروں کے آگے نہ ڈالو۔ (متی ۶:۷)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ایک کنعانی عورت کو جو یہودی نہ تھی ذیل کے الفاظ سے مخاطب کیا: میں بچوں کی روٹی کتوں کے سامنے نہیں پھینک سکتا۔ اس پر عورت نے عرض کیا بچوں کے دستر خوان سے جو ٹکڑے گرتے ہیں انھیں کتے کھا ہی لیا کرتے ہیں۔ (مرقس باب ۷ آیت ۲۷، ۲۸)

انجیل کی ان آیات میں غیر یہودیوں کو کتے اور سور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ یہ نفرت انگیز تعلیم عیسائی اور غیر عیسائی کو کبھی بھی اتحاد کی لڑی میں منسلک نہیں ہونے دے گی۔

ہندو مذہب تو چار ورنوں کی تعلیم دیتا ہے اور برہمن کو باقی ذاتوں پر فوقیت دیتا ہے سب سے مظلوم اور گھٹیا ذات شودر ہے۔ وید لکھتا ہے:

---

1. الاسلام والحضارۃ العربیۃ جلد ۲ صفحہ ۱۳۱۔

"برہمن پر ماتما کے منہ سے، کشتری بازوؤں سے ویش رانوں سے اور شودر پاؤں سے پیدا ہوا۔" (رگوید، یجروید، اتھروید)

ویدوں کی اس تعلیم کے تحت نسل انسانی کبھی بھی متحد نہیں ہو سکتی۔

اشتراکیت دنیا کو دو طبقوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ایک مزدور طبقہ اور دوسرا سرمایہ دار، اشتراکیت مزدوروں کو ابھارتی ہے اور سرمایہ داروں کو صفحہ ہستی سے مٹاتی ہے۔

فاشزم کی بنیاد ہی ایک خاص قوم اور نسل کی فوقیت پر ہے۔ حکمران طبقہ دوسرے طبقوں سے افضل ہوتا ہے۔ اس نظام میں اعلیٰ نسل کا فرد حاکم ہوتا ہے اور عوام محکوم، فاشزم اس طبقاتی تقسیم کو معاشرہ کے لیے مفید سمجھتی ہے۔

نازی ازم

نازی تحریک کی اساس ہی اس نعرہ پر اٹھائی گئی تھی کہ جرمن قوم اعلیٰ قوم ہے صرف اسی قوم کو دوسری اقوام پر حکومت کرنے کا حق حاصل ہے۔

سرمایہ داری نظام

سرمایہ داری نظام میں سرمایہ داروں کو برتری حاصل ہے۔ اس نظام میں مزدور غلام بن کر رہ گئے ہیں۔

اسلام اور اتحاد

اسلام اتحاد کا سرچشمہ توحید کو قرار دیتا ہے۔ عقیدہ توحید نے نسل انسانی کو غلامی کی تمام زنجیروں سے رہائی دلا کر اتحاد کی لڑی میں منسلک کر دیا ہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کا بار بار ذکر آتا ہے۔ سورۃ فاتحہ کا آغاز ہی اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ کے الفاظ سے ہوتا ہے۔ یعنی تمام محاسن کا حقیقی حق دار صرف اللہ ہی ہے جو تمام جہانوں کا پالنے والا ہے۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف مسلمانوں کا ہی پالنے والا نہیں ہے بلکہ ہندو، عیسائی، یہودی وغیرہ دنیا کی تمام اقوام کا پالن ہار ہے۔ وہ اس کے سرچشمہ ربوبیت سے سیراب ہوتی ہیں۔

اِنَّ رَبَّكُمُ اللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي الَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهٗ حَثِيْثًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُوْمَ مُسَخَّرٰتٍۭ بِاَمْرِهٖ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ تَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ۔[1] تمہارا رب اللہ ہے جس نے آسمان اور زمین چھ وقتوں میں پیدا

[1] اعراف ۷: ۵۴۔

کیے پھر وہ عرش پر متمکن ہے رات کو دن کا لباس پہناتا ہے وہ اس کے پیچھے لگاتار چلا آتا ہے اور سورج اور چاند ستارے اس کے حکم سے کام میں لگائے گئے ہیں۔ سن لو بنانا اور حکم دینا اسی کا کام ہے۔ اللہ بابرکت ہے جو جہانوں کا رب ہے۔

رَبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ۔[1] تمہارا پروردگار بڑی ہی وسیع رحمت رکھنے والا ہے۔

قَالَ رَبُّنَا الَّذِیْ اَعْطٰی كُلَّ شَیْءٍ خَلْقَهٗ ثُمَّ هَدٰی.[2] فرمایا ہمارا پروردگار وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی پیدائش عطا کی پھر رہنمائی فرمائی۔ اتحاد کی حسب ذیل اقسام ہیں۔

ا۔ نسل انسانی کا اتحاد

اسلام تمام انسانی کو ایک اصل کی شاخیں قرار دیتا ہے۔ یہ وہ عظیم الشان پیغام ہے جو ایک امی نبی نے دنیا کو دیا۔ نسل انسانی کی وحدت کا تصور تہذیب انسانی پر وہ احسان ہے جس کی نظیر دوسرے کسی نبی یا کسی انسان کی تعلیم میں نہیں ملتی۔ یہ اتنا بلند نظریہ ہے جو بغیر خدا کی وحی کے انسان کی سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ ارشاد الٰہی ہے:

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً.[3] اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّاۤ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا.[4] اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْخَلْقُ عِیَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَی اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰی عِیَالِهٖ.[5] ساری مخلوق اللہ کا کنبہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق سے محبت کرتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَیْءٍ اِنِّیْ اَشْهَدُ اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ.[6] ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہے کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اتحاد ملی

اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو خطاب کرتے ہوئے فرماتا ہے: وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ.[7] یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں۔ سو میرا تقویٰ کرو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ.[8] مومن بھائی بھائی ہیں۔

---

1. انعام ۶:۱۴۷۔ 2. طہٰ ۲۰:۵۰۔ 3. النساء ۴:۱۔
4. یونس ۱۰:۱۹۔ 5. بیہقی کتاب الایمان۔ 6. مسند احمد۔ ابو داؤد
7. المومنون ۲۳:۵۲۔ 8. الحجرات ۴۹:۱۰۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اَلْجَمَاعَۃُ رَحْمَۃٌ وَالْفِرْقَۃُ عَذَابٌ۔[1] جماعت رحمت ہے اور متفرق ہونا عذاب ہے۔

تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ فِی تَرَاحُمِھِمْ وَتَوَادِّھِمْ وَتَعَاطُفِھِمْ کَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَکٰی عُضْوٌ تَدَاعٰی لَہٗ سَائِرُ جَسَدِہٖ بِالسَّھَرِ وَالْحُمّٰی۔[2] تو مومنین کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا جیسا کہ بدن میں ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارے اعضاء بخار اور بیداری میں اس کے شریک ہوں۔

اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ کَالْبُنْیَانِ یَشُدُّ بَعْضُہٗ بَعْضًا ثُمَّ شَبَّکَ بَیْنَ اَصَابِعِہٖ۔[3] ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسا کہ ایک عمارت کا ایک جز دوسرے جز کو قوت دیتا ہے پھر اپنی انگلیوں کو ملا کر مثال دی کہ اس طرح:

اِنَّمَا اَھْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمُ الْاِخْتِلَافُ۔[4] اگلے لوگوں کو اختلاف نے تباہ کیا۔

دینی اتحاد

اسلام نے دینی اتحاد کی بنیاد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عالمگیر پیغام پر رکھی کہ سب لوگ اسی پیغام کو مانیں جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لائے ہیں اور وہی دین فطرت ہے۔ اسی دین کے ابلاغ کے لیے مختلف زمانوں میں انبیاء علیہم السلام آتے رہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس دین کی تکمیل کر دی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: قُلْ یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ اِلَیْکُمْ جَمِیْعًا۔[5] کہہ اے لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔

وَمَا اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا وَّلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ۔[6] اور ہم نے تجھے تمام ہی لوگوں کے لیے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کَانَ کُلُّ نَبِیٍّ یُبْعَثُ اِلٰی قَوْمِہٖ خَاصَّۃً وَبُعِثْتُ اِلٰی کُلِّ اَحْمَرَ وَاَسْوَدَ۔[7] ہر نبی اپنی خاص قوم کی طرف بھیجا جاتا تھا اور میں تمام سرخ و سیاہ قوموں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

دین اسلام کی تکمیل کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْاِسْلَامَ دِیْنًا۔[8] آج میں نے تمہارا دین تمہارے لیے کامل

1۔ کنوز الحقائق حرف الجیم۔ 2۔ بخاری کتاب الادب۔

3۔ بخاری کتاب الادب۔ 4۔ کنوز الحقائق حرف الہمزہ۔ 5۔ اعراف 7:158۔

6۔ سباء 34:28۔ 7۔ مسلم باب المساجد۔ 8۔ المائدہ 5:3۔

کر دیا ہے اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور دین اسلام تمھارے لیے پسند کیا۔

قانونی اتحاد

اسلام میں قانون کی نظر میں مومن' کافر' بادشاہ' رعایا' امیر اور غریب' مزدور اور آقا سب برابر ہیں' ارشاد الٰہی ہے: يَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِي الْأَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ.[1] اے داؤد ہم نے تجھے زمین میں حاکم بنایا ہے' سو لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ کر اور خواہشات کی پیروی نہ کر۔ ورنہ وہ تجھے اللہ کی راہ سے بہکائیں گے۔

وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ اَهْوَاءَ هُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ وَمَنْ فِيْهِنَّ.[2] اگر حق ان کی خواہشات کا تابع ہو جائے تو زمین' آسمانوں اور جو کچھ ان میں ہے سب کا سب تباہ و برباد ہو جائے گا۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ خود ساختہ رسم و رواج یا اہوائے نفسانی کو نظر انداز کر کے فیصلہ قانون الٰہی کے تابع ہونا چاہیے۔

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَاءَ هُمْ عَمَّا جَاءَ كَ مِنَ الْحَقِّ.[3] سو ان کے درمیان اس کے مطابق فیصلہ کر جو اللہ نے اتارا اور اس کو چھوڑ کر جو تیرے پاس حق آیا ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کر۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَادُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ اُولٰٓئِكَ فِي الْأَذَلِّيْنَ.[4] جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقرر کردہ قوانین کی مخالفت کرتے ہیں وہ سخت ذلیل لوگوں میں سے ہیں۔

عہد نبویؐ کا ایک مشہور واقعہ ہے کہ ایک اونچے خاندان کی عورت نے چوری کی۔ کچھ لوگوں کو خیال آیا کہ اگر اس عورت کو سزا ہو گئی تو جگ ہنسائی ہو گی۔ حضرت اسامہؓ کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اقدس میں سفارش کے لیے بھیجا کہ اس عورت کو سزا نہ دی جائے۔ جب حضرت اسامہؓ نے اپنے مدعا کے اظہار کے لیے زبان کھولی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ غصہ سے متغیر ہو گیا اور فرمایا تم سے پہلی اقوام محض اس وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ وہ سزا نیچ لوگوں کو دیتے تھے اور بڑوں کو چھوڑ دیتے تھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا۔[5]

حضرت ابوبکرؓ نے خطبہ دیا۔ یقیناً تمھارے زبردست لوگ میرے لیے اس وقت تک کمزور ہیں جب تک میں ان سے ہر غصب شدہ حق نہ لے لوں اور بلاشبہ تمھارے کمزور لوگ میرے نزدیک اس وقت تک قوی ہیں جب تک میں ان کا غصب شدہ حق واپس نہ دلا دوں۔[6]

---

1. ص ۳۸:۲۶۔ 2. المومنون ۲۳:۷۱۔ 3. المائدہ ۵:۴۸۔ 4. المجادلہ ۵۸:۲۰۔
5. بخاری اقامۃ الحد علی الوضیع والشریف۔ 6. کتاب الاموال لابی عبید صفحہ ۳۶۶۔

قاضی عدالت کے معاملہ میں خلیفہ کے اثر سے آزاد ہے اگر خلیفہ کسی فیصلے پر مجبور کرے یا بعض نظر ثانی کا حکم دے تو قاضی کو یہ حق حاصل ہے کہ خلیفہ کے حکم کو مسترد کر دے۔ القاضی اذا قضی فی حادثة فی الحق ثم امر السلطان ان یسمع هذه الحادثة ثانیا بمشهدین العلماء لا یفترض علی القاضی ذلک۔[1] قاضی جب کسی مقدمہ میں کوئی فیصلہ کر چکے تو اس کے بعد سلطان اسے حکم دے کر وہ اس مقدمہ کی دوبارہ سماعت علماء کے سامنے کرے تو اس حکم کا ماننا قاضی کے لیے ضروری نہیں ہے۔

تیسرا وصف مساوات

مساوات سے یہ مطلب لینا کہ تمام لوگ ہر لحاظ سے برابر ہیں صحیح نہیں۔ مکمل مساوات ایک غلط بات ہے۔

ہر فرد دوسرے فرد سے قد و قامت، رنگ و روپ، ذہنی اور جسمانی صلاحیتوں کے اعتبار سے جدا ہے۔ اس اختلاف کے دو سبب ہیں:

۱۔ پیدائشی سبب اور
۲۔ ماحول کا اثر۔

پیدائش کے وقت ہر فرد مختلف استعدادوں اور قوتوں کا مالک ہوتا ہے بعض ذہین و فطین ہوتے ہیں اور بعض غبی، بعض جسمانی طور پر مضبوط اور توانا ہوتے ہیں اور بعض نحیف اور لاغر، یعنی اختلاف انسان کی ترقی اور زندگی کی رونق کا سبب ہے۔

ماحول کا اثر

انسان کی ذہنی اور جسمانی ترقی ماحول کے زیر اثر ہے اگر کسی کو صحت مند ماحول میسر آ جائے تو وہ دنیا میں ترقی حاصل کر لیتا ہے۔ اگر خراب میسر آ جائے تو اس کی تمام فطری صلاحیتیں اور استعدادیں نشو و نما پانے سے رک جاتی ہیں جس طرح ایک بیج ہوتا ہے۔ اس میں پودے کے تمام اجزاء پنہاں ہیں جب اس بیج کو صحیح ماحول میسر آ جاتا ہے تو اس کی مخفی استعدادیں ظاہر ہو جاتی ہیں اور وہ پودے کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ اگر بیج کو صحیح ماحول میسر نہ آئے تو اس کی تمام مخفی استعدادیں ضائع ہو جاتی ہیں۔

اس مختصر سی بحث سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ دنیا میں تمام انسان نہ تو ایک دوسرے کے برابر ہو سکتے ہیں اور نہ ہیں۔ علم تمدن میں مساوات کا صرف مفہوم یہ ہے کہ ہر فرد کو سیاسی، سماجی، قانونی اور اخلاقی طور پر بغیر امتیاز رنگ و نسل اور بلا تفریق دین و مذہب مساوی حقوق حاصل ہیں۔

---

[1] فتاوی عالمگیری باب خامس کتاب آداب القاضی۔

اگر مذاہب عالم اور دنیاوی تحریکات کا مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ صرف اسلام ہی حقیقی مساوات کا علمبردار ہے۔

ہندومت اور مساوات

ہندومت چار ورنوں کا پرچار کرتا ہے۔ برہمن کو باقی تین ذاتوں پر فوقیت دیتا ہے' اور سب سے مظلوم اور گھٹیا ذات شودر ہے۔ وید میں لکھا ہے:

> "برہمن پر ماتما کے منہ سے' کشتری بازوؤں سے' ویش رانوں سے اور شودر پاؤں سے پیدا ہوا۔ (رگوید' یجروید' اتھروید) وید کے لیے برہمن، حکومت کے لیے چھتری' کاروبار کے لیے ویش اور دکھ اٹھانے کے لیے شودر پیدا ہوا ہے۔
> (یجروید ۳۰:۵)

شودر کے لیے قادر مطلق نے صرف ایک ہی فرض بنایا ہے وہ ان تینوں کی خدمت کرتا ہے۔ (منوشاستر باب اوّل ۹۱)

جو کچھ اس دنیا میں ہے برہمن کا مال ہے چونکہ وہ خلقت میں سب سے بڑا ہے کل چیزیں اس کی ہیں۔ (باب اوّل ۱۰۰)

برہمن کو اگر ضرورت ہو تو وہ بلا کسی گناہ کے اپنے غلام شودر کا مال بہ جبر لے سکتا ہے۔ اس غصب سے اس پر کوئی جرم عائد نہیں ہوتا۔ کیونکہ غلام صاحب جائیداد نہیں ہو سکتا اس کی کل املاک مالک کا مال ہے۔ (باب ہشتم ۴۱۷)

برہمن کی خدمت کرنا شودر کے لیے نہایت قابل تعریف بات ہے اور اس کے سوا کسی اور چیز سے اسے اور کوئی اجر نہیں مل سکتا۔ (باب دہم ۱۲۳)

شودر کو اگر موقع ملے تو اسے نہیں چاہیے کہ مال و دولت جمع کرے کیونکہ شودر دولت جمع کر کے برہمنوں کو دکھ دیتا ہے۔ (باب دہم ۱۲۹)

برہمن اگر شودر کی چوری کرے تو اس کی سزا صرف یہ ہے کہ شودر کو مال کا تاوان دلایا جائے لیکن اگر یہی جرم شودر کرے تو اس کی سزا یہ ہے کہ شودر کو آگ کی بھینٹ چڑھا دیا جائے۔

اگر کوئی شودر کسی حاکم کو مارنے کی جسارت کرے تو اس کو زندہ لٹکا کر آگ میں بھونا جائے۔ اگر کوئی برہمن اس قسم کا جرم کرے تو اس پر تاوان عائد کیا جائے۔

موسوی شریعت اور مساوات

موسوی شریعت نے عورتوں کو مردوں کا ہمیشہ محکوم اور غلام بنایا ہے۔ چنانچہ لکھا ہے:

"اور خداوند نے کہا میں تیرے دردِ حمل کو بڑھاؤں گا تو درد کے ساتھ بچہ جنے گی۔ اور تیری رغبت اپنے شوہر کی طرف ہوگی اور وہ تجھ پر حکومت کرے گا۔"[1]

بائبل کی عبرانی زبان میں بیوی کو بعولہ (جائیداد منقولہ) کہا گیا ہے اور خاوند کو بعل (مالک) انسائیکلوپیڈیا بطینکا میں ان دونوں لفظوں پر لکھا ہے:

The man is the owner; the woman the chatle.

بائبل میں غلام اور لونڈیوں کے بارے میں لکھا ہے۔

"اگر کوئی اپنے غلام یا لونڈی کو لاٹھیاں مارے اور وہ مار کھاتے ہوئے مر جائے تو اسے سزا نہ دی جائے۔ اس لیے کہ وہ اس کا مال ہے۔"

یہودیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ یعقوب کی اولاد ہی صرف اللہ کو پیاری ہے باقی سب اس کی غلامی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔ اسی طرح تورات کا ایک یہ حکم ہے کہ تو اپنے بھائی سے سود نہ لے۔ اگر سود لینا برا ہے تو غیر یہودیوں سے لینا کیوں کر اچھا ٹھہرتا ہے۔ یہ مساوات کے صریحاً خلاف حکم ہے۔

اشتراکیت:

اشتراکیت دنیا کو دو طبقوں میں تقسیم کرتی ہے ایک طبقہ مزدور، دوسرا طبقہ سرمایہ دار، اشتراکی نظام مزدور طبقے کو اٹھاتا ہے اور سرمایہ دار طبقے کو مٹاتا ہے۔ سرمایہ داروں سے سرمایہ چھین کر مزدوروں میں تقسیم کرتا ہے۔

فاشزم

فاشزم کی بنیاد ایک خاص قوم اور نسل کی برتری پر ہے۔ حکمران طبقہ دوسرے طبقوں سے افضل ہوتا ہے۔ اس نظام میں اعلیٰ نسل کا فرد حاکم ہوتا ہے۔ عوام محکوم، فاشزم غیر مساوی طبقات کو معاشرہ کے لیے مفید سمجھتی ہے۔

نازی ازم

نازی تحریک کی بنیاد ہی اس نعرہ پر تھی کہ جرمن اعلیٰ قوم ہے صرف اسی قوم کو دوسری اقوام پر حکومت کرنے کا حق ہے۔

سرمایہ داری نظام

سرمایہ داری نظام میں غیر فطری طور پر سرمایہ داروں کو فوقیت حاصل ہے۔ مزدور ان کے غلام ہوتے ہیں۔

[1] پیدائش باب ۳۔

اسلام اور مساوات

سماجی مساوات

اسلام تمام بنی آدم کو ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں قرار دیتا ہے اور پیدائشی طور پر کسی کو ایک دوسرے پر کوئی فوقیت حاصل نہیں۔ گورا ہو کالا ہو۔ مشرق کا رہنے والا ہو مغرب کا رہنے والا ہو۔ کسی قوم کسی نسل کسی علاقے کا رہنے والا ہو۔ سب بحیثیت انسان برابر ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: یٰاَیُّھَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّ خَلَقَ مِنْھَا زَوْجَھَا وَبَثَّ مِنْھُمَا رِجَالاً کَثِیْرًا وَّنِسَآءً۔[1] اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا کَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَاخْتَلَفُوْا[2] اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَۃٌ[3] مومن بھائی بھائی ہیں۔

حدیث میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں: قَدْ اَذْھَبَ اللّٰہُ عَنْکُمْ عُبِّیَّۃَ الْجَاھِلِیَّۃِ وَفَخْرَھَا بِالْاٰبَاءِ اِنَّمَا ھُوَ مُؤْمِنٌ تَقِیٌّ وَفَاجِرٌ شَقِیٌّ وَالنَّاسُ بَنُوْ اٰدَمَ وَاٰدَمُ مِنْ تُرَابٍ۔[4] یعنی اللہ تعالیٰ نے اسلام کے ذریعہ تم میں سے جاہلیت والے تکبر اور اباؤ اجداد پر تفاخر کو دور کر دیا ہے۔ کیونکہ اصول صرف یہ ہے کہ ایک شخص نیک عمل کرنے والا اور خدا کو ماننے والا ہوتا ہے اور دوسرا بدعمل اور بدبخت اور سب لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے پیدا ہوا تھا۔

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ کُلِّ شَیْءٍ اِنِّیْ اَشْھَدُ اَنَّ الْعِبَادَ کُلَّھُمْ اِخْوَۃٌ۔[5] اے ہمارے رب ہر چیز کے پالنے والے میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے مشہور خطبے میں فرمایا:

اَیُّھَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰی۔[6] لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور بے شک تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر، عجمی کو عربی پر، سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

عرب کے اعلیٰ طبقہ کے لوگ ادنیٰ طبقہ کے لوگوں سے تعاون کرنا عار سمجھتے تھے۔ اسلام نے

---

1. النساء ۴:۱۔ 2. یونس ۱۰:۱۹۔ 3. الحجرات ۴۹:۱۰۔
4. ترمذی جلد ۲ ابواب المناقب۔ 5. احمد، ابوداؤد۔ 6. مسند احمد۔

اس مصنوعی تفریق کو بھی ختم کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی خالہ زاد بہن کی شادی اپنے غلام حضرت زیدؓ بن حارثہؓ کے ساتھ کر دی۔

اگر کسی نے معاشرہ میں جائز ذرائع سے ترقی کی ہے تو اسلام اس کی بڑائی اور ترقی کو بنظر استحسان دیکھتا ہے اور دوسروں کو یہ تلقین کرتا ہے کہ اس کی عزت کی جائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اَنْزِلُوا النَّاسَ عَلٰی مَنَازِلِهِمْ۔[1] یعنی لوگوں کو ان کے مراتب اور مدارج کے لحاظ سے جگہ دو۔

جو لوگ دینی یا دنیوی فضیلت کی وجہ سے بڑائی حاصل کر لیں تو ان کا احترام کیا جائے۔ بنو قریظہ کے فیصلہ کے لیے جب سعدؓ بن معاذ جو قبیلہ اوس کے رئیس تھے تشریف لائے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دیکھ کر صحابہ سے فرمایا:

قُوْمُوْا اِلٰی سَیِّدِکُمْ۔[2] یعنی اپنے رئیس کے احترام کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔

جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کی طرف بھیجا تو موسیٰ کو تاکید فرمائی کہ بات کرتے وقت فرعون کے مرتبے کی وجہ سے نرمی اور ادب کے طریق پر گفتگو کرنا۔ ارشاد الٰہی ہے: فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا۔[3] اس سے نرم بات کہو۔

قانونی مساوات

یہ جزوی امتیاز صرف معاشرتی اور تمدنی معاملات میں ہے لیکن عدالتی معاملات میں اسلام نے ہر فرد کے درمیان ہر لحاظ سے ترازو کو برابر رکھا ہے۔ قانون کی نظر میں بڑے سے بڑا آدمی اور چھوٹے سے چھوٹا آدمی برابر ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: اَقِیْمُوا حُدُوْدَ اللّٰهِ فِی الْقَرِیْبِ وَالْبَعِیْدِ وَلَا یَاْخُذُکُمْ فِی اللّٰهِ لَوْمَةُ لَائِمٍ۔[4] اللہ کی حدیں بلا تمیز دور و نزدیک سب پر جاری کرو اور کسی ملامت کرنے والے کی پرواہ نہ کرو۔

عہد نبویؐ میں ایک اونچے خاندان کی عورت نے چوری کا ارتکاب کیا۔ کچھ لوگوں کو خیال آیا کہ اس کو سزا ہوگی تو جگ ہنسائی ہوگی۔ حضرت اسامہؓ کو آمادہ کیا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس جا کر عورت کو چھوڑ دینے کی سفارش کریں۔ جب اسامہؓ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں گئے اور اپنے مافی الضمیر کو ادا کرنے کے لیے لب کشائی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

1۔ ابو داؤد جلد ۲ کتاب الاداب۔ 2۔ بخاری ابواب المناقب۔
3۔ طٰہٰ ۲۰:۴۴۔ 4۔ مشکوٰۃ کتاب الحدود صفحہ ۳۱۳۔

نے فرمایا: انما هلک من کان قبلکم امم کانوا یقیمون الحد علی الوضیع و یترکون الشریف والذی نفسی بیده لو فاطمة فعلت ذلک لقطعت یدها.[1] تم سے پہلے والے اس وجہ سے ہلاک ہوئے کہ وہ سزا نیچ لوگوں کو دیتے اور بڑوں کو چھوڑ دیتے تھے قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے اگر میری بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کا ارتکاب کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔

حضرت عمرؓ کے عہد خلافت کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک دفعہ غسان کے فرماں زوا جبلہ بن ایہم نے جو دائرہ اسلام میں داخل ہو چکا تھا طواف کعبہ کے وقت کسی بدو کو تھپڑ مار دیا۔ حضرت عمرؓ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے فرمایا:

"جبلہ! اگر تم نے ایسی حرکت کی ہے تو خدا کی قسم تم سے اس کا بدلہ لیا جائے گا۔"

جس پر جبلہ بھاگ گیا اور مرتد ہو گیا۔

حضرت ابوبکرؓ جب عہدۂ خلافت پر متمکن ہوئے تو آپ نے سب سے پہلے خطبہ میں قانونی مساوات ذکر کیا۔ فرمایا: الضعیف فیکم قوی عندی حتی ازیح علیه حقه ان شاء الله والقوی فیکم ضعیف عندی حتی اخذ الحق منه.[2] یعنی تم میں سے کمزور ترین شخص میرے نزدیک قوی ہو گا۔ جب تک کہ میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں اور تم میں سے قوی ترین شخص میرے نزدیک کمزور ہو گا۔ جب تک میں اس سے دوسرے کا حق نہ لے لوں۔

اس عہد جمہوریت میں کسی ملک کے اندر عدلیہ کو یہ اختیار نہیں ہے کہ وہ سربراہ مملکت کو مدعاعلیہ کی حیثیت سے طلب کر سکے لیکن اسلام میں صرف قانون کو ہی بالادستی حاصل ہے۔ عدالت سربراہ مملکت کو طلب کر سکتی ہے۔ چنانچہ تاریخ اسلام میں ایسی روشن مثالیں موجود ہیں۔ حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں کسی سے گھوڑا خریدا۔ سودا پکا ہو چکنے کے بعد اس پر سوار ہو گئے۔ گھوڑا ٹھوکر کھا کر گر پڑا۔ اور زخمی ہو گیا۔ حضرت عمرؓ نے گھوڑا واپس کرنا چاہا۔ مالک نے قیمت واپس کرنے اور گھوڑا واپس لینے سے انکار کر دیا۔ دونوں مدعی اور مدعاعلیہ کی حیثیت سے قاضی شریح کی عدالت میں حاضر ہوئے۔ قاضی شریح نے دعویٰ اور جواب دعویٰ سننے کے بعد حضرت امیرالمومنین سے خطاب کیا:

"جو چیز آپ خرید چکے وہ اب آپ کی ہے اور اگر واپس کرنا ہی ہے تو اس حالت میں واپس کیجئے جیسی خریداری سے پہلے تھی۔"

حضرت معاذ بن جبلؓ ایک دفعہ سفیر بن کر قیصر روم کے دربار میں تشریف لے گئے اور ایک موقعہ پر فرمایا:

"ہمارا سردار ہم میں کا ایک فرد ہے۔ اگر ہمارے مذہب کی کتاب اور ہمارے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ کی پیروی کرے تو ہم اس کو اپنا سردار باقی رکھیں گے اور اگر ان کے سوا وہ کسی اور چیز پر عمل کرے تو ہم اس کو معزول کر

---

[1] بخاری اقامة الحد علی الوضیع والشریف۔

[2] ابن ہشام ابن سقیفہ بنی ساعدة۔

دیں گے اگر وہ چوری کرے تو ہاتھ کاٹیں گے اور اگر زنا کرے تو سنگسار کریں گے اور اگر وہ کسی کو گالی دے گا تو وہ بھی اسی طرح گالی دے اگر وہ کسی کو زخمی کرے تو اس کے بدلے میں اس کو زخم پہنچایا جائے گا۔ وہ ہم سب سے چھپ کر پردہ میں نہیں بیٹھتا وہ ہم سے غرور نہیں کرتا مال غنیمت میں اپنے کو ہم پر ترجیح نہیں دے سکتا وہ ہم میں ایک معمولی آدمی کا رتبہ رکھتا ہے۔"[1]

سیاسی مساوات

سیاسی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص بلا امتیاز مذہب و ملت' رنگ و نسل ملک کے نظام میں حصہ لے سکتا ہے اور ہر ایک کو ترقی کرنے کے برابر کے حقوق حاصل ہوتے ہیں۔

جو شخص قرآن اور حدیث پر نظر رکھتا ہے وہ خوب جانتا ہے کہ اسلامی حکومت کی باگ ڈور صرف فرد واحد کے ہاتھ میں نہیں ہوتی بلکہ نظام حکومت میں ہر فرد کو مساوی حق حاصل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے کہ وہ حکومت کے معاملات میں باہمی مشورہ کیا کریں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ.[2] یعنی ان کا کام آپس میں مشورہ سے ہوتا ہے۔

وَشَاوِرْهُمْ فِى الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِيْنَ.[3]
معاملات میں ان کا مشورہ لے۔ پھر جب پختہ ارادہ کرے تو اللہ پر بھروسہ کر اللہ توکل کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے: مَاشَاوَرَ قَوْمٌ اِلَّا هُدُوْا.[4] یعنی جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاں پائی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معاملات حکومت میں صحابہ سے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔

حضرت ابوبکرؓ خلیفہ ہوئے تو سب سے پہلا خطبہ سیاسی مساوات پر دیا۔ انھوں نے فرمایا اور "میں تمہارا سردار بنایا گیا ہوں۔ حالانکہ میں سب سے اچھا نہیں ہوں اگر میں ٹھیک کام کروں تو میری مدد کرو اور اگر میں برائی کے راستہ پر چلوں تو مجھے سیدھا کر دو۔"

جب حضرت عمرؓ مسند خلافت پر متمکن ہوئے تو انھوں نے فرمایا:
"اگر تم میں سے کوئی مجھ میں کجی دیکھے تو اسے ٹھیک کر دے۔"
ایک اعرابی اٹھا اور کہا:

---

1. آئینہ حقیقت نما صفحہ ۲۲۔ 2. الشوریٰ ۴۲:۳۸۔
3. آل عمران ۳:۱۵۸۔ 4. کنوز الحقائق حدیث صفحہ ۸۷ (طبرانی)

"خدا کی قسم اگر ہم نے تم میں کجی دیکھی تو ہم اسے اپنی تلوار سے سیدھا کر دیں گے۔"

اسلام نظام حکومت کو امانت قرار دیتا ہے اور حکم دیتا ہے کہ یہ امانت بلا امتیاز رنگ و نسل انہی لوگوں کے ہاتھ میں دی جائے جو اس کے اہل ہیں۔

ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا۔[1] اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ عنان حکومت انہی لوگوں کے ہاتھ میں دو جو اس کے اہل ہیں۔

اقتصادی مساوات

اسلام کا اقتصادی نظام عدل و انصاف پر مبنی ہے نہ تو وہ مغربی ممالک کی جیسی سرمایہ داری کا موید ہے اور نہ اشتراکی ممالک کی جیسی اشتمالیت کا۔ سرمایہ داری نظام میں دولت صرف چند ہاتھوں میں سمٹ کر آ جاتی ہے۔ اشتراکی نظام سرمایہ داروں کا گلا گھونٹ کر زبردستی ان سے مال و دولت چھین لیتا ہے اس کے برعکس اسلام جائز طریقوں سے دولت کمانے کی ترغیب دیتا ہے اور دولت کو صرف چند ہاتھوں میں جمع نہیں ہونے دیتا۔ ذاتی ملکیت کو تسلیم کرتا ہے لیکن اجتماعی مفاد کو نظر انداز بھی نہیں کرتا اور اجتماعی مفاد کی خاطر اپنی ضرورت سے زائد دولت کو خرچ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ. (البقرہ ۲:۲۱۹) وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کرتے ہیں کہہ جو ضرورت سے زائد ہے۔ گویا اسلام کا اقتصادی نظام وسرمایہ داری اور اشتراکیت کا ایک حسین امتزاج ہے۔

اسلام میں تصور ملکیت

تمام معاشی دولت کا حقیقی مالک اللہ تعالیٰ ہے اللہ کی یہ ملکیت انسان کے پاس امانت ہے تاکہ وہ اس سے اللہ تعالیٰ کے منشاء کے مطابق فائدہ اٹھائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہے۔ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ اور مخلوق کے فائدہ کے لیے زمین بنائی ہے۔ وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِي الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا مَعَايِشَ ہم نے تم کو زمین پر آباد کیا اور اس میں تمھارے لیے معیشت کے سامان رکھ دیے ہیں۔ وَلِلّٰهِ خَزَآئِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ کے ہیں۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ زمین پر جو کچھ ہے وہ سب اجتماعی فائدہ کے لیے ہے جو بھی اجتماعی فائدے کو نظر انداز کر کے دولت جمع کرے گا۔ وہ اللہ کا مجرم ہو گا۔

کسب کی آزادی

فَانْتَشِرُوْا فِي الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ.[2] خدا کے فضل (رزق) کی تلاش کے

---

[1] النساء ۴:۵۸۔ [2] الجمعہ ۶۲:۱۰۔

لیے زمین میں پھیل جاؤ۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ.[1] مردوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ اَنْ يَرَى الْعَبْدَ مُحْتَرِفًا[2] اللہ اپنے بندہ کو کوئی پیشہ کرتے ہوئے دیکھنا پسند کرتا ہے۔

اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ.[3] عمل کرو ہر شخص کے لیے وہ کام آسان ہے۔ جس کی وہ صلاحیت رکھتا ہے۔

اِجْمَلُوْا فِي طَلَبِ الدُّنْيَا فَاِنَّ كُلًّا مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ.[4] دنیا کی طلب اپنی صلاحیت کے مطابق کرو اس لیے کہ جس کے لیے آدمی پیدا کیا گیا ہے وہ ضرور اس کو ملے گا۔

اسلام نے جہاں کسب کی آزادی دی ہے وہاں کاسب وہ تمام پابندیاں بھی لگا دی ہیں جو ناجائز کمانے سے روکتی ہیں۔

چوتھا وصف' حریت

آزادی کا عام مفہوم یہ لیا جاتا ہے' کہ ہر فرد اپنے دائرہ عمل میں آزاد ہو اور اس کے کسی کام پر کوئی قدغن نہ لگائی جائے۔ جس طرح وہ چاہے کام کرے۔ اسی کا نام (Absence of kestrant) ہے۔ یہ مفہوم مطلق العنانی سے مترادف ہے اور جمہوریت کی نفی کرتا ہے۔ اگر ہر شخص کو اس کے دائرہ عمل میں آزادی بخش دی جائے تو وہ آزادی نہیں ہو گی بلکہ طوائف الملوکی (Anarchy) ہو گی۔

آزادی کا ایک مفہوم لاسکی نے بیان کیا ہے' وہ کہتا ہے کہ:

> "آزادی سے مراد ایسی فضا ہے۔ جس میں افراد کو اپنی صلاحیتوں کی نشوونما کا مناسب موقع ملے۔"

جان اسٹورٹ مل اپنی کتاب (On Libert) میں آزادی کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ:

عوام کے افعال کو دو حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ یعنی وہ افعال جن کا تعلق صرف انسان کی ذات سے ہے اور ان کا کوئی اثر دوسروں پر نہیں پڑتا۔

دوم: یعنی وہ افعال جن کا تعلق دوسروں کے ساتھ ہے اور ان کا اثر دوسروں پر پڑتا ہے۔

1۔ النساء ۴:۳۲۔ 2۔ طبرانی بحوالہ کنوز الحقائق۔
3۔ بخاری۔ مسلم۔ 4۔ ابن ماجہ باب الاقتصاد فی طلب المعیشۃ۔

جان اسٹورٹ مل کی رائے میں عوام کے افعال پر کسی قسم کی پابندی عائد نہ کی جائے جن کا تعلق فاعل کی ذات سے ہو۔ جن افعال کا تعلق دوسروں کے ساتھ ہو۔ ان پر پابندی عائد کرنا ضروری ہے۔ اگر پابندی عائد نہ کی گئی تو معاشرہ میں بدامنی پیدا ہو جائے گی۔ اس طرح آزادی محض عدم مداخلت کا نام نہیں ہے اور نہ اس کا یہ مفہوم ہے کہ لوگوں پر اس قدر پابندیاں عائد کر دی جائیں کہ ان کے کاموں میں بھی رکاوٹیں پیدا ہو جائیں بلکہ اس کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ ملک میں ایسے مواقع موجود ہوں جن کے ذریعہ ہر شخص کو اپنی صلاحیتیں بروئے کار لانے کا پورا پورا موقع مل جائے۔

اسلام کا اعلان آزادی

مفکرین نے آزادی کے مفہوم کو متعین کرنے میں افراط اور تفریط کی راہ اختیار کی ہے۔ اسلام نے جو دین فطرت ہے راہ اعتدال اختیار کر کے آزادی کی صحیح حدود متعین کی ہیں۔ اسلام انسان کو ان افعال میں بھی بے لگام نہیں چھوڑتا جن کا دوسروں پر اثر نہیں پڑتا۔ اسلام ان تمام افعال پر پابندی عائد کرتا ہے جو انسان کی اپنی ذات اور دوسروں کے لیے نقصان دہ ہوں کیونکہ معاشرہ اور فرد کا باہمی تعلق نہایت ہی گہرا ہے۔ جب فرد کی صحیح نشوونما نہیں ہو گی تو معاشرہ میں لازماً بگاڑ پیدا ہو گا۔ اس وجہ سے جہاں اسلام انسان کے ان افعال پر پابندی لگاتا ہے جو دوسروں کو نقصان دیں وہاں ان افعال سے بھی روکتا ہے جو انسان کی اپنی ذات کو مجروح کریں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ۔[1] اور وہ جس وقت کوئی برا کام کرتے ہیں اور اپنی جانوں پر ظلم کر بیٹھتے ہیں۔ اللہ کو یاد کرتے ہیں پھر اپنے قصوروں کے لیے بخشش مانگتے ہیں۔

فَاحِشَة سے مراد وہ افعال قبیحہ ہیں جو دوسروں پر اثر انداز ہوں اور ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ سے مراد وہ افعال جن کا تعلق فاعل کی اپنی ذات سے ہو اور اس کی شخصیت کو مجروح کرنے والے ہوں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ اِنَّمَا يَاْمُرُكُمْ بِالسُّوْٓءِ وَالْفَحْشَاۗءِ۔[2] شیطان کے قدموں کی پیروی نہ کرو وہ یقیناً تم کو برائی اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔

سوء سے مراد وہ افعال ہیں جو انسان کی اپنی ذات سے تعلق رکھتے ہوں اور اس کی ذات کے لیے نقصان دہ ہوں۔

فحشاء سے مراد وہ برے افعال ہیں جو دوسروں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔

اسلام نے دونوں قسم کے افعال کو شیطان کی طرف منسوب کیا ہے اور ان سے باز رہنے کی تلقین کی ہے۔

اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے جس نے انسان کی گردن کو ہر قسم کی غلامی سے نجات دی ہے

1۔ آل عمران ۳:۱۳۵۔ 2۔ البقرہ ۲:۱۶۸، ۱۶۹۔

اور ہر قسم کی آزادی کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ. اور وہ انسانوں کی گردنوں کو ہر قسم کی غلامی کے طوق اور پھندے سے نجات دیتا ہے۔ اس آیت کریمہ میں باریک سے باریک قسم کی غلامی سے آزادی کا اعلان کیا ہے۔

قرآن مجید کا یہ اعلان اس وقت ہوا جب کہ دنیا آزادی حقوق کے نام سے بھی ناواقف تھی۔ یہ وہ پہلی آواز ہے جو عرب کے ریگستان سے اٹھی اور دنیا کے چاروں گوشوں میں گونج اٹھی۔ آج اسی آسمانی آواز سے متاثر ہو کر مفکرین آزادی آزادی پکار رہے ہیں۔ دنیا کی سب سے بڑی انجمن "اقوام متحدہ" نے انسانی حقوق کا عالمی منشور شائع کیا تو اس میں یہ اعلان کیا کہ (دفعہ ۳) ہر شخص کو اپنی جان کی آزادی اور ذاتی تحفظ کا حق ہے۔ دفعہ ۴' کوئی شخص غلام یا لونڈی بنا کر نہ رکھا جائے گا۔ غلامی اور بردہ فروشی چاہے اس کی کوئی شکل بھی ہو، ممنوع قرار دی جائے گی۔

دفعہ ۱۸' ہر انسان کو آزادی فکر' آزادی ضمیر اور آزادی مذہب کا پورا حق ہے۔ اس حق میں مذہب یا عقیدے کو تبدیل کرنے اور پبلک میں نجی طور پر تنہا یا دوسروں کے ساتھ مل جل کر عقیدے کی تبلیغ عمل عبادت اور مذہبی رسمیں پوری کرنے کی آزادی بھی شامل ہے۔

دفعہ ۱۹' ہر شخص کو اپنی رائے رکھنے اور اظہار رائے کی آزادی کا حق حاصل ہے۔ اس حق میں یہ امر بھی شامل ہے کہ وہ آزادی کے ساتھ اپنی رائے قائم کرے اور جس ذریعے سے چاہے بغیر ملکی سرحدوں کا خیال کیے علم اور خیالات کی تلاش کرے انھیں حاصل کرے اور ان کی تبلیغ کرے۔

دفعہ ۲۹ (۲) اپنی آزادیوں اور حقوق سے فائدہ اٹھانے میں ہر شخص صرف ایسی حدود کا پابند ہوگا۔ جو دوسروں کی آزادیوں اور حقوق کو تسلیم کرانے اور ان کا احترام کرانے کی غرض سے یا جمہوری نظام میں اخلاق امن عامہ اور فلاح و بہبود کے مناسب لوازمات کو پورا کرنے کے لیے قانون کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں۔"

عالمی منشور کی یہ دفعات دراصل اس آسمانی آواز کی بازگشت ہیں جو آج سے چودہ سو سال پیشتر ایک بے آب و گیاہ وادی سے اٹھی۔ جب دنیا غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی تھی۔ اس تاریک دور میں ایک امی نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہر قسم کی غلامی سے مخلوق خدا کو آزاد کر کے کامل حریت کا سبق پڑھایا جن میں سے چند مشتے نمونہ از خروارے مجملاً بیان کرتا ہوں۔

سیاسی آزادی (سیاسی غلامی سے نجات)

دنیا میں ہزارہا سال سے بادشاہ کی مطلق العنانی کا تصور چلا آ رہا تھا۔ اس کا ہر حکم قانون تصور کیا جاتا تھا اور وہ خود کسی قانون کے ماتحت نہیں ہوتا تھا اس طرح بادشاہ ظلم و استبداد کا مرقع اور رعایا غلامی کی بدترین تصویر بنی ہوئی تھی۔ اسلام نے نسل انسانی کو اس غلامی کی لعنت سے نجات دلائی۔ قانون کی بالادستی کو قائم کیا۔ حاکم اور عوام دونوں کو قانون کی نظر میں برابر قرار دیا جس طرح ایک عام آدمی قانون شکنی کی وجہ سے قابل مواخذہ ہے۔ اس طرح اگر حاکم قانون کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے۔ وہ بھی سزا کا مستحق ہے۔ قرآن مجید فرماتا ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ (النساء ۴: ۵۹) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور ان لوگوں کی جو تم میں سے صاحب امر ہیں پھر اگر تم میں کسی چیز میں باہم اختلاف ہو جائے تو اس کو اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔ یعنی قانون کی طرف۔ یہاں اللہ اور رسول قائم مقام قانون کے ہیں۔ کیونکہ قانون شریعت کا ماخذ اللہ اور رسول ہی ہیں۔

اس آیت کریمہ میں یہ بیان کیا ہے کہ قانون کی حکومت سب پر حاوی ہے۔ خواہ کوئی صاحب امر ہو یا عام رعایا۔ کسی کی گردن قانون کے جوئے سے باہر نہیں۔

تمدنی آزادی (تمدنی غلامی سے آزادی)

اسلام سے قبل ہر ایک قوم اپنی آبائی تقلید کی غلامی میں پھنسی ہوئی تھی۔ جس سے تمام علمی، اخلاقی، ذہنی ترقیاں مسدود ہو چکی تھیں۔ قرآن مجید نے آبائی تقلید اور سوسائٹی کے رسم و رواج سے نجات دلانے کے لیے فرمایا: اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ شَیْـًٔا وَّلَا یَهْتَدُوْنَ. یعنی کیا اگر ان کے آباؤ اجداد نہ کچھ عقل رکھتے ہوں اور نہ ہدایت پر ہوں۔ اس آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے کہ ضروری نہیں کہ باپ دادا جو کریں وہ صحیح ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ باپ دادا غلطی پر ہوں اس وجہ سے آباؤ اجداد کی پیروی کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا چاہیے کہ آیا ان کے باپ دادا کہیں غلطی پر تو نہ تھے۔ غرض کہ قرآن مجید نے آبائی کورانہ تقلید اور سوسائٹی کے رسم و رواج کی غلامی سے نجات دلا کر علمی اخلاقی اور ذہنی ترقیات کی راہ کھول دی ہے۔ اسی راستہ پر چل کر انسان تہذیب نو کی عمارت تعمیر کر سکتا ہے۔

معاشرتی آزادی (معاشرتی غلامی سے نجات)

اسلام سے قبل عورت گھر میں ایک غلام کی حیثیت رکھتی تھی۔ تمام معاشرتی حقوق سے محروم

تھی۔ وہ محض مرد کے رحم و کرم پر زندگی کے ایام گزارتی تھی۔ اسلام نے عورت کو اس غلامی سے نجات دلائی اور عورت کی معاشرتی حیثیت میں ایک زبردست انقلاب برپا کیا۔ سب سے پہلے اسلام نے انسان ہونے کے لحاظ سے عورت کو مرد کے ساتھ مساوی حیثیت دی اور ان دونوں کو ایک ہی اصل کی دو شاخیں قرار دیا۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّنِسَآءً وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا. (نساء ۴:۱) اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔ جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں اور اللہ کے حقوق کی جس کے ذریعہ سے تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رحموں کی نگہداشت کرو اللہ تم پر نگہبان ہے۔

اسلام نے عورت کے بیٹی ہونے کی حیثیت سے، بیوی ہونے کی حیثیت سے، ماں ہونے کی حیثیت سے علیحدہ علیحدہ حقوق مقرر کر دیے ہیں تاکہ عورت معاشرہ میں معزز فرد کی حیثیت سے زندگی بسر کرے۔ اسی طرح اسلام نے معاشرے کے تمام اعضاء کے حقوق و فرائض متعین کر دیے ہیں۔ اس طرح حقوق و فرائض کے دائرہ میں تمام اراکین معاشرے آزاد ہیں۔

اقتصادی آزادی (اقتصادی غلامی سے آزادی)

اسلام سے قبل مزدور سرمایہ داروں کی غلامی کی زنجیروں میں بری طرح جکڑے ہوئے تھے وہ غلامی کی مضبوط زنجیر سود در سود تھی۔ اسلام نے سود کو حرام قرار دے کر مزدوروں کو سرمایہ داروں کے چنگل سے نجات دی اس کے ساتھ ان کے ساتھ برادرانہ سلوک کی تعلیم دی۔ قرآن مجید میں آتا ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً. (آل عمران ۳:۱۳۰) اے ایمان والو! تم بڑھا بڑھا کر سود نہ کھاؤ۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا[1] اور اللہ نے خرید و فروخت کو حلال کیا ہے اور سود کو حرام کیا ہے۔

مزدوروں اور غرباء کی حالت سدھارنے کے لیے امراء پر زکوٰۃ اور صدقات فرض کر دیے تاکہ سرمایہ داروں کا سرمایہ حد سے زیادہ نہ بڑھنے پائے اور غرباء کی محبت ان کے دلوں میں پیدا ہو جائے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ[2] اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

1۔ البقرہ ۲:۲۷۵۔ 2۔ البقرہ ۲:۴۳۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا[1] ان کے مال سے زکوۃ لے تاکہ تو انھیں پاک اور صاف کرے۔

وَفِیْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُوْمِ[2] ان کے مالوں میں سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق ہے۔

اسلام نے سود کے علاوہ ان تمام ذرائع کو بھی ناجائز قرار دے دیا جو افادہ عامہ کے لیے نقصان دہ تھے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ.[3] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو آپس میں ایک دوسرے کے مال ناحق طور پر مت کھاؤ بجز اس کے کہ وہ مال تجارت ہو اور باہمی رضا مندی پر مبنی ہو۔

جہالت کی غلامی سے نجات

اسلام سے قبل جہالت کی وجہ سے لوگ اوہام باطلہ کی دلدل میں پھنسے ہوئے تھے۔ اسلام نے تمام اوہام باطلہ اور جاہلانہ رسم و رواج کو ملیامیٹ کر کے انسان کی عقل کو جہالت کی غلامی سے نجات بخشی اور انسان کو علم کی ترغیب دی، اسلام نے انسان کو بتایا کہ اس کو تمام مخلوق پر حتیٰ کہ ملائکہ پر بھی علم کی وجہ سے فضیلت حاصل ہے جیسا کہ سورۃ بقرہ کے آغاز میں ہی قصہ آدم بیان کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: عَلَّمَ اٰدَمَ الْاَسْمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ بِاَسْمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ قَالُوْا سُبْحٰنَكَ لَا عِلْمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا اِنَّكَ اَنْتَ الْعَلِیْمُ الْحَكِیْمُ.[4] اور آدم کو سب نام سکھائے پھر ان چیزوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ مجھے ان کے نام بتاؤ اگر تم سچے ہو۔ انھوں نے کہا تو پاک ہے ہمیں کوئی علم نہیں مگر وہی جو تو نے ہمیں سکھایا ہے۔ بے شک تو علم والا حکمت والا ہے۔

اس آیت میں بنی آدم کو یہ تعلیم دی ہے کہ اس کی خلافت علم پر مبنی ہے۔ حصول علم کے ساتھ ہی اس کی ترقی وابستہ ہے۔ دوسری جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ.[5] کہہ کیا جاننے والے اور نہ جاننے والے برابر ہیں۔

مَنْ كَانَ فِیْ هٰذِهٖٓ اَعْمٰى فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰى وَاَضَلُّ سَبِیْلًا.[6] جو اس دنیا میں اندھا رہا اور اس نے اپنی عقل و خرد سے کام نہ لیا تو وہ یقیناً آخرت میں اندھا ہی رہے گا اور راستہ سے بھٹکا ہوا ہوگا۔

1۔ التوبہ ۹:۱۰۳۔ 2۔ الذاریت ۵۱:۱۹۔ 3۔ النساء ۴:۲۹۔

4۔ البقرہ ۲:۳۱، ۳۲۔ 5۔ الزمر ۳۹:۹۔ 6۔ بنی اسرائیل ۱۷:۷۲۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ[1] ہر مسلمان پر علم حاصل کرنا واجب ہے۔

تَفَکُّرُ سَاعَةٍ خَیْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سَبْعِیْنَ سَنَةٍ.[2] ایک گھڑی فکر کرنا ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔

آزادی سکونت

قرآن مجید میں آتا ہے: قُلْ سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ بَدَاَ الْخَلْقَ.[3] کہہ زمین میں چلو پھر دیکھو کس طرح اس نے پہلی بار پیدا کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: کُوْنُوْا حَیْثُ شِئْتُمْ وَبَیْنَنَا وَبَیْنَکُمْ اَنْ لَا تَسْفِکُوْا دَمًا وَلَا تَقْطَعُوْا سَبِیْلًا وَلَا تَظْلِمُوْا اَحَدًا.[4] تم جہاں چاہو رہو اور ہمارے اور تمہارے درمیان شرط یہ ہے کہ نہ تم خون ریزی کرو اور نہ تم رہزنی کرو اور نہ کسی پر ظلم کرو۔

فکر وعقیدہ کی آزادی

اسلام ہی وہ دین ہے جس نے حریت اعتقاد کو تسلیم کیا ہے اور ہر فرد کو یہ آزادی بخشی ہے کہ وہ اپنی عقل وفکر سے جو عقیدہ چاہے اختیار کرے۔ ارشاد الٰہی ہے: لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ قَدْ تَبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ.[5] یعنی دین میں کوئی زبردستی منوانا نہیں ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: مَنْ کَفَرَ فَعَلَیْهِ کُفْرُهٗ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ یَمْهَدُوْنَ.[6] جو کفر کرتا ہے تو اس کا وبال کفر اسی پر ہے اور جو کوئی نیک عمل کرتا ہے تو وہ اپنی ہی جان کے لیے سامان کرتے ہیں۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ کفر اور غلط عقیدہ کی سزا اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کسی انسان کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ غلط عقیدہ کی وجہ سے کسی کو سزا دے۔

ایک اور جگہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اَفَاَنْتَ تُکْرِهُ النَّاسَ حَتّٰی یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ کیا تو لوگوں کو مجبور کر سکتا ہے کہ مومن ہو جائیں۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے لَکُمْ دِیْنُکُمْ وَلِیَ دِیْنِ.[7] تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین۔

1۔ سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء۔ 2۔ کنوز الحقائق حرف التاء۔
3۔ العنکبوت ۲۹:۲۰۔ 4۔ نیل الاوطار جلد ۷ صفحہ ۱۳۹۔
5۔ البقرہ ۲:۲۵۶۔ 6۔ الروم ۳۰:۴۴۔ 7۔ الکافرون ۱۰۹:۶۔

داعی اور مبلغ اپنے عقیدہ کو منوانے کے لیے صرف تذکیر اور موعظہ حسنہ سے کام لے سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرماتا ہے: فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ. پس تم یاد دلاؤ تم صرف یاد دلانے والے ہو تمھیں ان لوگوں پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا۔

رائے کی آزادی

اسلام نے رائے کے اظہار کرنے پر کسی قسم کی قدغن نہیں لگائی۔ خواہ دینی ہو یا غیر دینی۔ غیر دینی امور کے متعلق رائے کے اظہار کرنے کے لیے کسی قسم کی شرط نہیں لگائی۔ ہاں دینی امور کے متعلق فساد فی الدین کے خوف سے مجتہد کے لیے یہ شرط لگا دی ہے کہ اجتہاد قرآن مجید اور سنت رسول کے مخالف نہ ہو۔ چنانچہ اسلام نے قیاس کو مصادر تشریع میں سے ایک مصدر قرار دیا ہے۔

جیسا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ سے ایک حدیث مروی ہے کہ جب مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یمن بھیجا تو فرمایا اگر تمھارے سامنے کوئی مقدمہ پیش ہو جائے تو کس طرح فیصلہ کرو گے انھوں نے کہا۔ جو کتاب اللہ میں ہے اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا اگر کتاب اللہ میں نہ ہو۔ انھوں نے کہا جو اللہ کے رسول نے فیصلہ کیا ہو اس کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا وہ قضیہ ایسا ہو جس کے متعلق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی فیصلہ نہ دیا ہو تب کیا کرو گے تو انھوں نے فرمایا اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا اور کوتاہی نہ کروں گا۔[1]

ایک اور حدیث ہے جس میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

> ”ہر مجتہد کو اجر ملتا ہے۔ اگر اس نے اجتہاد میں غلطی کی تو اسے ایک اجر ملے گا۔ اگر اس نے صحیح اجتہاد کیا تو اسے دو اجر ملیں گے۔“

غیر دینی امور کے متعلق صحابہ کا اپنی رائے کے اظہار کرنے کے واقعات رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں بے شمار ہیں۔ ایک غزوہ میں آپ نے مسلمانوں کو ہدایت کی کہ فلاں فلاں جگہ پر اتریں۔ ایک صحابی نے آپ سے دریافت کیا۔ یہ فیصلہ وحی سے کیا ہے یا اپنی رائے سے۔ آپ نے فرمایا یہ میری ذاتی رائے ہے۔ صحابی نے عرض کیا تو یہ اتارنے کی جگہ مناسب نہیں اس کی بجائے فلاں منزل مناسب ہوگی۔ چنانچہ اسی رائے پر عمل کیا گیا۔

اسلامی سلطنت کا سب سے اہم وصف انسان کی آزادی کا ہر پہلو محفوظ رکھنا ہے۔

---

[1] ابو داؤد الترمذی۔

پانچواں وصف

شوریٰ

حضرت امام راغب ''شوریٰ'' کی حقیقت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شوریٰ کا مفہوم آراء کا حاصل کرنا ہے اس کے لیے پہلے دو سمتیں متعین ہوتی ہیں۔ ایک سمت رائے لینے والے ہوتے ہیں۔ دوسری طرف رائے دینے والے ایک سمت اپنی ذمہ داریوں کے دائرہ میں مہم معاملات سے دوچار ہے۔ ایسی حالت میں ایک سمت کے اصحاب دوسری سمت کے لوگوں سے رائے طلب کرتے ہیں اور سلامتی و کامیابی کے لیے ایک فیصلہ پر پہنچ جاتے ہیں پس اسی کا نام شوریٰ ہے۔''[1]

علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی شوریٰ کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''شوریٰ کی روح یہ ہے کہ جماعت کے افراد میں سے ہر فرد اپنے علم اور قابلیت کے مطابق اپنی آراء اور خیالات پیش کر دیتا ہے ایک دوسرے کے نظریات آپس میں ملتے ہیں اور اس سے ایک اچھا فیصلہ ہاتھ آ جاتا ہے۔''[2]

شوریٰ کی اہمیت ازروئے قرآن مجید

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ[3] (دنیاوی) معاملات میں ان کا مشورہ لے۔

دوسری جگہ مسلمانوں کے اجتماعی تعامل کے متعلق آتا ہے: وَأَمْرُهُمْ شُورَىٰ بَيْنَهُمْ[4] اور ان کا کام آپس میں مشورہ سے ہوتا ہے۔

شوریٰ کی اہمیت ازروئے حدیث

مَاشَاوَرَ قَوْمٌ إِلَّا هُدُوا۔[5] جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاں پائی۔

حضرت عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب شوریٰ کا حکم آیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگرچہ اللہ اور اس کا رسول شوریٰ سے بے نیاز ہیں مگر شوریٰ کا یہ حکم اس لیے ہے تاکہ امت کے لیے رحمت ہو۔ اس کے بعد امت کا جو فرد رائے اور مشورہ طلب کرے گا کبھی اعلیٰ درجہ کی راہنمائی

1۔ مفردات القرآن لفظ شوریٰ جلد ۲ صفحہ ۴۴۵۔ 2۔ تفسیر مظہری آل عمران جلد ۲ صفحہ ۱۶۲۔

3۔ آل عمران ۳: ۱۵۸۔ 4۔ الشوریٰ ۴۲: ۳۸۔ 5۔ طبرانی۔ کنوز الحقائق حدیث ۸۷۔

سے محروم نہ ہوگا اور جو شوریٰ کو ترک کرے گا وہ کبھی غلط راہ سے نہ نکلے گا۔[1]

حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر ہم کوئی چیز کتاب وسنت میں نہ پائیں تو کیا کریں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قانون جاننے والے عبادت گزاروں سے مشورہ کرو۔ پھر یہ ہدایت فرمائی۔ لَا تَمْضُوا فِيهِ رَأىَ خَاصَّةٍ یعنی ایسے موقعہ پر کسی شخص کی انفرادی رائے کو نافذ نہ کرنا (اعلام الموقعین جلد ۱ صفحہ ۵۴)

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے مَارَأَيْتُ اَحَدًا اَكْثَرَ مَشْوَرَةً لِاَصْحَابِهٖ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یعنی میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر اپنے اصحاب سے مشورہ کرتا ہو۔

بزرگانِ دین کی نظر میں شوریٰ کی اہمیت

ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ:

"رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قانون شوریٰ پر عامل تھے تم بھی اس پر عمل کرنا"۔[2]

سقیفہ کے شوری میں حضرت عمرؓ نے عوام کو یہ فرمایا فَمَنْ بَايَعَ عَنْ غَيْرِ مَشْوَرَةِ الْمُسْلِمِيْنَ فَاِنَّهٗ لَا بَيْعَةَ لَهٗ (سیرۃ ابن ھشام ج ۲ ص ۲۷۳) اگر مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کو خلیفہ بنایا گیا تو یہ فیصلہ کالعدم ہوگا۔

خلفائے راشدین کا یہی تعامل تھا کہ جب کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تو لوگوں کو مسجد میں جمع کیا جاتا اور ان کے سامنے پیش آمدہ مسئلہ رکھ دیا جاتا تو ان سے رائے طلب کی جاتی۔ کثرت رائے سے جو طے ہوتا وہی فیصلہ نافذ کر دیا جاتا تھا۔

علامہ شوکانی" یمانی لکھتے ہیں کہ:

"مسلمان اجتماعی نظم کے ساتھ شوریٰ سے کام لیتے تھے جلد بازی اور مطلق العنانی کے ساتھ انفرادی رائے سے کام لینا ان کی روایات میں داخل نہیں ہے۔"[3]

ابن خور بنداد لکھتا ہے کہ:

"امیر حکومت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ قانون شوریٰ سے قوت حاصل کرے۔ یہ ہوسکتا ہے کہ امیر حکومت کسی معاملہ میں اتنی واقفیت اور مہارت نہ رکھتا ہو۔ جس قدر معاشرہ کے دوسرے افراد رکھتے ہیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ کسی قوم پر صورت حال مشکلات سے پُر ہو جائے دونوں صورتوں میں شوریٰ کا

1. بیہقی شعب الایمان عن ابن عباس۔ 2. تفسیر مظہری جلد ۲ صفحہ ۱۶۱۔
3. فتح القدیر جلد ۴ صفحہ ۵۲۶۔

انعقاد اور ماہرین علم وفن کی رائے لینا ضروری ہے۔ جنگی معاملات میں فوج کے کمانڈروں سے مصالح عامہ کے سلسلہ میں عوام کے نمائندوں سے مملکت کے نظم اور تعمیر وترقی کے معاملہ میں اوّل درجہ کے مدبروں، دفتری حکام، انتظامی افسروں اور وزیروں سے شوریٰ میں رائے لینی چاہیے۔"[1]

چھٹا وصف

عدل

عدل کے لغوی معنی ہیں دو حصوں کو اس طرح تقسیم کرنا کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھر بھی کمی بیشی نہ ہو۔

اسلامی اصطلاح میں عدل کی تعریف سیّد شریف ان الفاظ میں کرتے ہیں:

"عدل افراط اور تفریط کے درمیان ایک نقطہ مساوات ہے جو اطراف کو برابر رکھتا ہے اور حق پر آ کر رُک جاتا ہے۔"

عدل کی تین قسمیں ہیں:

ا۔ سماجی عدل

یعنی وہ عدل جس کا اثر سوسائٹی پر پڑتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَامَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ.[2] اور اگر تمہیں خوف ہو کہ عدل نہیں کر سکو گے تو ایک ہی یا جس کے تمہارے داہنے ہاتھ مالک ہیں۔

یہ آیت تعدد ازدواج سے متعلق ہے جس میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر کوئی شخص ایک سے زائد بیویوں کے مابین عدل وانصاف قائم نہ رکھ سکتا ہو تو وہ ایک ہی بیوی سے شادی کرے کیونکہ عائلی زندگی کے امن کا دار ومدار عدل وانصاف پر ہے۔

یتامیٰ کے حقوق کو عام طور پر پامال کر دیا جاتا ہے اس وجہ سے یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے متعلق فرمایا:

وَاَنْ تَقُوْمُوْا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ.[3] یہ کہ یتیموں کے معاملہ میں عدل پر قائم رہو۔

---

[1] فتح القدیر، جلد ا صفحہ ۳۶۶۔ [2] النسآء ۴: ۳۔ [3] النسآء ۴: ۱۲۷۔

۲۔ قانونی عدل

قانونی عدل سے مراد یہ ہے کہ عدالتی کاروبار کے ہر پہلو میں عدل و انصاف کو برقرار رکھا جاتا ہے۔

تحریر و دستاویز کے متعلق حکم

وَلْيَكْتُبْ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ[۱] اور تمہاری باہمی قرارداد کو کوئی لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ.[۲] پھر جس شخص پر حق ہے (جس کے ذمہ قرض ہے) کم عقل یا ضعیف ہو یا لکھوانے کی قابلیت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی انصاف سے لکھے۔

شہادت کے حکم کے متعلق

شہادت دیتے وقت عموماً لوگ جنبہ داری سے کام لے جاتے ہیں۔ اسلام اس حالت میں بھی عدل و انصاف پر قائم رہنے کی تعلیم دیتا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَإِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ.[۳] اور جب تم کہو تو عدل کی بات کہو خواہ وہ کسی رشتے دار کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

عدل سے تصفیہ کرنے کے متعلق حکم

فریقین کے درمیان انصاف کرنے کے بارہ میں قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا فَإِنْ بَغَتْ إِحْدَاهُمَا عَلَى الْأُخْرَىٰ فَقَاتِلُوا الَّتِي تَبْغِي حَتَّىٰ تَفِيءَ إِلَىٰ أَمْرِ اللَّهِ فَإِنْ فَاءَتْ فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَأَقْسِطُوا إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ.[۴] اور اگر مومنوں میں سے دو گروہ جنگ کریں تو ان میں صلح کرا دو۔ پس اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرتا ہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کر لے پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل سے صلح کرا دو اور انصاف کرو کیونکہ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

وَإِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ أَنْ تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ.[۵] اور جب لوگوں میں فیصلہ کیا کرو تو انصاف سے فیصلہ کرو۔

اَلْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ[۶] آزاد کا بدلہ آزاد سے غلام کا بدلہ غلام

---

۱ البقرہ ۲:۲۸۲۔ ۲ البقرہ ۲:۲۸۲۔ ۳ انعام ۶:۱۵۲۔
۴ الحجرات ۴۹: ۹۔ ۵ النساء ۴:۵۸۔ ۶ البقرہ ۲:۱۷۸۔

سے اور عورت کا بدلہ عورت سے لیا جائے۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ قانون کی نظر میں سب لوگ یکساں ہیں۔ عہد نبوی کا مشہور واقعہ ہے کہ قبیلہ بنی مخزوم کی ایک عورت نے چوری کی۔ قریش کو یہ بات ناگوار گزری کہ ان کے قبیلہ کی کسی عورت کو سزا ملے۔ چنانچہ انھوں نے حضرت اسامہؓ سے کہا کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں جا کر سفارش کریں۔ جونہی حضرت اسامہؓ نے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے زبان کھولی تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوگیا اور لوگوں کو بلا کر ایک بلیغ خطبہ دیا فرمایا: اِنَّمَا هَلَکَ الَّذِیْنَ قَبْلَکُمْ اِنَّهُمْ کَانُوا یُقِیْمُوْنَ الْحَدَّ عَلَی الْوَضِیْعِ وَیَتْرُکُوْنَ الشَّرِیْفَ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوْ فَاطِمَةُ فَعَلَتْ ذَالِکَ لَقَطَعْتُ یَدَهَا. بے شک تم سے وہ قومیں ہلاک ہوگئیں جو کمزور پر حد قائم کرتے تھے۔ بڑے آدمی کو چھوڑ دیتے تھے خدا کی قسم اگر فاطمہ (میری بیٹی) بھی ایسا کرتی تو میں اس کا ہاتھ کاٹ دیتا۔[1]

اقتصادی عدل

اقتصادی عدل سے مراد وہ لائحہ عمل ہے جس کے تحت ملک کے ہر فرد کو قومی دولت سے برابر کا استفادہ کرنے کا موقعہ میسر ہو اور ایسے اصول وضع کر دیے جائیں جن کی وجہ سے دولت چند ہاتھوں میں جمع نہ ہو سکے۔

اسلام نے دنیا اور مافیہا کی ہر چیز کو اللہ کی امانت قرار دیا ہے۔ ملکیت انسان کے پاس امانت ہے تاکہ وہ اس سے اللہ تعالیٰ کے قانون کے تحت فائدہ اٹھائے۔

ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ زمین اللہ کی ہے وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ اور زمین مخلوق کے فائدہ کے لیے بنائی ہے: وَلَقَدْ مَکَّنّٰکُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَکُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ اور ہم نے تم کو زمین پر آباد کیا اور اس میں تمھارے لیے معیشت کے سامان رکھ دیے۔

وَلِلّٰهِ خَزَائِنُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ. آسمانوں اور زمین کے خزانے اللہ کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ ان خزانوں سے ہر شخص کو فائدہ حاصل کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَانْتَشِرُوْا فِی الْاَرْضِ وَابْتَغُوْا مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ[2] خدا کے فضل (رزق) کی تلاش کے لیے زمین میں پھیل جاؤ۔

لِلرِّجَالِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبُوْا وَلِلنِّسَاءِ نَصِیْبٌ مِّمَّا اکْتَسَبْنَ[3] مردوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں اور عورتوں کا حصہ ہے جو وہ کمائیں۔

---

[1] بخاری کتاب الحدود باب اقامۃ الحدود علی الشریف والوضیع۔ [2] الجمعہ ۶۲:۱۰۔
[3] النساء ۴:۳۲۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

اِعْمَلُوْا فَكُلٌّ مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ.[1] عمل کرو وہ ہر شخص کے لیے وہ کام آسان ہے جس کی وہ صلاحیت رکھتا ہے۔

اِجْمَلُوْا فِی طَلَبِ الدُّنْيَا فَاِنَّ كُلًّا مُيَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ.[2] دنیا کی طلب اپنی صلاحیت کے مطابق کرو اس لیے کہ جس کے لیے آدمی پیدا کیا گیا ہے وہ ضرور اس کو ملے گا۔

جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت میں بھی دوسری مخلوق کا حصہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَفِیْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ.[3] اور ان کے مالوں میں سوالی اور نہ مانگنے والے محتاج کا حق ہے۔

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ.[4] وہ تجھ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ دیجیے جو کچھ ضروریات اور حاجات سے زیادہ ہو وہ غرباء کی حالت سدھارنے کے لیے خرچ کریں۔

اسلام جائز ذرائع سے دولت کمانے کی تو اجازت دیتا ہے لیکن باطل اور ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔

ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ[5] اے ایمان والو! آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے نہ کھاؤ۔

اسلام نے صرف ناجائز ذرائع سے دولت کمانا ہی منع نہیں فرمایا بلکہ جائز ذرائع سے کمائی ہوئی دولت کو بھی جمع کر رکھنا اور بازار میں نہ لانا بھی ناجائز ٹھہرایا ہے۔

ارشاد الٰہی ہے: وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ.[6] اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اس کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے تو ان کو دردناک عذاب کی خبر دے دے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اَلْمُحْتَكِرُ مَلْعُوْنٌ[7] ذخیرہ اندوزی کرنے والا ملعون ہے۔

ساتواں وصف

امن و دفع شر

اسلامی ریاست کا ایک وصف ظلم و فساد کو دور کر کے دنیا میں امن کا قیام ہے۔ یہ وصف اسلام کے نام کے اندر ہی مضمر ہے۔ اسلام کے لغوی معنی صلح کے اندر داخل ہونا ہیں۔ مسلم وہ ہے جو خدا

[1] طبرانی۔ [2] ابن ماجہ باب الاقتصاد فی طلب المعیشۃ۔
[3] الذریت ۵۱:۱۹۔ [4] البقرہ ۲:۲۱۹۔ [5] النساء ۲۹۔
[6] التوبہ ۹:۳۴۔ [7] ابن ماجہ باب الحکرۃ والجلب۔

اور اس کے بندوں سے صلح کرے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِى السِّلْمِ كَآفَّةً [1] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم سارے کے سارے سلامتی کے ساتھ دائرہ اسلام میں داخل ہو جاؤ۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا [2] اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی جھک جا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اسلام کی حقیقت کے متعلق دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا: اَلتَّعْظِيْمُ لِاَمْرِ اللّٰهِ وَالشَّفَقَةُ عَلٰى عِيَالِ اللّٰهِ. [3] اللہ کے احکام کی تعظیم کرنا اور اللہ کی مخلوق سے محبت کرنا۔

انسانوں سے محبت کرنے کے بارے میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ. [4] ساری مخلوق اللہ کی عیال ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق سے زیادہ محبت کرتا ہے۔

امن کا فروغ ہی طاغوتی طاقتوں کو دبانے سے ہے۔ اس کے بارے میں ارشاد الٰہی ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ [5] (ان طاغوتی طاقتوں سے) اور جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو۔ پھر اگر طاغوتی طاقتیں رک جائیں تو سزا ظالموں کے سوا اور کسی کے لیے نہیں۔

اگر طاغوتی طاقتوں کو زیر نہ کیا جائے تو دنیا ظلم وفساد سے بھر جائے گی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ اگر اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کے ذریعہ طاغوتی طاقتوں کو دفع نہ کرتا تو آسمان اور زمین کا تمام نظام برباد ہو جاتا۔

ترمذی میں ایک روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ لوگ جب ظالم کو دیکھیں اور اس کو ظلم سے منع نہ کریں تو ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان سب کو عذاب میں مبتلا کر دے۔

آٹھواں وصف

رواداری

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اسلام وحدت انسانی کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اس پیغام کو فروغ اور تقویت دینے کے لیے اسلام مذہبی اور سیاسی رواداری کی تعلیم دیتا ہے یہی تعلیم امن عالم کی ضامن ہے۔

---

[1] البقرہ ۲:۲۰۸۔ [2] الانفال ۸:۶۱۔ [3] بیہقی کتاب الایمان۔

[4] بیہقی کتاب الایمان۔ [5] البقرہ ۲:۱۹۳۔

مذہبی رواداری

اسلام دوسرے مذاہب کے متعلق یہ تعلیم دیتا ہے کہ تمام آسمانی مذاہب خدا کی طرف سے ہیں اور ان کے بانیوں اور کتب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اس وقت تک مسلمان دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوسکتا جب تک کہ پہلی کتب اور رسولوں پر ایمان نہیں لاتا۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِکَ[1] اور جو ایمان لائے ہیں اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا۔ قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰہِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَیْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓی اِبْرٰھٖمَ وَاِسْمٰعِیْلَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِیَ مُوْسٰی وَعِیْسٰی وَمَآ اُوْتِیَ النَّبِیُّوْنَ مِنْ رَّبِّھِمْ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْھُمْ وَنَحْنُ لَہٗ مُسْلِمُوْنَ[2] تم کہو۔ ہم اللہ پر ایمان لائے اور اس پر جو ہماری طرف اتارا گیا اور اس پر جو ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ اور اسحاقؑ اور یعقوبؑ اور اس کی اولاد کی طرف اتارا گیا اور اس پر جو نبیوں کو اپنا رب کی طرف سے دیا گیا۔ ہم ان میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے۔

اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْہِ مِنْ رَّبِّہٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ کُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ لَا نُفَرِّقُ بَیْنَ اَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِہٖ.[3] رسول اس پر ایمان لایا جو اس کے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔ ہم اس کے رسولوں میں سے کسی میں کچھ تفرقہ نہیں کرتے۔

قرآن مجید کی واضح تعلیم ہے کہ تمام قوموں میں انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاِنْ مِّنْ اُمَّۃٍ اِلَّا خَلَا فِیْھَا نَذِیْرٌ[4] اور کوئی قوم نہیں مگر اس میں ڈرانے والا گزر چکا ہے۔

سیاسی رواداری

وَاِنْ اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِکِیْنَ اسْتَجَارَکَ فَاَجِرْہُ حَتّٰی یَسْمَعَ کَلٰمَ اللّٰہِ ثُمَّ اَبْلِغْہُ مَاْمَنَہٗ.[5] اور اگر مشرکوں میں سے کوئی تجھ سے پناہ مانگے تو اس کو پناہ دے دو۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دو۔

لَا یَنْھٰکُمُ اللّٰہُ عَنِ الَّذِیْنَ لَمْ یُقَاتِلُوْکُمْ فِی الدِّیْنِ وَلَمْ یُخْرِجُوْکُمْ مِّنْ دِیَارِکُمْ اَنْ تَبَرُّوْھُمْ وَتُقْسِطُوْٓا اِلَیْھِمْ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ[6] اللہ تمہیں ان سے نہیں روکتا جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی نہیں کی اور تمہیں اپنے گھروں سے نہیں نکالا کہ تم ان سے احسان کرو اور

---

1. البقرہ ۲:۴۔ 2. البقرہ ۲:۱۳۶۔ 3. البقرہ ۲:۲۸۵۔
4. فاطر ۳۵:۲۴۔ 5. التوبہ ۹:۶۔ 6. الممتحنہ ۶۰:۸۔

ان سے انصاف کرو۔ اللہ انصاف کرنے والوں سے محبت رکھتا ہے۔

حدیث میں آتا ہے۔

وفد (نجران) علی النبی صلی اللہ علیہ وسلم دخلوا علیہ مسجدہ بعد العصر فحانت صلاتهم فقاموا يصلون فی مسجده فاراد الناس منعهم فقال رسول الله صلی الله عليه وسلم دعوهم فاستقبلوا المشرق رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں عصر کے وقت نجران کا وفد آیا۔ آپ نے اس کو مسجد میں جگہ دی۔ ان کی نماز کا وقت آیا تو مسجد میں نماز ادا کرنے کے لیے کھڑے ہوئے۔ لوگوں نے ان کو منع کرنا چاہا رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوگوں کو روک دیا۔ پھر وہ مشرق کی طرف منہ کر کے عبادت کرنے لگے۔[1]

نواں وصف

فلاحی ریاست

اسلامی ریاست کا دوسرا نام ہی فلاحی ریاست ہے کیونکہ اسلامی ریاست ہی ایک ایسا روحانی اور مادی نظام ہے۔ جس میں انسان کی روح اور مادی تمام ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ آج دنیا میں فلاحی ریاست کے تصور کو مغربی تصور سمجھا جاتا ہے اور اس کا سہرا مغربی مفکرین کے سر پر سجایا جاتا ہے۔ جب کہ فلاحی ریاست کا تصور سب سے پہلے اسلام نے دیا پھر اس تصور کو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین نے عملی جامہ پہنایا۔

فلاحی ریاست

فلاحی ریاست ایک ایسا ملک ہوتا ہے۔ جس میں تمام لوگ خوش حال ہوں سب کی بنیادی ضروریات آسانی سے پوری ہوں اور سب کو بنیادی انسانی حقوق حاصل ہوں اور ریاست میں مساوات عدل و انصاف مذہبی آزادی احترام انسانیت اور احتساب و قانونی تحفظ حاصل ہو۔ ریاست ملک سے غربت فقر و فاقہ بے روزگاری جہالت رشوت منشیات جرائم سمگلنگ اور کلاشنکوف کلچر وغیرہ کا عملاً خاتمہ کر دے شہریوں کو جان، مال، نسل، عقل اور دین کی حفاظت کی ضمانت دے اس کے شہری امن و عافیت سے باعزت زندگی گزار سکیں۔ تمام شہری محنتی اور ایمان دار ہو۔ نیکی کے کاموں میں تعاون کریں اور برائی کے خلاف جہاد میں سرگرم رہتے ہوں۔ فلاحی ریاست اور حقوق انسانی لازم ملزوم ہیں۔

---

1. زاد المعاد فی ہدی خیر العباد۔

حقوق انسانی

۱۔	جان و مال آبرو کی حفاظت	۲۔	ذاتی ملکیت کا حق
۳۔	انسانی عزت و وقار کا حق	۴۔	حق خلوت
۵۔	اختلاف رائے کی آزادی	۶۔	مذہب اور عقیدہ کا حق
۷۔	مذہبی رواداری کا حق	۸۔	ہجرت کا حق
۹۔	پناہ لینے کا حق	۱۰۔	حصول تعلیم کا حق
۱۱۔	آزادی سکونت کا حق	۱۲۔	ظلم کے خلاف آواز اٹھانے کا حق
۱۳۔	ملکیت کا حق	۱۴۔	قانونی حق (قانون مساوات)
۱۵۔	حکومت میں شرکت کا حق	۱۶۔	تشکیل حکومت میں شرکت

۱۷۔ یتامیٰ، غرباء فقراء محتاجوں مساکین اور بیوگان کی ضروریات کو پورا کرنا ہے۔

۱۸۔ تقریر تحریر اور آزادی اظہار کی آزادی

۱۹۔ معاشرہ میں امن و امان

۲۰۔ معاشی استحصال کا خاتمہ (سود سٹہ بازی جوا اور دیگر ناجائز کاروبار کی روک تھام)

۲۱۔ مناصب جلیلہ پر اہل افراد کی تقرری

۲۲۔ بیروزگاری کا خاتمہ اور سب افراد کے لیے روزگار کے مواقع یکساں ہونے چاہئیں۔

۲۳۔ غیر مسلموں کے مذہبی سیاسی معاشرتی اور معاشی حقوق کا تحفظ۔

۲۴۔ کردار کی تعمیر سازی: (رشوت چور بازاری قحبہ گری ڈاکہ زنی اغوا قتل و غارت گری فحاشی جھوٹ عریانی ظلم شراب خوری اور دیگر نشہ آور اشیاء کا استعمال بے پردگی وغیرہ کا خاتمہ)

اسلامی فلاحی حکومت مذکورہ تمام حقوق کی بجا آوری کو اپنا فرض قرار دیتی ہے۔

باب ششم

ریاست کے ذرائع آمدن

ہر دور میں ریاست کے ذرائع آمدن بڑھتے رہتے ہیں۔ اس باب میں صرف ان ذرائع کا ذکر کیا جائے گا جو بنو عباس کے دور تک تھے۔

۱۔ زکوٰۃ

اسلامی ریاست کے بیت المال یا سرکاری خزانہ کے مالی وسائل و ذرائع میں سے اہم ترین ذریعہ زکوٰۃ ہے۔ زکوٰۃ صرف بیت المال کا اہم ترین ستون ہی نہیں بلکہ ارکانِ اسلام میں داخل ہے۔ اس کے بغیر اسلام کی عمارت مکمل نہیں ہوتی۔ قرآن مجید اور حدیث میں زکوٰۃ کی ادائیگی پر بہت زور دیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (البقرہ۲:۱۱۰) اور نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَمَا اٰتَیْتُم مِّنْ زَکٰوۃٍ تُرِیْدُوْنَ وَجْہَ اللّٰہِ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُضْعِفُوْنَ (روم ۳۰:۳۹) اور جو کچھ تم زکوٰۃ دیتے ہو (اس کے ساتھ) اللہ کی رضا چاہتے ہو تو یہی بڑھا لینے والے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے متعدد مواقع پر زکوٰۃ کی اہمیت بیان کی ہے۔ فرماتے ہیں: بُنِیَ الْاِسْلَامُ عَلٰی خَمْسٍ شَھَادَۃُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُہٗ وَرَسُوْلُہٗ وَاَقَامُ الصَّلٰوۃِ وَاِیْتَاءُ الزَّکٰوۃِ وَحَجُّ الْبَیْتِ وَصَوْمُ رَمَضَانَ (متفق علیہ) اسلام کی بنیاد پانچ باتوں پر رکھی گئی ہے۔ ۱۔ ایک تو اس بات کی گواہی دینا کہ خدا کے سوا کوئی سچا معبود نہیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں۔ ۲۔ نماز قائم کرنا۔ ۳۔ زکوٰۃ ادا کرنا۔ ۴۔ بیت اللہ کا حج کرنا۔ ۵۔ رمضان کے روزے رکھنا۔

فرمایا مَا مَنَعَ قَوْمٌ الزَّکٰوۃَ اِلَّا اِبْتَلَاھُمُ اللّٰہُ بِالسِّنِیْنَ (مجمع الزوائد ومنبع الفوائد حافظ نور الدین علی بن ابی بکر ج ۳ ص ۶۲) جس قوم نے زکوٰۃ نہ دی اللہ ان کو قحط سالی میں مبتلا کر دے گا۔

فقہاء کا اجماعی فیصلہ ہے کہ زکوٰۃ کا منکر کافر ہے اس سلسلہ میں امام نووی کے الفاظ قابلِ توجہ ہیں۔ فمن جحد وجوبھا فقد کذب اللّٰہ و کذب رسول صلی اللّٰہ علیہ وسلم فحکم

بکفرہ (المجموع ج ۵ ص ۳۳۴) جس نے زکوٰۃ کے واجب ہونے سے انکار کیا اس نے اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا لہٰذا اس کے کفر کا حکم دیا جائے گا۔

افرادِ زکوٰۃ

ا۔ مسلمان ہو۔ ۲۔ بالغ اور عاقل ہو۔ ۳۔ آزاد ہو۔ ۴۔ مقروض نہ ہو۔

مال زکوٰۃ کی چند خصوصیات

صرف وہی مال قابل زکوٰۃ ہے جس میں حسب ذیل خصوصیات پائی جاتی ہوں۔

ا۔ وہ مال کسی مسلمان کی مکمل ملکیت ہو کیونکہ جس مال کا کوئی مسلمان مالک نہ ہو۔ اس پر زکوٰۃ نہیں (ردالمحتار علی الدر المختار ابن عابدین ج ۲ کتاب الزکوٰۃ)

۲۔ مال بقدر نصاب ہو نصاب سے کم مال پر زکوٰۃ نہیں۔ نصاب کی تفصیل آگے آئے گی۔

۳۔ مال ضروریات اصلیہ (Basic Needs) سے زائد ہو۔ لہٰذا ایسی اشیاء جو بنیادی ضروریات زندگی سے متعلق ہوں اس پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ فقہاء کرام نے مندرجہ ذیل اشیاء ضرورت کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔

ا۔ ذاتی رہائشی مکان۔ ۲۔ پہننے کے پارجات۔ ۳۔ گھریلو استعمال کے برتن۔ ۴۔ سواری کے جانور اور دیگر سواریاں۔ ۵۔ اسلحہ برائے استعمال۔ ۶۔ خوردنی اشیاء اپنے اور اہل خانہ کے لیے۔ ۷۔ تزئین و آرائش کی اشیاء بشرطیکہ سونا اور چاندی کی تیار کردہ نہ ہوں۔ ۸۔ مطالعہ کی کتب۔ ۹۔ استعمال کے اوزار۔

۴۔ مال میں نمو (بڑھنے) کی صفت پائی جاتی ہو۔ نمو کی یہ خوبی سوائم (جنگل میں چرنے والے حیوانات) سونا اور چاندی (نقود) کھیتوں اور باغات کی پیداوار میں، معادن اور دفینوں اور اموال تجارت میں پائی جاتی ہے۔

۵۔ مال قرض سے پاک ہو یعنی اس پر ایسا قرض نہ ہو جو مقدار مال یا کل قیمت مال سے بھی زائد ہو یا برابر ہو۔ اگر کسی کے ذمہ مالدار کا قرض ہو اور قرض وصول ہونے کے تمام امکانات (مثلاً تحریر گواہان وغیرہ) موجود ہوں اور بذریعہ عدالت بھی اس کی وصولی ممکن ہو تو جب وصول ہو جائے۔ اس سے پہلے تمام سالوں کی زکوٰۃ ادا کرنا ہو گی۔

۶۔ مال ہر مسلمان کے قبضہ میں رہتے ہوئے پورا سال گزر جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا فرمان ہے لَا زَکٰوۃَ فِی مَالٍ حَتّٰی یَحُوْلَ عَلَیْہِ الْحَوْلُ (دار قطنی۔ ابن ماجہ۔ ابو داؤد) کسی پر زکوٰۃ فرض نہیں جب تک اس پر پورا سال نہ گزر جائے۔

نصاب زکوٰۃ۔ ا۔ مویشی

مسلمان جو مویشی اپنے استعمال کے لیے پالتے ہیں ان پر بھی زکوٰۃ ہوتی ہے اس زکوٰۃ کے فرض ہونے کے لیے مندرجہ ذیل شرائط کا پورا ہونا ضروری ہے۔

پہلی شرط یہ ہے کہ جانور چرنے والے ہوں اور وہ مال کا بیشتر حصہ جنگل میں چرتے ہوں تاکہ محنت مشقت کم اور نفع اور نسل کشی زیادہ ہو۔ گھر پر بندھے ہوئے اور مول کا گھاس دانہ وغیرہ کھانے والے مویشیوں پر زکوٰۃ نہیں۔

یہ حضرت امام ابوحنیفہ اور حضرت امام شافعی کی رائے ہے البتہ امام مالک تمام قسم کے مویشیوں پر زکوٰۃ فرض کرتے ہیں (ماوردی الاحکام السلطانیہ قاہرہ ص ۱۱۱)

دوسری شرط یہ ہے کہ ان جانوروں کو کسی خاص شخص کی ملکیت میں رہتے ہوئے پورا سال گزر جائے تاکہ اس دوران نسل پوری ہو جائے۔ اس کی بنیاد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وہ ارشاد ہے جس میں آپ نے فرمایا "سال گزرنے سے پہلے مال پر زکوٰۃ فرض نہیں ہے۔"

تیسری شرط یہ ہے کہ جانور کھیتی باڑی میں کام نہ آتے ہوں کیونکہ کھیتی باڑی کی پیداوار پر جو عشر یا نصف عشر لاگو ہوتا ہے۔ اس میں کھیتی باڑی میں کام کرنے والے جانوروں کی زکوٰۃ بھی شامل ہوتی ہے اور اگر ان پر دوبارہ زکوٰۃ عائد ہو جائے تو یہ دوہرا ٹیکس ظلم ہوگا۔ یہ اسلام کے نظام عدل کے خلاف ہے (کتاب الاموال ابوعبیدہ ۳۸۱، ۳۸۲)

ا۔ اونٹ: اونٹوں کا نصاب پانچ اونٹ میں اس سے کم پر زکوٰۃ نہیں۔

ب۔ بھیڑ بکریوں پر زکوٰۃ: چالیس سے کم بکریوں، بھیڑوں پر زکوٰۃ نہیں چالیس کے اوپر پر زکوٰۃ۔

ج۔ گھوڑے: گھوڑوں کی زکوٰۃ کے بارے میں فقہاء کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک ارشاد میں غلاموں اور گھوڑوں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کر دیا تھا۔ (کتاب الاموال ابوعبیدہ قاسم بن سلام ص ۶۳۴ الاحکام السلطانیہ ماوردی باب ۱۱ ص ۱۱۱)

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانہ میں گھوڑے صرف جہاد کے لیے تھے یہی صورت حضرت ابوبکرؓ کے عہد کی تھی حضرت عمرؓ کے دور میں عراق و شام کے مرغزار فتح کیے جہاں گھوڑے نسل کشی اور محض شکار اور سواری کے لیے پالے جاتے تھے۔ حضرت ابوعبیدہ کو ان مفتوحہ علاقوں کے لوگوں نے گھوڑوں کی زکوٰۃ پیش کی تو آپ نے حضرت عمرؓ کو لکھا صحابہ کی مشاورت کے بعد آپ نے گھوڑوں پر محصول لگانے کا ارادہ کیا۔ (کتاب الخراج ابویوسف ص ۷۷)

فقہاء میں سے حضرت امام ابوحنیفہ گھوڑوں پر زکوٰۃ کے قائل ہیں۔ جبکہ جنگل میں چرنے والے ہوں اور ہر گھوڑی پر ایک دینار واجب کرتے ہیں۔ (ہدایہ مرغینانی ج ا کتاب الزکوٰۃ)

گھوڑی گھوڑے کی قیمت کا اندازہ لگا کر زکوٰۃ ادا کی جا سکتی ہے چنانچہ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں "اگر گھوڑے گھوڑیاں جنگل میں چرنے والے (سوائم) ہوں تو ان کے مالک کو اختیار ہے کہ وہ فی گھوڑا گھوڑی ایک دینار ادا کرے اور اگر چاہے تو ان کی قیمت کا اندازہ لگا کر دو سو درہم پر پانچ درہم دے اور قیمت کا اندازہ لگانا حضرت عمرؓ سے منقول ہے۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں بلاذری فتوح البلدان ص ۱۶۸)

د۔ گائے بھینس: گائے بھینس کا ابتدائی نصاب تیس ہے۔[1]

سونا چاندی

سونا بیس مثقال اور چاندی دو سو درہم ہو۔ ان پر سال گزر جائے تو ۱/۴۰ دینا ہے۔

سامان تجارت

تجارت کا سامان اگر سونے چاندی کے نصاب تک پہنچ جاتا ہے تو ایک سال پر ایک سال بھی پورا گزر جاتا ہے تو ۱/۴۰ دینا پڑتا ہے۔

سونے چاندی کی کان اور خزانہ

قانون شریعت میں ان دونوں کی ایک حیثیت تھی اگر دارالحرب میں ہو تو ۱/۵ حصہ ریاست کا تھا۔ ارض صلح میں ۱/۴۰ حصہ ریاست کا تھا باقی پانے والے کا حق تھا۔

غلہ اور پھل

اگر زمینیں بارش اور قدرتی نالوں کے ذریعہ سیراب ہوتی ہیں تو ان کی پیداوار کا ۱/۱۰ حصہ لیا جاتا۔ ۱/۲۰ اس وقت لیا جاتا ہے جب انھیں سینچنا پڑتا ہو اور نشوونما میں کاوشیں اٹھانی پڑی ہوں۔ (صحیح بخاری۔ الجامع لاحکام القرآن ج ۷ ص ۹۹ الفقہ علی مذاہب الاربعہ)

کون سی حکومت زکوٰۃ وصول کرنے کا حق رکھتی ہے

زکوٰۃ اسلام میں نماز کی طرح ایک عبادت ہے اس وجہ سے یہ کسی رنگ میں ساقط نہیں ہو سکتی۔ اگر کوئی مسلمان ایسی جگہ رہتا ہے جہاں حکومت مسلمان نہیں تو وہ پھر اپنے مال سے زکوٰۃ نکال کر قرآن مجید کے بیان کردہ مصارف پر خرچ کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص اسلامی حکومت کا باشندہ ہے تو پھر حکومت کسی قسم کی ہو۔ اس میں زکوٰۃ وصول کرنے کا قانون ہے تو ہر مسلم حکومت کے خزانے میں زکوٰۃ ادا کرے۔ اگر حکومت میں زکوٰۃ وصول کرنے کا کوئی قانون نہیں تو صاحب نصاب قرآن کے بیان

---

[1] مویشیوں پر زکوٰۃ کی تفصیل فقہ کی کتب میں بیان ہے۔

کردہ مصارف کے مطابق خرچ کرے۔

حضرت عبداللہ بن عمر کی یہ روایت ہے اِدْ فَعُوْهَا اَلَيْهِمْ اِنْ شَرِبُوْا الْخُمُور (نیل الاوطار تالیف شوکانی مطبوعہ مصر جلد ۴ صفحہ ۱۶۵) تم زکوٰۃ والیانِ حکومت کے حوالے کرو چاہے وہ شرابی ہی کیوں نہ ہوں۔ اسلام میں زکوٰۃ کے وصول کرنے کا حق حکومت کو ہی ہے۔ اس لیے ہر اسلامی حکومت کو زکوٰۃ جمع کرنے کا بندوبست کرنا چاہیے۔ اس میں بڑی برکت اور خیر ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف

اللہ تعالیٰ نے مصارف قرآن مجید میں بیان کیے ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (توبہ ۶۰) زکوٰۃ صرف ناداروں کے لیے ہے اور مسکینوں اور اس کے کارکنوں (کے لیے) اور جن کے دل مائل کرنا ہے اور غلاموں کے آزاد کرنے اور قرض داروں (کے لیے) اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں (کے لیے) یہ اللہ کی طرف سے ضروری ٹھہرایا گیا ہے اور اللہ جاننے والا حکمت والا ہے۔

فقراء

یہ وہ لوگ ہیں جو کسی جسمانی معذوری کی وجہ سے روزی کمانے کے اہل نہ ہوں۔ ان میں بیمار، بوڑھے، معذور، بیوگان، یتیم بچے وغیرہ شامل ہیں۔ اسی طرح فقراء میں وہ لوگ بھی شامل ہیں۔ جن پر کوئی سخت مصیبت آن پڑی ہو وہ اس قابل نہ ہوں کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوسکیں اور اپنے بال بچوں کا پیٹ پال سکیں۔

مساکین

مسکین سے مراد وہ شخص ہے جو کمانے کے لائق ہو مگر غربت یا عدم ذرائع کی وجہ سے کچھ کما نہ سکتا ہو۔ مثلاً اہل حرفہ ہے نادار ہے اپنے پیشہ کے اوزار حاصل کرنے کے قابل نہیں۔ طالب علم ہے لیکن حصول علم کے وسائل سے محروم ہے۔

امام شافعی نے فقراء مسکین میں اسی کے قریب قریب فرق بیان کیا ہے وہ کہتے ہیں فقیر وہ ہے جس کے پاس نہ مال ہو نہ اس کے ہاتھ میں کوئی کسب اور مسکین وہ ہے جس کے پاس مال یا کسب تو ہو مگر اس کی ضروریات کے لیے مکتفی نہ۔ اس پر انھوں نے قرآن مجید کی آیت اَمَّا السَّفِيْنَةُ فَكَانَتْ لِمَسَاكِيْنَ (الکہف ۱۸:۷۹) کو پیش کیا ہے کیونکہ جن کے پاس کشتی تھی وہ نادار نہ تھے۔

حدیث کی کتابوں میں مسکین کی یہ تعریف کی گئی ہے المسکین الذی لا یجد غنی لیغنیہ

ولا یفطن له فیتصدق علیه ولا یقوم فیسئال الناس (معاشیات اسلام مصنفہ مولانا مودودی صاحب ص ۳۱۹) مسکین وہ ہے جو اپنی حاجت بھر مال نہیں پاتا اور نہ پہچانا جاتا ہے کہ اس کی مدد کی جائے اور نہ کھڑا ہو کر مانگتا ہے۔

اس تعریف کی رو سے مسکین وہ ہے جو تنگ دست ہو لیکن اپنی خود داری اور عزت نفس کی وجہ سے لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا۔ اسلامی ریاست پر یہ فرض ہے کہ وہ ایسے اشخاص کی فہرست مرتب کریں اور ان کے گھر تک ان کی روزینہ پہنچائے تاکہ وہ باوقار شہری بن سکیں۔

فقراء و مساکین کی مدد سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کو منگتا بنایا جائے بلکہ ان کی مدد کرنے میں اسلامی روح یہ ہے کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑے ہوں اور باوقار زندگی بسر کریں۔

عاملین علیہا (کارندے)

یہ وہ کارکن ہیں جو صدقات اور زکوٰۃ جمع کرتے ہیں اور بیت المال میں پہنچاتے ہیں۔ ان سب ملازمین کی تنخواہ اس مد سے ادا کی جائے گی۔ ایسے لوگ چاہے فقر و مسکین ہوں چاہے صاحب ثروت ان کا مشاہرہ زکوٰۃ کی فنڈ سے دیا جائے گا۔

فقہاء نے بعض ایسے لوگوں کو بھی شامل کیا ہے جو بظاہر عاملین زکوٰۃ کی تعریف میں نہیں آتے علامہ ابن رشد لکھتے ہیں۔ والذین اجازوھا للعامل وان کان غنیا اجازوھا للقضاۃ ومن فی معناھم ممن لھم المنفعۃ عامۃ المسلمین (ہدایۃ المجتہد از امام ابن رشد جلد ۱ صفحہ ۲۶۷) اور وہ فقہا جنھوں نے دولت مند عامل کے لیے زکوٰۃ کی مد سے لینا جائز قرار دیا ہے انھوں نے قاضی اور اس قسم کے دوسرے ملازمین کو جن سے عامۃ المسلمین کو فائدہ پہنچتا ہے۔ اس کا حق ڈال دیا ہے۔

فقہاء کی اس تصریح کے مطابق عدلیہ کے پورے نظام کے اخراجات زکوٰۃ کی مد سے پورے کیے جاسکتے ہیں۔

مولفۃ القلوب (تالیف قلوب)

یہ دو قسم کے لوگ ہیں اوّل ایسے لوگ جو دائرہ اسلام میں داخل نہیں ہوئے اور ان کو اسلام کے قریب لانے کی ضرورت ہے۔

دوم وہ نومسلم جن کے قلوب میں اسلام ابھی پورے طور پر راسخ نہیں ہوا۔ ان کی امداد اور ان کو تعلیم اسلام سے واقف کرانے کے لیے زکوٰۃ کے فنڈ سے خرچ کیا جائے۔

تالیف قلوب اتنا اعلیٰ اصول ہے لیکن اس اصول کو مسلمانوں نے نسیاً منسیا کر دیا ہے جس وجہ سے کوئی بھی اپنے ہم قوم اور اعزہ و اقارب سے بگاڑ کر اسلام کو قبول کرنے کی طرف مائل نہیں ہوتا

اس کے برعکس عیسائیوں نے اس اصول کو اپنا لیا ہے اور تالیف قلوب کی مد سے کروڑوں روپے خرچ کر رہے ہیں اس احسان اور امداد کو دیکھ کر لوگ دھڑا دھڑ آغوش نصرانیت میں جا رہے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے اپنے دور خلافت میں اس مد کو ساقط کر دیا تھا لیکن بعد کے فقہاء نے پھر اس کو رائج کر دیا۔ امام شوکانی لکھتے ہیں "والظاهر جواز التاليف عند الحاجة فاذا كان فى زمن الامام قوم لا يطيعونه الا للدنيا ولا يقدر على ادخالهم تحت طاعته بالقسر والتغلب فله ان يتالفهم (نيل الاوطار تاليف علامه شوكانى ص ۷۷) اور ظاہر بات یہ ہے کہ ضرورت کے وقت تالیف قلب جائز ہے اگر کسی مسلمان حکمران کو ایسے لوگوں سے سابقہ ہو جو مال کے بغیر اطاعت کرنے پر راضی نہ ہوں اور بزور طاقت بھی ان پر قابو نہ پایا جا سکے تو وہ ان کی تالیف قلب کر سکتا ہے۔

فی الرقاب (غلاموں کو آزاد کرنا)

اسلام کے علاوہ کوئی ایسا مذہب نہیں جس نے غلاموں کے لیے باضابطہ طور پر بیت المال سے ایک حصہ مقرر کیا ہو۔ یہ آزادی تین طرح سے ہو سکتی ہے۔

ا۔ حکومت مالکوں سے غلام خرید کر آزاد کر دے۔

۲۔ اسیران جنگ کا فدیہ دیا جائے۔

۳۔ ان غلاموں کی مدد کی جائے جو مالک سے مکاتبہ کر کے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔

اسلام کا انسانی تہذیب پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے کرۂ ارض سے غلامی کو ختم کر دیا ہے۔

فی سبیل اللہ یعنی اللہ کی راہ میں۔ اس سے مراد جہاد ہے۔ جہاد تین قسم کا ہے جہاد سیفی، جہاد قلمی اور جہاد لسانی۔

تینوں جہاد مسلمانوں کی زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ یہ جہاد اپنے اپنے حالات کے مطابق کیے جاتے ہیں۔ یہ تینوں جہاد قومی ترقی اور سالمیت کے لیے ضروری ہیں۔

بعض علماء نے سبیل اللہ کے لفظ کو ہر قسم کی نیکی پر استعمال کیا ہے۔ جس میں اللہ کی رضا مقصود ہو۔ ان کے نزدیک زکوٰۃ کا مال ہر قسم کے نیک کام پر خرچ کیا جا سکتا ہے۔ امام فخر الدین رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

واعلم ان ظاهر اللفظ فى قوله " وفى سبيل الله" لايوجب القصر على الغزاة فلهذا المعنى نقل القفال فى تفسيره عن بعض الفقهاء انهم اجازوا صرف الصدقات الى جميع وجوه الخير من تكفين الموتى وبناء الحصون و عمارة المساجد لان قوله و فى سبيل الله عام فى الكل (تفسير كبير جلد ۴ ص ۴۶۴) اور جاننا چاہیے کہ اللہ کے قول "فی سبیل اللہ" میں لفظ کے ظاہر سے یہ لازم نہیں آتا کہ یہ مد تمام تر فوجی اخراجات کے لیے مخصوص ہے۔ اس وجہ

سے علامہ قفال نے اپنی تفسیر میں بعض فقہاء کے متعلق نقل کیا ہے کہ وہ صدقات کو تمام معارف خیر مثلاً مردوں کی تجہیز و تکفین، حلقوں (چھاؤنیوں) کی تعمیر، مساجد کی آبادکاری پر خرچ کرنا جائز قرار دیتے ہیں کیونکہ فی سبیل اللہ کے الفاظ سب کے لیے عام ہیں۔

علامہ رشید رضا کی تفسیر:۔ علامہ صاحب نے فی سبیل اللہ کی تفسیر ان الفاظ میں کی ہے وفی سبیل اللہ وهو یشتمل سائر مصالح الشرعیة العامة فی ملاک امر الدین والدولة واولها بالتقدیم الاستعداد للحرب بشراء السلاح واغذیة الجند ادوات النقل و تجهیز الغزاة و تقدم مثله عن محمد بن الحکم (تفسیر المنار تالیف علامہ رشید رضا صفحہ ٥٠٥) فی سبیل اللہ سے مراد وہ تمام شرعی مصالح ہیں جن پر دین وحکومت کا انحصار ہے۔ ان میں سب سے اوّل اور سب سے مقدم یہ ہے کہ جنگ کی تیاری کے لیے اسلحہ خریدا جائے۔ فوج کے لیے غذائی سامان فراہم کیا جائے۔ ٹرانسپورٹ کا انتظام کیا جائے۔ غازیوں کا سامان جہاد مہیا کیا جائے اور ایسا ہی قول محمد بن الحکم کی روایت سے بیان کیا جا چکا ہے۔

فوج کو تنخواہیں بھی اس مد سے دی جاتی ہیں بڑے بڑے امیر صحابہ جہاد کے مقاصد کے لیے اس مد سے لیا کرتے تھے۔ قاضی ابوبکر جصاص لکھتے ہیں کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقبل احدهم الصدقة وله من السلاح والکراع والعقار قیمته عشر الاف درهم (احکام القران للجصاص مطبوعہ مصر جلد ٣ ص ١٦٠) صحابہ کرام دس دس ہزار درہم کی مالیت کے جنگی ہتھیاروں اور دوسرے اموال کے مالک ہوتے تھے۔ پھر بھی (جہاد کے لیے) صدقہ کی مد سے لیتے تھے۔

ابن السبیل (مسافر)

زکوٰۃ فنڈ سے مسافروں کی امداد کرنے کا حکم ہے بعض اوقات سفر میں ایسے مرحلے بھی آ جاتے ہیں کہ مسافر بیمار ہو جاتا ہے اس کی رقم گر جاتی ہے تو وہ بالکل تہی دست ہو جاتا ہے اس صورت میں وہ مالی امداد کا بہت محتاج ہوتا ہے۔

٢۔ جزیہ

اہل کتاب اور کفار جو مغلوب ہو کر اسلامی اقتدار تسلیم کر لیں اور اسلامی ریاست کے وفادار شہری بن کر رہیں حکومت ان کے جان و مال و آبرو کی حفاظت کرے۔ جس کے صلہ میں وہ ریاست کو ایک معمولی سا ٹیکس سالانہ دیتے ہیں۔ اس ٹیکس کو جزیہ کہا جاتا ہے قرآن مجید میں آتا ہے۔ قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَلَا يَدِيْنُوْنَ دِيْنَ

الْحَقِّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ حَتّٰى يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَنْ يَّدٍ وَّهُمْ صٰغِرُوْنَ (توبہ ۹:۲۹) ان سے جنگ کرو جو اللہ پر ایمان نہیں لائے اور نہ پچھلے دن پر اور نہ ہی ان چیزوں کو حرام ٹھہراتے ہیں جو اللہ اور اس کے رسول نے حرام کیں اور نہ سچے دین کو اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی۔ یہاں تک کہ وہ ہاتھ سے جزیہ دیں اور وہ محکوم ہوں۔

افراد جزیہ

جزیہ صرف تندرست کمانے والے خوش حال عاقل' بالغ اور آزاد ذمیوں سے لی جاتی تھی اور جزیہ ان فوجی خدمات کے استثناء کے عوض میں لیا جاتا ہے۔ (کتاب الخراج ابو یوسف ص ۶۴ تا ۷۰)

مقدار جزیہ

جزیہ کی مقدار کا تعین حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہوا۔ آپ نے شروع شروع میں جن ذمیوں کے پاس سونا ہوتا تھا ان پر سالانہ چار دینار اور جن کے پاس چاندی ہوتی تھی اور خوش حال ہوتے تھے ان سے چالیس درہم لیے جاتے تھے۔ مگر بعد میں جب لوگوں کی معاشی حالت اچھی ہوگئی تو آپ نے ذمیوں میں سے امراء پر ۴۸ درہم سالانہ (بارہ روپے) متوسط لوگوں پر ۲۴ درہم (چھ روپے) اور ادنیٰ طبقہ سے ۱۲ درہم مقرر کیے (کتاب الاموال ابو عبیدہ قاسم ابن سلام ص ۳۹ التاریخ الکبیر ابن عساکر)

غریبوں' بے کسوں' اندھوں' اپاہجوں' مجنونوں اور دوسرے معذور افراد سے جزیہ نہیں لیا جاتا تھا۔ راہب اگر متمول نہ ہوتے تو انھیں جزیہ ادا نہ کرنا پڑتا تھا۔ (کتاب الخراج ص ۶۹-۷۲ الجامع لاحکام القران قرطبی ج ۸ ص ۱۰۸' الاحکام السلطانیہ ص ۱۳۹)

حضرت عمرؓ کے اس عمل سے ظاہر ہوتا ہے جزیہ کی رقم ذمی کے مناسب حال کے مطابق لی جاتی تھی۔ گویا یہ ٹیکس متزاد قسم کا ہے جو ہر ذمی پر اس کی مالی حیثیت کے مطابق لگایا جاتا تھا۔ آپ نے تین درجے بنائے تھے ہر ایک پر علیحدہ علیحدہ جزیہ لگایا۔ ناداروں' معذوروں کو مستثنیٰ قرار دیا۔ جزیہ اسلام کا نظریہ نہیں ہے بلکہ یونانیوں نے اسے سب سے پہلے ایشیائے کوچک کے باشندوں پر ۵۰۱ ق۔م عائد کیا تھا۔ رومیوں اور ایرانیوں نے ان کی تقلید کی تھی اور اپنی مفتوحہ قوموں پر اسے لازمی قرار دیا تھا۔ مسلمانوں کا جزیہ ایرانیوں کے نظام جزیہ سے بہت کچھ ملتا جلتا ہے۔

مسلمان فرمانروا جزیہ وصول کرنے میں عدل و انصاف اور نرمی کا برتاؤ کرتے تھے۔ اسلام کا یہ قانون تھا کہ جزیہ وصول کرنے کے لیے کسی ذمی کو زدوکوب نہ کیا جائے نہ دھوپ میں کھڑا کیا جائے نہ بدن داغ کر یا کسی دوسری طرح جسمانی اذیت پہنچائی جائے۔ سہل انکار کی حالت میں صرف حوالات

میں بند کیا جا سکتا ہے مگر ادائیگی کے بعد فوراً رہا کر دیا جائے۔ امام ابو یوسف نے ہارون رشید کو خط لکھا تھا "آپ کا فرض ہے ذمیوں سے رواداری برتیں یہ حضرت عمر، آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا معمول تھا ان کی ضرورتوں سے بے خبر نہ رہتے۔ ان پر جبر وجور اور زیادتی نہ ہونے پاتے جزیہ کے علاوہ اور ان کا مال نہ لیا جائے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ان آخری الفاظ سے آپ ناواقف نہ ہوں گے۔" ذمیوں سے بھلائی کرنا ان سے رواداری برتنا انھیں کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے دینا (کتاب الخراج ص ۱۳۷)

عہد عباسیہ میں ذمیوں کے حقوق کے تحفظ اور ان کی دوسری ضروریات کے لحاظ رکھنے کے لیے ایک مستقل محکمہ قائم تھا۔[1]

جزیہ معاوضہ سلامتی

اگر اسلامی حکومت ذمیوں کی حفاظت نہ کر سکتی تھی تو ذمیوں کو جزیہ کی رقم واپس کر دیتی تھی۔ اسلامی تاریخ میں اس کی بیسیوں مثالیں موجود ہیں۔ حضرت ابو عبیدہ بن الجراح نے شام کے دیہاتی عیسائیوں کو جزیہ کی رقم اس لیے واپس کر دی کہ ان کی فوج کو جنگی مصلحت کے لیے اس علاقہ کو خالی کرنا پڑا۔ لہٰذا اب مسلمان ان کی حفاظت نہیں کر سکتے تھے۔ (الموطا کتاب الزکوٰۃ باب الجزیہ امام مالک)

اگر کوئی ذمی دائرہ اسلام میں داخل ہو جاتا تو اس کا جزیہ ساقط ہو جاتا۔

۳۔ خراج

خراج نقد یا پیداوار کی ایک معین مقدار کا نام ہے جو غیر مسلموں کی ان زمینوں سے لیا جاتا تھا کہ جن پر مسلمانوں کے مقابلہ کے بعد یا صرف صلح کے بعد تسلط قائم کیا تھا۔

خراجی زمین

خراجی زمینیں آٹھ ہیں۔

۱۔ وہ زمینیں جنھیں مجاہدین اسلام نے بزور اسلام فتح کیا اور پھر یہ زمینیں اس علاقہ کے ذمیوں کو کھیتی باڑی کے لیے بغرض خراج دے دی جائیں۔ مثلاً سواد عراق اور مصر۔

۲۔ وہ بے کار زمین جسے ذمی نے اسلامی ریاست کے سربراہ کی اجازت سے قابل کاشت بنایا ہو یا اس ذمی نے جہاد اسلامی میں لشکر کی مدد کی ہو اور امیر یا سربراہ نے زمین کا کوئی ٹکڑا بطور انعام دیا ہو۔

۳۔ ذمی کے گھر کے باغ کی زمین خواہ اسے عشری پانی سے سیراب کرے۔

[1] A short history of the saracens P 415

۴۔ اس کافر قوم کی زمین جس نے خراج پر مسلمانوں سے صلح کی ہو۔

۵۔ جو زمین خراجی پانی سے سیراب ہو۔

۶۔ جو زمین مسلمانوں نے ذمی یا کافر سے خریدی ہو۔

۷۔ وہ عشری زمین جو خراجی پانی سے سیراب ہو۔

۸۔ مسلمان کے گھر کے باغ کی زمین جسے خراجی پانی سے سینچا گیا ہو۔[1]

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں مفتوحہ زمینیں مجاہدین میں تقسیم کر دی جاتیں لیکن حضرت عمرؓ کے دور میں مصر اور عراق وغیرہ کے علاقے فتح ہوئے تو اس وقت پھر مجاہدین میں زمینوں کے تقسیم کا معاملہ اٹھا۔ حضرت عمرؓ اس حق میں تھے کہ زمینیں ریاست کی ملکیت ہوں اور سابقہ قابضین کو بے دخل نہیں کیا جائے گا۔ ان سے جو محاصل ہوں انھیں بیت المال میں جمع کیا جائے۔ انھوں نے یہ نکتہ قرآن کی سورۃ حشر کی آیت ۷۔۹ سے اخذ کیا۔ جس میں بیان کیا گیا ہے کہ "فے" کا تعلق غربا و فقراء سے ہے۔ جو مہاجرین میں سے ہیں۔ انصار میں سے اور ان کے لیے جو ان کے بعد آئیں گے۔

آپ نے "جو ان کے بعد آئیں گے" پر سب سے زیادہ زور دیا اس سے یہ اصول متعین ہوا کہ مفتوحہ زمینیں ریاست کی ملکیت ہوں۔

کرایہ کے تعین کے ضمن میں زمین کی نوعیت اقسام اور پیداوار کے تناسب سے درجہ بندی کی گئی۔ معقول کرایہ نقد رقم یا جنس کی شکل میں عائد کیا گیا۔ جس کی صورت میں یہ کسی حالت میں نصف پیداوار سے زیادہ نہ ہوئی۔ آپ نے جاگیرداری کا خاتمہ کر دیا۔

خراجی زمین کے متعلق حضرت عمرؓ کا ایک عظیم الشان اصلاحی کارنامہ

جب رومیوں نے شام و مصر کو فتح کیا تو ان کی اچھی زمینوں پر قبضہ کر لیا۔ ان کا ایک حصہ تو فوج کے کمانڈروں اور دوسرا عملے میں تھوڑا تھوڑا کر کے تقسیم کر دیا۔ دوسرے حصے کو ملکیت شاہی قرار دے دیا گیا۔ ایک حصہ گرجا کے لیے مخصوص ہوا۔ ان کے اصلی مالکان حقوق ملکیت سے بے دخل کر دیے گئے۔ انھیں صرف کاشتکار کی حیثیت سے رکھا گیا یا غلام بنا لیا گیا اور نئے قابضین کو ان کی جائیداد کا مالک بنا دیا گیا۔ انتہا یہ تھی کہ اگر نئے مالکان اپنی زمین بیچتے تو اس زمین کے ساتھ ساتھ کاشتکار بھی مشتری کو منتقل ہو جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے جب اس علاقہ پر قبضہ کیا تو آپ نے اس نظام کو ختم کر دیا۔ شاہی املاک اور زمین جو رومی افسروں کے قبضے میں تھیں انھیں دوبارہ اصلی مالکوں کی طرف لوٹا دیا گیا اور قانون نافذ کر دیا گیا کہ مسلمان کسی حالت میں غیر مسلم مالکوں سے ان زمینوں کو خرید بھی نہیں سکتے۔

---

[1] نور الدرایہ من عین البدایہ ج ۱ قسط ۱۵ ص ۲۴۔

وہ لوگ جو فوج کی پیش قدمی کے خوف سے اپنے گھروں سے بھاگ گئے تھے انھیں دعوت عام دی گئی کہ واپس آ جائیں اور اپنی زمینوں کو واپس لے لیں۔

۴۔ فئے

امام ابو یوسف کے نزدیک خراج دراصل فئے کی ہی ایک قسم ہے۔ وہ لکھتے ہیں فاما الفئی یا امیر المومنین فھو الخراج عندنا خراج الارض واللّٰہ اعلم اے امیرالمومنین ہمارے نزدیک مال فئی سے مراد زمین کا خراج ہے اللہ بہتر جانتا ہے۔ (کتاب الخراج ابو یوسف ص ۲)

کیونکہ اگر معمولی جنگ کے بعد کفار مغلوب ہو کر صلح کر لیں تو وہ مال فئے میں ہی شمار ہوتا ہے۔ تو گویا جب فتح کے بعد حکومت نے کفار کی زمینوں کو غنائم میں تقسیم کرنے کی بجائے ان پر ٹیکس مقرر کر کے ان ہی کے قبضہ میں رہنے دیا تو یہ ٹیکس فئے میں شمار ہوگا۔

خراج کی شرعی دلیل

ارشاد الٰہی ہے: مَاۤ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰى وَالْیَتٰمٰى وَالْمَسٰكِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ كَیْ لَا یَكُوْنَ دُوْلَةًۢ بَیْنَ الْاَغْنِیَآءِ مِنْكُمْ (الحشر ۵۹:۶) جو اللہ نے اپنے رسول کو بستیوں والوں سے مال غنیمت دلایا تو وہ اللہ کے لیے اور رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر (کے لیے) ہے تم میں سے دولت مندوں کے اندر نہ پھرتا رہے۔

خراج کی دوسری شرعی دلیل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل ہے آپ نے خیبر کا علاقہ فتح کرنے کے بعد وہاں کے باشندوں کو خراج مقاسمہ پر دیا تھا۔ ثُمَّ دَفَعَهَا رَسُوْلُ اللّٰهِ بِاَرْضِهَا وَنَخْلِهَا اِلٰی اَهْلِهَا مَقَاسَمَةً عَلٰی النصفِ مِمَّا یخرج من الثَّمَرِ وَالْحَبِّ وَوَلّٰی عَلَیْهِمْ فِی ذَالِکَ عَبْدَ اللّٰهِ بْنِ رَوَاحَة (فتوح البلدان البلاذری ابو الحسن ص ۳۴) پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر کی زمینیں اور کھجوریں ان کے مالکان کے پاس پھلوں اور غلہ کے نصف خراج پر انھیں دیں اور اس کی وصولی وغیرہ کے لیے عبداللہ بن رواحہ کو مقرر فرمایا۔

تیسری دلیل حضرت عمر کا عمل ہے جنھوں نے سواد عراق اور شام کی زمینیں ان کے اصل مالکان کے پاس خراج پر رہنے دیں (کتاب الخراج ص ۲۵)

حضرت عمر کے زمانے میں عراق کا خراج دس کروڑ بیس ہزار درہم شام کا ایک کروڑ چالیس لاکھ دینار اور مصر کا ایک کروڑ بیس لاکھ دینار تھا۔ (مقدمہ ابن خلدون جلد ا ص ۳۹۴)

خراج کی قسمیں

خراج بالمسامہ

خراج بالمسامہ سے مراد وہ ٹیکس ہے جو کھیتوں کی پیمائش کے لحاظ سے خراج مقرر کیا جائے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مبارک عہد سے لے کر عباسی خلیفہ مہدی کے زمانے تک خراج کی یہی قسم مروج تھی۔ مہدی نے بدل کر پیداوار کا ایک متعین حصہ یعنی ۱/۳، ۱/۴ خراج مقرر کر دیا۔ حضرت عمرؓ نے حضرت عثمانؓ بن حنیف کے ذریعہ عراق کی تمام زمین کی پیمائش کرائی۔ خراج بالمسامہ مقرر کیا۔ انگور کے باغات پر دس درہم، کھجور کے باغات پر آٹھ درہم، گیہوں کے کھیت پر چار درہم اور جو کے کھیت پر دو درہم وغیرہ۔ (کتاب الخراج ص ۳۶)

خراج مقاسمہ

خراج مقاسمہ پیداوار کے ایک متعین حصہ یعنی ۱/۳، ۱/۴ کو کہتے ہیں۔

خراج مقاسمہ مختلف قسم کی زمینوں پر مختلف ہوتا تھا۔ مثلاً

۱۔ چشموں اور بارش سے سیراب ہونے والی زمین کا خراج پیداوار ۱/۳۔

۲۔ ڈول اور رہٹ سے سیراب ہونے والی زمین سے پیداوار کا ۱/۳۔

۳۔ ضروری محنت اور اجرت سے زائد رہٹ کی مدد سے سیراب ہونے والی زمین سے پیداوار کا ۱/۴۔

خلیفہ ہارون الرشید کے دور میں اس شرح کو بدل دیا گیا۔ مختلف زمینوں پر مندرجہ ذیل مختلف شرحیں مقرر کیں۔

۱۔ چشموں سے سیراب ہونے والی گیہوں اور جو کی زمین کا محصول پیداوار ۲/۵۔

۲۔ رہٹ اور کنویں سے سیراب ہونے والی زمین کا محصول پیداوار ۱/۵ اور ۱/۱۰۔

۳۔ انگوروں کی بیلوں، پختہ کھجور اور باغات پر محصول پیداوار کا ۱/۳۔

۴۔ موسم گرما میں پیدا ہونے والے غلوں پر پیداوار کا ۱/۴۔

یہ شرحیں حتمی نہیں۔ حالات کے مطابق یہ شروح بدلی جا سکتی ہیں۔

نصاب

امام ابوحنیفہ کے نزدیک خراج کا کوئی نصاب نہیں۔ یہ عشر کی طرح قلیل و کثیر مقدار پر ہے۔ (کتاب الخراج ص ۵۲)

حضرت امام ابو یوسف کے نزدیک خراج بالکل عشر کی طرح اس پیداوار پر ہوگا جس کی مقدار یا قیمت پانچ وسق کے برابر ہو۔ (کتاب الخراج ص ۵۲)

۵۔ مال غنیمت

مال غنیمت ان تمام قابل انتقال چیزوں پر ہوتا ہے جو کفار سے لڑائی میں ہاتھ آتا ہے۔ مثلاً ہتھیار، گھوڑے اور دوسری چیزیں۔ مال غنیمت ۴/۵ تو ان مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ جو لڑائی میں حصہ لیتے تھے۔ ایک گھوڑا سوار پیدل سے دوگنا حصہ لیتا تھا جبکہ وہ مجاہد جو لڑائی میں کسی دشمن کو قتل کر دیتا تھا تو وہ اپنے حصہ کے علاوہ سیلاب (Salab) بھی پاتا تھا۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں طریقہ تھا۔ بقیہ ۱/۵ حصہ خدا اور اس کے رسول کے لیے ہوتا تھا۔ یا دوسرے الفاظ میں ریاست کا حق ہوتا تھا۔ جسے قرآنی ہدایت کے مطابق ضرورت مندوں، غریبوں، یتیموں، مسافروں، حضور کے رشتہ داروں پر فی سبیل اللہ اور معاشرہ کی بھلائی پر خرچ کیا جاتا تھا۔ جنگ میں ہاتھ آنے والے (جنگی قیدی) بچے جوان اور عورتیں بھی مال غنیمت میں شمار کی جاتی تھیں۔ ان کو ان شرائط پر سپاہیوں میں تقسیم کیا جاتا تھا کہ ان کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا جائے گا۔ کپڑے پہننے کے لیے دیئے جائیں گے۔ ان کی رہائی کے لیے ہر ممکن آسانی رکھی گئی تھی۔

۶۔ عشر

وہ محصول جو مسلمان کاشت کاروں سے وصول کیا جاتا تھا۔ اگر زمین کی سیرابی کے لیے پانی کی قدرتی فراہمی ہے تو دس فیصد ورنہ ۵ فیصد۔

۷۔ عشور

ایران اور روم کی حکومتیں مسلمان تاجروں سے ٹیکس وصول کرتی تھیں لیکن جب غیر مسلم تاجر اسلامی ریاست میں تجارت کی غرض سے آتے تو ان سے ٹیکس وصول نہیں کیا جاتا تھا۔ اس طرح اسلامی ریاست کے شہریوں کو تجارتی خسارہ تھا اور غیر مسلم خسارہ سے محفوظ تھے۔ اس سلسلہ میں حضرت ابو موسیٰ اشعری نے حضرت عمرؓ کو لکھا جب معاملہ آپ کو سمجھ میں آیا تو آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو ایک فرمان بھیجا جس کی کاپیاں تمام گورنروں کو ارسال کر دیں۔

خُذْ اَنْتَ مِنْهُمْ كَمَا يَاخُذُوْنَ مِنْ تُجَّارِ الْمُسْلِمِيْنَ وَخُذْ مِنْ اَهْلِ الذِّمَّةِ نِصْفَ عُشْرٍ وَمِنَ الْمُسْلِمِيْنَ مِنْ كُلِّ اَرْبَعِيْنَ دِرْهَمًا مَازَادَ بِحِسَابِهٖ (کتاب الخراج امام ابو یوسف ص ۱۳۵)

ان سے اتنا ہی وصول کیا جائے جتنا وہ مسلمان تاجروں سے وصول کرتے ہیں۔ اہل ذمہ سے نصف عشر لے لیجئے اور مسلمانوں سے ہر چالیس درہم پر ایک درہم وصول کریں اور جتنا اس پر زائد ہو اس سے اسی حساب سے وصول کیجئے۔

حضرت عمرؓ نے اس فرمان میں نہ صرف غیر مسلموں بلکہ جو مسلمان یا ذمی، دارالحرب اور دارالسلام کے درمیان تجارت کرتے ہیں۔ ان پر سب پر ٹیکس لگا دیا۔ البتہ یہ رعایت دی کہ جس تاجر نے سال میں ایک مرتبہ ٹیکس (عشور) وصول کرلیا جائے وہ اس کے بعد سال میں جتنی دفعہ آئے اس سے دوبارہ وصول نہ کیا جائے۔ پہلی دفعہ تاجروں کو سال بھر کے لیے رسید لکھ کر دے دی جاتی تھی۔ (کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۵۳۴۔ الموطا امام مالک باب الزکاۃ العروض)

۶۔ خمس

مال غنیمت اور رکاز (دفینے اور کانوں سے نکلے ہوئے سونے چاندی) سے نفع حاصل کرنے سے قبل ان سے پانچواں حصہ نکالنا ضروری ہے۔ یہ رقم سرکاری بیت المال میں جمع ہو گی۔

فقہائے اسلام کے مطابق مذکورہ آمدنیاں مال غنیمت کے تحت آتی ہیں۔ شریعت اسلامیہ کے مطابق ہر وہ مال، مال غنیمت ہے جو اچانک ہاتھ لگ جائے یا بغیر محنت کے مل جائے۔ قرآن مجید میں غنیمت کے ذکر میں اس حق (خمس) کا بھی تذکرہ کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاعْلَمُوْا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَیْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ لِلرَّسُوْلِ وَلِذِی الْقُرْبٰی وَالْیَتٰمٰی وَالْمَسٰکِیْنِ وَابْنِ السَّبِیْلِ (الانفال ۸:۴۱) اور جان لو کہ کوئی چیز تم فتح پا کر حاصل کرو تو اس کا پانچواں حصہ اللہ کے لیے ہے اور رسول کے لیے اور قریبیوں کے لیے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافروں کے لیے۔

اس طرح صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ اور بعض دوسری کتب حدیث کی ایک روایت کے مطابق رکاز (دفینے) کا بھی خمس ۱/۵ ہے۔ وَفِی الرِّکَازِ خُمُسٌ اور رکاز میں ۱/۵ حصہ لینا واجب ہے۔

اہل لغت کے ہاں رکاز دفینے پر بولا جاتا ہے لیکن حضرت امام ابویوسف نے ایک روایت میں رکاز کی یہ تقسیم کی ہے۔

فَقِیْلَ لَهٗ مَا الرِّکَازُ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ فَقَالَ الذَّهَبُ وَالْفِضَّةُ الَّذِیْ خَلَقَهُ اللّٰهُ فِی الْاَرْضِ یَوْمَ خُلِقَتْ (کتاب الخراج امام ابویوسف ص ۲۳)۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دریافت کیا گیا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رکاز کیا شے ہے۔ آپ نے فرمایا وہ سونا اور چاندی جو اللہ تعالیٰ نے خلقی طور پر زمین کے اندر ودیعت کر دیا ہے یعنی کانیں۔

۷۔ کراء الارض

اسلامی ریاست کا سربراہ جن سرکاری زمینوں پر سالانہ اجرت (لگان) مقرر کرے کاشت کے لیے دے دے اور ان سے جو محصول وصول ہوگا۔ اس کا نام کراء الارض ہے۔

یہ ایسی زمینیں ہوتی ہیں۔ جن سے نہ عشر لیا جاتا ہے۔ انھیں مقررہ اجرت سے کاشت کے

لیے دیا جاتا ہے یا یہ وہ زمینیں ہوتی ہیں جو لاوارث ہو کر بیت المال کے تحت آ جاتی ہیں۔ یا لشکر کشی کے بعد وقف للمسلمین بن کر اجیروں کو مقررہ اجرت پر دے دی جائیں۔ اسلامی فقہ کی اصطلاح میں ایسی زمینوں کو ارض المملکت یا ارض الحوزہ کہتے ہیں۔ (ردالمختار بن عابدین جلد ۳ باب العشر والخراج والجزیہ ص ۲۵۳) اسلامی مالیاتی نظام میں اس کا دوسرا نام الاقطاع بھی ہے۔

۸۔ وقف

وہ منقولہ یا غیر منقولہ مال ہے جو صاحب ثروت خدا کی رضا کے لیے اپنی جائیداد میں سے ایک حصہ فلاحی امور کے لیے ریاست کے حوالے کر دیتا ہے۔ ایسی جائیداد کو اسلام کے مالیاتی نظام میں وقف کہا جاتا ہے۔ اسلام کی رو سے وقف کرنے والے کو ۱/۳ سے زیادہ جائیداد کا حصہ وقف کرنے کی اجازت نہیں بعض فقہاء نے اس کی اصل اس قرآنی آیت کو قرار دیا ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (ال عمران ۹۲:۳) تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک (اللہ کی راہ میں) اس چیز کو خرچ نہ کرو جو تمھیں بہت عزیز ہے۔

تاریخ میں بے شمار مثالیں ہیں کہ صحابہ کرامؓ نے اس آیت کے اترنے کے بعد اپنی اپنی جائیدادیں ریاست کے لیے وقف کر دیں۔ سب سے پہلے حضرت عمرؓ نے اپنی اراضی خیبر کی جاگیر اللہ تعالیٰ کے نام پر وقف کر دی۔ اس کی آمدنی فقراء۔ اقرباء غلاموں کی آزادی اور کارہائے خیر مجاہدین مسافروں اور مہمانوں کے لیے وقف تھی۔ اس کے ساتھ یہ شرط عائد کر دی کہ اس زمین کو نہ خرید و فروخت کیا جائے نہ اس میں وراثت جاری ہو سکتی ہو اور نہ ہبہ کی جائے گی۔ اس کا نگران اس سے مناسب طور پر اپنا حق خدمت لے سکتا ہے اور ذخیرہ کیے بغیر اپنے دوست کو بھی مناسب طریقہ پر کھلا سکتا ہے۔ (بخاری ۱۹:۵۴ اور درالمختار ابن عابدین ج ۳ کتاب الوقف)

اسی طرح جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت طلحہؓ نے اپنا پیارا باغ بیرحاء اللہ کے راستہ میں وقف کر دیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے انھیں ہدایت فرمائی۔ اِجْعَلْهُ فِي فُقَرَاءِ قَوْمِكَ تم اسے اپنی قوم کے فقراء کے لیے وقف کر دو۔ (کتاب الاموال ابوعبیدہ ص ۵۶۱ بخاری کتاب الاموال ص ۵۶۱)

۹۔ ضرائب

ایسے ٹیکس جو حکومت ہنگامی حالات کے تحت لگاتی ہے۔ جنگ چھڑ گئی ہے حکومت کو روپیہ کی ضرورت ہے تو حکومت عوام پر حربی ٹیکس عائد کر دے گی۔ اسی طرح قحط سالی سے بے روزگاری ہے۔ تو اس قسم کی ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے حکومت جو ٹیکس عائد کرے گی وہ فقہی اصطلاح میں ضرائب ہو گا۔ قرآن مجید میں اس کی اصل یہ آیت ہے يَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ قُلِ الْعَفْوَ وہ تجھ سے سوال

کرتے ہیں کہ کیا خرچ کریں کہہ جو ضرورت سے بچ جائے۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔ ''بلاشبہ اللہ تعالیٰ نے دولت مندوں کے مال میں اس قدر حق فرض کر دیا ہے جس قدر کہ ان کے فقراء کو کفایت کر سکے۔ پس اگر فقراء بھوکے ہیں ننگے ہیں اور خستہ حال ہیں تو اس کا سبب یہی ہوتا ہے کہ اغنیاء اس فرض کی ادائیگی میں مانع ہیں۔ (محلی جلد ۶ ص ۱۵۶)

وَعَنْ اِبْنِ عُمَرَ اَنَّهٗ قَالَ فِی مَالِکَ حَقٌّ سِوَای الزَّکٰوة (محلی جلد ۶ ص ۱۵۸) حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ تیرے مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حقوق ہیں۔

۱۰۔ اموال فاضلہ

مذکورہ بالا آمدنی کے وسائل اور ذرائع کے علاوہ متفرق آمدنیاں بیت المال کی ملک قرار دی جائیں ان سب کو اموال فاضلہ کہا جاتا ہے۔

۱۱۔ قطائع کی آمدنی

اسلامی ریاست کے پاس کچھ ایسی زمینیں ہوتی ہیں مثلاً دریا سے کھلی ہوئی زمینیں، جنگل کاٹ کر یا صحرا آباد کر کے زمینیں تیار کی جائیں یا ایسی زمینیں جن کے مالکان کا پتہ نہیں۔ ایسی زمینیں حکومت بطور اقطاع مسلمانوں کو عطا کر دے۔ ان پر مقرر کردہ ٹیکس بیت المال میں جمع ہو گا۔

۱۲۔ سرکاری قرضے

حکومت اپنی مالیاتی پالیسی کو کامیاب بنانے کے لیے اندرون اور بیرون قرضے لیتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے یہ ثابت ہے کہ آپ نے عبداللہ بن ابی ربیعہ سے ۴۰ ہزار درہم کی رقم قرض لی۔ (سنن نسائی کتاب البیوع باب الاستقراض)

اموی خلیفہ عبدالملک کے عہد میں ان کے خراسان کے گورنر نے جنگی اخراجات کے لیے تاجروں سے بھاری رقم قرض پر لی۔ (طبری جلد ۲ ص ۱۰۲۲)

حضرت عمرؓ ثانی کے زمانے میں مصر کے گورنر نے ۲۵،۰۰۰ دینار قرض لیے تا کہ پنشن یافتہ لوگوں کو ادائیگی کر سکیں۔ (الواعظ والاعتبار مقریزی جلد ۱ ص ۸۷)

ولید بن عبدالملک نے مسجد نبوی کی تعمیر کے لیے ۹۸ھ میں بازنطنی حکمران سے رقم، سامان اور ماہرین کی مدد لی۔ (طبری جلد ۲ ص ۱۹۴)

اس حکمران نے ولید کی فرمائش پر ۱۰۰،۰۰۰ مثقال سونا ایک سو معمار اور ایک سو اونٹ سنگ مرمر سے لدے ہوئے بھیجے۔ (طبری ص ۱۱۹۴)

باب ہفتم

جہاد و تبلیغ

جہاد

جہاد کے لغوی معنی

لفظ جہاد جَہد یا جُہد سے مشتق ہے جَهَدَ یا جَاهَدَ کے معنی ہیں ایک شخص نے کوشش کی۔ محنت کی یا لیاقت خرچ کی۔ جَاهَدَ فِي الْأَمْرِ کے معنی ہیں اس نے خوب سعی کی۔ اپنی لیاقت اور طاقت سے پورا کام کیا۔ جہاداً حاصل مصدر ہے یعنی مشقت' محنت تکلیف' تھکان۔

جوہری اپنی صحاح میں لکھتا ہے: جَاهَدَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ مُجَاهَدَةً وَجِهَادًا اور نیز اِجْتَهَدَ اور جَاهَدَ کے معنی ہیں اس نے خوب زور لگایا اور جفاکشی کی۔

مصباح المنیر میں ہے: جَاهَدَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ جِهَادًا اور اِجْتَهَدَ فِي الْأَمْرِ کے معنی ہیں اس نے اللہ کی راہ میں اپنی طاقت اور کوشش سے پورا پورا کام کیا۔

امام راغب جہاد اور مجاہد کے معنی دشمن اور دفاع کے لیے طاقت خرچ کرنا لکھتا ہے پھر بیان کرتا ہے جہاد تین قسم پر مشتمل ہے۔ (۱) کھلے دشمن کے خلاف (۲) شیطان کے خلاف (۳) نفس کے خلاف۔

قرآن مجید میں جہاد اور اس کے مشتقات کے معنی

جہد یا جہاد اور اس کے مشتقات قرآن کی مکی اور مدنی سورتوں میں آئے ہیں۔

لفظ جہاد مکی سورتوں میں

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَإِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ (سورہ عنکبوت ۶۹)
اور جو لوگ ہمارے لیے کوشش کرتے ہیں ہم یقیناً انھیں اپنے راستوں کی ہدایت کریں گے اور اللہ نیکی کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

اس آیت میں جَاهَدُوا جو جہاد یا مجاہدہ سے مشتق ہے۔ اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لیے کوشش کرنے کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

وَجَاهِدُوا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ (سورۃ الحج ۲۲ آیت ۷۸) اور اللہ کی راہ میں کوشش کرو جو کوشش کا حق ہے۔ اس آیت میں بھی خدا کا قرب حاصل کرنے کے معنی میں لفظ جاھد و استعمال ہوا ہے۔

وَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا (سورۃ الفرقان ۲۵:۵۲) پس کافروں کی بات نہ مان اور اس قرآن کے ذریعہ ان کے ساتھ جہاد کر جو بڑا جہاد ہے اس آیت میں بہ کی ضمیر قرآن مجید کی طرف لوٹتی ہے۔

لفظ جہاد مدنی سورتوں میں

يٰۤاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ وَمَاْوٰهُمْ جَهَنَّمُ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ (سورۃ توبہ ۹ آیت ۷۳) اے نبی کافروں اور منافقوں سے جہاد کر اور ان کے مقابلہ میں شدت اختیار کر اور ان کا ٹھکانہ دوزخ ہے اور وہ بری جگہ ہے۔

اس آیت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کفار اور منافقین دونوں سے جہاد کا حکم دیا گیا ہے تاریخ اسلام اس امر پر شاہد ہے کہ منافقین کے ساتھ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کبھی لڑائی نہیں کی اس آیت میں کفار اور منافقین کے ساتھ جہاد کرنا انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے جس معنی میں یہ لفظ مکی سورتوں میں استعمال ہوا ہے۔ سورۃ بقرہ میں آتا ہے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَجَاهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (بقرہ آیت ۲۸) اس آیت میں لفظ جَاهَدُوْا جو جہد یا جہاد سے مشتق ہے جنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔

حدیث میں لفظ جہاد کا استعمال

حدیث میں بھی یہ لفظ صرف جنگ کے معنوں میں ہی استعمال نہیں ہوا بلکہ دوسرے معنوں میں بھی استعمال ہوا ہے مثلاً رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حج کو افضل جہاد قرار دیا ہے اَفْضَلُ الْجِهَادِ حَجٌّ مَبْرُوْرٌ. فرمایا بہترین جہاد حج مبرور ہے۔

حضرت امام بخاریؒ نے کتاب الجہاد والسیر کے عنوان کے تحت تبلیغ اسلام کے متعلق احادیث لائے ہیں مثلاً: دُعَاءُ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِلَى الْاِسْلَامِ وَالنُّبُوَّةِ وَاَنْ لَا يَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا اَرْبَابًا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (بخاری ۱۰۶) حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مشرکین کو اسلام کی دعوت دینا اور یہ کہ وہ اللہ کے سوائے کسی اور کو معبود نہ بنائیں۔

باب نمبر ۱۴۳ کا عنوان ہے: فَضْلُ مَنْ اَسْلَمَ عَلٰى يَدَيْهِ رَجُلٌ اس شخص کی فضیلت جس کے ہاتھ پر کوئی شخص مسلمان ہو۔

باب نمبر ۱۷۸ کا عنوان ہے: كَيْفَ يُعْرَضُ الْاِسْلَامُ عَلَى الصَّبِيِّ یعنی بچے کے سامنے

کس طرح اسلام پیش کیا جائے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امام بخاری کے زمانہ تک لفظ جہاد وسیع تر معنوں میں استعمال ہوتا رہا ہے۔

جہاد کا لفظ جنگ کا مترادف نہیں

مستشرقین جہاد کے معنی صرف کفار کے ساتھ جنگ کرنے کے لیے لیتے ہیں جیسا کہ جہاد کی لغوی بحث سے یہ واضح ہوتا ہے جہاد کا لفظ نہ قرآن میں نہ حدیث میں اور نہ لغت میں صرف جنگ کے معنی میں استعمال ہوا ہے بلکہ جنگ کے لیے عربی زبان میں حرب وقتال کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ عرب استعارہ اور تشبیہ کے طور پر یہ الفاظ (روع وفزع وخوف) شر (اصل معنی بدی کے ہیں) (دیکھو کتاب جہاد مولوی چراغدین) اہیاج برانگیختگی مغضبہ (غصہ ناراضی) لڑائی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں اسی طرح جنگ کو چکی سے بھی تشبیہ دی ہے اِذَا دَارَتْ رَحَی الْحَرْبِ الزَّبُوْنِ جب جنگ کی چکی چلتی ہے۔

اس سے مستشرقین کا اعتراض خود دور ہو جاتا ہے

مستشرقین کا جہاد کے لفظ کو جنگ کے معنی میں استعمال کرنے کا صرف ایک مقصد ہے وہ یہ کہ اسلام کی اشاعت بزور شمشیر ثابت کریں۔ چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں جہاد کے عنوان کے تحت لکھا ہے ''اسلام کی اشاعت بزور شمشیر عام طور پر مسلمانوں کا ایک مذہبی فریضہ ہے بالفاظ دیگر جہاد صرف جنگ ہی نہیں بلکہ اسلام پھیلانے کی غرض سے تلوار اٹھانے کا نام ہے۔

کلین نے ریلجن آف اسلام میں لکھا ہے۔

> ''جہاد یعنی منکرین اسلام کے خلاف اس مقصد کے لیے جنگ کرنا یا تو انھیں اسلام کے اندر جذب کر لیا جائے یا اگر وہ قبول اسلام سے انکار کریں تو انھیں مطیع و منقاد بنا لیا جائے اور..... ان کی بیخ کنی کر دی جائے اور یہ کہ اسلام کی اشاعت اور اس کو تمام مذاہب پر غالب کرنا مسلمان قوم کا ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔''

اسلام نے کب جنگ کرنے کی اجازت دی

اسلام صرف مدافعت دین اور حفاظت خود اختیاری کے لیے لڑائی کی اجازت دیتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقَاتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ نِ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْ لَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ

لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوَاتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهُ (الحج ۲۲:۴۰) ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے۔ جن سے لڑائی کی جاتی ہے اس لیے کہ ان پر ظلم کیا گیا اور اللہ یقیناً ان کی مدد پر قادر ہے اور وہ اپنے گھروں سے ناحق نکالے گئے۔ صرف اس وجہ سے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر اللہ لوگوں کی ایک دوسرے کے ذریعہ مدافعت نہ کرتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت ذکر کیا جاتا ہے گرا دی جاتیں۔

یہ آیات اس امر پر بین ثبوت ہیں کہ مسلمانوں کی جنگیں دفاعی تھیں اور ان کو اس وقت اجازت دی گئی جب ان کی بقا اور زندگی خطرے میں تھی۔ کفار مسلمانوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے۔ مکہ میں کفار کا ظلم و ستم انفرادی طور پر تھا۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے پر ظلم و ستم کے پہاڑ ڈھائے جاتے تھے لیکن جب مسلمان مدینہ میں ہجرت کر کے آ گئے تو کفار نے لشکر کشی کے ذریعہ اسلام کو مٹا دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس صورت میں بین الاقوامی قانون بھی یہی تقاضا کرتا ہے کہ اپنی قومی بقا کے لیے لڑائی لڑی جائے۔

آیت ۴۰ اسلامی جنگوں کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتی ہے کہ اسلامی جنگیں صرف مسلمانوں کی اپنی مذہبی آزادی کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب کی آزادی کے لیے تھیں۔ جنگوں کی غرض تمام مذہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت ہے عبادت گاہوں کی حفاظت مذہبی تحفظ پر دلالت کرتی ہے۔

اس آیت میں قیام امن کا نہایت ہی سنہری اصول بیان کیا ہے کہ اگر دنیا کے کسی حصے میں کسی مذہب کے ماننے والوں اور ان کی عبادت گاہوں کو دشمن کی طرف سے خطرہ لاحق ہو تو مسلمانوں پر ان کی مدد کرنا فرض ہو جاتا ہے۔

مستشرقین کی سمجھ اور ادراک پر افسوس ہے کہ وہ جنگیں جو قیام امن اور مذہبی آزادی کو برقرار رکھنے کے لیے لڑی گئی تھیں ان کو وہ بے رحمی اور ظلم کی جنگوں کا نام دیتے ہیں۔

سورۃ بقرہ میں آتا ہے۔ وَلَا يَزَالُوْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا (بقرہ آیت ۲۱۷) اور وہ ہمیشہ تم سے جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ وہ تمھیں تمھارے دین سے لوٹا دیں اگر انھیں طاقت ہو۔

یہ آیت اس کی طرف اشارہ کرتی ہے کہ کافر مسلمانوں سے اس لیے جنگ لڑتے تھے کہ ان کو دین اسلام سے ہٹا دیں۔ یہ آیت مستشرقین کے اس اعتراض کی بیخ کنی کرتی ہے کہ مسلمانوں نے کفار کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کے لیے جنگیں نہیں کیں۔

پھر قرآن مجید میں ارشاد ہے۔ وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ

اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ (بقرہ) اور اللہ کے راستے میں جنگ کرو۔ ان لوگوں سے جو تم سے جنگ کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھنا بے شک اللہ تعالیٰ حد سے بڑھنے والوں کو ناپسند کرتا ہے۔ اس آیت میں واضح طور پر اسلامی جنگ کا اصول بیان کیا ہے کہ جنگ صرف انہی لوگوں سے جائز ہے جو مسلمانوں کی قومی زندگی کو ختم کرنے کے لیے ہتھیار اٹھائیں۔ اس کے ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ بھی اخلاقی تعلیم دی ہے کہ جنگ میں زیادتی نہ کی جائے۔

جنگ کا دوسرا داعیہ

اسلام نے ان لوگوں سے جنگ کرنے کی اجازت دی ہے جو نقض عہد کرتے ہیں یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ نقض عہد خرمن امن کو بھسم کر دیتا ہے اور اس وقت تک امن قائم نہیں ہو سکتا۔ جب تک معاہدات کی پابندی نہ کی جائے۔ اسلام نے معاہدات کی پابندی پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاَوْفُوْا بِعَهْدِ اللّٰهِ اِذَا عَاهَدْتُّمْ وَلَا تَنْقُضُوا الْاَيْمَانَ بَعْدَ تَوْكِيْدِهَا. جب تم معاہدہ کرو تو اللہ کے عہد کو پورا کرو اور قسموں کو پختہ کرنے کے بعد انہیں نہ توڑو۔ اس آیت کے بعد معاہدہ توڑنے والوں کی مثال ایک بے وقوف عورت سے دی ہے جو سوت کاتتی ہے پھر کاتنے کے بعد تار تار کر دیتی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّتِيْ نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْۢ بَعْدِ قُوَّةٍ اَنْكَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَيْمَانَكُمْ دَخَلًا بَيْنَكُمْ اَنْ تَكُوْنَ اُمَّةٌ هِيَ اَرْبٰى مِنْ اُمَّةٍ اے معاہدہ توڑنے والو تم اس عورت کی طرح نہ بن جاؤ جو اپنے سوت کو کاتنے کے بعد تار تار کر دیتی ہے تم اپنی قسموں کو آپس میں مکر و فریب کا ذریعہ نہ بناؤ تا کہ ایک قوم دوسری قوم سے نفع میں بڑھ جائے۔

اسلام نے صرف اس قوم سے لڑنے کی اجازت دی ہے جو معاہدات کے کرنے کے بعد بار بار توڑتی ہے اور مسلمانوں کی بقاء کے لیے خطرہ کا موجب بنتی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَلَّذِيْنَ عَاهَدْتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَهُمْ فِيْ كُلِّ مَرَّةٍ وَّهُمْ لَا يَتَّقُوْنَ. (۵۶:۸) وہ جن سے تو عہد کرتا ہے پھر وہ اپنا عہد ہر بار توڑ دیتے ہیں وہ عہد کے توڑنے کے جرم سے نہیں بچتے۔

فَاِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِمْ مَّنْ خَلْفَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ (۵۷:۸) سو اگر تو ان کو جنگ میں پائے تو ان کو عبرت ناک سزا دے کر منتشر کر دے تا کہ ان کی آنے والی نسلیں نصیحت حاصل کریں۔

اس کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتا ہے۔ اِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْۢبِذْ اِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاۗءٍ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَاۗىِٕنِيْنَ (۵۸:۸) اگر تجھے کسی قوم کی بدعہدی کا خوف ہو تو ان کا عہد برابری کو لحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے اللہ عہد میں خیانت کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اسلام بدعہد قوم کے ساتھ بھی خیانت کی اجازت نہیں دیتا بلکہ یہ حکم دیتا ہے کہ معاہدہ قوم کی بدعہدی کا علم ہو جانے کے بعد ان کو برابر کا موقعہ دے کر معاہدہ سے دست برداری اختیار کر لی جائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور آپ کے صحابہ کفار کی اذیتوں کی وجہ سے مکہ سے مدینہ ہجرت کر آئے تو آپ نے مدینہ میں یہود سے بھی معاہدے کیے اور گرد و نواح کے قبائل سے بھی معاہدے کیے تاکہ ہر گروہ امن کے ساتھ زندگی بسر کر سکے۔

تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ یہود نے اپنے معاہدات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مدینہ پر حملہ آوروں کا ساتھ دیا اور مسلمانوں کے لیے وہ مارِ آستین ثابت ہوئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کی بدعہدی کی وجہ سے ان کو مدینہ سے جلاوطن کر دیا مسلمانوں کا بدعہد یہود سے مقابلہ کرنا اس وجہ سے نہیں تھا کہ ان کو دائرہ اسلام میں داخل کیا جائے بلکہ یہ مقابلہ ان کی بدعہدی کی وجہ سے تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مکہ پر حملہ اس وجہ سے کیا تھا کہ انھوں نے صلح حدیبیہ کی شرط کی خلاف ورزی کی تھی۔ صلح حدیبیہ کی شرائط کے مطابق بنوخزاعہ مسلمانوں کے حلیف بن گئے اور بنوبکر قریش کے۔ بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کر دیا۔ قریش نے ان کی مدد کی بنوخزاعہ اپنی مظلومیت کی داستان لے کر بارگاہ رسالت میں پہنچے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک قاصد قریش کے پاس تین شرائط کے ساتھ بھیجا یا تو خون بہا دے دیں یا بنوبکر کی حمایت سے دستبردار ہو جائیں۔ یا یہ اعلان کر دیں کہ معاہدہ حدیبیہ ٹوٹ گیا ہے۔ قریش نے تیسری شرط منظور کر لی۔

اب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر بنوخزاعہ کے ساتھ معاہدہ ہونے کی وجہ سے یہ فرض تھا کہ وہ ان کی مدد کرتے تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس ہزار قدسیوں کے ساتھ مکہ پر حملہ آور ہوئے۔

کیا دنیا کا کوئی قانون اس حملہ کو جارحانہ حملہ کہہ سکتا ہے یا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ حملہ اس وجہ سے ہوا تھا کہ قریش کو دائرہ اسلام میں داخل کیا جائے۔

اسی طرح مشرکین عرب کے ساتھ اسلام کی مٹھ بھیڑ کی وجہ بھی نقض عہد تھا۔ مشرکین عرب جب موقع پاتے معاہدات کو پس پشت ڈال کر اسلام کی بیخ کنی کی کوشش کرتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قیصر روم کے حملہ کو روکنے کے لیے عرب کی شمالی سرحد تبوک پر گئے تھے تو مشرکین نے اس نازک موقعہ پر تمام معاہدات کو پس پشت پھینک دیا اور اسلام کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے آمادہ ہو گئے۔ ہرقل کی فوجیں بعض وجوہات کی بنا پر میدان جنگ میں نہ آئیں اور مسلمان بغیر لڑائی لڑے واپس آ گئے مشرکین اپنے منصوبے کو عملی جامہ نہ پہنا سکے۔

اس قسم کی غداریوں کی روک تھام کرنا ہر حکومت کا فرض ہے اس روک تھام کے لیے اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان فرمایا ہے: فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ (توبہ ۹:۵) پھر جب حرمت والے مہینے گزر جائیں تو ان مشرکوں کو جہاں پاؤ قتل کر دو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے حج کے دن ان مشرکین سے اعلان جنگ کیا اور حرمت والے چار ماہ کا نوٹس دیا تاکہ وہ لڑائی کی تیاری کر لیں۔ کیونکہ مشرکین معاہدات کو بار بار توڑنے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہے تھے کہ ان کو اس طرح کھلا چھوڑ دیا جائے۔ ان کو کھلا چھوڑنے کی وجہ سے امن میں خلل آتا تھا۔ اب صرف ایک ہی صورت باقی رہ گئی تھی کہ وہ مطیع ہو کر اسلامی حکومت کے تحت زندگی بسر کریں تاکہ ملک کا امن برقرار رہ سکے۔ اب کون سا بین الاقوامی قانون ہے جو اس قسم کی جنگ کو ناجائز قرار دے سکتا ہے اس قسم کی جنگیں قیام امن کے لیے ضروری ہیں۔ اگر یہ جنگیں نہ لڑی جائیں تو دنیا سے امن ہی اٹھ جائے جن قبائل نے معاہدات کی خلاف ورزی نہیں کی ان کو اعلان جنگ سے مستثنیٰ قرار دیا ہے: اِلَّا الَّذِيْنَ عَاهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْئًا وَّلَمْ يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ۔ (توبہ ۹:۴) مگر جب مشرکوں کے ساتھ تم نے عہد کیا۔ پھر انھوں نے تمھارے ساتھ کوئی کمی نہیں کی نہ تمھارے خلاف کسی کی مدد کی تو ان کے ساتھ ان کا عہد ان کی مدت تک پورا کرو اللہ تقویٰ اختیار کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

یہ آیات ظاہر کرتی ہیں کہ مشرکین کے ساتھ جنگ کی وجہ صرف عہد شکنی ہے نہ کہ کفر اور شرک۔ اگر جنگ کی وجہ صرف کفر اور شرک ہوتا تو کسی مشرک کو بھی اعلان جنگ سے مستثنیٰ قرار نہ دیا جاتا۔ پھر اس کے آگے صرف نقض عہد کو وجہ جنگ بیان کرتے ہوئے فرمایا: اَلَا تُقَاتِلُوْنَ قَوْمًا نَّكَثُوْا اَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوْا بِاِخْرَاجِ الرَّسُوْلِ وَهُمْ بَدَءُوْكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ (توبہ ۹:۱۳) تم ان لوگوں سے کیوں جنگ نہیں کرتے جنھوں نے اپنی قسموں کو توڑا اور رسول کے نکالنے کا قصد کیا اور انھوں نے پہلے تمھارے ساتھ ابتداء کی۔

تیسرا داعیہ

احترام انسانیت اور مظلوموں کی دست گیری

اسلام نے نہ صرف ظلم کرنے سے روکا ہے بلکہ مظلوم کی حمایت اور ظالم کو ظلم سے روکنے کی تعلیم بھی دی ہے۔ جب دنیا سے ظلم کا قلع قمع نہ کیا جائے تو دنیا میں نہ تو انسانیت کا احترام باقی رہ سکتا ہے اور نہ امن کا شجر ہرا رہ سکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد ہے۔ عَنْ اَبِيْ بَكْرٍ قَالَ اِنِّيْ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُوْلُ اِنَّ النَّاسَ اِذَا رَاَوُا الظَّالِمَ فَلَمْ يَاْخُذُوْا عَلٰى

یدیہ اوشک ان یعمھم اللہ بعقاب منہ (اخرجہ الترمذی) حضرت ابوبکرؓ سے روایت ہے فرمایا کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے ہوئے سنا۔ جب لوگ ظالم کو دیکھیں اور اس کو ظلم سے باز رکھنے کی کوشش نہ کریں تو اللہ سب کو عذاب میں مبتلا کر دے گا۔

یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ ظلم کا سدباب کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ قرآن مجید نے مظلومین کی حمایت میں جنگ کرنا لازمی قرار دیا ہے ارشاد ہے: وَمَالَكُمْ لَاتُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا۔ (سورۃ النساء ۴ آیت ۷۵) تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں جنگ نہیں کرتے اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی دوست بنا اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی مددگار اور معاون بنا۔

اس آیت میں اسلامی جنگ کا کتنا بلند اور مقدس مقصد بیان کیا ہے کہ دنیا کے کسی خطہ میں مردوں اور عورتوں کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہو۔ خواہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ مسلمانوں کا یہ مذہبی فریضہ ہے کہ ان مظلوم انسانوں کو درندگی اور بہیمیت کے چنگل سے نجات دلائیں۔

چوتھا داعیہ

اسلام حریت انسانی کا جاں فزا پیغام لے کر آیا ہے۔ اسلامی نقطہ نگاہ سے طاقت ور حکومت کمزور حکومت پر زبردستی قبضہ حاصل کرنے کی مجاز نہیں دنیا کے نقض امن کا سبب یہی طاقتور حکومتیں ہوتی ہیں جو ملک گیری کی ہوس کو پورا کرنے کے لیے کمزور ملکوں پر چڑھائی کر دیتی ہیں اور زمین کو معصوم اور بے گناہ لوگوں کے خون سے رنگ دیتی ہیں۔ قرآن مجید نے اس قسم کی فتنہ سازی اور استعماریت کے خلاف جنگ کرنے کی تعلیم دی ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَاتَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ (بقرہ ۱۹۳) تم ان سے لڑتے رہو جہاں تک فتنہ باقی نہ رہے اور دین اللہ کے لیے ہو جائے پھر اگر وہ باز آ جائیں تو ظالموں پر دست درازی سے رک جاؤ۔

اسی مضمون کو دوسری جگہ ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے: لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا (الحج ۲۲:۴۰) اگر اللہ لوگوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ کے ذریعہ نہ ہٹاتا تو یقیناً راہبوں کی کوٹھڑیاں اور گرجے اور عبادت گاہیں اور مسجدیں جن میں اللہ کا نام بہت لیا جاتا ہے۔ گرا دی جائیں۔

اس آیت میں اسلامی جنگوں کا مقصد زمین سے فساد کی بیخ کنی اور امن کا قیام بیان کیا ہے۔

اگر دنیا کی تمام حکومتیں اسلام کے اس سنہری اصول پر عمل کر کے باغی اور استعمار پسند حکومت کے خلاف اٹھ کھڑی ہوں تو امن و سلامتی تمام دنیا کو اپنے دامن میں لے لے گی۔

قواعد جنگ

اسلام نے اصولی طور پر جنگ کے قواعد قرآن مجید میں بیان کر دیے ہیں۔ پہلا قاعدہ قتل ہے دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ جب فوج یا اس کا ایک حصہ محاصرہ میں آ جائے اور ہتھیار ڈال دے تو ان کو قید کر لینا چاہیے۔ تیسرا قاعدہ یہ بیان کیا ہے کہ جنگ کے زمانہ میں دشمن ملک کے آدمیوں کو اپنے ملک میں آنے سے روکنا چاہیے کیونکہ بے شمار فوجی راز ہوتے ہیں جن کے انکشاف سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے۔

ان تین قواعد کو حسب ذیل آیات میں بیان کیا گیا ہے: فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِينَ حَيْثُ وَجَدْتُمُوهُمْ پس تم مشرکین کو قتل کرو جہاں کہیں بھی تم ان کو پاؤ یہاں ان مشرکین کا ذکر ہے جو برسر پیکار ہوں اور میدان جنگ میں اترے ہوئے ہوں۔ معاہد مشرکین اور لڑائی میں حصہ نہ لینے والے مشرکین اس قاعدہ سے مستثنیٰ ہیں۔

وَاقْعُدُوا لَهُمْ كُلَّ مَرْصَدٍ. یعنی دشمن کے لیے گھات میں بیٹھے رہو ان الفاظ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ جنگ کے موقعہ پر ان تمام راستوں کو بند کر دینا چاہیے اور پہرے بٹھا دینے چاہئیں۔ جہاں سے دشمن ملک کے اندر آ سکتا ہو اس طرح دشمن کی فوج کی پیش قدمی روکنے کے لیے تمام اہم جگہوں پر فوج متعین کر دینی چاہیے۔ اگر وہاں سے دشمن فوج آگے بڑھے تو اس پر حملہ کر دیا جائے۔

صلح

اسلام صلح کو جنگ پر ترجیح دیتا ہے۔ اگر دشمن صلح کی طرف مائل ہوں تو فوراً صلح کا ہاتھ بڑھا دینا چاہیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ (الانفال ۶۱) اگر وہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ اور اللہ پر بھروسہ رکھو درحقیقت وہ خوب سننے والا اور جاننے والا ہے۔

اسلامی جنگوں کی اخلاقی قدریں

اگر دنیا کی مہذب سے مہذب قوم کی جنگوں کے حالات پڑھیں تو وہاں بھی بربریت و بہیمیت ظلم و ستم، غصب و نہب کے خونچکاں واقعات نظر سے گزریں گے۔ جن کو پڑھ کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

اسلام ایک دین رحمت ہے۔ جس کی رحمت کے سائے زندگی کے ہر شعبہ پر چھائے ہوئے

ہیں۔ ہر قوم کی زندگی میں لڑائی ناگزیر ہے۔ اسلام نے لڑائی کے لیے بھی ضابطہ اخلاق مقرر دیا ہے۔

جیسا کہ مبحث گذشتہ میں بیان ہو چکا ہے کہ اسلامی جنگیں مدافعت، حفاظت خود اختیاری مذہبی آزادی حمایت مظلومین اور استعمار اور فتنہ کی بیخ کنی کے لیے لڑی گئی تھیں یہ جنگیں بنی نوع انسان کے لیے سراسر رحمت تھیں اور وہ اخلاقی قوانین کے تابع لڑی گئی تھیں اگر کوئی مجاہد اخلاقی قیود کو توڑتا تو وہ قابل مواخذہ ہوتا تھا۔

اسلام میں جنگ کے متعلق احکام

جنگ کے اسلامی احکام بیان کرنے سے قبل اہل عرب کے تصور جنگ اور وحشت کاریوں کا ذکر کرنا ضروری ہے تاکہ قاری اسلامی جنگوں کی برکت اور رحمت آسانی سے سمجھ سکے۔ عربوں کا تصور جنگ ان مجموعہ الفاظ سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے۔ جو ان کے لٹریچر میں استعمال ہوا ہے جس کا ذکر مستشرقین کے اعتراض کے جواب میں ذکر کیا گیا ہے ان الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک جنگ غصب و نہب تباہی و بربادی غارت گری کا دوسرا نام ہے کبھی انھوں نے لڑائی نیک مقصد کے لیے نہیں لڑی۔ ان کا مقصد لوٹ مار جذبہ تفاخر کا اظہار جذبہ انتقام کو ٹھنڈا کرنا ہوتا تھا۔ جب عربوں کا تصور جنگ اور مقصد اتنا گھٹیا قسم کا تھا تو ان کی جنگوں میں انسانیت کی مٹی کیوں نہ پلید ہوتی ہوگی۔ ذیل میں عربوں کی جنگ کے وحشیانہ طریقے اور انسانیت سوز افعال کا ذکر کیا جاتا ہے تاکہ اسلام کا نظریہ جہاد قاری کے سامنے نکھر کر آ جائے اور معلوم ہو جائے کہ اسلامی مسلح جہاد بنی نوع انسان کے لیے کون سا رحمت کا پیغام لایا ہے اور اسلام نے طریقہ جنگ میں کیا کیا اصلاحات کی ہیں۔

جنگ کے انسانیت سوز طریقے

ا۔ عرب دشمن کے لیے قسی القلب تھے۔ وہ دشمن کو زندہ آگ میں پھینک دینے میں تامل نہ کرتے تھے۔ عرب کی تاریخ کا مشہور واقعہ ہے کہ جب منذر بن امرء القیس نے جنگ میں بنی شیبان پر فتح حاصل کر لی تو ان کی مستورات کو زندہ آگ میں پھینک دیا۔

عمرو بن ہند کے بھائی نے بنو تمیم پر حملہ کر دیا سو وہ لوگ بھاگ گئے۔ صرف ایک عورت باقی بچی اس کو گرفتار کر کے آگ کے الاؤ میں پھینک دیا دور سے عمار نامی شخص نے آگ کا دھواں دیکھا۔ اس طرف کا رخ کیا شائد کھانے کو مل جائے عمرو نے آنے کی وجہ پوچھی اس نے جواب دیا۔ میں کئی دن سے بھوکا تھا۔ دھوئیں کو دیکھ کر آیا ہوں شائد کھانا مل جائے۔ اس سنگ دل عمرو نے حکم دیا کہ اس کو بھی آگ میں پھینک دیا جائے چنانچہ اس کو آگ میں پھینک دیا گیا۔

۲۔ حملہ آور قبیلہ جب مغلوب قبیلہ کے مرد اور عورتیں اور بچے پنجہ اسیری میں لے لیتا تو ان سے ہر قسم کا ناروا سلوک کرتا۔ قتل کرائے جاتے آگ کے الاؤ میں پھینک دیے جاتے۔ پہاڑ کی چوٹیوں سے نیچے گرا کر آتش غضب کو بجھایا جاتا۔ منذر بن امرؤ القیس نے بنی شیبان کے جتنے قیدی پکڑے ان سب کو پہاڑ کی چوٹی پر قتل کر دیا۔

احادیث میں عکل اور عرینہ کا واقعہ مذکور ہے کہ یہ لوگ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چرواہوں کو پکڑ کر لے گئے ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ دیے ان کی آنکھوں میں گرم سلایاں پھیریں اور انھیں تپتی ہوئی ریت پر پھینک دیا یہاں تک وہ تکلیف اور پیاس سے مر گئے۔

امرء القیس کے باپ حجر بن حارث نے بنی اسد پر حملہ کیا ان کے جتنے آدمی پنجہ اسیری میں آئے ان سب کو ڈنڈوں کی ضربات سے مار دیا۔

۳۔ عرب اپنے جوش غضب کو معصوم بچوں کے خون سے ٹھنڈا کرنے سے نہیں چوکتے تھے داحس اور غبراء کی لڑائیوں میں قیس نے بنو ذبیان کے پاس اپنے بچے بطور ضمانت رکھے تھے۔ حذیفہ رئیس ذبیان ان بچوں کو ایک وادی میں لے جاتا ان کو تیروں کا نشانہ بناتا تھا۔ اس کے قبیلہ کے لوگ اس انسانیت کے سوز نظارے کو دیکھ کر خوش ہوتے۔

۴۔ عرب لوگ اتنے بے رحم اور سنگ دل تھے کہ جب اپنے حریف کو مار دینے سے بھی ان کی آتش غضب ٹھنڈی نہ ہوتی تو وہ لاشوں کا مثلہ کرتے پھڑکتے ہوئے اعضاء کا ہار بنا کر گلے میں پہنتے چنانچہ جنگ احد کا مشہور واقعہ ہے کہ حضرت ابوسفیانؓ کی بیوی ہندہ نے سیدالشہداء حضرت حمزہؓ کی لاش کا مثلہ کیا پھر ان کا کلیجہ چبا کر اپنی آتش غضب کو ٹھنڈا کیا۔

۵۔ عربوں کا کینہ اس قدر سخت ہوتا تھا کہ اپنے دشمن کے متعلق منت مانتے کہ اس کو قتل کر کے اس کی کھوپری میں شراب پئیں گے۔ جنگ احد میں عاصمؓ بن ثابت نے مسافع بن طلحہ اور حلاس بن طلحہ کو قتل کیا۔ ان کی والدہ سلافہ نے قسم کھائی کہ وہ عاصم کی کھوپڑی میں شراب پیے گی۔

۶۔ عربوں کا دائرہ ظلم صرف مقاتلین تک ہی محدود نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کے ظلم وستم کے آہنی پنجہ سے غیر مقاتلین بھی نہیں بچ سکتے تھے۔ معصوم بچوں کے خون سے زمین رنگ دی جاتی۔ حاملہ عورتوں کے پیٹوں کو چاک کر دیا جاتا۔ بوڑھوں اور راہبوں کو قتل کر دیا جاتا۔

۷۔ عربوں کی یہ عادت تھی کہ وہ ہمیشہ دشمن پر غفلت کی حالت میں حملہ کرتے تھے تاکہ وہ آسانی سے قابو پا سکیں اور ان کے خون سے آتش انتقام کو ٹھنڈا کر سکیں۔ عربوں کی اصطلاح میں غفلت میں حملہ کرنے کو فتک اور حملہ کرنے والے کو فتاک کہتے ہیں۔ تابط شر،

سلیک اور حارثہ بن ظالم مشہور فتاک گزرے ہیں۔

۸۔ اپنے ذاتی اغراض کے سامنے معاہدات کو کوئی حیثیت نہ دیتے تھے۔ جب بھی انتقام لینے کا موقعہ پاتے تو تمام معاہدات کو ردی کی ٹوکری میں پھینک دیتے اور حملہ کر دیتے۔ بدعہدی کی مثالیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد میں کثرت سے ملتی ہیں۔ آپ نے یہود سے معاہدات کیے انھوں نے ہر بار معاہدہ توڑ دیا اور مسلمانوں کے خلاف کفار سے مل کر ریشہ دوانیاں شروع کر دیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حدیبیہ کے مقام پر قریش سے معاہدہ کیا انھوں نے اس کا کوئی پاس اور لحاظ نہ کیا۔ مسلمانوں کے حلیف بنوخزاعہ کے خلاف بنوبکر کی مدد کی۔

اسلام کی جنگی اصلاحات

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو دنیا کے لیے رحمت بن کر آئے تھے جنگ کی ان تمام قبیح اور انسانیت سوز رسومات کو پاؤں تلے روند دیا اور ایک جنگی ضابطہ اخلاق دیا۔

پہلی اصلاح

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے عرب کی جنگ کا مقصد ہی غصب ونہب، قتل و غارت تھا۔ سب سے پہلے اسلام نے مقصد جنگ کی تطہیر کی۔ اسلام نے مسلمانوں کے سامنے جنگ کا مقصد یہ پیش کیا کہ خدا پرستی کو فروغ ہو مظلوم کی دست گیری ہو۔ انسانیت کا احترام قائم ہو۔ فتنہ کی بیخ کنی ہو۔ جارحیت ختم ہو۔ اب جب ایک مجاہد ان مقاصد کو سامنے رکھ کر میدانِ جنگ میں جائے گا تو وہ لازمی طور پر وہ ان تمام افعال سے اجتناب کرے گا جو انسانیت سوز اور موجب فساد ہیں۔

دوسری اصلاح

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غیر مقاتلین کو قتل کرنے کی ممانعت فرمائی ابو داؤد میں حضرت انسؓ کی روایت ہے: اِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ وَسَلَّمَ قَالَ انْطَلِقُوا بِاسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ وَ عَلٰی مِلَّۃِ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ لَا تَقْتُلُوْا شَیْخًا فَانِیًا وَلَا طِفْلًا صَغِیْرًا وَلَا اِمْرَاۃً وَلَا تَغُلُّوْا وَضُمُّوْا غَنَائِمَکُمْ وَاَصْلِحُوْا وَ اَحْسِنُوْا اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُحْسِنِیْنَ۔ کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فوج کو روانہ کرتے وقت فرمایا اللہ کا نام لے کر اللہ کی مدد سے اور اللہ کے رسول کی ملت پر قائم رہتے ہوئے چل پڑو۔ کسی بوڑھے ضعیف چھوٹے بچے اور عورت کو قتل نہ کرنا۔ مال غنیمت میں سے چوری نہ کرنا۔ جنگ میں جو کچھ ہاتھ آئے ایک جگہ جمع کرنا۔ صلح کی روش اختیار کرنا احسان کرنا کیونکہ اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔

مسلم بخاری اور ترمذی میں عبداللہؓ بن عمر سے روایت ہے ایک دفعہ جنگ میں ایک عورت کی لاش پڑی ہوئی دیکھی تو آپ نے عورتوں اور بچیوں کو قتل کرنے سے منع فرمایا۔

حضرت ابو ایوب فرماتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں مقابلہ میں اجیروں اور غلاموں اور لونڈیوں کے قتل کرنے سے منع فرمایا۔ (مسند احمد)

اسی طرح ابن عباس کی روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا تَغْدِرُوْا وَتغلُوْا وَلَا تَمَثَّلُوا وَلَا تَقتُلُوا الْوِلْدَانَ وَلَا اَصْحَابَ الصَّوَامِعِ (مسند احمد) یعنی بدعہدی نہ کرو۔ مال غنیمت میں سے خیانت نہ کرو۔ مثلہ نہ کرو بچوں اور خانقاہ نشینوں کو قتل نہ کرو۔

اسلام نے جنگ میں مقاتلین کے متعلق ذیل کی نصیحتیں فرمائیں۔

۱۔ زخمی پر حملہ نہ کیا جائے۔ بھاگنے والے کا تعاقب نہ کیا جائے۔ قیدی کو قتل نہ کیا جائے جو اپنے گھر کا دروازہ بند کر لے وہ امان میں ہے (فتوح البلدان لبلاذری صفحہ ۴۷)

۲۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے آگ کا عذاب دینے سے منع فرمایا۔ فرمایا: لَا یَنْبَغِی اَنْ یُعَذِّبَ بِالنَّارِ اِلَّا صَاحِبُ النَّارِ یعنی آگ کا عذاب دینا صرف خدا کا حق ہے۔

۳۔ آپ نے مقتولین کے اعضاء کی قطع و برید سے منع فرمایا۔ عبداللہؓ بن یزید انصاری کی روایت ہے: نَهَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَنِ النُّهْبِی وَالْمُثْلَةِ یعنی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوٹ مار اور مثلہ (اعضاء کی قطع و برید) سے منع فرمایا۔

اسلام نے صرف ہم مثل سزا دینے کی اجازت دی ہے قرآن مجید میں آتا ہے: وَاِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوْا بِمِثْلِ مَاعُوْقِبْتُمْ بِهٖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِّلصّٰبِرِيْنَ. (النحل ۱۶:۱۲۶)
اگر تم بدلہ لو تو صرف اتنا ہی لو جس قدر تم پر زیادتی ہو چکی ہے لیکن اگر تم صبر کرو تو یقیناً یہ بات صبر کرنے والوں کے لیے بہتر ہے۔

۴۔ قتل میں احتیاط برتنے سے متعلق ارشاد فرمایا: اعف الناس قتلة اهل الایمان (ابو داؤد) یعنی اہل ایمان قتل کرنے میں تمام دنیا کے انسانوں سے زیادہ محتاط ہوتے ہیں۔

۵۔ باندھ کر قتل کرنا منع ہے۔ ابو ایوب انصاری نے فرمایا: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ یَنْهٰی عَنْ قَتْلِ الصَّبْرِ (ابو داؤد) یعنی میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا کہ آپ نے باندھ کر قتل کرنے سے منع فرمایا۔

۶۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کفار کے مقتولین کی لاشوں کو گڑھوں میں دفن کروایا علامہ ابو یعلی نے الاحکام السلطانیہ میں لکھا ہے کہ لشکر کے رئیس پر یہ فرض ہے کہ وہ کفار کی لاشوں کو گڑھوں میں دفن کرے۔

تیسری اصلاح

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم غفلت یا نیند کی حالت میں حملہ کرنے سے احتراز فرماتے تھے۔ حضرت انسؓ سے روایت ہے: اِنَّ النَّبِیَّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ خَرَجَ اِلٰی خَیْبَرَ فَجَاءَ ھَا لَیْلًا وَکَانَ اِذَا جَاءَ قَوْمًا بِلَیْلٍ لَا یُغِیْرُ عَلَیْھِمْ حَتّٰی یُصْبِحَ. (صحیحین) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خیبر پر چڑھائی کی۔ آپ رات کے وقت وہاں پہنچے اور آپ کا یہ دستور تھا کہ جب کسی محارب قوم پر رات کے وقت پہنچتے تو آپ حملہ نہ کرتے۔ جب تک صبح نہ ہو جاتی۔

لیکن اگر دشمن قوم کے ساتھ جنگ جاری ہے تو ایسی صورت میں رات کے وقت حملہ کرنا جائز ہے۔

چوتھی اصلاح

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوٹ مار کی ممانعت فرمائی ہے۔ عبداللہ بن زید انصاری سے روایت ہے۔ نَھَی النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَنِ النَّھْبِیٰ وَالْمُثْلَۃَ (بخاری) کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے لوٹ مار اور مثلہ سے منع فرمایا۔

عاصم بن کلیب اپنے باپ سے اور وہ ایک انصاری سے روایت کرتے ہیں۔

خَرَجْنَا مَعَ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ فِی سَفَرٍ فَاَصَابَ حَاجَۃٌ شَدِیْدَۃٌ وَجَھْدٌ فَاَصَابُوْا غَنَمًا فَانْتَھَبُوْھَا فَاِنَّ قُدُوْرَنَا لَتَغْلِی اِذْ جَاءَ نَا رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَمْشِی فَاَکْفَاءَ الْقُدُوْرَ بِقَوْسِہٖ ثُمَّ جَعَلَ یُرَمِّلُ اللَّحْمَ بِالتُّرَابِ ثُمَّ قَالَ اِنَّ النَّھْبَۃَ لَیْسَتْ بِاَحَلَّ مِنَ الْمَیْتَۃِ (ابو داؤد) ہم ایک سفر میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ نکلے اس سفر میں خوراک کی قلت کی وجہ سے لوگوں کو سخت تکلیف ہوئی۔ لوگوں کو بکریاں مل گئیں اور انھوں نے لوٹ لیں اور ذبح کر لیں اور ہماری ہنڈیاں پک رہی تھیں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے آپ نے اپنی کمان سے ہنڈیاں الٹ دیں اور گوشت کو مٹی سے آلودہ کر دیا اور فرمایا لوٹ کا مال مردار سے بہتر نہیں ہے۔

پانچویں اصلاح

اسلام نے تباہ کاری اور فساد برپا کرنے سے منع فرمایا۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے:

تِلْکَ الدَّارُ الْاٰخِرَۃُ نَجْعَلُھَا لِلَّذِیْنَ لَا یُرِیْدُوْنَ عُلُوًّا فِی الْاَرْضِ وَلَا فَسَادًا وَالْعَاقِبَۃُ لِلْمُتَّقِیْنَ (قصص ۲۸:۸۳) ہم آخرت کا گھر جنت میں ان لوگوں کے لیے مخصوص کریں گے جو زمین میں اپنی بڑائی نہیں چاہتے اور نہ فساد کرنا چاہتے ہیں نیک انجام متقیوں کے لیے ہے۔ حضرت ثوبانؓ سے روایت ہے۔ اَنَّہٗ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ مَنْ قَتَلَ صَغِیْرًا وَّ کَبِیْرًا اَوْ اَحْرَقَ نَخْلًا

اَوْ قَطَعَ شَجَرَۃً مُثْمِرَۃً اَوْ ذَبَحَ شَاۃً لِاَھَابِھَا لَمْ یَرْجِعْ کَفَافًا (مسند احمد) یعنی انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا جو شخص کسی چھوٹے بچے کو یا معمر آدمی کو قتل کرے گا یا کھجوروں کے درخت جلائے گا' یا پھل دار درختوں کو کاٹے گا یا بکری کو محض اس کی کھال حاصل کرنے کے لیے ذبح کرے گا تو وہ جہاد کے ثواب سے تہی دست لوٹے گا۔

جنگ کی نوعیت اور مصلحت اور ضرورت کی بناء پر درخت وغیرہ کاٹنے کی اجازت ہے جیسا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بنو نضیر کی کھجوریں کٹوا دیں۔ اور انھیں جلا دیا اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی: مَاقَطَعْتُمْ مِنْ لِیْنَۃٍ اَوْ تَرَکْتُمُوْھَا قَائِمَۃً عَلٰی اُصُوْلِھَا فَبِاِذْنِ اللّٰہِ کھجور کے درختوں میں سے جو کچھ تم نے کاٹا ہے اور جو کچھ چھوڑا ہے سب اللہ ہی کے حکم سے ہے۔

چھٹی اصلاح

اسلام نے مال غنیمت میں سے خیانت کی شدید ممانعت کی ہے قرآن مجید میں آتا ہے: وَمَنْ یَغْلُلْ یَاْتِ بِمَا غَلَّ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ (آل عمران ۳:۱۶۱) جو کوئی مال غنیمت میں خیانت کا مرتکب ہو گا۔ وہ جو کچھ اس نے خیانت کی ہے قیامت کے دن لائے گا۔

اس آیت کی تشریح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لَا تَغُلُّوْا فَاِنَّ الْغُلُوْلَ نَارٌ وَعَارٌ عَلٰی اَصْحَابِہٖ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ (احمد) یعنی مال غنیمت میں خیانت نہ کرو کیونکہ خیانت دنیا کے اندر اور آخرت میں بھی مرتکبین کے لیے عذاب اور شرمندگی کا باعث ہے۔

موطا امام مالک اور ابو داؤد میں حدیث ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسے شخص کی نماز جنازہ پڑھانے سے انکار کر دیا۔ جس نے مال غنیمت میں چوری کی تھی۔

ساتویں اصلاح

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سفراء اور قاصدوں کے قتل سے منع فرمایا چنانچہ مسیلمہ کذاب کے دو قاصد آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا: اَمَا وَاللّٰہِ لَوْلَا اِنَّ الرُّسُلَ لَا تُقْتَلُ ضَرَبْتُ اَعْنَاقَکُمَا (ابو داؤد۔ احمد) اللہ کی قسم اگر قاصدوں کا قتل ممنوع نہ ہوتا تو میں تمہاری گردن الگ کر دیتا۔

آٹھویں اصلاح

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سپاہیوں کو ہر قسم کی بدنظمی اور سرکشی کی ممانعت فرمائی عربوں کی یہ عادت تھی کہ جب وہ کسی قبیلہ پر حملہ کے لیے نکلتے تو جس منزل پر پڑاؤ ڈالتے یا جس راستہ پر سے گزرتے وہاں کے لوگ مصیبت میں پڑ جاتے۔ ایک دفعہ آپ کے پاس اس قسم کی سرکشی کی

شکایت آئی تو آپ نے فرمایا: مَنْ ضَيَّقَ مَنْزِلًا أَوْ قَطَعَ طَرِيْقًا فَلَا جِهَادَ لَهُ. یعنی جو کوئی راستے کے لوگوں کو تنگ کرے یا راستے میں لوٹ مار کرے اس کا کوئی جہاد نہیں۔

...ویں اصلاح

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے معاہدات کو صرف دنیاوی منفعت کے لیے توڑ دینے سے منع فرمایا۔ کیونکہ یہ بدعہدی قیام امن کے راستے میں ایک مضبوط دیوار ہے جب تک یہ دیوار کھڑی ہے۔ اس وقت تک امن نہیں ہو سکتا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سب سے پہلے قیام امن کے لیے اس دیوار کو پیوند خاک کیا اور عہد کی پابندی پر زور دیا۔ آپ نے فرمایا: مَنْ قَتَلَ مُعَاهَدًا لَمْ يَرِحْ رَائِحَةَ الْجَنَّةِ وَإِنَّ رِيْحَهَا لَتُوْجَدُ مِنْ مَسِيْرَةِ أَرْبَعِيْنَ عَامًا. یعنی جو کوئی کسی معاہد کو قتل کرے گا وہ جنت کی بو تک نہیں سونگھے گا حالانکہ اس کی خوشبو چالیس برس کی مسافت سے بھی محسوس ہوتی ہے۔

عمرو بن عتبہ سے روایت ہے انھوں نے کہا: سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ كَانَ بَيْنَهُ وَبَيْنَ قَوْمٍ عَهْدٌ فَلَا يَحِلَّنَّ عُقْدَةً حَتّٰى يَنْقَضِيَ أَمَدُهَا أَوْ يَنْبِذَ إِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ (ابوداؤد. ترمذی) کہ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو فرماتے سنا جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہو وہ اس وقت تک معاہدے کا بند نہ کھولے جب تک اس کی مدت نہ پوری ہو جائے یا وہ برابر کا لحاظ کر کے اس قوم کی طرف پھینک دے۔ ينبذ اليهم على سواء. یعنی برابر کو ملحوظ رکھ کر معاہدہ کو اس قوم کی طرف پھینک دے کا مطلب یہ ہے کہ معاہد قوم کو صاف طور پر اطلاع دے دی جائے کہ ان کے معاندانہ رویہ اور امن سوز حرکات کی وجہ سے معاہدہ کو فسخ کیا جاتا ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِيَانَةً فَانْبِذْ إِلَيْهِمْ عَلٰى سَوَاءٍ إِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِيْنَ (الانفال) اگر تمہیں کسی قوم کی خیانت کا خوف ہو تو ان کا معاہدہ برابری کو ملحوظ رکھ کر ان کی طرف پھینک دے۔

ابن عمر سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: إِذَا جَمَعَ اللّٰهُ الْأَوَّلِيْنَ وَالْآخِرِيْنَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرْفَعُ لِكُلِّ غَادِرٍ لِوَاءٌ فَقِيْلَ هٰذَا غَدْرَةُ فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ. (رواہ مسلم) جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اوّلین اور آخرین کو جمع کرے گا تو ہر عہد شکنی کے لیے ایک نشان بلند ہوگا کہ یہ فلاں بن فلاں کی بدعہدی کا نشان ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے امیر لشکر کو ہدایات دیتے ہوئے فرمایا: لَا تَغُلُّوْا وَلَا تَغْدِرُوْا وَلَا تُمَثِّلُوْا وَلَا تَقْتُلُوْا وَلِيْدًا وَلَا امْرَأَةً (مؤطا امام مالک) مال غنیمت میں سے خیانت نہ کرنا' بدعہدی نہ کرنا' مثلہ نہ کرنا' بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کرنا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عمل یہ بتاتا ہے کہ آپ نے معاہدات کی پوری طرح حفاظت کی صلح حدیبیہ کا مشہور واقعہ ہے۔ ابوجندل معاہدہ ہو چکنے کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کی خدمت میں پابہ زنجیر حاضر ہوتا ہے اور درخواست کرتا ہے کہ اس کو پنجہ ظلم سے نجات دلائیں۔ آپ نے دنیا کو معاہدہ کی حفاظت کرنے کا سبق دینے کے لیے ابوجندل کو فرمایا "اے ابوجندل صبر کر۔ ہم عہد کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ اللہ تعالیٰ تمھارے لیے کوئی راستہ نکال دے گا۔

دسویں اصلاح

اسیروں سے حسن سلوک

اسلام سلامتی اور امن کا دین ہے۔ بنی نوع انسان کے لیے رحمت اور اسلامی کا پیغام لے کر آیا ہے اور اس نے ان تمام زمانہ جاہلیت کی مکروہ رسومات کو کچل کر رکھ دیا تھا جس سے حرمت انسانیت مجروح ہوتی تھی۔ زمانہ جاہلیت کی مکروہ رسومات میں سے ایک گھناؤنی رسم اسیران جنگ سے انسانیت سوز سلوک تھا۔ جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ اسلام نے اسیرانِ جنگ کو مستقل طور پر پنجہ اسیری میں جکڑے رکھنے سے منع فرمایا بلکہ یہ تعلیم دی کہ یا ان کو احسان کے طور پر یا ان سے فدیہ لے کر رہا کر دو اور جب تک وہ قبضہ میں ہوں ان سے نیک سلوک کیا جائے قرآن مجید میں آتا ہے: فَإِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا فَضَرْبَ الرِّقَابِ حَتَّىٰ إِذَا أَثْخَنتُمُوهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً حَتَّىٰ تَضَعَ الْحَرْبُ أَوْزَارَهَا۔ (محمد ۴۷:۴) پس جب کافروں سے مٹھ بھیڑ ہو تو پہلے گردنیں مارنا ہے یہاں تک کہ تم ان پر غالب آ جاؤ۔ پھر قید کے بندھن مضبوط کرو۔ اس کے بعد تمھیں اختیار ہے یا تو احسان کے طور پر یا فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ یہاں تک کہ لڑائی اپنے ہتھیار رکھ دے۔

دوسری جگہ آتا ہے: يُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا إِنَّا نَخَافُ مِن رَّبِّنَا يَوْمًا عَبُوسًا قَمْطَرِيرًا۔ (سورۃ دھر ۷۶:۸۔۱۰) مسلمان اللہ کی محبت کی خاطر مسکینوں، یتامیٰ اور قیدیوں کو کھانا کھلاتے ہیں، ہم صرف اللہ کی رضا کے لیے کھانا کھلاتے ہیں۔ ہم نہ تو تم سے بدلہ چاہتے ہیں اور نہ شکریہ ہم اپنے رب سے تنگی اور سختی کے دن کا خوف رکھتے ہیں۔

جنگ بدر میں جو قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے ان کے ساتھ نہایت ہی نیک سلوک روا رکھا گیا اس حسن سلوک کی وجہ سے بہت سے قیدی اسلام کے حلقہ اسیری میں داخل ہو گئے۔ ایک قیدی بیان کرتا ہے کہ وہ جس گھر میں قید تھا گھر والے اس کو تو اچھا کھانا کھلاتے تھے لیکن خود کھجور وغیرہ کھا لیتے تھے۔ بعض بدری قیدیوں کو فدیہ دے کر آزاد کر دیا گیا، بعض ناداروں کو بلا فدیہ رہا کر دیا گیا اور جو لوگ لکھنا پڑھنا جانتے تھے ان کو دس دس بچوں کو تعلیم دینے کی شرط پر چھوڑ دیا گیا۔ جنگ مریسیع میں بنی مصطلق کے ایک سو خاندان پکڑے گئے۔ ان سب کو فدیہ لیے بغیر رہا کر دیا گیا۔ غزوہ حنین میں قبیلہ

ہوازن کے چھ ہزار قیدی بطور احسان آزاد کر دیے گئے جبال تنعیم میں مکہ کے اسی آدمیوں نے اسلامی لشکر پر دھاوا بول دیا۔ سب کے سب گرفتار کر لیے گئے۔ جب آپ کی خدمت میں ان کو پیش کیا گیا تو آپ نے از راہِ احسان سب کو رہا کر دیا۔

اسلام بزور شمشیر نہیں پھیلا

جہاد پر تفصیل ماضیہ مستشرقین کے اس اعتراض کو رد کر دیتی ہے کہ اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے جیسا کہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں جہاد کے عنوان کے تحت لکھا ہے:

"اسلام کی اشاعت بزور شمشیر عام طور پر مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے بالفاظ دیگر جہاد صرف جنگ ہی نہیں بلکہ اسلام پھیلانے کی غرض سے تلوار اٹھانے کا نام ہے۔"

کلین نے ریلجن آف اسلام میں جہاد کے متعلق اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے:

"جہاد یعنی منکرین اسلام کے خلاف اس مقصد کے لیے جنگ کرنا کہ یا تو انھیں اسلام کے اندر جذب کر لیا جائے یا اگر وہ قبول سے انکار کریں تو انھیں مطیع و منقاد بنا لیا جائے اور ان کی بیخ کنی کر دی جائے اور یہ کہ اسلام کی اشاعت اور اس کو تمام مذاہب پر غالب کرنا مسلمان قوم کا ایک مقدس فریضہ سمجھا جاتا ہے۔"

اگر مستشرقین اعتراض کرنے سے قبل نیک نیتی سے لغت کا مطالعہ کر لیتے اور قرآن مجید کے ان محکم اصولوں پر نظر ڈال لیتے جو اشاعت اسلام سے متعلق ہیں تو وہ یقیناً اعتراض نہ کرتے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ (البقرۃ ۲:۲۵۶)

یعنی دین میں کوئی جبر نہیں کیونکہ ہدایت کی راہ گمراہی کے مقابلہ میں واضح ہو چکی ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی تو مصائب و آلام سے پر تھی۔ مسلمان کھلے بندوں عبادت تک نہیں کر سکتے تھے۔ مدنی زندگی اقتدار کی زندگی تھی اس زندگی میں ایک مثال نہیں ملتی جس کا معترضین سہارا لے کر اپنی دلیل ٹھہرا سکیں۔ مدینہ پر کفار نے بار بار حملے کیے ہر جنگ میں مسلمانوں کا پلہ بھاری رہا۔ دشمنوں کے قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے آپ نے فدیہ لے کر یا احسان کے طور پر رہا کر دیا ایک مثال بھی نہیں ملتی کہ آپ نے کسی قیدی کو جبر و اکراہ کے ساتھ اسلام میں داخل کرنے کی کوشش کی ہو۔

مشرکین کے ساتھ معاہدے کیے۔ باوجود قوت حاصل کر لینے کے اسلام نے ان مشرکین سے جنگ کرنے کی ممانعت کر دی جو اپنے معاہدوں پر کار بند تھے۔ اگر اسلام جبر کا حامی ہوتا تو قوت

اور طاقت ملنے کے ساتھ ہی تمام مشرکین کو جنگ کر کے دائرہ اسلام میں داخل کر لیا جاتا تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات تک عرب میں ایسے لوگوں کی تعداد خاصی تھی جو دائرہ اسلام میں نہیں داخل ہوئے تھے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ کفار کو حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ دعوت اسلام دینے کی تلقین کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اُدۡعُ اِلٰی سَبِیۡلِ رَبِّکَ بِالۡحِکۡمَۃِ وَالۡمَوۡعِظَۃِ الۡحَسَنَۃِ وَجَادِلۡھُمۡ بِالَّتِیۡ ھِیَ اَحۡسَنُ (النحل ۱۶ : ۱۲۵) اے نبی اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ دعوت دو اور لوگوں سے احسن طریقہ پر مجادلہ کرو۔ یہ آیت معترضین کے اعتراض پر کاری ضرب ہے اور واضح کرتی ہے کہ اسلام کی تبلیغ حکمت اور موعظہ حسنہ کے ساتھ ہونی چاہیے۔

اسلام جہاں بغیر کسی وجہ کے دوسروں کے علاقوں کو زیر کرنا بنظرِ استحسان نہیں دیکھتا۔ وہاں یہ بھی تعلیم دیتا ہے کہ سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔ اگر غیر ممالک پر چڑھائی فساد اور بگاڑ کا موجب ہے تو سرحدوں کو کھلا چھوڑ دینا بھی موجب فساد ہے۔ اس وجہ سے قیام امن کے لیے اسلام نے سرحدوں کو مضبوط رکھنے کی تعلیم دی ہے۔

جہاد میں کامیابی کے اصول

اطاعت امیر

قرآن مجید اور احادیث میں اطاعت امیر پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَاَطِیۡعُوا الرَّسُوۡلَ وَاُولِی الۡاَمۡرِ مِنۡکُمۡ فَاِنۡ تَنَازَعۡتُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ فَرُدُّوۡہُ اِلَی اللّٰہِ وَالرَّسُوۡلِ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُؤۡمِنُوۡنَ بِاللّٰہِ وَالۡیَوۡمِ الۡاٰخِرِ۔[1] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے میں سے حاکم کی اطاعت کرو اور تمہارا اگر کسی امر پر حاکم سے اختلاف ہو جائے تو اس کا فیصلہ اللہ اور اس کی تعلیم کے مطابق کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: عَلَی الْمَرْءِ الْمُسْلِم السَّمْعُ الطَّاعَةُ فِیْمَا اَحَبَّ وَکَرِهَ اِلَّا اَنْ یُوْمَرَ بِمَعْصِیَةٍ فَاِنْ اُمِرَ بِمَعْصِیَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ.[2] مسلمان مرد پر سمع اور طاعت لازم ہے خواہ برضا رغبت ہو خواہ بکراہت ہو تاوقتیکہ اس کو معصیت کا حکم نہ دیا جائے پھر اگر گناہ کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے اور نہ اطاعت' فرمایا: اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا وَاِنِ اسْتُعْمِلَ عَلَیْکُمْ عَبْدٌ حَبْشِیٌّ کَاَنَّ رَاْسَهٗ زَبِیْبَةٌ. سنو اور اطاعت کرو اگرچہ تم پر حبشی غلام بھی امیر مقرر کر دیا جائے جس کا سر کشمش کے دانہ کی طرح ہو۔

1۔ النساء ۴:۵۹۔ 2۔ مسلم باب الجہاد۔

اتحاد

کامیابی کا دوسرا اصول اتحاد ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَلَا تَفَرَّقُوْا [1] اور سب کے سب اللہ کی رسی کو تھامے رکھو اور تفرقہ نہ کرو۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ. [2] اور آپس میں جھگڑا نہ کرو، ایسا کرو گے تو بزدلی اور کمزوری کا شکار ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔

اَلْاِسْلَامُ اَحْوَجُ اِلَی الْجَمَاعَةِ [3] اسلام جماعتی نظام چاہتا ہے۔

اَلْجَمَاعَةُ رَحْمَةٌ وَالْفِرْقَةُ عَذَابٌ [4] جماعت رحمت ہے اور تفرقہ عذاب ہے۔

اِنَّمَا اَهْلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمُ الْاِخْتِلَافُ [5] اگلے لوگوں کو اختلاف نے ہلاک کیا۔

اللہ پر بھروسہ

اسباب اور ذرائع سے پورا کام لینے کے بعد کامیابی کی امید اللہ سے وابستہ کرنی چاہیے اور اپنی طاقت پر غرور نہیں کرنا چاہیے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: لَاتَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بَطَرًا وَّرِئَآءَ النَّاسِ. یعنی ان لوگوں کی طرح مت ہو جاؤ جو اپنے شہروں سے تکبر کرتے ہوئے اور اپنی طاقت کی نمائش کرتے ہوئے جنگ کے لیے نکلے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جنگ حنین کا نقشہ کھینچتے ہوئے مسلمانوں کو نصیحت کی۔ لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ وَيَوْمَ حُنَيْنٍ اِذْ اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْئًا وَضَاقَتْ عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ. اللہ نے تمہیں کئی میدانوں میں فتح دی اور حنین کی جنگ میں بھی لیکن بعد سرزنش کرنے کے کیونکہ اس دن تمہاری کثرت تعداد کے گھمنڈ نے تمہاری یہ حالت کی تھی کہ زمین باوجود فراخ ہونے کے تم پر تنگ ہو گئی یہاں تک کہ تم پیٹھ پھیر کر میدانِ جنگ سے بھاگ نکلے۔

---

1. آل عمران ۳:۱۰۳۔
2. الانفال آیت ۴۶۔
3. کنوز الحقائق حرف الہمزہ۔
4. کنوز الحقائق حرف الجیم۔
5. کنوز الحقائق حرف الہمزہ۔

ذکر الٰہی

جب دشمن سے مقابلہ آن پڑے تو اللہ کو کثرت سے یاد کرنا چاہیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اِذَا لَقِیْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِیْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ جب تمہارا کسی گروہ سے مقابلہ آن پڑے تو تم ثابت قدم رہو اور اللہ تعالیٰ کو بہت یاد کرو تا کہ تم کامیابی حاصل کرو۔

انفاق فی سبیل اللہ

جب تک مجاہدین اسلحہ سے مسلح نہ ہوں گے۔ دشمن فوج کا مقابلہ نہ کر سکیں گے۔ اس وجہ سے مجاہدین کو اسلحہ مہیا کرنے اور دوسرے اخراجات پورے کرنے کے لیے مال کی قربانی بہت ضروری ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔[1] مومن صرف وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں پھر کچھ شک نہیں کرتے اور اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں یہی لوگ سچے ہیں۔

صبر اور سرحدوں کی مضبوطی

اللہ کی راہ میں تکالیف کو خوشی سے برداشت کرنے اور اپنی سرحدوں کو مضبوط رکھنے میں ہی کامیابی کا راز مضمر ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: یَاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا[2] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور مقابلہ میں بڑھ کر صبر دکھاؤ اور اپنی سرحدوں کی حفاظت کرو۔

جہاد کی شرائط

اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر

جہاد کی پہلی شرط یہ ہے کہ جہاد اللہ کے راستے میں خدا کی رضا کے لیے کیا جائے اور اس کا مقصد صرف اللہ کے نام کو بلند کرنا ہو حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ایک شخص بہادری کے لیے لڑتا ہے یا حمیت قومی کے لیے لڑتا ہے یا دکھاوے کے لیے لڑتا ہے۔ ان میں سے کون سی جنگ اللہ کی راہ میں ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اللہ کے راستے میں جہاد اس شخص کا ہے جو شخص

1. حجرات ۴۹:۱۵۔ 2. آل عمران ۳:۲۰۰۔

اللہ کا نام بلند کرنے کے لیے لڑے۔

شہرت اور اجر کی خواہش سے پاک

زمانہ جاہلیت میں جنگیں شہرت اور دنیاوی اغراض کے لیے لڑی جاتی تھیں۔ لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص مال اور ناموری کے لیے لڑتا ہے۔ اسے کوئی اجر نہیں ملے گا مختلف روایات میں جنگ کے پانچ محرکات سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ طلب غنائم' اظہار شجاعت' حمیت قومی و وطنی اور جوش انتقام۔

دنیوی فوائد کی خواہش سے پاک

مسند احمد میں روایت ہے حضرت عبادہ بن صامت بیان کرتے ہیں کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور صرف ایک اونٹ باندھنے کی رسی کی بھی نیت کی تو پس اس کو وہ رسی ہی ملے گی۔ ثواب کچھ نہیں ملے گا۔

خدا کی راہ میں نکلنے کی تڑپ

ارشاد الٰہی ہے: وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَآ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَآ اَجِدُ مَآ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ تَوَلَّوْا وَّ اَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ.[1] اور ان لوگوں پر الزام نہیں ہے جو خود آپ کے پاس آئے کہ آپ ان کے لیے سواریاں مہیا کریں اور جب آپ نے کہا کہ میں تمھارے لیے سواریوں کا انتظام نہیں کر سکتا تو وہ اس حال میں واپس ہوئے کہ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اس غم میں کہ ان کے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لیے خرچ کرنے کو کچھ موجود نہیں۔

(۲) مالی جہاد

مالی جہاد قوم کی ترقی اور استحکام اور عزت کا باعث ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید نے انفاق فی سبیل پر بہت زور دیا ہے۔ جہاں نماز جو روحانی ترقی کا زینہ ہے کا ذکر کیا ہے۔ وہاں انفاق کا ذکر کیا ہے۔ جو قوم کی بہبودی اور ملک کی ترقی کا ذریعہ ہے۔ صلوٰۃ اور انفاق فی سبیل اللہ کو اکٹھا لا کر مسلمانوں کو سبق دیا ہے کہ روح کی پاکیزگی کے ساتھ ساتھ مادی ترقی کی طرف قدم بڑھانا بھی ضروری ہے۔

مالی جہاد کی اہمیت از روئے قرآن مجید

ارشاد الٰہی ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا

[1] التوبہ ۹:۹۲۔

بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ حقیقت میں وہی لوگ مومن ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاتے ہیں۔ پھر وہ شک نہیں کرتے بلکہ اللہ کی راہ میں اپنے مال اور جان سے جہاد کرتے ہیں یہی لوگ (اپنے دعویٰ میں) سچے ہیں۔

اس آیت کریمہ میں ایمان کی عملی صورت مال اور جان سے جہاد کرنا بتایا ہے پھر مالی جہاد کو جانی جہاد پر مقدم کیا ہے۔

دوسری جگہ ارشادِ الٰہی ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۳:۹۲) یعنی تم ہرگز نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک تم اپنی محبوب ترین چیز خرچ نہ کرو۔

پھر ارشادِ الٰہی ہے: فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجَاهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَی الْقَاعِدِیْنَ دَرَجَةً وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی (۴:۹۵) یعنی اللہ تعالیٰ نے مال اور جان نے جہاد کرنے والوں کو گھر میں بیٹھے رہنے والوں پر درجات میں فضیلت دی ہے اللہ نے سب سے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔

پھر ارشاد الٰہی ہے: وَمَا لَکُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَلِلّٰهِ مِیْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَایَسْتَوِیْ مِنْکُمْ مَنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ اُولٰٓئِکَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِیْنَ اَنْفَقُوْا مِنْ بَعْدُ وَقٰتَلُوْا وَکُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی. یعنی تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ آسمان اور زمین اللہ کی میراث ہے۔ جن لوگوں نے فتح سے پہلے مال خرچ کیا اور لڑائی لڑی۔ تم میں سے کوئی ان کے برابر نہیں ہے اور ان لوگوں کا مقام ان لوگوں سے کہیں بڑھا ہوا ہے جنھوں نے فتح کے بعد مال خرچ کیا اور جہاد میں حصہ لیا اللہ نے ہر ایک سے نیکی کا وعدہ کیا ہے۔

اہمیت از روئے حدیث

عَنْ خُرَیْمِ بْنِ فَاتِکٍ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مَنْ اَنْفَقَ نَفَقَةً فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ کُتِبَ لَهٗ بِسَبْعِ مِائَةِ ضِعْفٍ (ترمذی' نسائی) خریم بن فاتک سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ کی راہ میں کچھ مال خرچ کرتا ہے تو اللہ کی طرف سے اس کے لیے سات سو گنا اجر لکھا جاتا ہے۔

حضرت علیؓ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں۔

قَالَ مَنْ اَرْسَلَ نَفَقَةً فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاَقَامَ فِیْ بَیْتِهٖ فَلَهٗ بِکُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُ مِائَةِ دِرْهَمٍ وَمَنْ غَزَا بِنَفْسِهٖ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ وَاَنْفَقَ فِیْ وَجْهِهٖ ذٰلِکَ فَلَهٗ بِکُلِّ دِرْهَمٍ سَبْعُ مِائَةِ اَلْفِ دِرْهَمٍ ثُمَّ تَلَا هٰذِهِ الْاٰیَةَ وَاللّٰهُ یُضٰعِفُ لِمَنْ یَّشَاءُ (ابن ماجہ) آپ نے فرمایا جس نے اللہ کی راہ میں اپنا مال بھیجا اور خود گھر میں بیٹھا رہا تو اسے ہر درہم کے بدلے سات سو درہم کا اجر ملے گا۔ لیکن جو خود اللہ کی راہ میں جہاد کے لیے نکلا اور اپنا مال خرچ کیا تو اسے ہر درہم کے بدلے سات لاکھ درہم ملیں گے۔ اس

کے بعد آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔

وَاللّٰهُ يُضَاعِفُ لِمَنْ يَّشَاءُ.

حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: مَامِنْ يَوْمٍ يُّصْبِحُ الْعِبَادُ فِيْهِ اِلَّا مَلَكَانِ يَنْزِلَانِ فَيَقُوْلُ اَحَدُهُمَا اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُنْفِقًا خَلَفًا وَيَقُوْلُ الْاٰخَرُ اَللّٰهُمَّ اَعْطِ مُمْسِكًا تَلَفًا. (بخاری۔ مسلم) انسانوں پر کوئی دن ایسا نہیں گزرتا جس میں دو فرشتے نازل نہ ہوتے ہوں۔ ان میں سے ایک فرشتہ یہ دعا کرتا ہے اے اللہ جس نے خرچ کیا اسے اچھا بدلہ دے اور دوسرا کہتا ہے اے اللہ جس نے ہاتھ روک رکھا ہے اس کے مال کو تلف کر یہ حدیث ظاہر کرتی ہے کہ انفاق فی سبیل اللہ ترقی کا موجب اور بخل ہلاکت اور تباہی کا سبب ہے۔

قرآن مجید میں بے شمار آیات ہیں جو انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دیتی ہیں۔ اس طرح بے شمار احادیث ہیں جو انفاق فی سبیل اللہ کے فوائد اور حکمت بیان کرتی ہیں۔ صرف اختصار کو مدنظر رکھ کر چند آیات اور چند احادیث بیان کر دی ہیں۔

اس وقت اس امر کی اشدت ضرورت ہے کہ مسلمان قومی ضروریات اور اشاعت اسلام کے لیے دل کھول کر خرچ کریں تاکہ مسلمان قوم ذلت اور منکبت کی گہرائیوں سے نکل کر ترقی کی شاہراہ پر چل پڑے مسلمانوں کی پستی اور تنزل کا باعث ترک جہاد اور دنیاوی حرص ہے۔ قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے۔

قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ نِ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ. (توبہ ۹:۲۴) اے نبی کہہ دو کہ اللہ اگر تمھارے باپ اور تمھارے بیٹے اور تمھارے بھائی اور تمہاری بیویاں اور تمھارے خاندان کے آدمی اور مال جو تم کماتے ہو اور تجارت جس کے ماند پڑ جانے کا تم کو اندیشہ ہو اور مکان جن کو تم پسند کرتے ہو۔ تمھارے نزدیک اللہ اور اس کے رسول اور اس کے راستہ میں جہاد سے زیادہ پسندیدہ ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے اور اللہ نافرمانوں کو ہدایت نہیں کرتا۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے قومی ترقی کا ایک اصول بیان کیا ہے وہ یہ کہ مسلمان ہمیشہ دین کو دنیا پر مقدم رکھیں جب کبھی بھی ان کو دین کی اشاعت کے لیے اپنے عزیزوں، تجارتوں، مالوں اور عظیم الشان مکانوں کو قربان کرنا پڑے تو وہ بطیب خاطر قربان کر دیں۔ اگر انفاق فی سبیل اللہ کی بجائے دنیا کی محبت پر گدھوں کی طرح گرے پڑے رہے تو ان کو اپنی پستی اور زوال کا منظر سامنے رہنا چاہیے۔

اس آیت کریمہ میں دولت کمانے اور عزیزوں سے تعلق رکھنے سے منع نہیں فرمایا بلکہ یہ تعلیم

دی ہے کہ یہ چیزیں اللہ اور اس کے رسول اور جہاد سے عزیز نہ ہوں۔

ابن عمر کہتے ہیں کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ جب لوگوں کے دلوں میں دنیا اور درہم کی محبت غالب آ جائے گی اور جنس بازار میں آنے سے پہلے ہی اس پر بیع کرنے لگیں گے کھیتی باڑی میں ہی منہمک ہو جائیں گے اور جہاد کو ترک کر دیں گے تو اُن پر اللہ سخت آزمائش مسلط کر دے گا اور وہ اس آزمائش سے اس وقت تک چھٹکارا نہ پا سکیں گے۔ جب تک اپنے دین کی طرف نہ لوٹ آئیں گے۔ یعنی جب تک دین کو دنیا پر مقدم نہ کریں گے۔ (مسند احمد۔ ابوداؤد)

ابو ہریرہؓ سے روایت ہے۔ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ اے ثوبان تمہاری اس وقت کیا حالت ہوگی جب تم پر دوسری قومیں اس طرح ٹوٹ پڑیں گی جس طرح بھوکے کھانے کے برتن پر ٹوٹ پڑتے ہیں؟ ثوبان نے عرض کیا۔ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ اے اللہ کے رسول کیا ہماری مغلوبیت کی حالت قلت تعداد کی وجہ سے ہوگی؟ آپ نے فرمایا نہیں بلکہ تعداد میں تم زیادہ ہو گے لیکن تمھارے اندر کمزوری آ جائے گی۔ دوسرے صحابہ کرام نے دریافت کیا۔ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کمزوری سے کیا مراد ہے آپ نے فرمایا تمہارا دنیا کی محبت کا شکار ہو جانا اور موت کو ناپسند کرنا۔

پس مسلمانوں کی پستی اور زوال کا اصل سبب مالی، قلمی، لسانی اور سیفی جہاد کو ترک کر دینا ہے اب جب تک مسلمان قوم ہر قسم کے جہاد کو اپنا نہیں لیتی اس وقت تک اس کا ذلت اور مسکنت اور محکومی کی زنجیروں سے چھٹکارا پانا مشکل ہے۔

(۳) جہاد بالنفس

جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم جہاد بالنفس ہے۔ یعنی نفس امارہ کی سرکش اونٹنی کو مطیع و منقاد بنانا۔ یہی وہ عظیم مقصد ہے جس کے لیے اسلام آیا ہے۔

اس جہاد میں انسان کی دنیاوی و اخروی فلاح مضمر ہے جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا [1] یعنی جس نے اپنے نفس کو پاک کیا وہ کامیاب ہو گیا اس جہاد سے روگردانی کرنا ناکامی اور نامرادی کے مترادف ہے ارشادِ الٰہی ہے۔ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا [2] اور نامراد ہو گیا وہ شخص جس نے اپنے نفس کو گناہوں کی میل سے آلودہ کیا۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ إِنَّ اللّٰهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ [3] جو کوئی جہاد کرتا ہے وہ اپنے ہی نفس کے لیے جہاد کرتا ہے۔ اللہ تو تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جہادِ بالنفس کو جہاد اکبر قرار دیا ہے چنانچہ ایک مرتبہ

ا۔ الشمس ۹:۹۱۔ ۲۔ ۱۰:۹۱۔ ۳۔ العنکبوت ۶:۲۹۔

صحابہ کسی لڑائی سے واپس مدینہ آئے تو آپ نے فرمایا: رَجَعْتُمْ مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ تم چھوٹے جہاد سے بڑے جہاد کی طرف لوٹ آئے ہو چھوٹے جہاد سے مراد دشمن سے جنگ اور بڑے جہاد سے مراد تزکیہ نفس ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک اور ارشاد ہے: جَاهِدُوا اَهْوَاءَ كُمْ كَمَا تُجَاهِدُوْنَ اَعْدَاءَ كُمْ اپنی خواہشات سے جہاد کرو جس طرح اپنے دشمن سے جہاد کرتے ہو۔

اصلاح نفس کے اصول

اسلام ایک دین کامل ہے۔ جہاں اس نے اپنے جذبات اور خواہشات پر قابو پانے کی تعلیم دی ہے۔ وہاں اس نے وہ ذرائع بھی بیان کر دیے ہیں جن کے ذریعہ آسانی سے نفس کی سرکش اونٹنی کو قابو میں لایا جا سکتا ہے۔ وہ ذرائع حسب ذیل ہیں۔

اللہ تعالیٰ کی معرفت

اللہ تعالیٰ کی ذات کا جتنا انسان کو عرفان حاصل ہو گا اتنا ہی برائیوں سے دور رہے گا۔ کوئی شخص جانتے ہوئے زہر نہیں کھاتا کیونکہ اس کو علم ہے کہ اس کے کھانے سے موت لازمی ہے۔ اسی طرح انسان کو جتنی اللہ کی معرفت زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ اتنا ہی وہ برائیوں سے دور ہٹتا چلا جاتا ہے۔ پس نفس امارہ کی سرکش اونٹنی کو ذبح کرنے کے لیے سب سے بڑا ذریعہ معرفت الٰہی ہے۔

دعا

اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے: اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ تم دعا کرو میں قبول کروں۔ نفس امارہ پر قابو پانے کے لیے سب سے بڑا ذریعہ دعا ہے اور دعا اسی وقت کارگر ثابت ہوتی ہے جب انسان اپنی زندگی اور اپنی تمام استعدادوں اور قوتوں کو اللہ کی راہ میں وقف کر دیتا ہے اور قرآن مجید کی اس آیت کا مصداق بن جاتا ہے: قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْيَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ۔ یعنی انسان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اللہ کی رضا کے لیے وقف ہو۔ دعا کیا ہے انسان اپنے اوپر ایک موت وارد کرتا ہے۔ جب انسان کی خواہشات اللہ کی محبت کی آگ سے بھسم ہو جاتی ہیں اور انسان کی روح آستانہ الوہیت پر پانی کی طرح بہہ نکلتی ہے تو اس وقت انسان شیطان کے پنجہ سے نجات حاصل کر لیتا ہے اور شیطان بھی اس آدمی کو گناہوں کے راستہ پر چلانے سے مایوس ہو جاتا ہے۔

توبہ واستغفار

توبہ لغت عرب میں رجوع کرنے کو کہتے ہیں۔ اسی وجہ سے قرآن مجید میں خدا کا نام تواب

ہے یعنی بہت رجوع کرنے والا۔ جب انسان اپنے کردہ گناہوں سے دست بردار ہو کر کامل صدق و وفا کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی طرف رجوع کرتا ہے اور اس کو اپنے فضل و کرم کی چادر میں لپیٹ لیتا ہے۔

توبہ کے لیے تین شرائط ہیں

اقلاع یعنی توبہ کرنے والا اپنے دل سے خیالات فاسدہ کو دور کرے کیونکہ خیالات فاسدہ ہی افعال بد کا محرک ہوتے ہیں۔ عمل سے پہلے تصور جنم لیتا ہے۔ وہ تصور عمل کے لیے راستہ ہموار کرتا ہے جب انسان اپنے دل کو خیالات فاسدہ سے پاک کرے گا تو اس سے افعال ردّیہ سرزد نہیں ہوں گے۔

ندم

یعنی اپنے کیے پر حقیقی پشیمانی اور ندامت اختیار کرنا۔ جب انسان اپنے کیے پر حقیقی پشیمانی اور ندامت اختیار کرتا ہے تو پھر اس سے دوبارہ افعال ردّیہ سرزد نہیں ہوتے کیونکہ ندامت روح پر ایک ایسی ضرب ہے جو ہمیشہ انسان کو افعال شنیعہ سے آگاہ رکھتی ہے اور لغزشوں سے بچاتی ہے۔

عزم

یعنی آئندہ کے لیے مصمم ارادہ کر لینا کہ پھر ان افعال شنیعہ اور خصائل فاسدہ کی طرف رجوع نہیں کرے گا۔ جو اس سے پہلے سرزد ہو چکے ہیں۔ جب بندہ اس عزم کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ بھی اس کو سچی توبۃ النصوح کی توفیق عطا کرتا ہے۔

استغفار

استغفار غفر سے مشتق ہے جس کے معنی ہیں کہ اللہ سے یہ درخواست کرنا کہ بشریت کی کمزوری ظاہر نہ ہو۔ دوسرے الفاظ میں استغفار کے معنی استمداد اور استعانت کے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں استغفار اور توبہ کرنے کے متعلق بہت تاکید کی ہے ارشاد ہے: اِسْتَغْفِرْ لِذَنْبِکَ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنَاتِ یعنی خدا سے درخواست کر کہ وہ تجھے بشریت کی کمزوری سے محفوظ رکھے۔ اسی طرح مومن مرد اور مومن عورتوں کو بھی محفوظ رکھے۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّکُمْ ثُمَّ تُوْبُوْا اِلَیْہِ یعنی تم اپنے رب سے استغفار کرو اور اس کی طرف رجوع کرو۔

استغفار اور توبہ دو ایسے ہتھیار ہیں۔ جن سے انسان نفس امارہ پر غالب آ سکتا ہے۔

مجاہدہ

قرآن مجید میں آتا ہے۔ وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا وہ لوگ جو ہمارا قرب

حاصل کرنے کے لیے سعی تمام کرتے ہیں۔ ہم ان کو اپنے راستہ کی ہدایت دے دیتے ہیں یہ ایک امر مسلمہ ہے کہ سعی بلیغ کے بغیر کوئی چیز بھی حاصل نہیں ہو سکتی۔ نفس امارہ پر قابو پانے کے لیے مجاہدات ضروری ہیں۔ تمام انبیاء اور اولیاء کی مقدس زندگیاں اس امر کا بین ثبوت ہیں کہ انسان مجاہدات سے ہی نفس امارہ پر غلبہ حاصل کر سکتا ہے۔

استقامت

استقامت یہ ہے کہ انسان مصائب اور تکالیف میں گھر جائے کوئی بھی مونس و معاون نہ ہو۔ اس حالت میں بھی اس کی زبان اور اس کے جوارح سے کسی قسم کی بے چینی اور اضطراب ظاہر نہ ہو بلکہ مصائب کے کڑوے گھونٹ آبِ شیریں سمجھ کر پی جائے۔ اس کے چہرہ پر انبساط اور بشاشت کی لہریں دوڑیں اس کا قدم اللہ کی رضا جوئی کے لیے اور بھی تیزی سے اُٹھے۔ قرآن مجید میں آتا ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِیْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا فِی الْاٰخِرَةِ یعنی وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر استقامت اختیار کی ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم مت ڈرو اور مت غمگین ہو جنت اور دائمی خوشی کی بشارت پاؤ۔ جس کا تمھیں وعدہ دیا گیا ہے ہم دنیا اور آخرت کی زندگی میں تمھارے دوست ہیں۔

راست بازوں کی صحبت

قرآن مجید میں آتا ہے۔ كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِیْنَ یعنی ان لوگوں کی صحبت اور معیت اختیار کرو جو اپنے قول اور فعل میں صادق ہیں۔ انسان بالطبع نمونہ کا محتاج ہے۔ جب انسان صالحین اور راست بازوں کی صحبت اختیار کرے گا تو لازماً اپنی زندگی صادقین کے نمونہ پر ڈھالے گا۔

اکل حلال اور طیب

خوراک کا انسان کے اخلاق پر نہایت گہرا اثر پڑتا ہے۔ اس وجہ سے قرآن مجید نے ان تمام چیزوں کے کھانے سے منع فرمایا ہے جو انسان کی روحانی زندگی کے لیے پیغام موت ہیں۔ مثلاً اسلام نے سور کا گوشت کھانے سے منع کیا ہے۔ کیونکہ یہ جانور نجاست خور اور حد درجہ کا دیوث اور بے غیرت ہے تمام یونانی طبیبوں نے یہ رائے ظاہر کی ہے۔ اس جانور کا گوشت حیاء کو کم کرتا ہے دیوثی کو بڑھاتا ہے۔ اس رائے کی صداقت اور مشاہدہ کرنا ہو تو یورپ کی اقوام کی دیکھ لو کہ کس طرح ان میں بے حیائی اور دیوثی پائی جاتی ہے۔ قرآن مجید میں حلال اور طیب کھانے کے متعلق ارشاد الٰہی ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا اے رسولو! پاک اشیاء کھاؤ اور نیک اعمال بجا لاؤ۔ اکل طیب اور اعمال صالحہ کو اکٹھا بیان کر کے یہ اشارہ کیا ہے کہ طیب کھانے سے اچھے اعمال بجالانے کی توفیق ملتی ہے۔

دہشت گردی اور جہاد

مسئلہ جہاد پر سیر کن بحث گزر چکی ہے۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ جہاد سے متعلق مستشرقین کا جو تصور کہ "کلمہ پڑھو ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے" بہت ہی گمراہ کن اور اسلامی تعلیم کے منافی تھا۔ مسلمانوں نے جنگیں لڑی ہیں وہ مسلمانوں نے اپنی جان، مال اور عزت اور ملکی سرحدوں کی حفاظت کے لیے لڑی تھیں جیسا کہ قرآن مجید کے یہ الفاظ ظاہر کر رہے ہیں۔ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا الخ (ان لوگوں کو اجازت دی گئی ہے جن سے لڑائی لڑی جاتی ہے پس اس وجہ سے وہ مظلوم تھے) ان الفاظ میں دو باتیں ظاہر ہو رہی ہیں ایک تو مسلمانوں پر جنگ تھونپی گئی تھی۔ دوم مسلمان مظلوم تھے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جب اللہ کے حکم سے ہتھیار اٹھائے تو صرف اپنے دفاع کے لیے تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے زیادتی اور دیگر اس دور کے جنگی جور و ستم اور مظالم سے سختی سے منع کیا جیسا کہ جنگی اصلاحات کا ذکر گزر چکا ہے۔

اس کے ساتھ جہاد کی بحث کے ضمن میں یہ بھی رقم کیا تھا کہ قرآن مجید میں لفظ جہاد صرف قتال کے معنی میں ہی استعمال نہیں ہوتا یہ لفظ مختلف معانی میں بھی استعمال ہوا ہے حاصل کلام یہ ہے کہ مسلمانوں کا جہاد بالسیف دفاعی ہے اور ملک گیری کی ہوس سے پاک ہے۔

دہشت گردی

قرآن مجید میں دہشت گردی کے لیے دو الفاظ بیان ہوئے ہیں۔ فتنہ اور فساد۔ دونوں الفاظ مذموم مفہوم میں استعمال ہوئے ہیں۔ اسلام نہ فتنہ کو پسند کرتا ہے اور نہ فساد کو۔ اسلام فتنہ و فساد کو مٹا کر امن قائم کرنے آیا ہے جیسا کہ لفظ اسلام کا مفہوم ظاہر کر رہا ہے۔ اب یہ دیکھنا ہے دہشت گردی کی کیا تعریف ہے۔ پھر یہ دیکھنا ہے کہ یہ تعریف اسلامی جہاد پر استعمال ہو سکتی ہے امریکہ کی وزارت دفاع کے ایک سابق فوجی سیاسی تجزیہ نگار جان مور (John Moore) اپنے مقالے "اسلامی دہشت کا ارتقاء" (The evolution of Islamic Terrorism) سے اخذ کی ہے۔

(Terrorism is) the in lawful use of..... threatened use of force or violence against individual or property to coerce or

intimidate government or societies, often to achieve political, religious or indeological objectives" [1]

''سیاسی یا نظریاتی مقاصد کے حصول کے لیے مختلف معاشروں، حکومتوں اور افراد کے خلاف غیر قانونی طور پر طاقت کا استعمال یا طاقت استعمال کی دھمکی دہشت گردی ہے۔''

گویا ذاتی مفاد کے لیے معاشروں، حکومتوں اور افراد کے خلاف غیر قانونی طور پر طاقت استعمال کرنے یا دھمکی دینے کا نام دہشت گردی۔ اسلام کی رو سے اس قسم کی کاروائیاں بھی حرام ہیں اور اس قسم کی کاروائیوں کو ناپسند قرار دیتا ہے۔ دنیا کا کوئی قانون اس قسم کی کاروائیوں کو جائز قرار نہیں دے گا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے اگر کسی ملک پر کوئی طاقت شدید بمباری اور مہلک ہتھیار استعمال کر کے عوام پر ظلم ڈھا کر قبضہ کر لے اور اس ملک کے عوام زمین دوز قیادت کے تحت اپنی سرزمین سے غیر طاقت کا قبضہ چھڑانے کے لیے زمین دوز مجاہدانہ کوشش یا ایک نظم و نسق کے تحت اپنے قائد کی ہدایت پر قابضین کے افراد پر خودکش حملے کر کے ان کی پریشانی کا باعث بنتے ہیں اور اپنے ملک سے غیروں کا قبضہ چھڑانے کی کوشش کرتے ہیں اس مقدس مقصد کے لیے اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کرتے ہیں یا کوئی ایسی تنظیم معرض وجود میں آ جاتی ہے جو کسی ملک کے کمزور طبقے عورتوں، بچوں، بوڑھوں کو آزادی دلانے اور ان کی تکالیف اور مصائب کو دور کرنے کے لیے ان کی معاون اور مددگار بنتی ہے کیا اس قسم کی تنظیم قائم کرنے والے دہشت گرد ہیں؟

ان سوالات کے متعلق مختلف قسم کے نظریات ہیں ایک تو اس قسم کی تمام کاروائیوں اور اس قسم کی تنظیموں کو ناجائز قرار دیتے ہیں اور دہشت گردی میں شامل کرتے ہیں۔ دوسرا نظریہ یہ ہے کہ اس قسم کی کاروائیاں اسلامی تعلیم کے مطابق ہیں اور وہ اس کو جہاد قرار دیتے ہیں۔

اسلام میں کسی معاملہ کو صحیح یا غلط پرکھنے کا پیمانہ صرف قرآن مجید ہے اب دیکھنا یہ ہے قرآن مجید اس قسم کی کاروائیوں کے متعلق کیا کہتا ہے۔ اس لیے پھر ہم ان آیات پر نظر دوڑاتے ہیں جو جہاد کے متعلق ہیں۔ پہلی آیت تو وہی ہے جس کا ذکر ابھی کیا ہے ارشاد الٰہی ہے۔ اُذِنَ لِلَّذِیْنَ یُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰی نَصْرِهِمْ لَقَدِیْرُ نِ الَّذِیْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِیَارِهِمْ بِغَیْرِ حَقٍّ اِلَّآ اَنْ یَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ وَلَوْ دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِیَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ یُذْكَرُ فِیْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِیْرًا وَلَیَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ یَّنْصُرُهٗ۔ [2]

---

[1] "The evolution of Islamic terrorism P.1 w.w.w state gov

[2] الحج ۲۲: ۳۹، ۴۰

یہ آیت واضح ثبوت ہے کہ مسلمانوں کی جنگیں دفاعی تھیں، ان کو اس وقت اجازت دی گئی جب ان کی بقاء اور زندگی خطرے میں تھی۔ کفار مسلمانوں کو ہستی کو مٹا دینے پر تلے ہوئے تھے مکہ میں ظلم وستم انفرادی تھا۔ دائرہ اسلام میں داخل ہونے پر تکالیف دی جاتی تھیں۔ جب مسلمان مدینہ میں ہجرت کر کے آ گئے تو کفار نے لشکر کشی کے ذریعہ اسلام اور مسلمانوں کو مٹا دینے کا تہیہ کر لیا۔ اس صورت میں بین الاقوامی قانون بھی یہی تقاضا کرتا ہے کہ اپنی قومی بقا اور ملکی سرحدوں کی حفاظت کے لیے لڑائی لڑی جائے۔

اسی طرح سورۃ الحج کی آیت ۴۰ میں اسلامی جنگوں کی غرض و غایت پر روشنی ڈالتی ہے کہ اسلامی حروب صرف مسلمانوں کی آزادی کے لیے ہی نہیں بلکہ تمام مذاہب کی آزادی کے لیے تھیں۔ جنگوں کی غرض و غایت تمام مذاہب کی عبادت گاہوں کی حفاظت، مظلومین کی حمایت اور مدد بیان کی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِينَ يَقُولُونَ رَبَّنَا أَخْرِجْنَا مِنْ هَٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ أَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ وَلِيًّا وَاجْعَلْ لَنَا مِنْ لَدُنْكَ نَصِيرًا (النساء:۷۵) اس آیت میں اسلامی جنگ کا کتنا بلند اور دور رس مقصد بیان کیا ہے کہ دنیا کے کسی خطہ میں مردوں اور عورتوں کے حقوق کی پامالی ہو رہی ہو۔ خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ مسلمانوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ ان مظلوم انسانوں کی مدد کی جائے۔

سورۃ الحج کی آیت ۴۰ میں ان لوگوں کو مدافعانہ جنگ کی اجازت دی گئی ہے جو مظلوم ہیں۔ ساتھ یہ بیان کیا ہے کہ اگر یہ مدافعانہ جنگیں نہ لڑی جائیں تو مذہب خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔

سورۃ النساء کی آیت ۷۵ میں یہ بیان کیا گیا ہے کہ غریب کمزور مظلوم لوگ دنیا کے کسی خطے میں ہوں اگر اپنی مدد کے لیے مسلمانوں کو پکاریں تو مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ اس مدد کے لیے نکل پڑیں۔

یہ ہے اسلام کی جنگوں کا فلسفہ یعنی امن قائم کرنا اور مظلوم عوام کی اعانت اب زمانہ قریب میں بعض ممالک پر استعمار پسند قوم نے محض اپنے ذاتی مفاد کی خاطر ظلم ڈھائے ہیں کیا ان کا اپنی آزادی کے لیے استعمار پسند قوم سے لڑنا دہشت گردی کہلائے گا اور کیا ان ممالک کے مظلوم لوگوں کا اپنی مدد کے لیے پکارنا اور کسی تنظیم کا ان مظلوموں کی مدد کرنا ناجائز ہے۔ قرآن مجید واضح طور پر اس بات کی اجازت دیتا ہے کہ مظلوموں کو اپنی آزادی کے حصول کے لیے لڑنا جائز ہے خواہ وہ لڑائی کی صورت میں ہو۔ مسئلہ صرف جارح قوم کے مظالم سے نجات ہے۔ نجات حاصل کرنے کے کئی طریقے ہیں۔ ان طریقوں میں سے ایک طریقہ خودکش حملے بھی ہیں۔ عراق، افغانستان، کشمیر اور فلسطین میں یہ خودکش حملے انفرادی نہیں ہیں بلکہ یہ تمام حملے اپنے ملک کے دفاع اور ظالموں کے پنجہ استبداد سے نجات حاصل کرنے کے لیے اپنے زیر زمین قائد اور حکمران کے حکم پر عمل کر رہے ہیں۔ اس قسم کی زیر زمین قائدین کے حکم پر کاروائیاں دہشت گردی کے زمرے میں نہیں آتیں۔ یہ تمام کاروائیاں سرفروشانہ اور مجاہدانہ افعال کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کاروائیوں میں تعمیر اور زندگی کی رمق پائی جاتی ہے اور مظلوم ظالم کا مقابلہ کر رہے ہیں۔

اور سورۃ الحج کی آیت ۴۰ اور دیگر قرآنی آیات کی عین روح کے مطابق ہیں۔ دوسرا مسئلہ ہے مظلوموں کی مدد کرنا۔ سورۃ النساء کی آیت ۷۵ واضح بیان کرتی ہے کہ مظلوموں کی مدد کرنا خواہ وہ کسی ملک کے باشندے ہوں خواہ وہ کسی مذہب سے تعلق رکھتے ہوں۔ ان کو پنجہ استبدادیت سے نجات دلانے اور ان کی حریت کی بحالی کے لیے ہر مسلمان کا فرض ہے اگر کوئی تنظیم دوسرے مظلوم ممالک کی مدد کے لیے جان فروشوں کو بھیجتی ہے اور وہ اپنی مرضی سے حصول رضائے الٰہی اور حکم خداوندی کے تحت جاتے ہیں یہ عمل بھی قرآن مجید کی تعلیم کے مطابق ہے کیونکہ وہ ایک قرآن کا حکم بجا لا رہے وہ مجاہدین کی صف میں شامل ہوں گے۔ ان کا اجر خدا کے پاس ہے جو لوگ ان سرفروشانہ کارروائیوں کو دہشت گردی قرار دیتے ہیں اگر انھوں نے نیک نیتی سے غور و خوض کرنے کے بعد یہ اجتہاد کیا ہے تو ان کا معاملہ تو خدا کے ساتھ ہے۔ میں ان کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا کیونکہ ان کا اجتہاد نیک نیتی پر مبنی ہے اگر کسی ملک کا حکمران محض استعمار پسند قوم کے حاکم کو خوش کرنے کے لیے مجاہدین کی سرگرمیوں کو کچلنے کے لیے اس کے ساتھ قدم بقدم چلتا ہے۔ ظالم حکمران کی آرزو کو پورا کرنے میں ہی اپنے حکمرانی عہدے کا تحفظ سمجھتا ہے۔ اس کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ تاریخ اس کو قوم کے غداروں میں شمار کرے گی۔ ماضی میں جن لوگوں نے جارح قوم کا ساتھ دیا وہ بھی یہی کہتے تھے کہ وقت کا یہی تقاضا ہے اور وہ جارح قوم سے انعام و اکرام کے متمنی تھے۔ ممکن ہے وہ اپنے تئیں درست ہی خیال کرتے ہوں لیکن تاریخ نے ان کی غداری کو معاف نہیں کیا۔ آج وہ تاریخ میں غدار کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں اور جن لوگوں نے کمزوری کے باوجود جارح اور ظالم قوم کا مقابلہ کیا اور لڑتے لڑتے جان دے دی تاریخ ان کو سنہری الفاظ میں یاد کرتی ہے۔

افغانستان، عراق، کشمیر اور فلسطین کے عوام کی سرفروشانہ کارروائیوں نے ان کو ایک زندہ قوم بنا دیا ہے۔ ان کی ان مجاہدانہ کارروائیوں کی وجہ سے مفاد پرست ظالم اور استعمار پسند قوم کے قدم دیگر ممالک پر حملہ کرنے سے رک گئے ہیں۔ اگر یہ لوگ اپنی زندگی کا نذرانہ نہ دیتے اور سرفروشانہ کارروائیاں نہ کرتے تو عین ممکن تھا وہ استعمار پسند قوم کئی دیگر ممالک پر چڑھائی کر دیتی اور ان کو تہ و بالا کر دیتی اے مجاہدانہ کارروائیوں کو دہشت گردی جاننے والو! وہ کارروائیاں تو دوسروں کی حفاظت کا ضامن بن رہی ہیں۔ ظالم قوم کے قدم رک گئے ہیں۔ اے مسلمانو! آؤ ہم استعمار پسند قوم کے سامنے بنیان مرصوص بن جائیں۔ دشمن مسلمانوں کی بیداری کو محسوس کر رہا ہے۔ اس بیداری کی لہر کو روکنے کے لیے پہلے بنیاد پرستی کا طعنہ دیا۔ جب یہ طعنہ بیدار عوام نے خوشی سے اپنے سینہ پر لگا لیا تو بنیاد پرستی کی اصطلاح کو چھوڑ کر دہشت گردی کی اصطلاح مجاہدانہ سرگرمیوں کو روکنے کے لیے اختراع کی۔ جبکہ دہشت گردی اور مجاہدانہ سرگرمیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے حالانکہ دہشت گردی کی تعریف کو سامنے رکھیں تو یہ تعریف استعمار پسند قوم پر ہی لاگو ہوتی ہے۔

تبلیغ (جہاد بالقلم واللسان)

تبلیغ جہاد کی ایک اعلیٰ قسم ہے۔ مسلح ہتھیار کے ذریعہ اگر دشمن کے حملوں کا دفاع کیا جاتا ہے اور اسلامی سرحدوں کی حفاظت کی جاتی ہے تو دلائل اور براہین کے ذریعہ اسلام کی سچائی اور حقانیت واضح کی جاتی ہے اور معترضین کے اعتراضات کا جواب دیا جاتا ہے۔ جتنا جہاد بالسیف ضروری ہے اتنا ہی جہاد بالقلم ضروری ہے۔

تبلیغ کے لغوی معنی انتہا یا آخری منزل تک پہنچانے کے ہیں۔ اسلامی اصطلاح میں تبلیغ سے مراد اللہ کے پیغام کو بنی نوع انسان تک پہنچانا ہے۔

قرآن مجید اور حدیث سے تبلیغ کی اہمیت اتنی ہی واضح معلوم ہوتی ہے۔ جتنی نماز اور روزہ کی اہمیت۔ افسوس مسلمان اس اہم فریضہ سے روگردانی کر کے تنزل اور ادبار کی انتہائی گہرائیوں میں جا گرے ہیں۔

تبلیغ کی اہمیت از روئے قرآن

قرآن مجید میں آتا ہے: قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ (یوسف ۱۲:۱۰۸) یعنی کہہ دیجئے یہ میرا راستہ ہے میں اللہ کی طرف بلاتا ہوں سمجھ بوجھ کر میں اور جو میری پیروی کرتے ہیں اور اللہ پاک ہے اور میں شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ دعوت الی اللہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا راستہ ہے جو شخص اس کام کو فرض منصبی نہیں سمجھتا وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راستے سے ہٹا ہوا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ (آل عمران ۳:۱۱۰) تم سب سے اچھی امت ہو جو لوگوں کی بھلائی اور بہبودی کے لیے پیدا کی گئی ہے۔ تم اچھے کاموں کا حکم دیتے ہو اور برے کاموں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

''للناس'' میں (ل انتفاع کے لیے ہے یعنی امت مسلمہ کا ظہور لوگوں کی بھلائی کے لیے ہے۔ بھلائی کی تشریح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے کی ہے یعنی تمہارا کام دنیا میں لوگوں کو نیکی کی طرف بلانا اور ان کو برائیوں سے روکنا ہے۔ تؤمنون باللہ کے الفاظ لا کر یہ ظاہر کیا ہے۔ داعی خود بھی

کمال نفس کا مالک ہو اور لوگوں کو جن امور کے کرنے اور جن امور سے مجتنب رہنے کا حکم دیتا ہے وہ خود بھی اس پر کاربند رہے۔

حدیث سے یہ امر واضح ہوتا ہے کہ امت مسلمہ خیرالامم ہے۔ چنانچہ امام احمد نے حدیث بیان کی ہے: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اُعْطِیْتُ مَالَمْ یُعْطَ اَحَدٌ مِنَ الْاَنْبِیَاءِ نُصِرْتُ بِالرُّعْبِ وَاُعْطِیْتُ مَفَاتِیْحَ الْاَرْضِ. سُمِّیْتُ اَحْمَدَ وَجُعِلَ التُّرَابُ لِی طَھُوْرًا وَجُعِلَتْ اُمَّتِی خَیْرَ الْاُمَمِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا مجھے وہ کچھ دیا گیا ہے جو اور کسی نبی کو نہیں دیا گیا۔ میری نصرت رعب سے کی گئی ہے اور مجھے زمین کے خزانے دیے گئے ہیں اور میرا نام احمد رکھا گیا ہے اور میرے لیے مٹی پاک کرنے والی بنائی گئی ہے' میری امت بہترین امت ہے۔

قرآن مجید کی آیت ظاہر کرتی ہے کہ امت مسلمہ کا خیرالامم ہونا نیکیوں کا حکم دینے اور برائیوں سے روکنے کی وجہ سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس امت کے علماء کو ورثۃ الانبیاء (انبیاء کے وارث)، کانبیاء بنی اسرائیل (بنی اسرائیل کے انبیاء کی طرح) کہا ہے۔

اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین ٹھہرایا ہے۔

پھر قرآن مجید میں آتا ہے: وَلْتَکُنْ مِنْکُمْ اُمَّۃٌ یَدْعُوْنَ اِلَی الْخَیْرِ وَیَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَیَنْھَوْنَ عَنِ الْمُنْکَرِ وَاُوْلٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ. (۱۰۳:۳) اور چاہیے کہ تم میں سے ایک گروہ ہو جو بھلائی کی طرف بلائے اور نیکی کے کاموں کا حکم دے اور برے کاموں سے روکے اور وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔

وَلْتَکُنْ مِنْکُمْ اُمَّۃٌ کہہ کر یُسر کے طور پر بتا دیا ہے کہ مسلمانوں میں ایک ایسا گروہ ضرور ہونا چاہیے جو تبلیغ کا کام سرانجام دے اس کی وجہ دوسری جگہ قرآن مجید میں فرمائی ہے: مَاکَانَ الْمُؤْمِنُوْنَ لِیَنْفِرُوْا کَآفَّۃً (توبہ ۱۲۲:۹) اور مومنوں کو یہ بھی مناسب نہیں کہ سب کے سب تبلیغ اسلام کی طرف نکل پڑیں۔

دعوت الی الخیر سے مراد دعوت الی القرآن ہے کیونکہ دوسری جگہ قرآن مجید کو خیر کہا گیا ہے۔

"مَایَوَدُّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْ اَھْلِ الْکِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِکِیْنَ اَنْ یُّنَزَّلَ عَلَیْکُمْ مِنْ خَیْرٍ مِنْ رَّبِّکُمْ (۱۰۵:۲) اہل کتاب میں سے جو کافر ہیں پسند نہیں کرتے اور نہ مشرک کہ تمھارے رب سے تم پر کوئی خیر اتاری جائے۔

وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ. (۱۰۳: ۱.....۳) قسم ہے وقت کی کہ انسان گھاٹے میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لاتے ہیں اور اچھے عمل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو

صبر کی نصیحت کرتے ہیں۔

اس مختصر سی صورت میں جن لوگوں کو خسران اور گھاٹے سے مستثنٰی کیا ہے وہ چار صفات کے مالک ہیں۔ ا۔ وہ عقائد صحیحہ کے مالک ہوتے ہیں۔ ۲۔ اعمال صالحہ کے زیور سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ۳۔ ایک دوسرے کو حق پہنچاتے ہیں۔ ۴۔ تمام دنیا کی مشکلات کا سامنا کر کے اطاعت الٰہی کی مضبوط چٹان پر کھڑے رہتے ہیں۔ اس سورت میں تواصوا بالحق کے الفاظ سے یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ انسان کی صرف یہی خوبی نہیں ہے کہ وہ خود حق کے بلند مینار پر کھڑا ہو جائے بلکہ حقیقی خوبی یہ ہے کہ وہ دوسروں کو بھی حق کی بلندی کی طرف لے جائے اور حق دعوت اسلام کا نام ہے۔

قرآن مجید میں دوسری جگہ آتا ہے: فَاذْكُرُونِي أَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي وَلَا تَكْفُرُونِ (۱۵۲:۲) پس مجھے یاد کرتے رہو میں تمھیں یاد رکھوں گا اور میری ناشکری نہ کرو۔ اس آیت میں مسلمانوں کی ترقی کا راز بیان کیا ہے کہ مسلمان اس وقت بڑے بن سکتے ہیں۔ جب وہ اللہ کے ذکر کو پھیلائیں گے۔ اللہ کا نام یاد کرنے سے مراد اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (حج ۲۲:۴۱) یعنی وہ لوگ جن کو ہم زمین پر صاحب اقتدار بناتے ہیں وہ نماز قائم کرتے ہیں' زکوۃ دیتے ہیں' بھلائی کا حکم دیتے ہیں' برائیوں سے روکتے ہیں۔ اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت پر تبلیغ اسلام فرض ہے۔

ارشاد الٰہی ہے۔ هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ (۹:۶۱) وہی ہے جس نے اپنا رسول ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تاکہ اسے سب دینوں پر غالب کرے۔

تبلیغ کی اہمیت ازروئے حدیث

عَنْ اَبِي هُرَيْرَةَ قَالَ قَالَ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِذَا عَظَمَتْ اُمَّتِي الدُّنْيَا نَزَعَتْ عَنْهَا هَيْبَةُ الْاِسْلَامِ وَاِذَا تَرَكَتِ الْاَمْرَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّهِي عَنِ الْمُنْكَرِ حُرِمَتْ بَرَكَةُ الْوَحْيِ وَاِذَا تَسَابَّتْ اُمَّتِي سَقَطَتْ مِنْ عَيْنِ اللّٰهِ. (ترمذی) حضرت ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جب میری امت دنیا کی عظمت میں کھو جائے گی تو اسلام کی ہیبت ان کے قلوب سے نکل جائے گی اور جب امر بالمعروف اور نہی المنکر کو ترک کر دے گی تو وحی کی برکات سے محروم ہو جائے گی۔ جب آپس میں ایک دوسرے کو سب وشتم دینا شروع کر دے گی تو اللہ کی نگاہ سے گر جائے گی۔

ابن مسعود سے روایت ہے کہ انھوں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ فرماتے سنا۔ نَضَّرَ اللّٰهُ اِمْرَأً سَمِعَ مِنَّا شَيْئًا فَبَلَّغَهٗ كَمَا سَمِعَهٗ فَرُبَّ مُبَلَّغٍ اَوْعٰى لَهٗ مِنْ سَامِعٍ کہ اللہ تعالیٰ اس آدمی

کو سرسبز اور کامیاب کرے جس نے ہم سے کوئی بات سنی پھر جس طرح اس کو سنا دوسروں تک پہنچا دیا کیونکہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ سننے والے سے جس کو حدیث پہنچائی گئی ہے وہ زیادہ محفوظ رکھنے والا ہوتا ہے۔

پھر لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: بَلِّغُوا عَنِّي وَلَوْ آيَةً یعنی مجھ سے پیغام حق بن کر لوگوں تک پہنچاؤ خواہ وہ ایک آیت ہی کیوں نہ ہو۔

ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: لِيُبَلِّغَ الْعِلْمَ الشَّاهِدُ الْغَائِبَ (بخاری ۳:۳۷) ان لوگوں تک میری علمی باتوں کو پہنچا دو جو میری مجلس میں موجود نہیں ہو سکتے۔

عَنِ الْمُغِيرَةِ عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَايَزَالُ نَاسٌ مِنْ أُمَّتِي ظَاهِرِيْنَ حَتّٰى يَأْتِيَهُمْ أَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ ظَاهِرُوْنَ (بخاری ۶:۲۸) حضرت مغیرہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے روایت کرتے ہیں آپ نے فرمایا کہ میری امت کے کچھ لوگ برابر غالب رہیں گے یہاں تک کہ اللہ کا امر ان کے پاس آ جائے اور وہ غالب آ جائیں۔

اس حدیث میں نَاسٌ مِنْ أُمَّتِي سے یہی مراد ہے یعنی وہ لوگ جو اعلائے کلمۃ اللہ کا کام کرتے ہیں خدا کے فیصلہ کے مطابق وہ غالب رہیں گے اور یہی قرآن مجید کی اس حدیث کی وضاحت اور تشریح ہے۔ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹:۶۹) اور جو لوگ ہمارے لیے جہاد کرتے ہیں ہم یقیناً انھیں اپنے رستوں پر چلائیں گے۔

سورہ آل عمران آیت ۱۰۳ میں بھی یہی بشارت دی گئی ہے وَأُولٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ وہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَاتَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ أُمَّتِي يُقَاتِلُوْنَ عَلَى الْحَقِّ ظَاهِرِيْنَ عَلٰى مَنْ نَاوَاهُمْ (مشکوٰۃ ۱۸ بروایت ابوداؤد) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میری امت سے ایک گروہ حق کے لیے لڑتا رہے گا اور وہ اس پر غالب رہیں گے جو ان کے ساتھ دشمنی کرے گا۔

عون المعبود میں یقاتلون کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے ''اس گروہ میں مومنوں کے مختلف طبقے شامل ہیں یعنی بہادر جنگ کرنے والے فقیہہ محدث، زاہد وہ جو نیکیوں کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں اور وہ لوگ جو نیک کام کرتے ہیں۔'' اس سے معلوم ہوا کہ شارحین حدیث نے نہ صرف لفظ جہاد کو اپنے وسیع معنی میں لیا ہے بلکہ قتال کے لفظ کو بھی صرف جنگ تک محدود نہیں کیا بلکہ اس میں ہر قسم کی خدمت اسلام کے کام کو شامل کیا ہے۔

اس لیے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جذبہ جہاد (تبلیغ) کو زندہ رکھنے کے لیے امت مسلمہ کو یہ بشارت دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اس امت کے لیے ہر صدی کے سر پر مجدد بھیجتا رہے گا جو

اس کے دین کی تجدید کرے گا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الفاظ یہ ہیں۔ اِنَّ اللّٰہَ یَبْعَثُ لِھٰذِہِ الْاُمَّۃِ عَلٰی رَأسِ کُلِّ مِائَۃِ سَنَۃٍ مَنْ یُّجَدِّدُ لَھَا دِیْنَھَا (ابوداؤد ۱،۳۶) اس وعدہ الٰہی کے مطابق ہر دور میں اس امت میں ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے ہیں جنھوں نے فریضہ تبلیغ سرانجام دیا۔ مسلمانوں میں جو قرآنی، کلامی، فقہی، حدیثی اور تصوف کی غلطیاں پیدا ہو گئی تھیں ان کو دور کیا، ان لوگوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ ہر وہ شخص جو تبلیغی کام کے لیے اپنی زندگی وقف کر دیتا ہے وہ اس حدیث کا مصداق ہے۔

اشاعت اسلام اور تبلیغ کا طریق کار

۱۔ عقیدہ کی اشاعت براہین اور دلائل کے زور سے ہونی چاہیے۔ اسلام میں کسی نظریہ کی اشاعت بزور شمشیر ناجائز ہے کیونکہ عقیدہ کا تعلق دل سے ہے تلوار کے زور سے جسم تو مطیع ومنقاد کیا جا سکتا ہے لیکن دل کو گرفت میں نہیں کیا جا سکتا۔ تلوار کی ضرب سے عقیدہ زبان سے تو کہلوایا جا سکتا ہے لیکن دل میں راسخ نہیں کیا جا سکتا اس لیے قرآن مجید نے اشاعت عقیدہ کا نہایت ہی عمدہ اصول مقرر کر دیا ہے۔ لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ دین کی تبلیغ میں کوئی جبر نہیں ہے۔

۔ اُدْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ وَجَادِلْھُمْ بِالَّتِیْ ھِیَ اَحْسَنُ اِنَّ رَبَّکَ ھُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِیْلِہٖ وَھُوَ اَعْلَمُ بِالْمُھْتَدِیْنَ. (نحل ۱۶:۱۲۵) یعنی اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت اور اچھے وعظ سے بلاؤ اور ان کے ساتھ عمدہ طریق کے ساتھ بحث کرو۔ تیرا رب خوب جانتا ہے جو اس کے راستہ سے گمراہ ہے وہ سیدھی راہ پر چلنے والے کو خوب جانتا ہے۔

اس آیت میں حکمت سے مراد مضبوط دلیل ہے عمدہ وعظ سے مراد یہ ہے کہ مبلغ اس خلوص، خیر خواہی اور نیک جذبات سے اپیل کرے کہ مخاطب کا شوق اور رغبت ابھر آئے اور حق کے ساتھ اس کا تعلق جذباتی بھی ہو جائے۔

اس کے بعد جدال کا ذکر آیا ہے۔ اگر تبادلہ خیالات میں بحث کی ضرورت پیش آ جائے تو عمدہ طریق سے بحث کی جائے جس سے دلوں میں نفرت کے جذبات پیدا نہ ہوں۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے: وَلَا تَسُبُّوا الَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ فَیَسُبُّوا اللّٰہَ عَدْوًا بِغَیْرِ عِلْمٍ اور ان کو برا بھلا نہ کہو جن کو اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔ مبادا بے علمی سے وہ اللہ کو گالیاں دیں۔

۳۔ مبلغ کے لیے یہ امر نہایت ضروری ہے کہ فلسفہ اسلام کی بنیاد صرف قرآن مجید پر رکھے۔ ہمارے پہلے متکلمین نے اپنے علم کلام کی بنیاد اپنے زمانہ کے فلسفہ پر رکھی۔ اس دور کے مشہور متکلم سرسید بھی اپنے علم کلام کی مغربی فلسفہ پر بنیاد رکھتے ہیں۔ دنیاوی فلسفے تو زمانہ کے حالات کے ساتھ ساتھ بدلتے رہتے ہیں لیکن اسلام ایک ایسا فلسفہ بیان کرتا ہے۔ جس میں کوئی تغیر نہیں۔ وہ ہر دور میں اپنی صداقت کا سکہ منواتا ہے۔ ایک وقت تھا کہ یورپ کے علماء نے مادہ کے ازلی ابدی ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی لیکن آج علماء یورپ نے اس نظریہ کے برعکس یہ ثابت کیا ہے کہ مادہ ازلی نہیں یہ تو بجلی کے مفردات سے پیدا ہوتا ہے اور وہ بجائے خود نیبولا سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور نیبولا ایتھر کی تاریک شعاعوں سے پیدا ہوتا ہے پھر ایتھر کی شعاعوں کا تجزیہ ہوا تو ان کا عدم وجود برابر ہو گیا کیونکہ ان کی ہستی محض علم حساب کی رو سے بنتی ہے۔ ورنہ درحقیقت کچھ بھی نہیں فقط انرجی ہی باقی رہ جاتی ہے۔ غرض کہ دنیاوی فلسفہ زمانہ کے حالات اور لوگوں کے خیالات کے بدلنے کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ اس وجہ سے علم کلام کی بنیاد اسی پر کھڑی کرنا سخت غلطی ہے۔

افسوس ہے کہ ہمارے اس دور کے متکلمین نے مغربی فلسفہ سے مرعوب ہو کر اسلام کے اصولوں کی صداقت مغربی فلسفہ کی روشنی میں پرکھنے کی کوشش کی ہے اور دُور از کار تاویلات سے کام لے کر اسلام کو سخت نقصان پہنچایا ہے اس وجہ سے مبلغ کے لیے یہ بات ضروری ہے کہ وہ اپنے علم کلام کی بنیاد صرف اور صرف قرآن مجید پر رکھے۔ کیونکہ قرآن کے مسلمات نہ عقل کے خلاف ہیں اور نہ نیچر کے۔

تبلیغ اسلام ایک یا چند متفرق آدمیوں کی مساعی سے نہیں ہو سکتی۔ تبلیغ یا تو حکومت کی سرپرستی سے ہو گی یا ایک منظم جماعت کے ذریعہ جس کا ایک امیر ہو مضبوط فنڈ ہو دینی مدارس ہوں جہاں سے مبلغ تیار ہو سکیں۔ جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰہِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (آل عمران ۳:۱۰۳) اور سب کے سب ایک مرکزی نقطہ (قرآن) پر جمع ہو جاؤ اور تفرقہ نہ کرو۔

اس آیت میں ان تمام امور سے مجتنب رہنے کی تعلیم دی ہے جن سے شیرازہ بندی بکھرتی ہو۔ مسلمانوں میں انتشار اور تفرقہ کا باعث کفر بازی ہے۔ علماء نے غیر مسلموں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کی بجائے اپنے بھائی مسلمانوں کو محض فروعی اختلافات کی بناء پر کفر بازی سے دائرہ اسلام سے خارج قرار دیا ہے پس تبلیغ اسلام کے لیے میدان عمل میں نکلنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ علماء اسلام اپنے فروعی اختلافات کو مٹا دیں اور اسلام کے بنیادی

اصولوں پر متحد ہو کر میدان میں نکلیں۔ قرآن مجید تفرقہ بازی کو مشرکین کی علامت قرار دیتا ہے۔ چنانچہ ارشاد الٰہی ہے: وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا شِيَعًا كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ (روم۳۰: ۳۱،۳۲) اور اس (خدا) کا تقویٰ کرو اور نماز قائم کرو اور مشرکوں سے نہ بنو جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور فرقے فرقے بن گئے۔ ہر گروہ جو اس کے پاس ہے اس پر خوش ہو رہا ہے۔

یہ مسلمہ امر ہے کہ خرابیوں کے جراثیم بھی اونچے طبقے سے نچلے طبقہ میں سرایت کرتے ہیں اور اس کے برعکس اگر اوپر کے طبقہ کی اصلاح ہو جائے تو نچلا طبقہ خود بخود ٹھیک ہوتا چلا جاتا ہے۔ اس وجہ سے پہلے بااثر طبقے کو ہی حق کے طرف دعوت دینی چاہیے۔ دوسری وجہ یہ ہے کسی علمی نظریہ کو دوسروں تک پہنچانے اور مقبول بنانے کے لیے دو چیزوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے:

اوّل: مال؛ اور

دوم: قائدانہ صلاحیت رکھنے والے افراد۔

یہ دونوں چیزیں خواص الناس سے ہی ملیں گی۔

۶۔ اسلام کی تبلیغ کرتے وقت ہمیشہ اسلام کی خوبیاں اور اوصاف بیان کرنے چاہئیں۔ دوسرے مذاہب کے مشنریوں کی طرح یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اپنا دامن گراں بہا قیمتی موتیوں سے تہی ہونے کی وجہ سے دوسروں کے جواہرات کو خزف اور پتھر کہنا شروع کر دے۔ اس طرح طبائع قبول حق کرنے کی بجائے نفرت کرنا شروع کر دیتی ہیں۔

۷۔ تبلیغ کرتے وقت ایک خاص تدریج اور ترتیب کا اہتمام ضروری ہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام نے دعوت حق میں توحید اور عبادت الٰہی کو مقدم کیا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جب سلاطین کو تبلیغی خطوط لکھے تو قرآن مجید کی یہ آیت لکھی: يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْـًٔا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَقُوْلُوا اشْهَدُوْا بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ (ال عمران: ۶۴) اے اہل کتاب ایک ایسے کلمہ کی طرف آؤ۔ جو ہمارے اور تمھارے درمیان مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائیں اور ہمارا بعض بعض کو اللہ کے سوا رب نہ بنائے۔ اگر وہ پھر جائیں پس تم کہو کہ گواہ رہنا کہ ہم فرمانبردار ہیں۔

حضرت ابن عباسؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو تبلیغی مشن پر یمن بھیجا۔ آپ نے فرمایا: اُدْعُهُمْ اِلٰی شَهَادَةِ اَنْ لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ اَنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لِذٰلِکَ فَاَعْلِمْهُمْ اَنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَیْهِمْ خَمْسَ صَلٰوتٍ فِیْ کُلِّ یَوْمٍ وَلَیْلَةٍ فَاِنْ هُمْ اَطَاعُوْا لَکَ فَاَعْلِمْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ افْتَرَضَ عَلَیْهِمْ صَدَقَةً فِیْ اَمْوَالِهِمْ تُؤْخَذُ مِنْ اَغْنِیَاءِ هِمْ وَتُرَدُّ فِیْ فُقَرَائِهِمْ. (بخاری کتاب الزکوۃ ۲۴ ۲:۲۴۴) تو انھیں دعوت دو کہ وہ گواہی دیں کہ اللہ کے سوائے کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اگر وہ ایسا مان جائیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے دن رات میں ان پر پانچ نمازیں فرض کی ہیں اور اگر وہ یہ بھی مان لیں تو انھیں بتاؤ کہ اللہ نے ان کے مالوں میں ان پر صدقہ فرض کیا ہے جو ان کے مال داروں سے لیا جائے گا اور ان کے محتاجوں کو دیا جائے گا۔

یہ ہے دعوت کا تدریجی طریقہ کہ پہلے اللہ کی توحید اور رسالت منوائی جائے پھر نماز کے لیے کہا جائے پھر زکوۃ کے لیے اس کے بعد دوسرے ارکان اسلام کی تبلیغ کی جائے۔

۸۔ اسلام ایک فطری دین ہے اس لیے اس کے احکام اور تعلیم میں کسی قسم کا عسر اور سختی نہیں ہے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: لاَ یُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلاَّ وُسْعَهَا اللہ تعالیٰ کسی شخص کو احکام الٰہی کے ادا کرنے میں اتنی تکلیف نہیں کہ وہ برداشت سے باہر ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے: یُرِیْدُ اللّٰهُ بِکُمُ الْیُسْرَ وَلاَ یُرِیْدُ بِکُمُ الْعُسْرَ (بقرہ: ۱۸۵) یعنی اللہ تمھارے ساتھ آسانی پیدا کرنا چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: بُعِثْتُ بالحنیفیة السَّمْحَةِ یعنی میں سہل مذہب لے کر مبعوث ہوا ہوں۔

ایک اور حدیث ہے: اِنَّ الدِّیْنَ یُسْرٌ وَ مَنْ یُّشَادَّ الدِّیْنَ اَحَدٌ اِلاَّ غَلَبَهٗ (بخاری۔ مشکوٰۃ) یعنی دین آسان ہے اور جو شخص دین میں مبالغہ کرتا ہے اس پر وہ غالب آ جاتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کو تبلیغی مشن پر بھیجتے تو ہدایت فرمایا کرتے تھے: فَبَشِّرُوْا وَلاَ تُنَفِّرُوْا وَیَسِّرُوْا وَلاَ تُعَسِّرُوْا پس مبلغ کو اسلام اس رنگ میں پیش کرنا چاہیے کہ پڑھنے والے کا دل بول اٹھے کہ یہ تعلیم عین فطرت کے مطابق ہے۔

مبلغ کے اوصاف

صحیح العقائد

مبلغ کا پہلا وصف یہ ہونا چاہیے کہ وہ صحیح العقائد ہو اور اسلام پر دل و جان سے ایمان

لائے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ[1] تم بہترین گروہ ہو۔ جسے انسانوں کے فائدے کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تم نیکیوں کا حکم دیتے ہو اور برائیوں سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

اس آیت کریمہ میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ساتھ ایمان باللہ کا ذکر کر کے صحیح عقائد اور صحیح ایمان کی اہمیت بیان کی ہے۔

دوسری جگہ آتا ہے: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ[2] رسول ایمان لایا اس پر جو اس کے رب کی طرف سے اتارا گیا اور مومن بھی ایمان لائے۔

حق کی بصیرت

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِیْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ[3] اے رسول! کہہ دیجئے کہ میرا راستہ تو یہ ہے اور میں علیٰ وجہ البصیرت خدا کی طرف دعوت دے رہا ہوں اور وہ لوگ بھی جو میری اتباع میں کام کر رہے ہیں۔

عالم باعمل

مبلغ کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ خود بھی اسلام کی تعلیم پر عمل کرنے والا ہو جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ[4] کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھلا دیتے ہو۔

دوسری جگہ آتا ہے: لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ[5] تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو خود نہیں کرتے۔

بے لوث خدمت اسلام

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا[6] ان سے کہہ دیجئے کہ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں چاہتا۔ سوائے اس کے جو چاہے اپنے رب کا راستہ اختیار کرے۔

خدا کی نصرت پر یقین کامل

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ[7] اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو اگر تم اللہ کی مدد کرو گے تو اللہ تمہاری مدد کرے گا اور تمہارے قدموں کو مضبوط کرے گا۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ[8] جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں۔ ہم ان کو اپنے راستہ کی ہدایت دیتے ہیں اور یقیناً اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

1۔ آل عمران ۳: ۱۱۰۔ 2۔ البقرہ ۲: ۲۸۵۔ 3۔ یوسف ۱۲: ۱۰۸۔ 4۔ البقرہ ۲: ۴۴۔
5۔ الصف ۶۱: ۲۔ 6۔ الفرقان ۲۵: ۵۷۔ 7۔ محمد ۴۷: ۷۔ 8۔ عنکبوت ۲۹: ۶۹۔

قلبی تڑپ

فَلَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ عَلٰی آثَارِھِمْ اِنْ لَّمْ یُؤْمِنُوْا بِھٰذَا الْحَدِیْثِ اَسَفًا [1] اے رسول! شاید آپ ان کے پیچھے غم کے مارے اپنی جان ہلاک کر دیں گے اگر یہ اس تعلیم پر ایمان نہ لائے۔

باوقار شخصیت

مبلغ ایک باوقار شخصیت کا مالک ہونا چاہیے اور مخالف اس کو ہلکانہ سمجھیں ارشاد الٰہی ہے: وَلَا یَسْتَخِفَّنَّکَ الَّذِیْنَ لَا یُوْقِنُوْنَ [2] اور ہلکانہ پائیں تم کو وہ لوگ جو یقین نہیں کرتے۔

تعصب سے بالا

مبلغ کو تعصب سے بالاتر ہونا چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے: یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰہِ شُھَدَاءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰی اَلَّا تَعْدِلُوْا [3] اے ایمان والو! اللہ کے لیے حق کی شہادت دینے والے بن جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تمہیں بے انصافی پر نہ ابھارے۔

علم

مبلغ کو دین کے علم سے آراستہ ہو کر میدان تبلیغ میں جانا چاہیے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: قُلْ ھَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ [4] کہہ دیجیے کیا علم والے اور جاہل برابر ہو سکتے ہیں۔

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ کُلِّ فِرْقَۃٍ مِّنْھُمْ طَائِفَۃٌ لِّیَتَفَقَّھُوْا فِی الدِّیْنِ وَلِیُنْذِرُوْا قَوْمَھُمْ اِذَا رَجَعُوْا اِلَیْھِمْ لَعَلَّھُمْ یَحْذَرُوْنَ [5] ایسا کیوں نہ ہو کہ ان کی ہر ایک جماعت میں سے ایک گروہ نکلے تاکہ وہ دین میں سمجھ حاصل کرے اور یہ لوگ اپنی قوم کو ڈرائیں جب ان کے پاس آئیں تاکہ لوگ بچیں۔

علم ہی ایک ایسا وصف ہے جو مبلغ کو افراط اور تفریط کا شکار نہیں ہونے دیتا تاریخ اس بات پر شاہد ہے کہ مذہب میں اس وقت بگاڑ پیدا ہوا جب علم اٹھ گیا اور لوگوں نے افراط اور تفریط کے راستے اختیار کر لیے۔

استقامت اور صبر

زندگی کے ہر شعبہ میں کامیابی کی کلید استقامت اور صبر ہے۔ اس وجہ سے مبلغ کی کامیابی کا راز استقامت اور صبر میں ہے ارشاد ہے: اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَیْھِمُ الْمَلٰئِکَۃُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّۃِ الَّتِیْ کُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُکُمْ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَۃِ [6]

---

[1] الکہف ۱۸: ۶۔ [2] الروم ۳۰: ۶۰۔ [3] المائدہ ۵: ۸۔
[4] الزمر ۳۹: ۹۔ [5] التوبہ ۹: ۱۲۲۔ [6] حم السجدہ ۴۱: ۳۰۔

یعنی وہ لوگ جنھوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے پھر استقامت اختیار کی۔ پھر ہر قسم کی تکلیف مصیبت اور آزمائش کے وقت ثابت قدم رہے ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ تم مت ڈرو اور مت غمگین ہو۔ تم کو جنت اور دائمی خوشی کی بشارت ہے۔ جس کا تمھیں وعدہ دیا گیا ہے ہم دنیا اور آخرت کی زندگی میں تمھارے دوست ہیں۔

وَاسْتَعِينُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ (بقرہ ۲:۴۵) صبر اور نماز سے مدد حاصل کرو۔

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ (احقاف ۴۶:۳۵) صبر کیجئے جس طرح صاحب عزم رسولوں نے صبر کیا۔

وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (بقرہ) جو لوگ تکلیف میں اور تنگی میں اور لڑائی میں صبر سے کام لیتے ہیں وہی ہیں جنھوں نے سچ کر دکھایا اور یہی لوگ متقی ہیں۔

قیام لیل (تہجد کا پڑھنا)

مبلغ کے لیے تہجد پڑھنا ضروری ہے جب اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے مبعوث فرمایا تو اس کے ساتھ ہی قیام لیل کا حکم دیا۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا اَوْ زِدْ عَلَيْهِ[1] اے کپڑا اوڑھنے والے رات کو نماز تہجد کے لیے کھڑا ہو سوائے تھوڑے حصے کے یعنی اس کا آدھا یا اس سے کچھ کم یا اس پر بڑھا۔

دل کی تطہیر

جب اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کندھوں پر لوگوں تک پیغام حق پہنچانے کا بوجھ ڈالا تو اس وقت فرمایا: وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ وَالرُّجْزَ فَاهْجُرْ[2] یعنی اپنے کپڑوں کو پاک رکھ اور ناپاکی کو چھوڑ دے۔ ثیاب سے مراد لباس بھی ہو سکتا ہے اور کنایہ کے طور پر دل بھی۔ تطہیر ثیاب کے معنی ابن عباس اور عکرمہ سے یہ مروی ہیں کہ اللہ کی معصیت کا لباس مت اوڑھ۔ ابن عباس سے بھی یہی معنی بیان ہوئے ہیں۔ عرب مطہر الثیاب اس شخص کو کہتے تھے جو عہد کو پورا کرے اور لوگوں میں اصلاح کرے۔ اچھے عمل کرنے والے کو بھی طاہر الثیاب کہتے ہیں۔ (ابن جریر)

اس آیت میں ظاہر اور باطن دونوں کی صفائی مراد ہے۔ پس مبلغ کے لیے دل کی طہارت ضروری ہے۔

دعا

مبلغ جب میدان تبلیغ میں نکل پڑے تو وہ ہر وقت اپنے رب کو یاد کرتا رہے اور اس کی طرف

1. مزمل ۷۳:۱۔۴۔
2. المدثر ۷۴:۴۔

جھکا رہے کیونکہ دعا سے اللہ تعالیٰ کی معرفت بڑھتی ہے۔ دعا ہی وہ ہتھیار ہے۔ جس کے ذریعہ غیب سے کامیابی کے دروازے کھلتے ہیں اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ مجھ سے دعا کرو میں تمہاری دعا قبول کروں گا۔

دوسری جگہ آتا ہے: وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا (۷۳:۸) اپنے رب کے نام کی بڑائی کر اور اس کی طرف متوجہ ہو جا۔

مبلغ کے فرائض

۱۔ اسلام کا چشمہ اور اصل الاصول قرآن مجید ہے۔ اس سرچشمہ سے زندگی تر و تازہ ہوتی ہے اور اسی اصل سے اسلام کی تمام شاخیں برآمد ہوتی ہیں۔ اس وجہ سے مبلغ کو میدان تبلیغ میں قرآن مجید کو ہی اصل الاصول ٹھہرانا چاہیے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور صحابہ کرام قرآن مجید کی تعلیم کی اشاعت کو ہی اپنا فرض منصبی سمجھتے تھے۔ قرآن مجید میں آتا ہے: فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ (ق ۵۰:۴۵) سو تو قرآن کے ساتھ نصیحت کر جو میرے وعدہ عذاب سے ڈرتا ہے۔

۲۔ مبلغ کا مزاج امور دین میں اتنا پختہ اور راسخ ہونا چاہیے کہ وہ کسی پہلو سے بھی افراط اور تفریط کا شکار نہ ہو سکے۔ قرآن مجید میں افراط اور تفریط کی لغزش سے بچنے کے لیے اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ کی دعا سکھائی ہے۔ اے خدا ہمیں سیدھے راستہ کی ہدایت دے۔ صراط مستقیم وہ راستہ ہوتا ہے جو افراط اور تفریط سے مبرا اور پاک ہو۔ پھر ساتھ ہی مغضوب علیھم اور ضالین (یہود اور نصاریٰ) کا ذکر کر دیا ہے جو افراط اور تفریط کے راستہ پر گامزن ہوئے تھے۔ اس بات کی وضاحت قرآن مجید نے لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ (یعنی اپنے دین میں غلو نہ کرو) کے الفاظ میں کر دی ہے۔

۳۔ مبلغ کو ان تمام امور سے مجتنب رہنا چاہیے جن سے دین میں تفرقہ پڑتا ہو۔ مثلاً تکفیر بازی یہ وہ خطرناک روش ہے جس پر علماء نے مل کر دین اسلام کو پارہ پارہ کر دیا ہے اور اسلام کے رخ زیبا کو کفر کے فتووں سے داغ دار کر دیا ہے۔ قرآن مجید انتشار پسندی کا شدید مخالف اور اتفاق اور اتحاد کا حامی ہے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا اے مسلمانو! اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو اور انتشار کا شکار نہ ہو جانا۔ دوسری جگہ آتا ہے: اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ (شوریٰ ۴۲:۱۳) دین کو قائم کرو اور اس میں تفرقہ نہ ڈالو۔

۴۔ مبلغ غیر مذاہب کے لوگوں کو مہذبانہ طریقہ سے دعوت اسلام دے تاکہ ان کے دل اسلام کی صداقت کے لیے کھل جائیں۔ بعض اوقات مبلغ کی سخت اور تیز کلامی اسلام کے قبول کرنے میں مانع جاتی ہے قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَا تُجَادِلُوْا اَهْلَ الْكِتَابِ اِلَّا بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ اِلَّا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ (۲۹:۴۶) اور اہل کتاب سے جھگڑا نہ کرو مگر اچھے طریقہ سے سوائے اس کے جو ان میں سے ظالم ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام کو تبلیغ حق کے لیے فرعون کے پاس جانے کی ہدایت کی تو ساتھ ہی تبلیغ حق کا طریق بھی بتایا۔ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰى (طٰہٰ ۲۰:۴۴) سو اسے نرم بات کہو شاید وہ نصیحت پکڑے اور ڈر جائے۔ پھر قرآن مجید میں آتا ہے: اُدْعُ اِلٰى سَبِیْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (۱۶:۱۲۵) تو اپنے رب کے راستہ کی طرف حکمت اور عمدہ نصیحت کے ساتھ بلا اور ان سے مہذبانہ طریق سے بحث کر۔

غلط تبلیغ اور اس کی اصلاح

اوّل تو مسلمانوں میں نہ اشاعت اسلام کا شوق باقی رہا ہے نہ اس کی اہمیت سے آگاہ ہیں۔ دنیا کے نقشہ پر کتنی اسلامی ریاستیں ہیں لیکن ایک بھی ایسی ریاست نہیں ہے جس نے فریضہ تبلیغ کی سرانجام دہی کے لیے اپنے بجٹ میں باقاعدہ رقم مخصوص کی ہو۔ اسی طرح کتنی مذہبی تنظیمیں ہیں جو لاکھوں روپے سادہ لوح مسلمانوں کی جیبوں سے غصب کر کے اپنے ذاتی مفاد پر خرچ کر رہی ہیں۔ بعض مذہبی جماعتوں کے ایسے بھی سربراہ ہیں اور گزرے ہیں جو کہ کوڑیوں سے کروڑ پتی بن چکے ہیں۔ انھوں نے صرف غریب افراد جماعت کے خون پسینہ کی کمائی ہوئی دولت ہی نہیں چھینی بلکہ اپنی شہوانی حرص کو پورا کرنے کے لیے بے شمار معصوم عورتوں کی آبروئیں بھی لوٹی ہیں۔ اگر ایسی جماعت کے افراد نے صدائے احتجاج بلند کی اور اپنی لٹی ہوئی آبرو پر واویلا کیا تو درندہ صفت نام نہاد مذہبی لٹیروں نے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اپنے مریدوں سے کہا کہ احتجاج کرنے والوں کا سوشل بائی کاٹ کر دو۔ جب ان کو دیکھیں تو لاحول پڑھیں۔ سادہ لوح مریدوں نے اپنے پیر کی آواز پر صرف لبیک ہی نہیں کہا بلکہ احتجاجی کو قتل کر کے ہمیشہ کے لیے موت کی گود میں سلا دیا تاکہ ان کا مرشد راضی ہو۔

ہمارے ملک میں اب بھی سبائی قسم کی تحریکوں کا وجود ہے ان تحریکات کا سب سے بڑا نقص

یہ ہوتا ہے کہ جب یہ تحریکات اپنے افعال شنیعہ کی وجہ سے ننگی ہو جاتی ہیں تو لوگ دہریت اور الحاد کا شکار ہو جاتے ہیں اشتراکیت چرچ کی خرابیوں کا ہی ردعمل ہے۔ اسلامی حکومتوں کا یہ فرض ہے کہ وہ ہر مذہبی تحریک کا ژرف نگاہی سے مطالعہ کریں۔ ان کے پروگراموں پر کڑی نگرانی رکھیں۔ ان کے سربراہوں کی دولت اور چال چلن کا سختی سے محاسبہ کرتی رہیں۔

میں پھر اپنے موضوع کی طرف رجوع کر کے اسلامی ریاستوں کے سربراہوں کی خدمت میں اپیل کرتا ہوں کہ اشاعت اسلام کے فرض منصبی کو کماحقہ ادا کریں قرآن مجید کی رو سے ہر ایک اسلامی ریاست کا فرض ہے کہ تبلیغ کے اہم فریضہ کو سرانجام دے۔

پاکستان یا دوسرے اسلامی ممالک میں جو مذہبی جماعتیں تبلیغ کرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ وہ غلط راستہ پر گامزن ہیں۔ ان جماعتوں کے نزدیک تبلیغ صرف اس بات کا نام ہے کہ کسی دوسری جماعت کو کافر کہہ دے۔ یا کسی فروعی مسئلہ کو دین کا عین جزو قرار دے کر اپنے سیاسی پروگرام کی راہ ہموار کرے یا کسی ایک بیرونی حکومت کے سیاسی نظریات کی جڑوں کو اپنے ملک میں مضبوط گاڑنے کے لیے سیاست کی پرخار وادی میں داخل ہو کر اسلام کی آڑ میں ان کے نظریات کی ترویج کرتی پھرے اور اس کو اجتہاد کا نام دے۔ یا اپنے نام نہاد مذہبی سربراہوں کے کارناموں کی ترویج کرتی پھرے اور ان کی بیعت کو جزو ایمان قرار دے۔ یہ تمام چیزیں بدعت اور گمراہی کا موجب ہیں اور مسلمانوں میں تفرقہ کا موجب ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دائرہ تبلیغ دو حصوں میں منقسم تھا۔ ایک حصہ مسلمانوں کی اصلاح اور تعلیم اور دوسرا حصہ غیر مذاہب کو دعوت حق کے ابلاغ پر مشتمل ہے۔ حصہ اوّل کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے: هُوَ الَّذِیْ بَعَثَ فِی الْاُمِّیّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ یَتْلُوْا عَلَیْهِمْ اٰیٰتِهٖ وَیُزَكِّیْهِمْ وَیُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَاِنْ كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ (الجمعۃ ۶۲:۲) وہ خدا جس نے امیوں میں ایک رسول بھیجا جو ان پر خدا کی آیات تلاوت کرتا ہے ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انھیں کتاب اور حکمت سکھاتا ہے اگرچہ اس سے پہلے یہ لوگ کھلی کھلی گمراہی میں تھے۔

اس آیت کریمہ میں موضوع تبلیغ چار بیان کیے ہیں:

۱۔ تلاوت آیات۔ ۲۔ تزکیہ نفس۔ ۳۔ تعلیم کتاب۔ ۴۔ تعلیم حکمت۔

غیر مذاہب کے لوگوں کے لیے نحن تبلیغ توحید اور صداقت رسالت ہوتا تھا۔

قرآن مجید میں آتا ہے: یٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَیْــٴًـا (النساء ۴:۶۴) اے اہل کتاب آؤ ہم اس ایک امر پر جمع ہو جائیں جو ہمارے

اور تمھارے درمیان مشترک ہے وہ یہ ہے کہ ہم سوائے اللہ کے کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں۔ یہ وہ مشہور آیت ہے کہ جب آپ نے سلاطین کو تبلیغی خطوط ارسال کیے تھے تو اس آیت کو موضوع خط بنایا تھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب کسی صحابی کو تبلیغی مشن پر بھیجتے تو یہ ہدایت فرماتے کہ پہلے مخالفین کو توحید کی طرف بلانا۔ جب وہ توحید کو مان جائیں تو پھر رسالت کو پیش کرنا رسالت کو مان جائیں تو پھر ان سے کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان پر دن رات میں پانچ نمازیں فرض کی ہیں۔ جب یہ بھی مان جائیں تو پھر ان سے کہنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مالوں میں غرباء کے لیے زکوۃ فرض کی ہے۔

یہ ہیں وہ تبلیغ کے دو حصے جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عمل سے ثابت ہیں۔

افسوس اس امر کا ہے کہ ہمارے علماء نہ تو عوام کے اخلاق کو سنوارنے کی کوشش کرتے ہیں اور نہ ان کو اسلام کی صحیح تعلیم سے روشناس کراتے ہیں بلکہ تکفیر بازی اور فروعی اختلافات میں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہیں اور نام نہاد مسلم مشنری صرف اپنے کسی گزرے ہوئے بزرگ اور فرقہ کی تبلیغ کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

ریاست اور فرد

مملکت اور افراد کے تعلق کے بارہ میں مختلف نظریے ہیں۔

ا۔ نظریہ وحدت (Monistic Theory)

افراد مملکت کا جزو ہیں۔ اور اپنا کوئی الگ وجود نہیں رکھتے۔

۲۔ نظریہ افرادیت (Mohadistic Theory)

مملکت افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان میں حقیقی وحدت نہیں ہے۔

۳۔ نظریہ ثنویت (Dualistic Theory)

افراد اور مملکت کا الگ الگ وجود ہے اور وہ صرف اپنی مرفہ الحالی اور بہبود کے لیے مملکت کے محتاج ہوتے ہیں۔

۴۔ نظریہ نامیت (Organic Theory)

مملکت اور افراد کی مثال جسم اور اس کے جوارح کی ہے۔ جسم اعضاء کے مجموعے کا نام ہے لیکن خود عضو نہیں اور جوارح جسم کے ذریعہ ہی زندہ رہ سکتے ہیں لیکن عضو فی ذاتہ جسم نہیں ہیں۔

۵۔ نظریہ افادیت (Utilitarian Theory)

مملکت کا وجود افراد کی خوشحالی اور بہبودی کے لیے ہے۔

۶۔ نظریہ مطلقیت (Absolute or Idealisim Theory)

مملکت اپنا مستقل وجود رکھتی ہے اور افراد اس کے تابع ہوتے ہیں۔ مملکت کے مقابلہ میں فرد کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ یہ تمام نظریات افراط اور تفریط کا شکار ہیں۔ یا تو افراد کو مملکت کے بالکل تابع کر دیا گیا ہے یا مملکت کو افراد کے تابع۔ اسلام کا نظریہ افراط اور تفریط سے پاک ہے اسلام مملکت کی فرمانبرداری کی اس وقت تک تعلیم دیتا ہے جب تک مملکت قانون کے تابع ہے۔ اگر حکومت قانون

سے سرمو انحراف کرے تو عوام کو حکمران طبقہ سے اقتدار چھین کر ان لوگوں کے سپرد کر دینے کا کلی اختیار ہے جو اس کے اہل ہیں۔

قرآن مجید میں آتا ہے۔ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِى الْاَمْرِ مِنْكُمْ فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِىْ شَىْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَى اللّٰهِ الرَّسُوْلِ[1] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اور اپنے میں سے صاحب امر کی اطاعت کرو۔ پھر اگر کسی چیز میں باہم جھگڑا کرو تو اسے اللہ اور رسول کی طرف پھیر دو۔

اس آیت کریمہ میں مملکت کی اطاعت مشروط قرار دی ہے۔ جب تک مملکت مفاد عامہ کا خیال رکھے۔ عوام کا یہ فرض ہے کہ وہ مملکت کے احکام کی اطاعت کریں۔ اگر حکمران طبقہ خود غرضی اور معصیت اور قانون شکنی کا شکار ہو جائے تو عوام پر اطاعت لازم نہیں رہتی۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: عَلَى الْمَرْءِ الْمُسْلِمِ اَلسَّمْعُ وَالطَّاعَةُ فِيْمَا اَحَبَّ اَوْ كَرِهَ اِلَّا اَنْ يُّوْمَرَ بِمَعْصِيَةٍ فَاِنْ اُمِرَ بِمَعْصِيَةٍ فَلَا سَمْعَ وَلَا طَاعَةَ.[2] ہر مسلمان مرد پر سمع و طاعت فرض ہے۔ خواہ وہ خوشی سے کرے یا ناپسندیدگی سے تاوقتیکہ اس کو گناہ کا حکم نہ دیا جائے۔ اگر گناہ کا حکم دیا جائے تو نہ سمع ہے اور نہ طاعت۔

حضرت ابوبکرؓ نے اپنے پہلے خطبہ میں فرمایا: فَاِنْ اَحْسَنْتُ فَاَعِيْنُوْنِىْ وَاِنْ اَنَازِغْتُ فَقَوِّمُوْنِىْ.[3] اگر میں نیکی کروں تو میری مدد کرو اگر کجی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کرو۔

آیت کریمہ اور احادیث نبوی سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اسلام میں نہ تو حکمران طبقہ کلی طور پر مختار ہے کہ جو چاہے کرے اور عوام ان کا حکم مانتے چلے جائیں اور نہ عوام کو یہ کلی اختیار حاصل ہے کہ جب چاہیں حکمران طبقہ کے خلاف اُٹھ کر ان سے زمامِ اقتدار چھین لیں۔ اس لیے اسلام کہتا ہے:

> ''اگر حکومت مفاد عامہ سے ربط و ضبط رکھتی ہے۔ تو عوام اس حکومت سے مکمل تعاون کریں اور عوام کو یہ حق دیا ہے کہ اگر حکومت ان کے مفاد کا خیال نہیں رکھتی تو حکمران طبقہ سے زمامِ اقتدار لے کر اہل طبقہ کے سپرد کریں۔''

سیّد شریف لکھتے ہیں:

> ''اگر مسلمانوں کے کام درست طریقہ پر انجام نہ پائیں' اور دین کے معاملات

1۔ النساء ۴:۵۹۔ 2۔ مسلم باب الجہاد۔ 3۔ کتاب الاموال لابی عبید۔

میں خرابی کی صورت نظر آئے تو امت امام کو عہدہ سے علیحدہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اجتماعی نظم ونسق کے لیے امام کا تقرر بھی امت کا حق ہے اور معزول کرنا بھی۔"[1]

اسلام کی خارجہ پالیسی کے اصول

پہلا اصول

اسلامی حکومت اس بات کا خیال رکھے کہ غیر مسلم حکومت سے اس قسم کے معاہدات نہ کرے جس سے کسی دوسری اسلامی ریاست کے مفادات مجروح ہوتے ہوں۔ لَا يَتَّخِذُوا الْمُؤْمِنُونَ الْكَافِرِينَ أَوْلِيَاءَ مِنْ دُونِ الْمُؤْمِنِينَ [2] اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا ہمدرد اور دوست نہ بناؤ۔ اگر کوئی غیر مسلم حکومت کسی اسلامی حکومت پر حملہ کرے تو دنیا کے تمام اسلامی ممالک کا فرض ہے کہ وہ اسلامی حکومت کی مدد کریں۔

دوسرا اصول

اسلامی حکومت کے تمام معاملات صلح اور امن پر طے ہونے چاہئیں۔ کیونکہ اسلام صلح اور امن کا پیغام لے کر آیا ہے۔ اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی میں ہر رنگ میں امن کی روح قائم رہنی چاہیے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَإِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا. [3] اور اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی مائل ہو جاؤ۔

امن قائم کرنے کے اصول

۱۔ حق کی معاونت: وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ. یعنی ایک دوسرے کی نیک کام اور پرہیزگاری پر امداد کرو اور گناہ اور ظلم پر مدد نہ کرو۔

۲۔ اگر دنیا کی بڑی طاقتیں اس اصول پر عمل کریں کہ وہ حق وصداقت میں تعاون کریں اور برائی اور باطل میں ترک تعاون کی راہ اختیار کریں تو دنیا میں امن قائم ہو جائے گا۔ دنیا میں فساد کی صرف وجہ یہ ہے کہ بڑی بڑی حکومتیں باطل کا ساتھ دیتی ہیں۔

۳۔ محاربین کے درمیان عدل سے صلح کرانا: وَإِنْ طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا

---

[1] المواقف معہ شرح جلد ۸ ص ۳۵۳۔ [2] آل عمران ۳:۲۸۔

[3] الانفال ۸:۶۱۔

بَيْنَهُمَا فَاِنْ بَغَتْ اِحْدٰهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىْ تَبْغِىْ حَتّٰى تَفِيْٓءَ اِلٰى اَمْرِ اللّٰهِ فَاِنْ فَآءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ[1] اور اگر مومنوں میں سے دو گروہ جنگ کریں تو ان میں صلح کرا دو۔ پس اگر ایک دوسرے پر زیادتی کرتا ہے تو اس سے جنگ کرو جو زیادتی کرتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف رجوع کرے۔ پس اگر وہ رجوع کرے تو ان کے درمیان عدل سے صلح کرا دو اور انصاف کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں یہ تعلیم دی گئی ہے کہ اگر دو ملکوں کے درمیان ایسے حالات پیدا ہو جائیں جن سے لڑائی کا اندیشہ ہو یا لڑائی شروع ہو گئی ہو تو حکومتوں کا یہ فرض ہے کہ وجہ فساد دریافت کر کے متحارب فریقین کے درمیان صلح کرا دیں۔

۴۔ اگر کوئی فریق صلح کی طرف مائل نہیں ہوتا' دنیا کے امن کو برباد کرنے پر تلا ہوا ہے تو زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف تمام دنیا کی طاقتیں اعلان جنگ کر دیں اور اس وقت تک جنگ جاری رکھیں جب تک زیادتی کرنے والا فریق حق کی طرف لوٹ نہیں آتا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کو ان الفاظ میں بیان فرمایا: اُنْصُرْ اَخَاكَ ظَالِمًا اَوْ مَظْلُوْمًا. یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم۔

صحابہ کرام نے پوچھا۔ ظالم کی مدد کس طرح کریں۔ فرمایا ظالم کی مدد یہ ہے کہ اس کا ہاتھ ظلم سے روک لو۔

صلح کرانے کا یہ سنہری اصول بتایا کہ متحارب فریقین کے درمیان صلح کراتے وقت عدل و انصاف کے تقاضوں کو پورا کرنا چاہیے۔

تیسرا اصول

اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی ایک عالمی انسانی برادری قائم کرنے والی ہو اور تمام اقوام عالم کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے والی ہو۔ کیونکہ اسلام نسل انسانی کی وحدت کا پیغام لے کر آیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے:

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا[2] سب لوگ ایک ہی امت ہیں لیکن وہ اس میں جھگڑتے ہیں۔

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِىْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ[3] اے لوگو! اپنے رب کا

1۔ الحجرات ۴۹: ۷-۱۰۔ 2۔ یونس ۱۰: ۱۹۔ 3۔ النساء ۴: ۱۔

تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک اصل سے پیدا کیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا وَرَبُّ کُلِّ شَیْءٍ اِنِّیْ اَشْھَدُ اِنَّ الْعِبَادَ کُلُّھُمْ اِخْوَۃٌ.[1] اے ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

تَوَاخَوْا فِی اللّٰہِ اَخَوَیْنِ اَخَوَیْنِ.[2] اللہ کی رضا کے لیے دو دو بھائی ہو جاؤ۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خاتم النبیین بنا کر بھیجنے میں یہی راز مضمر ہے کہ دنیا کی تمام قوموں کو ایک پلیٹ فارم جمع کیا جائے۔

چوتھا اصول

اسلامی حکومت عہد و پیمان کا احترام کرنے والی ہو۔ ارشاد الٰہی ہے۔ اَوْفُوْ بِالْعَھْدِ اِنَّ الْعَھْدَ کَانَ مَسْئُوْلاً [3] عہد پورا کرو یقیناً عہد کے متعلق پوچھا جائے گا۔ یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ. [4] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو اپنے معاہدے پورے کرو۔

نقض عہد کے متعلق ارشاد الٰہی ہے: وَلَا تَنْقُضُوا الْاَیْمَانَ بَعْدَ تَوْکِیْدِھَا [5] (قسموں) عہد کو پکا کرنے کے بعد مت توڑو۔

وَلَا تَکُوْنُوْا کَالَّتِیْ نَقَضَتْ غَزْلَھَا مِنْ بَعْدِ قُوَّۃٍ اَنْکَاثًا تَتَّخِذُوْنَ اَیْمَانَکُمْ دَخَلاً بَیْنَکُمْ اَنْ تَکُوْنَ اُمَّۃٌ ھِیَ اَرْبٰی مِنْ اُمَّۃٍ. [6] اور اس عورت کی طرح نہ ہو جاؤ جس نے محنت کر کے کاتا ہوا سوت ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ تم اپنی قسموں کو آپس میں فساد کا موجب بنا لیتے ہو۔ اس لیے کہ ایک جماعت دوسری جماعت سے بڑھ کر ہو۔

نقض معاہدہ کے لیے اسلام نے صرف دو صورتیں قرار دی ہیں:

۱۔ فریق ثانی معاہدہ کو پورا کرنے میں کوتاہی برت رہا ہے۔ اس وقت اسلام یہ اجازت دیتا ہے کہ معاہد قوم کو فوراً اطلاع دے دی جائے کہ اب معاہدہ نہیں رہا۔

ارشاد الٰہی ہے: وَاِمَّا تَخَافَنَّ مِنْ قَوْمٍ خِیَانَۃً فَانْبِذْ اِلَیْھِمْ عَلٰی سَوَاءٍ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَائِنِیْنَ [7] اگر تجھے قوم کی دغا بازی کا خوف ہو تو ان کے عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی پھینک دے اللہ دغا بازوں سے محبت نہیں کرتا۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ اسلام بد عہدی سے روکتا ہے۔ ہاں اگر قوم کی خیانت کا علم ہو جائے تو ان کو برابری کا موقعہ دے کر معاہدہ سے دست برداری کر لی جائے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۱۔ احمد، ابو داؤد۔ ۲۔ کنوز الحقائق حرف التاء۔ ۳۔ بنی اسرائیل ۱۷:۳۴۔
۴۔ مائدہ ۵:۱۔ ۵۔ النحل ۱۶:۹۱۔ ۶۔ النحل ۱۶:۹۲۔ ۷۔ الانفال ۸:۵۸۔

ان کان بینه و بین قوم عهد فلا یحلن عقده حتی امدها اوینبذ الیهم علی سواء.
یعنی اگر کسی کا دوسری قوم سے معاہدہ ہوا ہے چاہیے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کو نہ کھولے۔ یہ نہیں تو ان کا عہد برابری کو لحوظ رکھ کر ان کی طرف کرے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معاہدہ خاص حالات کے تحت کیا گیا ہو پھر کسی دوسری حالت میں اس معاہدہ کو قائم رکھنا باعث مضرت ہو۔ اس معاہدہ سے
اس صورت میں معاہدہ فسخ کیا جا سکتا ہے اور اطلاع معاہد قوم تک دینا ضروری ہے۔
ارشاد الٰہی ہے:
وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ اَنَّ اللّٰهَ بَرِيْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ[1] اور یہ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لوگوں کو حج اکبر کے دن اطلاع ہے کہ اللہ اور اس کا رسول مشرکوں سے بیزار ہے۔

معاہدہ کی شرائط

۱۔ معاہدہ فریقین کی رضا مندی سے ہوا ہو۔
۲۔ معاہدہ ایک دستاویز میں غیر مبہم الفاظ میں لکھا جائے جس میں فریقین کے حقوق و فرائض شرائط وغیرہ متعین کر دیے جائیں۔

پانچواں اصول

خارجہ پالیسی بین الاقوامی عدل پر مبنی ہو۔ ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى.[2] اے ایمان والو! اللہ کے نام پر انصاف کے ساتھ گواہی دینے کے لیے کھڑے ہو جاؤ۔ کسی قوم کی دشمنی تم کو اس امر پر نہ اکسائے کہ عدل کا دامن چھوڑ دو تم بہر حال انصاف کا کرو یہ بات تقویٰ کے زیادہ قریب ہے۔

چھٹا اصول

جنگ کے متعلق یہ ہے کہ جارح قوم کے ساتھ مقابلہ کرنا چاہیے کیونکہ اگر مدافعت نہ کی جائے تو امن برباد ہو جاتا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَقَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا[3] اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو۔ جنگ کی حد بیان کر دی کہ وہ زیادتی کے جذبے سے پاک ہو۔ محض مدافعت اور بدلہ مقصود ہو۔

۱۔ التوبہ ۹:۳۔ ۲۔ مائدہ ۵:۸۔ ۳۔ بقرہ ۲:۱۹۰۔

ارشادِ الٰہی ہے: جَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا.[1] بدی کا بدلہ اس کی مثل سزا ہے۔

ساتواں اصول

قرآن مجید نے مسلمانوں کو "امت مسلمہ" کے خطاب سے نوازا ہے ارشاد الٰہی ہے: وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک امت وسط بنایا ہے تاکہ تم سارے لوگوں کے پیش رو بنو اور رسول تمہارا پیش رو ہے۔ اس آیت کریمہ میں اسلامی حکومت کی خارجہ پالیسی کا ایک اصول مقرر کیا ہے۔ وہ یہ جو سچائی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حاصل ہے اسے لوگوں تک پہنچائیں۔ یعنی اسلامی حکومت اسلام کی مبلغ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے کوئی ایسا رویہ اختیار نہیں کرسکتی جو اسلام کی تعلیم کے منافی ہو۔

آٹھواں اصول

اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی اپنی سرحدوں کی حفاظت پر مبنی ہوتی ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود مدنی ریاست کی سرحدوں کی حفاظت پر بہت توجہ دی۔ جارح قوم سے پوری طاقت سے مقابلہ کیا۔ سرحدوں کی حفاظت کے متعلق قرآن مجید میں ارشاد الٰہی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا (ال عمران ۳:۲۰۰) اے لوگو! جو ایمان لائے ہو صبر کرو اور مقابلہ میں بڑھ کر صبر دکھاؤ اور (سرحدوں کی) محافظت کرو اس آیت میں یہ بیان کیا ہے کہ اسلامی حکومت کو ایک لمحہ کے لیے بھی غافل نہیں رہنا چاہیے۔

دوسری جگہ آتا ہے: قَاتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا (بقرہ ۲:۱۹۰) اللہ کی راہ میں ان لوگوں سے جنگ کرو جو تمہارے ساتھ جنگ کرتے ہیں اور حد سے نہ بڑھو۔

نواں اصول

اسلامی ریاست سفیروں اور قاصدوں کی جان کے تحفظ کی ضمانت دیتی ہے۔ اگر کوئی دوسرا حکمران اس اصول کی خلاف ورزی کرے تو اس کے خلاف جہاد کیا جائے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سفیر حضرت حارث بن عمر ازدی کو بلقاء کے حاکم نے شہید کر ڈالا تو آپ نے ان کا انتقام لینے کے لیے تین ہزار کا لشکر روانہ فرمایا۔ غزوہ موتہ اسی سلسلہ میں پیش آیا۔

دسواں اصول

اسلامی ریاست کا حفاظت خود مختاری اور سرحدوں کی سالمیت کا ایک اہم اصول یہ ہے کہ

[1] الشوریٰ ۴۲:۴۰۔ [2] البقرہ ۲:۱۴۳۔

بیرونی دشمن کو اپنے ملک میں گھسنے کا موقع دینے کے بجائے آگے بڑھ کر سرحد پر اس کا مقابلہ کرنے کا طریقہ اختیار کرے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں تبوک کا پُرصعوبت سفر اسی مقصد کے لیے تھا۔

خلفاء راشدینؓ کے دور میں ایران شام وغیرہ کی حکومتیں مدنی ریاست کے لیے مستقل خطرہ بنی ہوئی تھیں۔ سرحدوں پر عربی قبائل کو اکساتیں رہتی تھیں۔ خلفاء نے آگے بڑھ کر دشمنوں کے ملک میں داخل ہو کر ان کا مقابلہ کیا اور شکست دی۔

شام سے متصل عرب علاقوں (دومتہ الجندل۔ ایلہ۔ جرنیا اور اذرح) سے رومیوں کے اثر و رسوخ اور غلبہ کا خاتمہ کر دیا۔ اس طرح یمن، عمان اور بحرین کو مجوسی ایران سے نجات دلائی۔

گیارھواں اصول

اسلامی ریاست کی خارجہ پالیسی احترام انسانیت اور مظلوموں کی دست گیری پر مبنی ہے اسلام اسلامی ریاست پر یہ فرض قرار دیتا ہے کہ جہاں انسانیت کی ذلت ہو رہی ہو۔ عوام مظلومیت کا شکار ہوں تو ان کی مدد کی جائے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُقَاتِلُوْنَ فِي سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَا اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا وَّاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا (النساء ۴:۷۵) تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ تم اللہ کے راستہ میں جنگ نہیں کرتے اور کمزور مردوں اور عورتوں اور بچوں کے لیے جو کہتے ہیں۔ اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی جناب سے ہمارا کوئی دوست بنا ہمارا کوئی مددگار اور معاون بنا۔

باب ہشتم

جدید سیاسی نظریات

دورِ حاضر کا عمرانی پس منظر

جس یورپ کو اپنے تمدن پر ناز ہے اور جو رُبع مسکون پر محیط ہے اور وہ اب تک ابلیسی طاقتوں کی جولانگاہ بنا ہوا ہے۔ اس کے بطن سے پیدا شدہ تہذیب نما بربریت پوری عریانی کے ساتھ شرفِ انسانیت کو پامال کر رہی ہے۔ غارت گری اور آدم کشی کا عمل اس انداز سے جاری ہے کہ دیکھنے اور سننے والے کے حواس معطل ہو جاتے ہیں اور بیداری اور خواب کی تمیز مٹ جاتی ہے۔ چنگیز خان اور بخت نصر نے بھی ممالک کو تباہ و برباد کیا، لیکن ان کے خونین عمل تسخیر کو بھی ایک مدت درکار تھی۔ نپولین نے بھی نظام امن کو تہ و بالا کیا اور اس کی فتوحات کا سیلاب سارے یورپ پر چھا گیا۔ لیکن یورپ کی طاغوتی حکومتوں نے جو طوفان برپا کیا اس کی مثال ساری تاریخ عالم میں نہیں ملتی۔ دوسری عالمگیر جنگ میں انھوں نے گوناگوں آلات تخریب سے شہروں کے شہر چند دنوں بلکہ چند گھنٹوں میں صفحہ ہستی سے مٹا دیے۔ محاذ جنگ سے کوسوں دور آبادیاں کو بھی ان کے اجل بار طیاروں نے پیوند خاک کر دیا۔ بالکل قریب زمانہ میں امریکہ نے افغانستان اور عراق کے علاقہ پر بمبار جہازوں اور میزائلوں اور دیگر ہلاکت خیز اسلحہ سے تباہی مچائی اس کی مثال گذشتہ زمانہ میں ملنی مشکل ہے۔

ان متحارب قوموں کے مفکرین اس تباہی اور ہلاکت کے زمانے میں دنیا کو ایک پیغام دیتے رہے ہیں، وہ یہ ہے کہ انسانیت کے خاک و خون سے ایک نیا نظام عالم جنم لے گا۔ جو ہر رنگ میں پہلے نظام سے اعلیٰ اور ارفع ہو گا اور تصادم کی جگہ وحدت اور مودت ہو گی۔ اس میں کسی کو کلام نہیں کہ ان ہلاکت خیز جنگوں نے ایسی تہذیب کو جنم دیا جن کے اجزاء ترکیبی میں تخریب ہی تخریب مضمر ہے اور یہ محاربہ خونین اس کی خودکشی کا عبرت انگیز منظر پیش کریں گی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اس کی خاکستر سے یقیناً ایک صحت مند اور اصلح نظام پیدا ہو گا جو انسان کی مادی اور روحانی ضروریات کا کفیل اور نفس پرستی اور ہوس ناکی کے موذی عناصر سے یکسر پاک ہو گا لیکن اس کا موجد اور خالق کوئی مفکر یا فلاسفر نہ ہو گا بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ مابعد جنگ کا زمانہ مذہب کی صحیح اور سلیم روح کی بیداری کا زمانہ ہو گا

کیونکہ سچے مذہب کے اندر تعمیر حیات کے سارے عناصر موجود ہوتے ہیں۔ ان کا بروئے کار آنا ہی نئے نظام عالم کا پیدا ہونا ہے اور وہ اَشْرَقَتِ الْأَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا کا دور مبارک ہوتا ہے۔ اس لیے مادی مفکرین کا دعویٰ کہ وہی ایک صالح نظام پیدا کرنے والے ہیں ایک زعم باطل ہے جو کبھی شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کے تمام نظریات اور تخیلات نسلی تنفر و غرور اور قومی اور لسانی امتیازات سے پیدا ہوئے ہیں۔ ان کے نفاذ سے عالم انسانی آتش کدہ بن جاتا ہے۔

پچھلی جنگ عظیم کے بعد بھی انہی ائمہ فکر نے دنیا کی ''صورت گری'' اور ''مشاطگی'' کا تہیہ کیا اور تہذیب کے نشیمن کو مادیت اور لادینی کے شجر ملعونہ کی نازک شاخ پر تعمیر کیا اور سمجھ لیا کہ نوع انسان اب ہمیشہ کے لیے جنگوں سے بچ گئی ہے۔ حالانکہ ان کے افکار کی اساس ہی جنگ و جدل پر تھی۔ ان کی علمی اختراعات اور ایجادات محض اس لیے وجود میں آئیں کہ ملک کا ایک خطہ یا نسل انسانی کا ایک طبقہ دوسرے پر غلبہ پا لے۔ یورپی حکومتوں نے سائنس کو اپنی ''جوع الارض'' کی تسکین کے لیے ایک کنیز بنا لیا۔ ان کے دارالتجارب، ان کے سائنس دان، ان کی یونیورسٹیاں اور دیگر علمی ادارے شبانہ روز صرف ایک ہی مقصد کے لیے وقف کار تھے اور ہیں، وہ یہ کہ انسانی بستیوں کو جبراً و قہراً غلام بنایا جائے اور اپنی تجارت اور سیاست ہوس ملک گیری کو فروغ دیا جائے۔ جب علمی اور ذہنی ترقیات کے پیچھے ایسے خبیث اور ناپاک ارادے ہوں تو اس کا لازمی نتیجہ یہی ہوگا کہ اس پُرآتش تمدن کے مہلک مضمر ممکنات عمل میں آئیں جو اس کو جلا کر خاکستر کر دیں۔ چنانچہ اب ایسا ہی ہو رہا ہے کیونکہ دنیا میں اسی تہذیب کو بقا نصیب ہو سکتی ہے جو اصلح ہو یعنی انسانیت کے لیے مفید ہو۔ قرآن کریم میں خدائے عزوجل فرماتا ہے: اِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِيْنَةً لَّهَا لِنَبْلُوَهُمْ اَيُّهُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا وَاِنَّا لَجَاعِلُوْنَ مَا عَلَيْهَا صَعِيْدًا جُرُزًا. دنیا میں جو کچھ بھی پیدا کیا گیا ہے وہ اس لیے ہے کہ اس کی رونق و رعنائی اس کے حسن و جمال اور آرائش و زیبائش کو دوبالا کرے۔ خالق کائنات کا فعل خلق ایذا اور آزار سے بالکل پاک ہے۔ بحر و بر، میدان و کوہسار اور باد و باراں کو انسان کے لیے مسخر کر دیا گیا ہے۔ کائنات کے تمام پہلو آپس میں ہم آہنگ کر دیے گئے ہیں۔ اقوام عالم کو مہلت دی جاتی ہے کہ وہ تخلیق عالم کے مقدس مقصد کو پورا کریں۔ جو قوم اس کو پورا کرتی ہے وہی قوم اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ کی مصداق ٹھہرتی ہے اور اس کو فروغ نصیب ہوتا ہے۔ مگر جو قوم اس نگار خانہ ہستی میں رخنہ ڈالتی ہے اور اس کے توازن کو بگاڑتی ہے وہ قدرت کے دست قوی سے مٹ جاتی ہے۔

تہذیب مغرب آج اس واسطے دم توڑ رہی ہے کہ اس کے علمبرداروں نے قدرت کے خلاف بغاوت کی۔ اس کی چمن بندی میں خلل ڈالا۔ اس تہذیب کا سب سے زیادہ تباہ کن پہلو یہ ہے

کہ اس نے روح و بدن میں افتراق پیدا کر دیا ہے۔ حالانکہ انسان کی کامل شخصیت روح و بدن کی تالیف و امتزاج سے عبارت ہے۔ ان کے متوازی نشوونما سے یہ بڑھتی اور ثمرور ہوتی ہے۔ کوئی فکر یا مذہب کامیاب نہیں ہوسکتا جو ایک کو ابھارے اور دوسرے کو کچل دے۔ عیسائیت ہندومت نے بھی یہ غلطی کی' اس نے رہبانیت کے تیشے سے جسم کو گھائل کیا تا کہ روح بیدار ہو۔ مگر اس غیر طبعی تعلیم کا وہی نتیجہ ہوا جو ہوا کرتا ہے' یعنی تقشف کی جان سوزیوں کے ساتھ روح کی شمع بھی گل ہو کر رہ گئی اور اہل کلیسا میں مزاج خانقاہی پیدا ہو گیا اور ہندوؤں نے جنگلوں کی راہ لی۔ جس سے خود ساختہ مذہب مجروح ہو گیا۔ اس کے برعکس یورپ کے ائمہ مادیت نے روح سے انکار کیا اور عالم رنگ و بو ہی کو اپنا منتہائے نظر قرار دیا۔ انھوں نے جسم کی پرورش کی اور روح کو کچل دیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی تعلیمات کے پیرو ہوس ناک و جفا کار ہو گئے۔ اشتراکی اور فسطائی فلسفہ اسی سفلی تعلیم کا حامل ہے۔ دوسری عالمگیر جنگ بھی اسی کی کرشمہ سازی ہے اور ان کے سامانِ معیشت کی فراوانی اور دیگر وسائل حیات کی بہتات ہی ان کے حق میں پیغام اجل بن گئی ہے اور کَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ بَطِرَتْ مَعِيْشَتَهَا کی مصداق بن گئی۔ دولت و ثروت کے بڑے بڑے مراکز پیوند خاک ہو گئے۔ تاریخی آثار بھی ایک ایک کر کے ناپید ہو گئے۔

جب مذہب مٹ جائے تو فرعونی ملوکیت' ہامانی سیاست اور قارونی معیشت انسان پر مستولی ہو جاتی ہے۔ انسان کبھی بھی اپنی حیات کا خود کفیل نہیں ہو سکتا۔ اس کی فکر کج پرواز اس کو ہلاکت کی وادیوں میں لے جاتی ہے۔ جب بھی وہ اپنے کاشانہ حیات کو شمع مادیت سے روشن کرتا ہے تو اس پر ظلمت ہی ظلمت چھا جاتی ہے۔ کیونکہ اس زمین و آسمان کا حقیقی نور تو خدا ہی ہے اور مذہب اس نور کا حامل ہے اور اسی کی ہمہ گیر تعلیمات کے روغن سے انسانی زندگی کی قندیل روشن ہوتی ہے اور مادی تاریکیاں کافور ہو جاتی ہیں۔ جب یہ شمع روحانی گل ہو جاتی ہے تو عالم انسانی کفر و عصیان کے بھنور میں گھر جاتا ہے اور تباہی کی لپیٹ میں آ جاتا ہے۔

انیسویں صدی

تاریخ کے اس دور میں انیسویں صدی کو خاص اہمیت حاصل ہے کیونکہ اس صدی میں ان افکار و نظریات کی داغ بیل پڑی جنھوں نے جذبہ دینی کو ضعیف کر دیا اور لوگوں کو ملحد اور زندیق بنا دیا۔ مذاہب پر حملے ہر سمت سے ہوئے جنھوں نے انسانوں کے وسیع طبقے کو مذہب کی آغوش سے نکال کر ہوائے نفس کا غلام بنا دیا۔

اختصار کے ساتھ ان نظریات اور افکار پر آئندہ صفحات میں بحث کی جائے گی۔

جمہوریت (Democracy)

مفکرین کے نزدیک جمہوریت بہترین طرزِ حکومت ہے۔ اس نظام کو نوع انسان کے لیے رحمت اور فلاح و بہبود کا ضامن تصور کیا جاتا ہے۔ جو اس نظام کی مخالفت کرے اس کو انسانیت کا دشمن خیال کیا جاتا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ جمہوریت کیا ہے؟ اس کے کیا فوائد اور نقصان ہیں۔

انگریزی لفظ Democracy جس کے معنی جمہوریت ہیں دو یونانی لفظوں سے مشتق ہے۔ اوّل Demos جس کے معنی عوام ہیں' دوسرے Cracy جس کے معنی ہیں طاقت یعنی حکومت۔ اس طرح معنی کے لحاظ سے (Democracy) جمہوریت عوام کی حکومت کو کہتے ہیں۔ سیاسی مفکرین نے اس کی تعریف مختلف الفاظ میں کی ہے۔ ابراہیم لنکن نے جمہوریت کی سب سے زیادہ واضح الفاظ میں تعریف کی ہے۔

Democracy is A Government of the people by the people and for the people.

''جمہوریت عوام کی وہ حکومت ہے جو عوام کے ذریعہ ہو اور عوام کی ہی فلاح اور عوام کی بہبود کے لیے ہو۔''

ارسطو کا خیال

ارسطو جو جمہوریت کو ناپسند کرتا ہے ان الفاظ میں اس کی تعریف کرتا ہے۔ ''جمہوریت غریب لوگوں کی خراب حکومت کا نام ہے۔''

سیلی (Seeley)

''جمہوریت اس حکومت کو کہتے ہیں جس میں زیادہ سے زیادہ عوام شریک ہوں۔''

بنتھم (Bantham) اور مل (Mill) کے نزدیک

"Democracy is a system which secures the greatest good of the greatest number."

''جمہوریت ایک ایسی طرز حکومت ہے جس میں زیادہ سے زیادہ لوگوں کی زیادہ سے زیادہ فلاح و بہبود مدنظر رکھی جاتی ہے۔''

"Democracy is a government in which the will of

the majority of Qualified citizens rules."

''جمہوریت اس حکومت کو کہتے ہیں جس میں متعدد شہریوں کی اکثریت کی رائے حکمرانی کرتی ہے۔''

ڈائسی لکھتا ہے:

"Democracy is a form of government in which the governing body is a comparatively large fraction of entire nation."

''جمہوریت ایک طرز حکومت ہے جس میں حکمران طبقہ ساری قوم کا مقابلتہً معتدبہ حصہ ہوتا ہے۔''

گیٹل (Gettle) کہتا ہے:

''جمہوریت ایسی طرز حکومت ہے جس میں آبادی کا معتدبہ حصہ حاکمانہ طاقت کے استعمال میں شرکت کا حق رکھتا ہے۔''

امریکی اعلان آزادی میں جمہوریت کی تعریف زیادہ واضح الفاظ میں کی گئی ہے:

''حکومتیں محکوم کی مرضی سے اختیارات حاصل کر کے قائم ہوتی ہیں۔''

"Governments are instituted deriving their just powers from the consent of the governed."

جمہوریت کی اقسام

جمہوریت کی دو قسمیں ہیں:

(الف) بلاواسطہ جمہوریت۔

(ب) بالواسطہ جمہوریت

بلاواسطہ جمہوریت

وہ جمہوری حکومت جس میں شہری براہ راست نظم ریاست میں حصہ لیں۔ بلاواسطہ (Direct democracy) کہلاتی ہے۔

اس قسم کی جمہوریت انہی ریاستوں میں ممکن ہوسکتی ہے جو اپنے رقبے اور علاقے کے لحاظ سے چھوٹی ہوتی ہیں۔ ایسی ریاستوں میں لوگ قانون وضع کرنے' پالیسی مرتب کرنے اور افسروں کا تقرر کرنے کے لیے جسما جمع ہوسکتے ہیں۔ یہ جمہوریت قدیم یونان اور روما میں پائی جاتی تھی۔

ہمارے اس دور میں بلاواسطہ جمہوریت پر عمل کرنا دشوار ہے کیونکہ ریاستوں کے وسیع رقبے اور گنجان آباد ہونے کی وجہ سے تمام لوگ یک جا جمع نہیں ہو سکتے۔ البتہ صرف سوئٹزر لینڈ کے چند کانطونوں (Contons) میں کچھ ایسے طریقے رائج ہیں جن کی وجہ سے بلاواسطہ جمہوریت پائی جاتی ہے۔ جن کے نام آپن تسل (Appenzell) عوری (Ure) گلا روس (Glarus) اور اونٹروالڈین (Unterwalden) ہیں۔

وہ طریقے حسب ذیل ہیں:۔

حق ہدایت

(Initiative) کی رو سے عوام کی ایک مخصوص تعداد حکومت سے مطالبہ کر سکتی ہے کہ وہ مجلس قانون ساز کے ذریعہ کوئی قانون پاس کرے۔ یہ عوام کو بہت بڑا اختیار حاصل ہے کیونکہ وہ اس کے ذریعہ اپنی مرضی کے مطابق قانون مدون کرا سکتے ہیں۔

عوام عام طور پر اس طریقے کو نہایت ہی معمولی قوانین پاس کرانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔

شورائے عام

شورائے عام کو انگریزی میں (Referendum) کہتے ہیں۔ اس کی رو سے لوگوں کی ایک مقررہ تعداد باقاعدہ درخواست پیش کر کے حکومت سے مطالبہ کر سکتی ہے کہ مجلس قانون ساز کے بنائے ہوئے کسی قانون کو اس وقت تک نافذ نہ کرے جب تک عوام کی عام منظوری حاصل نہ ہو جائے۔ حکومت متنازعہ فیہ قانون کو عوام کے سامنے پیش کر دیتی ہے۔ اگر اکثریت اس قانون کی موافقت میں رائے دے تو اس قانون کو نافذ کر دیا جاتا ہے اور اگر مخالفت میں رائے دے تو قانون مسترد کر دیا جاتا ہے۔ یہ عوام کو بڑا اختیار حاصل ہے۔ چنانچہ مجلس قانون ساز قانون وضع کرتے وقت اس بات کا خاص خیال رکھتی ہے کہ کوئی ایسا قانون وضع نہ کرے جو عوام کی مرضی اور خواہشات کے خلاف ہو۔

حق بازطلبی (Recall)

اس طریقہ کی رو سے عوام آئینی طور پر اس بات کا حق رکھتے ہیں کہ کسی نااہل افسر کو برطرف کرا دیں۔ اس وجہ سے افسران اس بات کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ کہیں لوگ ان سے بدظن نہ ہو جائیں۔

بالواسطہ جمہوریت

جمہوریت کی دوسری قسم بالواسطہ یا نیابتی جمہوریت (Indirect or represantative

democracy ہے۔

آج کل ملکوں کا رقبہ وسیع ہے۔ آبادی گنجان ہے۔ اس وجہ سے بلاواسطہ جمہوریت پر عمل کرنا دشوار ہے۔ بالواسطہ جمہوریت آج کل کے حالات کے مطابق ہے۔ عوام کثرت رائے سے اپنے نمائندے منتخب کرتے ہیں اور وہ نمائندے قانون سازی کا کام سرانجام دیتے ہیں۔ گویا عوام اپنے اختیارات اپنے نمائندوں کو تفویض کر دیتے ہیں اور نمائندے نظم حکومت چلاتے ہیں۔

اس طرز حکومت میں حاکمیت براہ راست عوام ظاہر نہیں کرتے بلکہ اپنے منتخب شدہ نمائندوں کے ذریعہ کرتے ہیں۔ یہ نمائندے عوام کے امانت دار ہوتے ہیں اور عوام کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔

جمہوریت کے مفروضات

متذکرہ بالا بحث سے یہ بات ظاہر ہو جاتی ہے کہ جمہوریت کے حسب ذیل مفروضات ہیں:

۱۔ حاکم اور محکوم کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس طرز حکومت میں ''عوام کی حکومت' عوام کی فلاح و بہبود کی خاطر اور عوام کی وساطت سے'' کا اصول کارفرما ہوتا ہے۔

۲۔ عوام کا منشاء ان کے منتخب شدہ نمائندوں کے ذریعہ ہوتا ہے۔

۳۔ صحیح قانون وہ ہوگا جسے اکثریت صحیح کہہ دے۔

۴۔ اقلیت کو اکثریت کے فیصلے تسلیم کرنا پڑتے ہیں۔

تنقید

الفریڈ کوبن نے اپنی کتاب (The crisis of civilisation) میں مغرب کی تباہی کا ایک سبب ان کا انداز حکومت بیان کیا ہے۔ چنانچہ اس نے جمہوریت کے مفروضات پر خاصی تنقید کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ یہ کہنا کہ جمہوریت سے حاکم اور محکوم کا امتیاز ختم ہو جاتا ہے محض فریب ہے۔

پروفیسر کوبن لکھتا ہے:

اس نظریہ کا اگر غور سے مطالعہ کیا جائے تو ''عوام کے اقتدار اعلیٰ'' کا فریب کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔ اگر سیاست کو نظری پہلو سے نہیں بلکہ عملی پہلو سے دیکھا جائے تو یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ حاکم اور محکوم کو ایک ہی تصور کرنا عملی ناممکنات میں سے ہے۔ عملاً حکومت افراد کی ایک جماعت پر مشتمل ہوتی ہے اور رعایا افراد کی دوسری جماعت کا نام ہوتا ہے۔ جب سوسائٹی اپنی ابتدائی قبائلی زندگی سے ذرا آگے بڑھ جائے تو پھر حاکم اور محکوم کبھی ایک نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ لینا کہ دونوں ایک ہی ہیں مملکت میں بدترین قسم کی آزادی اختیارات پیدا کر دیتا ہے۔ (P:68)

جمہوریت کی رو سے صحیح قانون وہ ہے جس پر نمائندگان کی اکثریت نے صاد کیا ہو۔ اس

نظریہ کے بارہ میں پروفیسر مذکور لکھتا ہے:

عوام کے اقتدار اعلیٰ کے نظریہ کے حق میں روایتی دلیل یہ دی جاتی ہے کہ حکومت یا تو قوت کے بل بوتے پر قائم کی جائے گی یا باہمی رضا مندی سے اور چونکہ یہ غلط ہے کہ جس چیز کو قوت صحیح کہہ دے وہی صحیح ہو۔ اس لیے یہی درست ہے کہ حکومت کی اساس باہمی رضامندی پر ہونی چاہیے۔ لیکن یہ دلیل نہ تو منطقی طور پر درست ہے نہ ہی مبنی پر صداقت۔ اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہو سکتی...... فیصلہ وہی صحیح ہو گا جو حقیقت میں صحیح ہو نہ کہ وہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کر دیں۔ روسو کہتا ہے کہ "منشائے عمومی" ہمیشہ صحیح ہو گا ورنہ وہ منشائے عمومی کہلا نہیں سکے گا۔ اگر یہ امر صحیح ہے تو پھر اکثریت اور اقلیت کا سوال ہی باقی نہ رہا۔ سوال یہ رہ گیا کہ جو چیز اخلاقی بنیادوں پر صحیح ہے وہی صداقت ہے۔ (P.76)

جمہوریت کی خوبیاں

۱۔ جمہوریت رائے اور تنقید کے آزادانہ اظہار کی کامل اجازت دیتی ہے۔

۲۔ عوام کو اپنی حکومت تبدیل کرنے کا حق حاصل ہوتا ہے۔ جمہوری طرز حکومت میں سیاسی پارٹیاں ہوتی ہیں۔ اکثریت والی پارٹی حکومت بناتی ہے۔ اقلیت والی پارٹی یا پارٹیاں حزب اختلاف بناتی ہیں۔ اگر رائے عامہ حکومتی پارٹی کے خلاف اور حزب اختلاف کے حق میں ہو جائے تو حکومت نئی اکثریتی پارٹی کے سپرد کر دی جاتی ہے۔ اس طرح سابقہ حکومتی پارٹی حزب اختلاف میں آ جاتی ہے۔

۳۔ مملکت کا ہر شہری قانون کی نظر میں برابر ہوتا ہے خواہ وہ امیر ہو یا غریب۔

۴۔ جمہوریت ہر شہری کو ترقی کرنے کے مواقع یکساں دیتی ہے۔ ایک عام آدمی اپنی اعلیٰ استعدادوں کے ذریعہ ترقی کر کے حکومت میں اعلیٰ عہدہ پر فائز ہو سکتا ہے۔

۵۔ جمہوریت سینکا کے قول کے مطابق اس اصول پر مبنی ہے کہ "انسان انسان کے لیے مقدس ہے۔"

۶۔ جمہوریت طرز حکومت میں ہر شہری آزادی اور مساوات کی نعمت سے متمتع ہوتا ہے۔ نہ حاکم اپنی قوت سے دوسروں کے حقوق پامال کر سکتا ہے نہ دولت مند اپنی دولت سے عوام کو ان کے حقوق سے محروم کر سکتا ہے۔ اس میں ادنیٰ اور اعلیٰ کی کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ ایک فرد اور ایک ووٹ اور ہر ایک فرد ہر ایک عہدے کے لائق ہے۔ اس طرح حکومت میں عوام خود ہی حاکم اور خود ہی محکوم ہوتے ہیں۔

۷۔ جمہوری حکومت عوام کے سامنے جواب دہ ہے۔ اگر کوئی حکومت عوام کی امنگوں اور

خواہشات کے مطابق کام نہ کرے تو عوام اس کو الگ کر سکتے ہیں۔

۸۔ جمہوری حکومت مستحکم ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حکومت کے پیچھے عوام کی بے پناہ قوت ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری ممالک میں انقلاب اور بغاوت کے خطرات بہت ہی کم ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شخص جمہوری نظام حکومت میں انقلاب لانے کی کوشش کرے تو عوام کی قوت اس انقلاب کو ناکام بنا دیتی ہے کیونکہ عوام کی تمام ہمدردیاں اور تعاون جمہوری حکومت کے ساتھ وابستہ ہوتا ہے۔ اگر عوام کے نمائندے کوئی ایسی پالیسی مرتب کریں جو عوام کے مفاد کے خلاف ہو تو عوام اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتے ہیں اور اپنے مطالبات منوا لیتے ہیں۔ اس طرح تمام کام پُرامن طریقے سے سرانجام پا جاتے ہیں۔ اگر حکومت عوام کے مطالبات منظور نہ کرے تو عوام صاحب اقتدار لوگوں کو الگ کر سکتے ہیں اور دوسرے نمائندوں کے ہاتھ زمام حکومت سونپ سکتے ہیں اور انقلاب برپا کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ جمہوری طرز حکومت کے ملکوں میں صدیوں سے کوئی انقلاب نہیں ہوا۔

۹۔ جمہوریت کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ اس میں غریب عوام کا حصہ ہوتا ہے۔ اس طرز حکومت میں حکومت کرنا کسی خاص طبقہ کا حق نہیں ہے۔ وہی شخص حکومت کی مشینری کا کل پرزہ بنے گا جس کو لوگ منتخب کریں گے۔ بادشاہت میں صرف بادشاہ کا حکم قانون مانا جاتا ہے۔ اشرافیہ میں صرف بااقتدار اشخاص حکومت کرتے ہیں لیکن جمہوری حکومت میں ہر شخص حکومت میں حصہ لیتا ہے۔

۱۰۔ دوسری طرز کی حکومتوں میں صرف چند لوگ نظم حکومت میں شریک ہوتے ہیں۔ چنانچہ صرف انہی کی سیاسی تربیت ہوتی ہے۔ لیکن جمہوری طرز حکومت کا بڑا فائدہ یہ ہے کہ اس میں عوام کی سیاسی تربیت ہوتی ہے۔ انتخابات کے موقع پر مختلف سیاسی پارٹیاں اپنے منشور اور پروگرام لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ عوام کو ان پر غور فکر کرنے کا موقع ملتا ہے۔ ہر قسم کی تنقید کرتے ہیں۔ قائدین کی قابلیت اور صلاحیت کا موازنہ کرتے ہیں۔ اس طرح عوام کی سیاسی تربیت ہو جاتی ہے۔

۱۱۔ جمہوریت کی ایک خوبی یہ ہے کہ وہ عوام میں حب الوطنی کا جذبہ پیدا کرتی ہے۔ ملک کی زندگی میں بعض ایسے نازک مرحلے آتے ہیں کہ ملک تباہی کے گڑھے کے کنارے جا کھڑا ہوتا ہے۔ اس نازک مرحلہ پر حب الوطنی کا جذبہ کارگر ثابت ہوتا ہے۔ تمام قوم سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر خطرناک حالات کا مقابلہ کرتی ہے اور ان حالات پر قابو پا لیتی ہے۔

۱۲۔ جمہوریت خوف و ہراس اور دبدبے سے پاک ہوتی ہے کیونکہ جمہوریت کی بنیاد عوام کا اعتماد ہے۔ اس کے علاوہ تمام طریقہ ہائے حکومت خوف اور ہراس پر مبنی ہوتے ہیں مثلاً آمریت' فسطائیت' نازیت' بادشاہت وغیرہ۔

جمہوریت کی خامیاں

۱۔ جمہوری طرز حکومت میں ایک خاص جماعت کی حکومت ہوتی ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی شخصی حکومت ہے کیونکہ شخص کبھی حقیقی ہوتا ہے اور کبھی حکمی۔ کیونکہ فلسفہ کا مسئلہ ہے کہ مجموعہ بھی شخص واحد کے حکم میں ہوتا ہے۔ مگر وہ واحد حکمی ہے واحد حقیقی نہیں۔ جمہوری طرز حکومت میں گو بظاہر اکثریتی پارٹی کی حکومت ہوتی ہے مگر اکثریت مل کر شخص واحد ہوتا ہے۔ جو قانون بھی پاس ہوگا وہ سب کی رائے سے مل کر پاس ہوگا۔ اس طرز حکومت میں انفرادی رائے کچھ بھی نہیں' بلکہ اجتماعی رائے ہی وزن رکھتی ہے۔ اجتماعی رائے ایک قسم کی شخصی رائے ہے کیونکہ مجموعہ مل کر واحد حکمی ہو جاتا ہے۔

غرض یہ کہ شخصی حکومت میں فرد واحد حکومت کرتا ہے جمہوری طرز حکومت میں شخصی جماعت حکومت کرتی ہے۔ دوسرے لوگ اس کے تابع ہوتے ہیں۔

۲۔ جمہوریت میں مساوات پر بہت زور دیا جاتا ہے۔ مکمل مساوات اصول فطرت کے خلاف ہے اور دنیا میں مکمل مساوات قائم کرنا ناممکن ہے۔ اوّل تو کوشش سے مکمل مساوات قائم ہی نہیں ہو سکتی' جدوجہد خود بے ثمر رہے گی۔ دوم اگر مساوات قائم ہو جائے تو معاشرہ میں فساد اور بگاڑ پیدا ہو جائے گا۔

دنیا میں ہر انسان مختلف اہلیت اور صلاحیت لے کر پیدا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے مختلف اہلیت اور صلاحیت کے پیش نظر اختیارات میں امتیاز قائم کرنا ناگزیر ہے۔ جمہوریت طرز حکومت ایک عالم فلاسفر کو وہی اختیارات دیتی ہے جو عامی شخص کو۔ ایڈمنڈ برک (Edmund burke) کہتا ہے کہ قدرت نے انسانوں میں عقل و فہم کا فرق رکھا ہے لہٰذا جمہوری مساوات ایک سفید جھوٹ ہے۔

۳۔ جمہوری طرز حکومت میں عالم اور عامی شخص ایک ہی صف میں کھڑے ہوتے ہیں۔ یہ بات ظاہر ہے کہ علماء اور فلاسفروں کی نسبت عامی اشخاص کی زیادہ تعداد ہوتی ہے جو عموماً جاہل اور نااہل ہوتے ہیں۔ افلاطون پہلا مفکر ہے جس نے جمہوریت کے اس پہلو کو سامنے رکھ کر جمہوریت پر کم علمی اور جاہلیت کا الزام لگایا۔ عصر حاضر میں بھی لیکی (Leckey) اور مین (Maine) نے یہی اعتراض دوہرایا ہے۔ لیکی کہتا ہے کہ جمہوریت غریب ترین' جاہل

ترین اور نااہل ترین افراد کی حکومت ہوتی ہے جو کہ لازماً کثیر التعداد ہوتے ہیں۔
مین بھی جمہوری طرز حکومت کو جاہلوں اور غیر دانشوروں کی حکومت سمجھتا ہے۔ کارلائل کہتا ہے: "چونکہ ایک زیرک آدمی کے مقابلہ میں ہمیشہ نو بے وقوف پائے جاتے ہیں' اس لیے جمہوریت بے وقوفوں کی حکومت ہوتی ہے۔"
اس اعتراض کی اساس یہ ہے کہ جمہوری طرز حکومت میں ہر ایک کو ووٹ دینے کا حق حاصل ہے۔ عوام اکثر و بیشتر جاہل اور سیاسی سوجھ بوجھ سے عاری ہوتے ہیں...... پروفیسر ایوننگ جمہوری طرز حکومت پر تنقید کرتے ہوئے لکھتا ہے:
جمہوریت کے خلاف سب سے بڑی اصولی دلیل ایسی واضح ہے جس کی لمبی چوڑی تشریح کی ضرورت ہی نہیں۔ جمہوریت کے معنی ایسی طرز حکومت ہیں جس میں ہر انسان دخیل ہوتا ہے۔ لیکن گورنمنٹ ایک خاص فن ہے اور بڑی مشکل سائنس' اور ہر شخص میں نہ اس کی صلاحیت ہوسکتی ہے نہ اس کا مذاق۔ نہ اس کے لیے فرصت نہ میلان کہ وہ اس فنی سائنس میں درک حاصل کر لے۔ جس طرح ہر عطائی فن طب کا ماہر نہیں ہوسکتا۔ لہٰذا جمہوریت کے معنی ہیں ایسے لوگوں کی حکومت جو فن حکومت کے ماہر نہیں ہیں۔ پس اس کی مثال یوں سمجھیے جیسے طب کے کسی اہم سوال کے متعلق عوام کی کثرت رائے سے فیصلہ کر لیا جائے اور ان آراء میں ماہر فن ڈاکٹر کی رائے بھی ایک ہی شمار کی جائے۔[1]
جوڈ جو جمہوریت کا زبردست حامی ہے۔ اس کو بھی اپنے نظریہ کے خلاف لکھنا پڑا۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب Decadence میں رقمطراز ہے کہ سائنس کی رو سے ہر چیز کی قیمت اس کی کمیت (Quantity) کے لحاظ سے مقرر ہوتی ہے کیفیت (Quality) کی رو سے نہیں۔
سائنس کے عام ہونے کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی اصول کو سیاست پر بھی منطبق کر لیا گیا۔ چنانچہ جمہوری طرز حکومت میں فیصلے "سروں کی گنتی" سے ہونے لگے۔ ہر سر ایک ووٹ خواہ ایک سر مفکر کا ہو اور دوسرا گدھے کا کیوں نہ ہو۔

۴۔ جمہوری طرز حکومت کی ایک خامی یہ ہے کہ وہ علاقائی نمائندگی اور کثرت رائے کے اصول پر مبنی ہے۔ ایک علاقہ میں مختلف پیشوں کے لوگ آباد ہوتے ہیں۔ وہ آبادی کے لحاظ سے اپنا نمائندہ چنتے ہیں۔ مگر یہ ناممکن ہے کہ وہ منتخب نمائندہ اپنے علاقے کے تمام گروہوں کی یکساں طور پر نمائندگی کر سکے۔ ہر گروہ کا مفاد الگ الگ ہوتا ہے اور نمائندہ ایک ہوتا ہے۔ وہ نمائندہ تمام گروہوں اور طبقوں کے مفادات کی حفاظت نہیں کر سکتا۔ علاوہ ازیں ایک حلقہ میں کئی امیدوار کھڑے ہوتے ہیں۔ ان میں سے ایک ہی کثرت رائے سے منتخب ہوتا ہے۔

[1] The Individual the state and world government P.24.

اگرچہ اس کے مخالف امیدواروں نے مجموعی طور پر کامیاب امیدوار سے زیادہ ووٹ حاصل کیے ہوتے ہیں مگر وہ سب ووٹ رائیگاں جاتے ہیں۔ صرف نمائندہ وہی سمجھا جاتا ہے جس نے سب امیدواروں میں سے زیادہ ووٹ حاصل کیے ہوں۔ حالانکہ صورت حال یہ ہوتی ہے کہ اکثریت نے اس کو ووٹ نہیں دیے ہوتے۔ اقلیت کا نمائندہ اکثریت کا شمار کیا جاتا ہے۔

۵۔ جمہوری طرز حکومت میں قانون سازی کا کام اکثریتی پارٹی کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اگرچہ مجلس قانون ساز میں اقلیتی پارٹیاں بھی حصہ لیتی ہیں مگر قانون سازی کا اختیار ان کو نہیں ہوتا۔ صرف اکثریتی پارٹی قانون وضع کرے گی۔ اس میں طبعی رجحانات اور ذاتی اغراض و مقاصد کا دخل ہوگا۔ جو عدل و انصاف سے دور ہوں گے۔ اقلیتی پارٹیاں کڑی تنقید کریں گی؛ جس کا یہ نتیجہ ہوگا کہ پارٹیوں میں اختلافات اور افتراق کی خلیج حائل ہو جائے گی اور ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی کوشش شروع کر دی جائے گی۔ ایک عرصہ کے بعد اکثریتی پارٹی عوام میں اپنا وقار اور اعتماد کھو بیٹھے گی۔ دوسری کوئی پارٹی برسر اقتدار آ جائے گی تو وہ پہلی اکثریتی پارٹی کے قانون کو منسوخ کر دے گی جو خاص طبقہ کے ذاتی اغراض و مقاصد پر مبنی تھا۔ اس طرح یہ چکر جاری رہتا ہے۔ اس سے صرف قانون کی بے حرمتی نہیں ہوتی بلکہ حکومت کی سالمیت کو بھی خطرہ لاحق ہو جاتا ہے۔

۶۔ تمام جمہوری ممالک میں حکومتیں مدت سے سرمایہ داری اور سامراجیت کی علمبردار ہیں۔ برسر اقتدار طبقہ مختلف تدابیر سے ذرائع آمدن پر قابض ہو جاتا ہے اور عوام منافع اور فوائد سے محروم کر دیے جاتے ہیں۔ برطانیہ میں صرف سرمایہ دار ہی برسر اقتدار آتے ہیں اور انہی کے ہاتھ میں زمام اقتدار ہوتی ہے۔ کوئی عامی شخص ایک سرمایہ دار کو انتخاب میں شکست نہیں دے سکتا۔ اسی طرح امریکہ میں سرمایہ داروں اور بنک کاروں کا غلبہ ہے۔ گویا جمہوریت سرمایہ داروں کی حکومت ہوتی ہے اور یہ سرمایہ دار غیر ممالک کو فتح کر کے سامراجیت قائم کرتے ہیں۔

۷۔ جمہوریت کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں اجتماعی ارادہ (General Will) کی حکومت کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ خوبی جمہوریت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اجتماعی ارادہ کسی مستقل چیز کا نام نہیں ہے بلکہ ایک لوچدار چیز ہے جو ہر وقت دباؤ سے اپنی شکل بدلتی رہتی ہے۔ اس کو فریب اور لالچ کے دام میں پھنسایا جا سکتا ہے۔ اس کو بدلا جا سکتا ہے۔ ایسی غیر مستقل اور ناپائیدار چیز پر ریاست کی بنیاد رکھی جائے گی تو اس میں نہ پائیداری پائی جائے گی اور نہ انسان کے لیے مفید ہو سکے گی۔

۸۔ جب اجتماعی ارادے کا ماحول سے متاثر ہونا یقینی ہے تو ریاست کے لیے کوئی مستقل قانون وضع نہیں کیا جا سکتا۔ اگر عوام غلط رو میں بہ جائیں اور ان میں برے رجحانات نشوونما پانے لگیں تو ریاست اور قانون دونوں جمہور اور ان کے رجحانات کے غلام ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ نہ تو حکومت کو استحکام حاصل ہوتا ہے اور نہ قانون کو پائیداری نصیب ہوتی ہے۔ اس سے قوم کی تباہی و بربادی کے لمحات قریب آتے جاتے ہیں۔

۹۔ تاریخ اس امر پر شاہد ہے کہ جمہوریت بداخلاقی کو ترقی دیتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جمہوری طرز حکومت میں اخلاق کا کوئی مستقل معیار ہی نہیں ہے۔ جمہوریت نے تو عوام کے اجتماعی ارادہ کے پیچھے چلنا ہے۔ اگر عوام میں اخلاقی حس موجود ہے تو حکومت پر بھی عوام کی اخلاقی حس کا اثر ہوگا۔ اگر عوام اخلاقی حس سے عاری ہو گئے ہیں تو حکومت بھی رائے عامہ اور اجتماعی ارادہ کو سامنے رکھ کر بداخلاقی کو روکنے کے لیے کوئی کوشش نہ کرنے گی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ حکومت بداخلاقی کو قانوناً جائز قرار دے دیتی ہے۔

انگلستان میں رائے عامہ کو سامنے رکھ کر لواطت کو جائز قرار دے دیا گیا ہے۔ جوا اور شراب نوشی مغربی جمہوری ممالک کے تمدن کا ایک حصہ بن گئے ہیں۔ حالانکہ جوئے اور شراب نوشی سے ہی مغربی تہذیب و تمدن برباد ہوتا جا رہا ہے۔ اب کوئی مغربی جمہوری ملک عوام کی رائے اور رجحانات کے خلاف قمار بازی اور شراب نوشی پر قدغن نہیں لگا سکتا۔

۱۰۔ جمہوریت کی ایک خرابی یہ ہے کہ اکثریتی پارٹی حکومت کرتی ہے۔ اقلیتی پارٹی حکومت سے محروم رہتی ہے۔ جن ممالک میں مذہبی اختلافات اور مناقشات ہوتے ہیں وہاں اکثریتی پارٹی اقلیت پر ظلم کرنا شروع کر دیتی ہے۔ امریکہ میں سیاہ فام باشندے سفید فام اکثریت کے ہاتھوں ظلم و ستم کا شکار بنے ہوئے ہیں۔

ایک مشہور اطالوی مفکر میزینی (Mazzini) لکھتا ہے: ''لیکن ایسی قوم میں جس میں وحدت عقائد نہ ہو' جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کر سکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔''

قائداعظمؒ کا خیال تھا کہ ہندوستان جیسے ملک کے لیے جمہوریت نامناسب ہے کیونکہ اس طرح اکثریت کا ہمیشہ کے لیے اقتدار قائم ہو جائے گا' اقلیتیں اطمینان اور سکون کا سانس نہ لے سکیں گی۔

۱۱۔ جمہوری طرز حکومت میں اکثریتی جماعت کے نمائندوں میں حق گوئی اور صداقت پسندی کا وصف ختم ہو جاتا ہے۔ وہ اس طرح کہ پارٹی ڈسپلن اس بات کا متقاضی ہوتا ہے کہ اکثریتی

پارٹی کے ممبر وہی بات کہیں جو پارٹی کی رائے ہے۔ جس چیز کو وہ حق اور صداقت سمجھتے ہوں اس کا اظہار نہیں کر سکتے۔ کوئی ممبر بھی اپنی پارٹی کے مفادات کے خلاف کچھ نہیں کر سکتا۔

۱۲۔ جمہوری طرز حکومت کی ایک بڑی خرابی یہ ہے کہ انتخابات کے موقع پر انتخاب لڑنے والے اپنی دولت کو پانی کی طرح بہا دیتے ہیں۔ امیدوار ووٹ حاصل کرنے کے لیے ہر قسم کے جائز اور ناجائز طریقے اختیار کرتا ہے تاکہ اسمبلی کا ممبر بن جائے۔ دولت خرچ کرنے کے بعد جب امیدوار اسمبلی کا ممبر بن جاتا ہے تو اپنی جیب سے خرچ کی ہوئی دولت کو وصول کرنے کے لیے ہر جائز اور ناجائز ہتھکنڈے استعمال کرتا ہے جس سے عوام ظلم و ستم کی چکی میں پس جاتے ہیں' عدل و انصاف سے محروم ہو جاتے ہیں۔ معاشرہ میں ایک فساد برپا ہو جاتا ہے۔ یہ سب خرابیاں اس دولت کے خرچ کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں جو امیدوار نے الیکشن جیتنے کے لیے صرف کی تھی۔

۱۳۔ جمہوری طرز حکومت کا ایک خاصہ یہ ہے کہ اس کی پالیسی کا محور صرف اقتصادیات ہے۔ معاشی مسائل کو ہی اوّلیت کا درجہ دیتی ہے اور زندگی کے دوسرے مسائل اس کے تابع ہوتے ہیں۔ جب زندگی کا ہر شعبہ معاشیات کے تابع ہو جائے تو اخلاقی اور روحانی اقدار ختم ہو جاتی ہیں۔ صرف حیوانی قدریں ہی نشوونما پاتی ہیں۔ جس سے حرص' ہوس' شکم پرستی وغیرہ معاشرتی امراض پیدا ہو جاتے ہیں' جن کی وجہ سے معاشرتی زندگی تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔

تاریخ اس امر پر شاہد ناطق ہے۔ جہاں جمہوریت نے قدم رکھا وہیں سرمایہ داری کو فروغ نصیب ہوا۔ گویا سرمایہ داری کا جمہوریت کے ساتھ غیر منقطع رشتہ قائم ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ کسی ملک میں جمہوری نظام ہو وہاں نظام معاشی سرمایہ داری کے علاوہ کچھ اور ہو۔ جب سرمایہ داری نظام عروج پر پہنچتا ہے تو اس کے بطن سے انقلاب کا آنا ضروری ہے۔ جو ملک کے سیاسی اور معاشی نظام کو بھسم کر کے رکھ دیتا ہے اور اس کی جگہ کوئی اور نظام لے لیتا ہے۔

۱۴۔ جمہوری طرز حکومت میں کام نہایت ہی سست رفتار سے سرانجام پاتے ہیں۔ کسی معاملہ کے بارہ میں فیصلہ کرنے کے لیے نہ جانے کتنے مشورے کرنا پڑتے ہیں' جس سے خاصہ وقت ضائع ہوتا ہے۔ اس طرح حکومت کے کاموں میں تاخیر ہو جاتی ہے۔ اگر ملک میں ہنگامی حالات پیدا ہو جائیں تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے جمہوریت میں صلاحیتیں موجود نہیں ہوتیں۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان ہنگامی حالات میں فیصلے جلدی نہ ہونے کی وجہ سے حکومت کی مشینری میں خرابیاں رونما ہو جاتی ہیں اور لوگوں کو تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

ان حالات میں کوئی آمر اٹھ کھڑا ہوتا ہے جو جمہوری نظام کو ختم کر دیتا ہے اور شخصی حکومت کی داغ بیل ڈال دیتا ہے۔

۱۵۔ جمہوری طرز حکومت کی ایک خرابی یہ ہے کہ پارٹی بازی کی وجہ سے حکومت کے کاموں میں تسلسل قائم نہیں رہتا۔ ہر جیتنے والی پارٹی کا اپنا منشور اور پروگرام ہوتا ہے۔ جب وہ برسراقتدار آتی ہے تو پہلی پارٹی کے پروگرام اور منشور کو ختم کر دیتی ہے اور اپنے منشور اور پروگرام پر عمل پیرا ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ پہلے منصوبوں پر خرچ شدہ رقم ضائع ہو جاتی ہے۔ اس سے ملک کی اقتصادی ترقی رک جاتی ہے۔

۱۶۔ جمہوری طرز حکومت میں ایک سے زائد پارٹیوں کا ہونا لازمی ہے۔ ہر پارٹی دوسری پارٹی کے پروگراموں کے نقائص عیاں کرتی رہتی ہے۔ اس سے ایک تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ پارٹیوں میں شدید اختلاف رونما ہو جاتا ہے۔ دوم ہر پارٹی کے حامیوں میں تصادم ہو جاتا ہے جس سے ملک کی معیشت اور سالمیت کو شدید نقصان پہنچتا ہے۔

اسلام میں جمہوریت کا تصور

اسلام میں جمہوریت کا وہ تصور نہیں جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔ اسلامی جمہوریت کے حسب ذیل تقاضے ہیں:

۱۔ اسلام میں ریاست ایک نظریاتی ادارہ ہے اور اقتدار اعلیٰ کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ ریاست کا جو رئیس ہو گا وہ اللہ تعالیٰ کا خلیفہ (نائب) ہو گا، اسی کے دستور کے مطابق حکومت چلائے گا۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَاللّٰهُ يَحْكُمُ لَا مُعَقِّبَ لِحُكْمِهٖ۔[1] اللہ تعالیٰ حکمرانی کرتا ہے کوئی اس کے حکم کو ٹالنے والا نہیں۔

اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ۔[2] حکم دینے کا اختیار صرف اللہ تعالیٰ کو ہی حاصل ہے۔

اللہ تعالیٰ کے قانون کی فرمانبرداری کرنے کے متعلق قرآن مجید میں آتا ہے: فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ۔[3] پس تو لوگوں کے درمیان اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کر اس قانون حق کو چھوڑ کر جو تمہارے پاس آیا ہے لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کر۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُحَآدُّوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗۤ اُولٰٓئِكَ فِى الْاَذَلِّيْنَ۔[4] جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ کے مقرر کردہ قوانین کے خلاف کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگوں میں سے ہیں۔

---

[1] الرعد ۱۳: ۴۱۔ [2] یوسف ۱۲: ۴۰۔ [3] المائدہ ۵: ۴۸۔ [4] المجادلہ ۵۸: ۲۰۔

وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰئِکَ هُمُ الْکَافِرُوْنَ.[1] اور جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلے نہ کریں تو ایسے ہی لوگ کافر ہیں۔

۲۔ حکومت جمہور کی مِلک ہے، وہ ذاتی یا خاندانی نہیں۔ یہ دفعہ خلاصہ جمہوریت اور زُبدہ مباحث ہے۔ اس بارہ میں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: وَشَاوِرْهُمْ فِی الْاَمْرِ.[2] تو حکومت کے معاملات میں ان سے مشورہ لے۔

وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰی بَیْنَهُمْ[3] ان کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: مَاشَاوَرَ قَوْمٌ اِلَّا هُدُوا.[4] جس قوم نے باہمی مشورہ کیا اس قوم نے فلاح پائی۔

ان آیات کریمہ سے حسب ذیل نتائج نکلتے ہیں:

۱۔ اسلامی حکومت میں عوام سے مشورہ ضروری شرط ہے۔

۲۔ حکومت کی اضافت عام مسلمانوں کی طرف کی گئی ہے۔ جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت کسی کی ذاتی ملک نہیں بلکہ جمہور کی ملک ہے۔

۳۔ صدر اوّل میں مسلمان اسی پر عمل پیرا تھے۔

اگر تاریخ اسلام پر نظر دوڑائی جائے تو ان نتائج کی صداقت خود بخود سامنے آ جاتی ہے کہ:

(ا) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدین ہمیشہ حکومت کے معاملات میں صحابہ سے مشورہ کیا کرتے تھے۔

(ب) رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفاء راشدین نے اپنے بعد کسی اپنے عزیز کو نامزد نہیں کیا۔

(ج) خلفاء کا تقرر مشورہ عام سے ہوا۔

۳۔ خلیفہ کا تقرر اور عزل عوام کے اختیار میں ہے اور اس کو دیگر باشندگان پر کوئی ترجیح حاصل نہیں ہے۔

اگر خلفاء راشدین کے انتخاب پر نظر دوڑائی جائے تو یہ بات عیاں اور واضح نظر آتی ہے کہ ان کے انتخاب میں عوام کا مشورہ اور ارباب حل و عقد کی رائے شامل تھی۔ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سقیفہ میں ہوئی۔ اس وقت بھی انصار اور مہاجرین کے صاحب الرائے افراد شریک تھے۔ پھر مسجد میں بیعت عام ہوئی اور سب نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

حضرت عمرؓ کو حضرت ابوبکرؓ نے تمام صحابہ سے مشورہ کرنے کے بعد نامزد کیا۔ حضرت عمرؓ نے

۱۔ المائدہ ۵:۴۴۔ ۲۔ آل عمران ۳:۱۵۹۔ ۳۔ الشوریٰ ۴۲:۳۸۔

۴۔ کنوز الحقائق حدیث ص ۸۷۔

ایک کمیٹی بنا دی جو آپس میں مشورہ کر کے ایک خلیفہ چن لے۔ اس کمیٹی نے حضرت عبدالرحمانؓ بن عوف کے ہاتھ میں خلیفہ کے انتخاب کی باگ ڈور دے دی تھی۔ انھوں نے تمام صحابہؓ سے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ کے بارے میں پوچھا کہ کس کو خلیفہ بنایا جائے۔ جب حضرت عبدالرحمانؓ نے دیکھا کہ اکثریت کا میلان حضرت عثمانؓ کی طرف ہے تب حضرت عثمانؓ کی خلافت کا اعلان کیا۔ بیعت عام کے وقت کسی نے اعتراض نہیں کیا۔ حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مہاجرین حضرت علیؓ کے پاس گئے کہ آپ خلیفہ بنیں لیکن آپ نے انکار کر دیا لیکن مہاجرین کے اصرار پر حضرت علیؓ رضا مند ہو گئے۔ تو انھوں نے کہا کہ میں اپنی خلافت کا اعلان گھر کے اندر نہیں کرنا چاہتا' مسجد نبوی میں گئے اور سب لوگوں نے بیعت کی۔ اس طرح حضرت علیؓ جمہور کے انتخاب سے خلیفہ بنے۔

حضرت عمرؒ بن عبدالعزیز خلفاء راشدین کی صف میں کھڑے کیے جاتے ہیں۔ انھیں سلیمان بن عبدالملک نے اپنا جانشین مقرر کر دیا تھا۔ سلیمان کی وفات کے بعد انھوں نے مسجد میں اعلان کر دیا: ''مسلمانو! میں اپنی رائے اور خواہش اور مسلمانوں کے عام مشورہ کے بغیر امارت کے عذاب میں مبتلا ہو گیا ہوں' اس لیے میں اپنی بیعت کے بارے میں تمھیں سبکدوش کر دیتا ہوں' اب تم اپنی رائے میں بالکل مختار ہو' میرے سوا جس کو چاہو اپنا امام بنا لو۔''

انعقاد خلافت کے متعلق حضرت عمرؓ کا قول مشعل راہ ہے' آپ فرماتے ہیں:

لا خلافة الا عن مشورة۔[1] یعنی خلافت صرف عام مشورہ سے طے ہو سکتی ہے۔ جس طرح نصب خلیفہ کا اختیار عوام کے ہاتھ میں ہے۔ اسی طرح حق عزل بھی عوام کے اختیار میں ہے۔ چنانچہ مواقف اور شرح مواقف میں لکھا ہے:

اگر مسلمانوں کے کام درست طریقہ پر انجام نہ پائیں اور دین کے معاملات میں خرابی کی صورت نظر آئے تو امت امام کو عہدہ سے علیحدہ کرنے کا حق رکھتی ہے۔ اجتماعی نظم کے لیے امام کا تقرر بھی امت کا حق ہے اور معزول کرنا بھی۔[2]

ابن عطیہ لکھتا ہے: اگر صدر حکومت ماہرین علم وفن اور امت کے دیندار افراد کا شوریٰ طلب کیے بغیر اپنی رائے سے کام کرتا ہے تو اس کو عہدہ سے معزول کر دینا چاہیے۔ اس پر تمام علماء قانون متفق ہیں۔[3]

اسلام میں خلیفہ کو باشندگان حکومت پر کسی قسم کی ترجیح نہیں ہے۔ اس کی نظر میں آقا اور غلام

---

1. کنز العمال جلد ۳ صفحہ ۱۲۹۔ 2. المواقف مع شرح ج ۸ ص ۳۵۲۔
3. فتح القدیر شوکانی (آل عمران) ج ۱ ص ۳۶۰

امیر اور فقیر، چھوٹا اور بڑا سب برابر ہیں۔ صہیبؓ اور بلالؓ جو آزاد شدہ غلام تھے وہ سب رئیسان قریش کے پہلو بہ پہلو ہر مجلس میں بیٹھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ.[1] مومن سب بھائی بھائی ہیں۔ وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا.[2] سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ.[3] انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔ كُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰهِ اِخْوَانًا.[4] تم اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔ اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ.[5] ساری مخلوق عیال اللہ ہے۔

حجۃ الوداع کے مشہور خطبہ میں فرمایا: اَيُّهَا النَّاسُ اَلَا اِنَّ رَبَّكُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاكُمْ وَاحِدٌ اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِيٍّ عَلٰى عَجَمِيٍّ وَلَا لِعَجَمِيٍّ عَلٰى عَرَبِيٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ عَلٰى اَسْوَدَ وَلَا لِاَسْوَدَ عَلٰى اَحْمَرَ اِلَّا بِالتَّقْوٰى.[6] اے لوگو! خبردار تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

اِنَّ كُلَّ مُسْلِمٍ اَخُو الْمُسْلِمِ وَاِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ اِخْوَةٌ.[7] ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے اور مسلمان باہم بھائی بھائی ہیں۔

مساوات قانون کی مثال دنیا کے کسی جمہوری ملک میں پائی نہیں جاتی سوائے اسلام کے۔ کسی جمہوری ملک کا رئیس مملکت عدالت میں پیش نہیں ہوسکتا۔ انگلستان میں ایک مدعی کے جواب میں پارلیمنٹ نے اعلان کر دیا کہ بادشاہ عدالت میں حاضر نہیں ہوسکتا اور نہ کوئی عدالت اس کے نام سمن جاری کر سکتی ہے۔

اسلام ہی وہ حقیقی جمہوریت پیش کرتا ہے جس میں اعلیٰ اور ادنیٰ کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: لَوْ اِنَّ فَاطِمَةَ بِنْتِ مُحَمَّدٍ سَرَقَتْ لَقَطَعْتُ يَدَهَا. اگر محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیٹی فاطمہؓ بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی ضرور کاٹا جاتا۔ اَقِيْمُوْا حُدُوْدَ اللّٰهِ عَلَى الْقَرِيْبِ وَالْبَعِيْدِ وَلَا تَاْخُذُكُمْ فِى اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ (ابن ماجہ) خدا کے حدود قریب کے اور دور کے رشتہ داروں سب پر یکساں جاری کرو اور خدا کے معاملہ میں تم ملامت کرنے والوں کی ملامت کی پرواہ نہ کرو۔ حضرت ابوبکرؓ اپنے پہلے خطبہ میں تمام

1. الحجرات ۴۹: ۱۰۔ 2. یونس ۱۰: ۱۹۔ 3. احمد، ابوداؤد۔
4. بخاری۔ 5. بیہقی کتاب الایمان۔ 6. مسند احمد۔
7. مستدرک حاکم، طبری، ابن اسحاق۔

لوگوں کے سامنے فرماتے ہیں:

اِنَّ اَقْوَاکُمْ عِنْدِی الضَّعِیْفُ حَتّٰی اٰخُذَلَهٗ بِحَقِّهٖ وَاِنَّ اَضْعَفَکُمْ عِنْدِی الْقَوِیُّ حَتّٰی اٰخُذَ مِنْهُ الْحَقَّ۔[1] تمھارے زبردست لوگ میرے لیے اس وقت تک کمزور ہیں جب تک میں ان سے ان پر واجب شدہ حق نہ لے لوں اور بلاشبہ تمھارے کمزور لوگ میرے پاس اس وقت تک زبردست ہیں جب تک کہ میں ان کا غصب شدہ حق واپس نہ دلا دوں۔

حضرت عمرؓ اور ابی بن کعبؓ کا کسی معاملہ میں جھگڑا ہو گیا۔ حضرت زیدؓ بن ثابت کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوا۔ حضرت عمرؓ جب عدالت میں حاضر ہوئے تو انھوں نے تعظیم کے لیے جگہ خالی کر دی۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''ابن ثابت! یہ پہلی بے انصافی ہے جو تم نے اس مقدمہ میں کی ہے'' یہ کہہ کر اپنے فریق کے برابر بیٹھ گئے۔

ایک عیسائی شہزادے جبلہ بن ایہم غسانی نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اسلام قبول کیا تھا۔ کعبہ کے طواف کے موقع پر کسی بدوی کا پاؤں اس کی چادر پر آ گیا۔ جبلہ نے اس کے منہ پر ایک طمانچہ دے مارا۔ اس بدوی نے حضرت عمرؓ کے پاس شکایت کی آپ نے سن کر کہا کہ جبلہ کو ویسے ہی سزا ملے گی۔ عیسائی شہزادے نے ایک رات کی مہلت مانگی وہ تاریکی کے پردہ میں مکہ سے بھاگ گیا۔

۴۔ اسلام میں بیت المال پر خلیفہ کو بغیر مشورہ اہل حل وعقد کے تصرف کی اجازت نہیں ہے اور نہ اپنی ذات پر اسراف اور تبذیر سے خرچ کر سکتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم چٹائی پر سوتے تھے اور جسم مبارک پر داغ پڑ جاتے تھے۔ ان کے جانشین معمولی غذا کھاتے' پھٹے کمبلوں کو جسم پر رکھتے اور معمولی مکانوں میں رہتے تھے۔ حضرت عمرؓ نے ایک موقع پر اپنے مصارف بتلا دیے:

''میں تمھیں بتاتا ہوں کہ بیت المال سے مجھے کتنا لینا جائز ہے۔ دو جوڑے کپڑے' ایک موسم سرما کے لیے اور ایک موسم گرما کے لیے۔ ایک سواری جس پر حج اور عمرہ ادا کروں اور قریش کے ایک متوسط الحال آدمی کے اخراجات طعام کے برابر اپنے اور اپنے خاندان کے لیے۔ اسکے بعد میں ایک ادنیٰ مسلمان ہوں جو ان کا حال ہے وہی میرا حال ہے۔''

۵۔ اسلام خلیفہ کے انتخاب کا حق عوام کو دیتا ہے لیکن ساتھ یہ بھی شرط عائد کر دیتا ہے کہ عنان حکومت صالحین کے سپرد کی جائے۔ جیسا کہ ارشاد الٰہی ہے: اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰۤی اَهْلِهَا۔[2] بے شک اللہ تعالیٰ حکم دیتا ہے کہ امانتیں اس کے اہل کے سپرد کی جائیں۔

۱۔ ابن سعد جلد ۳ ص ۱۳۹۔ کتاب الاموال لابی عبیدہ ص ۳۶۶۔ ۲۔ النساء ۴: ۵۸۔

وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُوْرِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ اَنَّ الْاَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصّٰلِحُوْنَ اِنَّ فِي هٰذَا لَبَلٰغًا لِقَوْمٍ عٰبِدِيْنَ. [1] اور ہم نے زبور میں نصیحت کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث میرے صالح بندے ہوں گے یقیناً اس میں عبادت کرنے والوں کے لیے پیغام ہے۔

۶۔ اسلامی جمہوریت فرد کی انفرادیت کے استحکام اور نشوونما کی ضامن ہے۔ فرد کے اختیار اور ارادہ کی وسعتوں کو وسیع کرتی ہے۔ اس پر صرف وہی پابندیاں عائد کرتی ہے جن سے اس کی اپنی ذات سے دوسروں کے حقوق پر زد پڑتی ہو۔ ہر اس ضابطہ کی مخالفت کرتی ہے جس سے فرد کی انفرادیت میں کمزوری واقع ہوتی ہے۔ اس کی نظر میں ملوکیت، پیشوائیت، نازیت فسطائیت حرام ہیں۔ کیونکہ ان نظاموں سے فرد کو اپنی عقل کی رو سے کسی بات کے تسلیم کرنے یا نہ کرنے کا اختیار نہیں رہتا۔ اسلام نظام سرمایہ داری کو اس وجہ سے برا کہتا ہے کہ اس سے دولت چند ہاتھوں میں سمٹ کر آ جاتی ہے اور عوام ضروریات زندگی سے محروم ہو جاتے ہیں۔ سرمایہ دار اپنی قوت کے بل بوتے پر مزدوروں پر ظلم و ستم کرتے ہیں۔ ان کا ضمیر مردہ ہو جاتا ہے۔ قوت فکریہ جواب دے جاتی ہے۔ وہ صرف سرمایہ داروں کے غلام بن کر رہ جاتے ہیں۔

۷۔ اسلامی جمہوریت میں امت کا ہر فرد حکومت کی ذمہ داریوں میں براہ راست شریک ہوتا ہے اور ارکان سلطنت کے سامنے اپنی رائے پیش کر سکتا ہے۔

مغربی انداز کی جمہوریت میں افراد حکومت کی ذمہ داریوں میں براہ راست شریک نہیں ہوتے، اپنے نمائندوں کے ذریعے حکومت کے کاموں میں شرکت کرتے ہیں۔

۸۔ اسلامی جمہوریت میں تفرقہ بازی کا کوئی تصور نہیں اور تمام سیاسی پارٹیوں کا مطمح نظر عوام کا فلاح ہے اور تمام پارٹیاں اسی اصول کی کاربند ہوتی ہیں۔ اگر برسر اقتدار پارٹی کی طرف سے اس اصول سے انحراف ہو تو ہر مسلم شہری کا یہ فرض ہوتا ہے کہ اس کے خلاف آواز بلند کرے۔ ارشاد الٰہی ہے:

وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا [2] اور سب کے سب اللہ کے عہد کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ [3] اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی باتیں آ چکی تھیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں: كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ کہ تم میں سے ہر ایک راعی (حاکم و والی) ہے اور ہر ایک کو اپنی رعایا سے متعلق پوچھا جائے گا۔

۱۔ الانبیاء ۲۱: ۱۰۵، ۱۰۶۔ ۲۔ ال عمران ۳: ۱۰۳۔ ۳۔ ال عمران ۳: ۱۰۵۔

۹۔ مغربی جمہوریت کے بطن سے سرمایہ داری اور اشرافیہ حکمران پیدا ہوتے ہیں جبکہ اسلامی جمہوریت سرمایہ داری کے بداثرات سے نجات دیتی ہے۔ سرمایہ کو عوام کی خدمت کا ذریعہ بناتی ہے اور تجوریوں کو بھرنے سے روکتی ہے اور اکتناز کرنے والوں کے لیے عذاب الیم کی خبر دیتی ہے اور عوام کا خادم حکمران پیدا کرتی ہے۔

قومیت

قوم اور قومیت کی لغوی تشریح

لفظ قوم قَامَ یَقُوْمُ سے ہے، جس کے معنی کھڑا ہونا ہیں۔ یہ اسم جمع ہے۔ اس سے مراد یہ لی جاتی ہے کہ لوگوں کا ایسا گروہ جو اپنوں کے ساتھ کھڑا اور اپنے امور کا متکفل ہو۔

قوم (Nation) کا لفظ انگریز مفکرین ایک آزاد قومی ریاست کے لیے بھی استعمال کرتے ہیں۔ جرمن کے لوگ اس لفظ کے مرادف (Volk) یعنی عوام کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور انگریزی میں (Vock) کے مقابلہ میں (People) کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ انگریزی زبان میں لفظ قوم (Nation) ایک سیاسی مفہوم اپنے اندر رکھتا ہے جب کہ جرمنی میں یہی لفظ عوام کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

ہیز کے نزدیک قوم کا لفظ لاطینی زبان (Natus) سے مشتق ہے جس کے معنی پیدائش اور نسل کے ہیں۔

تعریف

قوم کی تعریف مختلف مفکرین نے مختلف کی ہے۔ چند مفکرین کی تعریفیں یہاں نقل کی جاتی ہیں۔

گارنر (Garner) لکھتا ہے: قوم ایسا معاشرتی گروہ ہے جن کی ثقافت مشترک ہو اور اپنی روحانی زندگی اور اظہار کی وحدت کو شعوری طور پر سختی سے قائم رکھنا چاہتا ہو۔"

اس تعریف میں قوم کے تصور کے سیاسی پہلو کا ذکر نہیں کیا گیا۔

قوم سے مراد افراد نسل انسانی کا وہ گروہ ہے جسے تاریخ نے مشترک اغراض و مصالح و بعض دیگر اسباب کی بناء پر متحد کر دیا ہو۔ ایک ایسا گروہ جس کا ایک مخصوص وطن ہو، مخصوص زبان ہو، مخصوص تہذیب و ثقافت ہو اور ایک مخصوص نظام معیشت ہو یا پھر ایک علاقے میں بسنے والے انسان جو ایک حکومت، ریاست یا ملک کی وجہ سے آپس میں متحد ہو گئے ہوں قوم کہلاتے ہیں۔[1]

گلکرائسٹ لکھتا ہے: "قوم سے مراد ریاست ہے جس میں کچھ اور بھی شامل کر دیا گیا ہو۔ یعنی ریاست جس کو ایک خاص نقطہ نظر سے دیکھا گیا ہو۔ یعنی لوگوں کا ایسا اتحاد اور وحدت جو ایک ریاست میں رہ کر قائم کی گئی ہو۔" (تعارف سیاسیات از مظہر الحق ص ۱۰۰)

1. Wedster's new world dictionary P.977.

بحوالہ ثانوی تعلیم مضمون قومیت اور اسلام از پروفیسر امان اللہ ایم اے۔

لارڈ برائس کہتا ہے کہ "قوم ایک ایسی قومیت ہے جس نے اپنے آپ کو سیاسی طور پر منظم کر لیا ہو' خواہ وہ آزاد ہو یا آزادی حاصل کرنے کی خواہش رکھتی ہو۔"

ایم ہاسر کہتا ہے: "ایک قوم ثقافتی ہم آہنگ معاشرتی گروہ ہے جو بیک وقت اپنی وحدت اور مشترکہ زندگی کے لیے شعور رکھتا ہے۔ یہ ایک ہی علاقے کے ایسے باشندوں کا اتحاد ہے جن کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ ایک ہی حکومت کے ماتحت ہوں لیکن ان میں مشترکہ مفاد کا جذبہ اتنا پرانا ہو جس سے یہ یقین ہو جائے کہ وہ ایک ہی نسل سے تعلق رکھتے ہیں۔"

برجس کہتا ہے: "قوم ایک ایسی آبادی ہے جس میں مشترکہ زبان اور ادب مشترکہ طور طریقے یا تاریخ مشترکہ رسم و رواج اور حق اور ناحق کے پہچاننے کے لیے مشترکہ شعور ہوتا ہے۔"

(نظری سیاسیات از شاہ فرید الحق ص ۲۳۵)

پروفیسر ارنسٹ بارکر لکھتا ہے: "قوم سے مراد افراد کا ایسا مجموعہ ہے جو ایک خاص علاقے میں بستے ہوں۔ جہاں رہ کر وہ اپنے مختلف خون اور رنگ کے اختلاط سے نسلاً ایک بن گئے ہیں اور نفسیاتی طور پر اپنے ذہن' خیالات' احساسات اور جذبات میں ہم رنگ ہو گئے ہیں اور اپنی زبان' ثقافت اور مذہب وغیرہ میں مشترک اور سیاسی شعور اور مقاصد میں ہم آہنگ ہو گئے ہیں۔"[1]

فرانسیسی مفکر رینان کہتا ہے: "قوم بننے کے لیے مشترکہ زبان یا نسل ضروری نہیں بلکہ قوم ایسے لوگ ہیں جو مشترک تاریخی ورثہ کے باعث اپنے سابقہ تجربے اور روایات کی بناء پر ہمیشہ مل جل کر مشترکہ زندگی گزارنے کے جذبہ سے سرشار ہوں۔"[2]

قومیت کی تعریف

قومیت کی تعریف بھی مختلف مفکرین نے مختلف کی ہے۔

قومیت ایک روحانی جذبہ یا اصول ہے جو لوگوں کی ایک ایسی تعداد کے اندر پیدا ہو جاتا ہے جو ایک خاص خطہ زمین میں رہتے ہوں اور جن میں ایک ہی زبان' ایک ہی مذہب' یکساں تاریخ و روایات' مشترک اغراض و مقاصد اور مشترک سیاسی میل جول اور مطمح نظر موجود ہو۔"[3]

برائس قومیت کی تعریف ان الفاظ میں کرتا ہے:

"ایک قومیت ایک ایسی آبادی ہے جو بعض رشتوں سے مربوط ہوئی ہو۔ مثال کے طور پر زبان و ادب' خیالات' مراسم اور طور طریقے اور اپنے میں ایسے مکمل اتحاد کا احساس کرے جس کے

---

1. Princpies of social and political theory by E.Barker P.53.

بحوالہ تعارف سیاسیات از مظہر الحق ص ۱۰۰۔

2. تعارف سیاسیات صفحہ ۱۰۱۔ 3. اصول سیاست از گلکرائسٹ ص ۳۶ بحوالہ تعارف سیاسیات ص ۱۰۱۔

ذریعے وہ ایسی غیر آبادی سے متفرق ہو جائے جو اپنے طریقے پر اسی طرح مربوط ہوئی ہو۔"

(نظری سیاسیات از شاہفرید الحق ص ۲۳۷)

"قومیت سے مراد وہ مضبوط جذبہ ہے جو عموماً ایک ہی قسم کی روایات و ثقافت کے حامل انسانوں اور ایک مخصوص علاقے میں بسنے والے افراد اور واحد ملتجائے مقصود رکھنے والے اشخاص کو آپس میں متحد رکھنے میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے۔ یہ جذبہ قوموں اور ریاستوں کی تخلیق میں اصول اور سرچشمہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جو افراد کو اپنے وطن' اپنی قوم اور اپنی تہذیب و ثقافت کی خدمت اور اس کے تحفظ و بقاء کے لیے عظیم سے عظیم قربانی دینے پر ابھارتا ہے۔" (رسالہ ثانوی تعلیم مقالہ قومیت اور اسلام از پروفیسر امان اللہ)

پروفیسر ایچ جے لاسکی لکھتا ہے:

"نظریہ قومیت کی تعریف آسانی سے نہیں کی جا سکتی' کیونکہ کوئی ایسا نچا تلا عامل نہیں ہے جس سے اس کا رشتہ جوڑا جا سکے..... غیر جانبدارانہ رائے یہ ہے کہ درحقیقت نظریہ قومیت جیسے کہ رینان نے اپنے مشہور مضمون میں باصرار کہا ہے' نوعیت کے لحاظ سے یقیناً روحانی ہے۔ یہ جذبہ ایک ایسے خاص اتحاد کا تصور پیدا کرتا ہے جو ان لوگوں کو جو اس میں شریک ہوتے ہیں بقیہ پوری انسانیت سے ممتاز اور الگ کر دیتا ہے۔ اس گروہ کی تخلیق مشترک تاریخ' مشترک فتوحات اور متحدہ کوشش کے نتیجے میں بننے والی روایات کی مرہون منت ہوتی ہے۔ یوں انسانوں میں بھائی چارے کا ایک ایسا مضبوط جذبہ پروان چڑھتا ہے جو ان کو وحدت کے رشتہ میں مضبوطی سے منسلک کر دیتا ہے۔ وہ دوسرے افراد کے مقابلے میں اپنی پسند و ناپسند کو نمایاں حیثیت دینے لگتے ہیں۔ ان کا معاشرتی ورثہ واضح طور پر ان کا اپنا ورثہ قرار پاتا ہے۔ وہ ایک ایسے فن و ادب کے حامل ہو جاتے ہیں جو دوسری اقوام سے مختلف اور ممتاز قرار پاتا ہے۔"[1]

پروفیسر ولیم تھامسن لکھتے ہیں:

"اس کے برعکس قومیت سے مراد وہ جذبہ یا وہ تحریک ہے جو قوموں اور ریاستوں کی تخلیق میں اصول یا سرچشمہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ یا وہ مثالی نظریہ یا پھر وہ اصول وضوابط جو مختلف گروہوں یا اقوام کو ریاستیں قائم کرنے پر ابھارتے ہیں۔"[2]

---

[1] رسالہ ثانوی تعلیم مقالہ قومیت اور اسلام از امان اللہ بحوالہ

Laski H.J.A Grammar of politics London 1963, PP 219-20

[2] رسالہ ثانوی تعلیم مقالہ قومیت اور اسلام از امان اللہ بحوالہ

Nationalism and Islam P.P 51-52.

قومیت کے عناصر ترکیبی

قوم اور قومیت کن کن عناصر سے پیدا ہوتی ہے' اس کے بارہ میں مفکرین کا شدید اختلاف ہے در حقیقت ہر ایک قوم یا قومیت کے بننے میں اس کی تاریخ اور ثقافت کے لحاظ سے مختلف عناصر کار فرما ہوتے ہیں' ذیل میں چند عناصر بیان کیے جاتے ہیں:

ا۔ مشترکہ نسل

قومیت کی تعریف میں نسلی اتحاد پر بہت زور دیا گیا ہے۔ پروفیسر زمرن کے نزدیک نسلی اتحاد قومیت کا جزو ہے۔ اسی جزو سے قوم میں جذبہ محبت اور یگانگت پروان چڑھتا ہے۔ لارڈ برائس بھی اشتراک نسل کو عوامل قومیت میں سے ایک اہم عامل قرار دیتا ہے۔ مثلاً انگریز قوم اینگلو سیکسن (Anglo Saxon) قبائل کی نسل سے ہیں جو تقریباً دو ہزار سال قبل انگلستان میں آباد ہوئے۔

لیکن مفکرین کا ایک ایسا گروہ بھی ہے جو نسلی اتحاد کو قومیت کا ضروری حصہ قرار نہیں دیتا۔ رینان کہتا ہے کہ نسل ایک ایسی چیز ہے جو خود اپنے آپ کو بناتی اور بگاڑتی ہے۔ اس کا سیاست سے کوئی واسطہ نہیں۔

ہینز کہتا ہے کہ خالص نسل کا وجود تو باقی نہیں ہے' اگر ہے بھی تو قبائل میں۔

اگر تاریخ اور حیاتیات کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو بھی مشترکہ نسل کا عامل قومیت کے پیدا کرنے میں قابل قبول نہیں۔ ہر ملک اور قوم میں متعدد نسلوں اور خون کا امتزاج پایا جاتا ہے۔ مثلاً امریکی قوم متعدد اقوام اور نسلوں کے اختلاط سے بنی ہے۔

پاکستان میں پنجابی' بلوچی' سندھی' پٹھان اور بنگالی مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں لیکن اس اختلاف کے باوجود وہ ایک ہی رشتہ میں بندھے ہوئے نظر آتے ہیں جبکہ پنجابی مسلمان سکھ اور ہندوؤں میں نسلی قرابت پائی جاتی ہے لیکن وہ ایک رشتہ میں منسلک نہیں ہیں۔

دوسری دقت یہ ہے کہ تاریخی طور پر یہ تحقیق کرنا مشکل ہے کہ کون سے لوگ اصل نسل کے ہیں اور کون سے نہیں کیونکہ مدت مدید سے ایک ہی علاقہ میں مختلف اقوام آ کر بس گئی ہیں' پھر ان میں شادی بیاہ بھی ہو گئے۔ ایک نسل کے فرد کی شادی دوسری نسل کے فرد سے ہو گئی۔ اس طرح نسلی خون آپس میں مل جل گیا ہے اور خالص رہا ہی نہیں۔ مثلاً امریکہ' سوئٹزر لینڈ' کناڈا' ہندوستان اور پاکستان میں مختلف نسلوں کے لوگ رہتے ہیں' لیکن نسلی اتحاد کے فقدان کے باوجود وہ ایک ہی قومیت تصور کیے جاتے ہیں۔

متذکرہ بالا بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اتحاد نسل قومیت کے ارتقاء کے لیے ضروری نہیں۔

ہاں نسلی اتحاد سے قومیت کو استحکام اور یگانگت حاصل ہو سکتی ہے۔

۲۔ مشترکہ زبان اور ادبیات

قومیت کی تشکیل میں اتحاد زبان کو ضروری قرار دیا گیا ہے کیونکہ زبان کے ذریعہ ایک شخص دوسرے شخص کے سامنے اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے تو اس طرح ان میں باہمی ہمدردی اور جذبہ محبت پیدا ہو جاتا ہے۔ جب لوگ ایک ہی زبان سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں تو ان میں جذبات اور خیالات کے گہرے رشتے قائم ہو جاتے ہیں۔ یہی کیفیت ادب کی ہے۔ لوک گیت' گانے' نظمیں' ڈرامے' کہانیاں وغیرہ لوگوں میں اتحاد اور ہم خیالی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہی کیفیت فرانس میں رابیلے (Rabelais) مونٹینی (Monetagne) مولیئے (Molia) والٹیر (Voltaire) پاسکال (Pascal) وغیرہ نے پیدا کی۔ جرمن میں بھی ان کے ادبا وشعراء نے یہی کیا موجودہ دور میں عربوں میں قومیت کے ابھار کا راز بھی عربی زبان اور عربی ادب وفن میں مضمر ہے۔ انگریز قوم کو چائسر' ملٹن کی شاعری' شیکسپیئر کے ڈراموں نے متحد کر کے ایک قوم بنا دیا۔ اسی طرح دنیا کی ہر قوم کے ادب نے ان کے باہمی رشتہ کو زیادہ مضبوط بنا دیا ہے۔

ریمزے میور کہتا ہے کہ زبان کا اتحاد نسلی اتحاد سے زیادہ ضروری اور اہم ہے۔

جوزیف کے نزدیک مشترکہ زبان قومی نفسیات پیدا کرتی ہے جس سے اتحاد اور قومی جذبہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ باہمی اخوت کے جذبات استوار ہوتے ہیں اور غیریت کی فضا ختم ہو جاتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ مشترکہ زبان قومی اتحاد کے لیے بہت ضروری ہے۔ لیکن اسے قومیت کا ترکیبی عنصر قرار دینا مناسب نہیں۔ یہ تاریخی امر ہے کہ دنیا میں بعض ایسی قومیں بھی پائی جاتی ہیں جن میں کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ مثلاً سوئٹزر لینڈ میں تین زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن وہ ایک ہی قومیت کے افراد تصور کیے جاتے ہیں۔ پاکستان میں کئی زبانیں بولی اور سمجھی جاتی ہیں۔ اسی طرح ہندوستان کئی زبانوں کا مسکن ہے' لیکن وہ ایک ہی قومیت کے رشتہ میں منسلک ہیں۔ اس کے برعکس دنیا میں کئی ملک ایسے ہیں جن میں ایک زبان بولی جاتی ہے لیکن ان کی قومیت الگ الگ ہے۔ مثلاً انگریزی زبان انگلستان' ریاست ہائے متحدہ امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ میں بولی جاتی ہے۔ لیکن یہ ممالک قومیت کے اعتبار سے الگ الگ ہیں۔ اسی طرح پرتگالی زبان پرتگال اور برازیل میں مشترک ہے لیکن دونوں علیحدہ قومیں ہیں۔

۳۔ مشترکہ مذہب

مذہبی اتحاد لوگوں میں محبت اور اخوت کے جذبات پیدا کرتا ہے' اس سے خیالات اور افعال

میں ہم آہنگی آ جاتی ہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ مذہب نے قوموں کی زندگی پر بہت اثر ڈالا اور ان کو اتحاد اور بھائی چارہ کی لڑی میں منسلک کر دیا۔ حقیقت الامر یہ ہے کہ اشتراک مذہب لوگوں میں زیادہ اتحاد پیدا کرنے کا موجب ہے۔ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کی ایک وجہ اسلام ہے۔ ہندوستان کے جن علاقوں میں مسلمان زیادہ تھے آزادیٔ ہند کے وقت ان علاقوں کو پاکستان کا نام دے کر الگ ریاست قائم کی گئی۔

گلکرائسٹ کہتا ہے کہ مذہبی اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ ایک آبادی میں بنیادی عقائد کا اشتراک پایا جاتا ہو۔ فروعی اختلافات مذہبی اتحاد پر اثر انداز نہیں ہو سکتے۔ مثلاً ہندومت، اسلام اور عیسائیت فروعی اختلافات کی بناء پر کئی فرقوں میں بٹ گئے ہیں لیکن مسالک کے اختلافات کے باوجود ان میں قومی اتحاد قائم ہے۔ مسلمانوں میں شیعہ، سنی، عیسائیوں میں پروٹسٹنٹ اور کیتھولک وغیرہ مختلف فرقے ہیں جن میں فروعی اختلافات ہیں لیکن فروعی اختلافات کے باوجود اپنے آپ کو ایک قومیت خیال کرتے ہیں۔

مذہب نے قوموں کی زندگی پر بہت اثر ڈالا ہے۔ اس لیے یہ عنصر تمام عناصر پر غالب ہے۔ اس عنصر نے قوموں میں جو یگانگت، اتحاد اور اخوت پیدا کی ہے کسی اور عنصر نے پیدا نہیں کی لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مذہب کی حقیقی روح کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ایک ہی قوم کے لوگ محض فروعی اختلافات کی بناء پر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہوئے۔ قتل و غارت کا بازار گرم ہوا جس سے قومی یگانگت اور استحکام کو کافی نقصان پہنچا۔ پروٹسٹنٹوں اور کیتھولکوں کے درمیان قتل و غارت ہوئی۔ شیعہ سنی اختلاف اسلامی خلافت کے لیے تباہ کن ثابت ہوا۔ فروعی اختلافات کی وجہ سے قتل و غارت کا بازار گرم کرنا تنگ نظری کا نتیجہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مذہب باہمی بیر اور دشمنی ختم کرنے آتا ہے۔ اس وجہ سے ریاست کا یہ اہم فریضہ ہے کہ لوگوں کو مذہب کی حقیقی روح سے آگاہ رکھے اور فروعی اختلافات کی بناء پر جھگڑوں کو دبا دے۔ ایک ریاست میں مختلف قسم کے مذاہب کے لوگ آباد ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے اکثریت کو اقلیت کے ساتھ مذہبی رواداری اور دوستی کا برتاؤ کرنا چاہیے۔

۴۔ جغرافیائی اشتراک

بعض مفکرین جغرافیائی اتحاد کو قومیت کا ایک لازمی اور اہم عنصر قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب لوگ ایک ہی متعین علاقے میں زندگی بسر کرتے ہیں تو باہمی میل جول اور تعلقات کی وجہ سے باہمی اتحاد اور یگانگت کو فروغ ہوتا ہے۔ ادب، تہذیب و تمدن، فن اور مشترک رسم و رواج پیدا ہو جاتے ہیں جو لوگوں کے عقول و قلوب میں یکساں جذبات اور خیالات پیدا کرتے ہیں۔ لیکن اس کے برعکس وہ لوگ جو خانہ بدوشی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ نہ ان میں اتحاد اور اخوت کے جذبات پیدا ہوتے ہیں اور نہ وہ ایک رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں کیونکہ دور دراز علاقوں میں گھومنے پھرنے والے

لوگوں میں اتحاد نہیں ہوتا۔ ان کے اندر جذبہ قومیت ترقی نہیں پاتا۔

اگر تاریخی طور پر اس نظریہ کا جائزہ لیا جائے تو صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ ایک قوم مخصوص زبان' ادب اور رسم و رواج کی حامل ہوتی ہے۔ پھر گردش زمانہ سے وہ منتشر ہو جاتی ہے تب بھی وہ اپنے اندر جذبہ قومیت رکھتی ہے۔ مثلاً یہودی قوم دو ہزار سال سے دنیا کے مختلف حصوں میں آباد تھی لیکن اس کے مذہب' ادب اور روایات نے اس میں قومی جذبہ کو بیدار رکھا' حتی کہ انگریز' امریکی اور فرانسیسی طاقتوں کی مدد سے دوبارہ فلسطین میں آباد ہو گئے۔ اگر ان میں جذبہ قومیت وطن نہ ہونے کی وجہ سے فنا ہو چکا ہوتا تو پھر ایک جگہ جمع نہ ہو سکتے۔ باوجودیکہ ان کا ایک وطن نہیں تھا پھر بھی ان میں جذبہ قومیت بیدار رہا اور پھر ایک وطن میں آباد ہو گئے۔ اسی طرح انڈونیشیا ہزار جزیروں میں بٹا ہوا ہے مگر اس کے باوجود انڈونیشی ایک قوم ہے۔

۵۔ مشترک ثقافت

ثقافت سے مراد تہذیب و تمدن' افکار و خیالات' رسم و رواج اور فنون ہیں۔ یہ تمام باتیں ایک قوم کو دوسری قوم سے ممیز کرتی ہیں اور قوم کو یگانگت اور اتحاد کی لڑی میں منسلک کر دیتی ہیں۔ ان میں محبت اور انسیت کے جذبات ترقی کرتے ہیں۔

ثقافت ماضی کا ورثہ ہوتا ہے۔ قومیں اس ورثہ پر فخر کرتی ہیں اور اس سے اپنے مستقبل کا لائحہ عمل بناتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر قوم اپنے تعلیمی نصاب میں اپنے آباؤ اجداد کی تاریخ کو خاص اہمیت دیتی ہے۔ ایک طرف تو یہ کارنامے اور قومی تاریخ لوگوں کے دلوں میں مشترکہ جذبات اور افکار کو فروغ دیتے ہیں۔ دوسری طرف ایک مرکز پر متحد ہونے کا سبق دیتے ہیں۔ مشترکہ جذبات اور ایک مرکز سے وابستگی قومی زندگی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ اسی وجہ سے جان اسٹورٹ مل کے نزدیک "مشترکہ سیاسی واقعات' قومی تاریخ' یادداشتیں' مجموعی سربلندی اور بے عزتی' خوشی اور رنج جو ماضی سے متعلق ہوتے ہیں' قومیت کے عناصر میں سب سے مضبوط اور اہم ہیں۔"[1]

۶۔ مشترکہ سیاسی جذبات اور تجربات

مشترکہ سیاسی جذبات اور تجربات لوگوں کے اندر قومیت کا تصور پیدا کر دیتے ہیں۔ مشترکہ جذبات سے مراد یہ ہے کہ قومیت یا تو آزاد ہو کر اپنی ایک نئی مملکت کے قیام کی خواہاں ہوتی ہے یا دوسری حکومت کے ماتحت رہتے ہوئے اپنے اندرونی معاملات میں آزادی چاہتی ہے۔ مشترکہ سیاسی جذبات' تجربات اور جدوجہد لوگوں کو ایک دوسرے کے قریب لاتے ہیں۔ ان میں جذبہ الفت اور انسیت بیدار ہوتا ہے۔ وہ ایک دوسرے کے لیے مرنے مارنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ایک دوسرے

[1] نظری سیاسیات از شاہ فرید الحق ص ۲۳۷۔

کے رنج و محن میں شریک ہوتے ہیں۔ جب لوگوں کی متحدہ کوشش سے آزادی مل جاتی ہے تو وہ اپنے آپ کو قوموں میں تبدیل کر لیتے ہیں۔ مثلاً پاکستانی قوم کی تشکیل میں اس جدوجہد کا بہت حصہ ہے جو مسلمانوں نے انگریزوں کی غلامی سے آزادی حاصل کرنے کے لیے برسوں تک جاری رکھی۔ آخر کار وہ کوشش پاکستان کے قیام پر منتج ہوئی۔

گلکرائسٹ کہتا ہے: ''قومیت دو وجہوں سے زندہ رہتی ہے۔ یا اس وجہ سے کہ وہ قوم حاکم رہ چکی ہے اور اس کا اپنا علاقہ اور مملکت رہی ہے یا اس وجہ سے کہ وہ اپنی خاص مملکت اور علاقے کے ساتھ ایک قوم بن جانا چاہتی ہے۔''[1]

یہ خیال کہ ہر قومیت کے لیے الگ ریاست ہو' بعض حالتوں میں نہ صرف خطرناک ہے بلکہ ناممکن العمل بھی ہے۔ ایک ہی ملک میں بے شمار چھوٹی چھوٹی قومیتیں ہوتی ہیں۔ ہر ایسی قومیت کے لیے الگ ریاست کا تصور ایک بڑی ریاست کو کئی حصوں میں تقسیم کر دے گا۔ جو سیاسی اور اقتصادی نقطہ نگاہ سے خطرناک ہے۔ یہ چھوٹی قومیتیں نہ تو اپنا دفاع کر سکتی ہیں اور نہ اقتصادی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہیں۔ ہاں اگر کوئی قوم ایسی ہے جو ایک جغرافیائی علاقہ میں رہتی ہو' اس کی تعداد بھی کافی ہو' وہ اپنا دفاع کر سکتی ہو اور معاشی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کھڑی ہو سکتی ہو تو ایسی قوم کو آزاد سیاسی حیثیت دینا ضروری ہے۔

۷۔ جذبہ قومیت

جذبہ قومیت سے مراد وہ جذبہ ہے جو لوگوں میں قومیت کا تصور بیدار کر کے اتحاد کی ایک لڑی میں منسلک کر دے۔ یہ عنصر قومیت کا جزو لاینفک ہے۔ اگر مذکورہ بالا عناصر میں سے کوئی عنصر نہ بھی پایا جائے تب بھی قوم کی تشکیل ہو سکتی ہے لیکن یہ عنصر موجود نہ ہو تو کوئی قوم اپنے آپ کو قوم نہیں بنا سکتی۔ جیسا کہ پروفیسر زمرن کا قول ہے کہ اگر لوگ اس بات کا احساس کر لیں کہ وہ ایک قوم ہیں تو قوم ہو جاتے ہیں۔

میکڈوال (Macdowall) اپنی کتاب گروہی ذہن (Group Mind) میں رقمطراز ہے کہ ''یہ بے سود ہے کہ قومیت کے راز کو ایسی باتوں میں تلاش کیا جائے جیسے جغرافیائی حدود' نسل' تاریخ یا اقتصادی عوامل' یہ عوامل سچے اور اہم ضرور ہیں لیکن بالواسطہ طور پر آدمیوں کے ذہنوں' عقائد' رائے اور جذبات پر اثر ڈالتے ہیں اور اس طرح قومی جذبہ اور خیال کو ترقی دیتے یا کمزور کرتے ہیں۔''[2]
اس سے معلوم ہوا کہ مذکورہ بالا عوامل تبھی موثر ہوتے ہیں جب وہ قومی جذبات کو بیدار کریں۔

---

[1] اصول علم سیاسیات از گلکرائسٹ صفحہ ۴۳۔

[2] بحوالہ تعارف سیاسیات مصنفہ مظہر الحق ص ۱۰۷۔

اگر کوئی قوم جذبہ قومیت سے عاری ہے تو کوئی عنصر بھی اس کو قومی زندگی نہیں بخش سکتا۔ یہ عناصر قومیت کی تشکیل میں اس وقت سود مند ہوتے ہیں جب قوم میں جذبہ قومیت بیدار ہو۔ فرانسیسی مفکر رینان لکھتا ہے کہ قومیت بالآخر ایک روحانی جذبہ ہے جو ایک نسل آنے والی نسلوں کو وراثتاً دیتی ہے اور اس طرح قوم کا تصور سیاسی نصب العین کی صورت میں اس کے ہر رکن کے ذہن اور شعور میں کار فرما ہوتا ہے۔ اس کے طفیل ہی قوم زندہ جاوید رہتی ہے۔[1]

تحریک قومیت کی تاریخ

اس وقت دنیا میں تین مادی تحریکیں زوروں پر ہیں: قومیت' سامراجیت اور کمیونزم۔ ہر تحریک ایک دوسرے پر چھا جانے کی سر توڑ کوشش کر رہی ہے لیکن جو مقبولیت تحریک قومیت کو ہوئی ہے کسی اور تحریک کو نہیں ہوئی۔ اب تو یہ تحریک تمام کرہ زمین پر پھیل چکی ہے اور ہر ریاست قومی ریاست بن چکی ہے۔

قومیت کے آغاز سے متعلق اختلاف ہے۔ ایک نظریہ یہ ہے کہ جب سے تمدن کا آغاز ہوا ہے اسی وقت سے قومیت کا آغاز ہوا ہے۔ تمدن قبائلی زندگی کا نتیجہ ہے۔ دنیا کی ہر ریاست پہلے چھوٹے چھوٹے قبائل میں بٹی ہوئی تھی۔ ریاست ایک ہی ہوتی تھی لیکن اس میں کئی قبائل رہتے تھے جن کا اپنا سیاسی نظام ہوتا تھا۔ پھر دنیا قبائلی زندگی سے آگے بڑھی تو قومی دوائر میں تقسیم ہو گئی۔ یعنی ریاستوں کا قبائلی نظام ختم ہو گیا۔ اس کی جگہ قومی نظام نے لے لی۔ اب ریاستیں ایک نظام کے تحت آ گئیں۔ قوم کیا ہے؟ مختلف قبائل کا یک جا ہو جانا۔ اس لیے جو دساتیر قبائلی زندگی میں کارفرما تھے وہی قومی زندگی میں کارفرما ہو گئے۔

بابل' مصر' یونان' روم کی قدیم تہذیبوں میں قومیت کا جو تصور تھا وہی آج بھی دنیا میں سمجھا جاتا ہے۔ اگر بنی اسرائیل میں جذبہ قومیت نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے گرد جمع نہ ہوتی اور وہ جذبہ قومی ہی تھا جس نے فرعون سے نجات حاصل کرنے کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مانا اور بیت المقدس میں آباد ہونے کے لیے مصر سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں نکل پڑے۔ ازمنہ ماضیہ میں جتنی بھی جنگیں ہوئی ہیں وہ سب جذبہ قومی کی وجہ سے ہوئیں۔ اگر کسی ایک قوم نے دوسری قوم کو صفحہ ہستی سے مٹانے اور اس کے ملک پر قبضہ کرنے کے لیے حملہ کیا تو دوسری قوم نے محض جذبہ قومیت کی وجہ سے حملہ آور قوم سے مقابلہ کیا' تا کہ اپنے وجود کو باقی رکھ سکے۔ وہ قوم جس پر حملہ کیا گیا تھا اس میں قومی جذبہ نہ ہوتا تو وہ کبھی بھی جنگ کی آگ میں نہ کودتی۔

بعض لوگوں کا یہ خیال ہے کہ قومیت کا آغاز پندرھویں صدی میں فرانس اور انگلستان کی

---

[1] تعارف سیاسیات از مظہر الحق ص ۱۰۷۔

لڑائی سے ہوا۔ یہ جنگ ایک سو سال تک رہی۔ جنگ کے نتیجہ میں دونوں ملکوں میں قومی زبان اور ثقافت کی وجہ سے قومی جذبات بیدار ہو گئے جو قرونِ وسطیٰ کے نصرانی نظریات کے مخالف تھے۔ جب یہ جذبات زور پکڑ گئے تو دونوں ملک دو قومی ریاستیں بن گئے۔ جب سولھویں صدی میں یورپ میں مذہبی جنگیں شروع ہوئیں تو سپین اور ہالینڈ بھی ایک دوسرے کے ساتھ برسر پیکار تھے اور دونوں ملک دو قومی ریاستیں بن گئے۔ اسی طرح جنگ و پیکار کا سلسلہ جاری رہا تو اٹھارویں صدی میں تقریباً سارا مغربی اور وسطی یورپ قومی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ اٹھارویں صدی کے آخر میں فرانس میں انقلاب رونما ہوا جس کے نتیجہ میں نیشنلزم کی لہر تمام یورپ میں پھیل گئی۔ تقریباً ایک صدی میں سارا یورپ قومی ریاستوں میں تقسیم ہو گیا۔ جب انیسویں صدی کا آغاز ہوا تو یہ تحریک دنیا کے دوسرے ممالک میں بھی پھیل گئی اور براعظم ایشیا اور افریقہ میں نئی ریاستیں معرض وجود میں آ گئیں۔

اس قومی جذبہ نے ہی سامراجی طاقتوں کو کمزور کیا اور ان کی حاکمیت کے بندھن ڈھیلے پڑنا شروع ہو گئے اور آہستہ آہستہ غلام ملک سامراجی طاقتوں کے پنجہ اقتدار سے نجات پا کر آزاد ہونے لگے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد تو سامراجی طاقتوں کو اتنا ضعف لاحق ہو گیا کہ ایک ایک کر کے تمام محکوم ریاستیں آزاد ہوتی چلی گئیں۔ یہ تحریک اس قدر زوروں پر ہے کہ ایشیا اور افریقہ کی تمام محکوم ریاستیں ایک ایک کر کے آزاد ہوتی چلی جا رہی ہیں۔

ایچ۔ جی ویلز اس تحریک کے انیسویں صدی کے احوال پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"پوری انیسویں صدی میں قومیت کے اس جذبہ کو دنیا بھر میں کامیاب کرنے کے لیے سر توڑ کوششیں کی جاتی رہیں۔ اگرچہ فطری طور پر انسان کسی نہ کسی جماعت سے وابستگی رکھنے والا اور محب قوم و وطن واقع ہوا ہے لیکن انیسویں صدی میں اس فطری قبائلی عصبیت کو غیر فطری طور پر بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا' اسے نہایت ہی خوبصورت رنگوں میں پیش کیا گیا اور اس کے پھیلانے میں بے پناہ جوش و خروش کا اظہار کیا گیا۔ اس سے اس جذبے میں آگ جیسی تیزی پیدا کرنے کی کوشش ہوئی اور اسے زبردستی طور پر قومی سانچے میں ڈھالا گیا۔ قومیت کا سبق مدرسوں میں پڑھایا گیا۔ اخباروں نے وسیع پیمانے پر اس کی اشاعت کی۔ واعظوں نے اس کی تلقین کی اور مغنیوں نے اپنے نغمات میں اس جذبہ کا اظہار کیا۔ انسانوں کو یہ احساس دلایا گیا کہ وہ قومیت کے جذبہ کے بغیر اسی طرح ناموزوں ہیں جس طرح کہ وہ ایک عظیم اجتماع میں بغیر لباس کے ہوں۔ ساکنانِ مشرق جنھوں نے پہلے قومیت کا نام تک نہیں سنا تھا' انھوں نے بھی اس تحریک کو مغرب کے سگریٹ اور ہیٹ کی طرح ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ہندوستان جو متضاد اقوام' مذاہب اور تہذیبوں کا گہوارہ تھا اور جہاں دراوڑ' منگول اور آریائی قومیں آباد تھیں' ایک قوم بن گیا۔"[1]

1. Wells H.G: The Outline of history London N.D. PP ii.666

بحوالہ رسالہ ثانوی تعلیم مقالہ قومیت اور اسلام از پروفیسر امان اللہ۔

اگر قومیت کی تاریخ کے متعلق مختلف نظریات کا علمی جائزہ لیا جائے تو تضاد ختم ہو جاتا ہے۔ نیشنلزم اپنی روح کے لحاظ سے آغاز تمدن کے وقت سے ہے۔ اگر یہ روح نہ ہوتی تو کوئی قوم نہ زندہ رہتی اور نہ اپنی بقا کے لیے کوشش کرتی لیکن پندرھویں صدی میں نظریہ کے طور پر مفکرین کا موضوع بنی تو اس طرح یہ اپنی روح کے لحاظ سے اتنی قدیم ہے جتنا تمدن اور نظریہ کے لحاظ سے اس کا آغاز پندرھویں صدی میں ہوا۔ گویا قومیت کی روح کو پندرھویں صدی میں نظریہ کی حیثیت دے دی گئی اور مفکرین نے اس پر لکھنا شروع کر دیا اور سیاست کا ایک حصہ بن گئی۔

قومیت کے فوائد

۱۔ قومیت جمہوریت اور حریت انسانی کے فروغ اور ترویج کے سلسلہ میں بڑا نمایاں کردار ادا کرتی ہے۔ تاریخ کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ قومیت جمہوری خواہشات کی پیداوار ہے۔ جب کسی قوم پر کوئی اپنا یا غیر آمرانہ تسلط جما لیتا ہے تو محکوم قوم کے قومی جذبات بیدار ہوتے ہیں اور وہ آزادی کے حصول کے لیے میدان عمل میں اتر آتی ہے اور ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار رہتی ہے اور اپنے ملک میں جمہوری حکومت قائم کرنے کی خواہاں ہوتی ہے۔ یہ غلامی کی زنجیروں کو کاٹ دیتی ہے۔

۲۔ قوم پرستی قوم میں اتحاد اور انسیت کے جذبات پیدا کرتی ہے اور وہ دشمن کے مقابل پر بنیان مرصوص بن جاتی ہے۔ جب کوئی بیرونی طاقت حملہ آور ہو تو اپنے جذبہ اتحاد سے اس کے دانت کھٹے کر دیتی ہے اور اسے پسپا کر دیتی ہے۔ جب یہ جذبہ کسی قوم میں سرد پڑ جاتا ہے تو اس کا اتحاد پارہ پارہ ہو جاتا ہے اور وہ بیرونی طاقتوں کا لقمہ تر بن جاتی ہے۔

۳۔ نیشنلزم سے قوم زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر جاتی ہے کیونکہ عوام زندگی کے ہر شعبہ میں جانفشانی سے کام کرتے ہیں۔ جس کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ قوم ترقی کے میدان میں گامزن ہو جاتی ہے۔ سائنسدان سائنس کے میدان میں دن رات محنت کرتے ہیں۔ ادیب' شعراء اور مصنف اپنے اپنے دائرہ عمل میں جانفشانی سے کام کرتے ہیں جس سے ملک کی معاشی ترقی ہوتی ہے اور لوگوں کا معیار زندگی بلند ہوتا ہے۔

۴۔ نیشنلزم عوام کو اپنے محدود گروہوں مثلاً اعزہ و اقربا کے تنگ نظریوں سے بلند کر کے قومی سطح پر سوچنے کی راہنمائی کرتا ہے اور عوام قوم اور ملک کی خاطر ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔

قومیت یا قوم پرستی کے نقصانات

قومیت دنیا میں جنگ' نفرت اور تعصب کے جذبات کو فروغ دیتی ہے۔ امن اور رواداری

کے اصولوں کو پامال کرتی ہے۔ اس دور میں باہمی منافرت اور امن کی بربادی کی وجہ محض قومیت ہے۔
پروفیسر کوبن لکھتا ہے: "قومیت پرستی کا احساس نفرت سے پیدا ہوتا ہے اور عداوت سے پرورش پاتا ہے۔ ایک قوم کو اپنی ہستی کا احساس ہی اس وقت ہوتا ہے جب وہ کسی دوسری قوم سے متصادم ہو۔ پھر ان اقوام کا جذبہ عداوت و پیکار اپنی قومی وحدت کی تکمیل پر ہی ختم نہیں ہو جاتا۔ جوں ہی کوئی قوم اپنے حق استقلال و خود مختاری کو مسلط کر لیتی ہے تو ان اقوام کو دبانا شروع کر دیتی ہے جو اپنے لیے خود مختاری کی مدعی ہوں ..... ان تمام وجوہات کی بناء پر اس نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ کسی نظام حکومت کے لیے قومیت پرستی کی بنیاد بڑی ہی خطرناک ہے۔"[1]

Pillsburg لکھتا ہے:

"تاریخ بتاتی ہے کہ قریب قریب تمام قومیں بڑی بڑی لڑائیوں یا دوسری قوموں سے طول و طویل مخاصمت کی پیدا کردہ ہیں۔"[2]

میسن لکھتا ہے:

"جنگ کی بنیاد نیشنلزم ہے۔ جس طرح افراد میں باہمی تنازع کی بنیاد جذبہ انائیت ہوتا ہے۔ ارتقائے جنگ کی ساری تاریخ کا سراغ اسی بنیاد سے لگ سکتا ہے۔"[3]

پروفیسر ولیم برنڈ (William Brend) اپنی کتاب (Foundations of Human Conflicts) کے مقدمہ میں رقمطراز ہے:

"اغلب یہی ہے کہ موجودہ جنگ کے بعد اقوام یورپ چند سال تک عملی نبرد آزمائی میں نہ الجھیں گی کیونکہ ان میں سے بعض تو بہت تھکی ہوئی ہوں گی اور بعض کو ان کے فاتحین دبا کر رکھیں گے۔ لیکن قومیت پرستی (Nationalism) یعنی وہ جذبہ جو جنگ کا اصلی ذمہ دار ہے باقی رہے گا۔ اس لیے مستقبل میں جنگ (کے امکانات) کو ختم کرنے کے لیے آج کی سیاست دانی کی پرکھ اس سے ہوگی کہ موجودہ جنگ کے بعد قومیت پرستی کے اس جذبہ کے متعلق کیا تدابیر اختیار کی جاتی ہیں۔"[4]

Adam De Hegedus اپنی کتاب The state of the world میں لکھتا ہے:

"مسئلہ کسی قدر پیچیدہ کیوں نہ ہو، یہ واقعہ ہے کہ ہمارے دور کی دونوں عالمگیر لڑائیاں نیشنلزم کی پیدا کردہ ہیں اور یہی چیز ہمارے زمانہ میں سب سے بڑی سیاسی قوت ہے۔ ان دونوں لڑائیوں کی

"قومیت کی تشکیل اور جامعیت میں سب سے موثر جذبہ نفرت کا ہے اور تاریخ بحوالہ انسان نے کیا سوچا از پرویز ص ۲۳۷۔

1. The Crisis of Civilisation P.166
2. بحوالہ انسان نے کیا سوچا از پرویز ص ۲۳۷۔
3. Creative Freedom
4. بحوالہ انسان نے کیا سوچا از پرویز ص ۲۳۸۔

میں وہی اصول کارفرما تھا جس کی رو سے دنیا کو آزاد قومی مملکتوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے اور جس کا فطری نتیجہ یہ ہے کہ مختلف مملکتیں ایک دوسرے سے بڑھنے کی فکر کرتی ہیں اور اس طرح ایک دوسرے سے برسرپیکار ہیں۔ ان حالات میں کبھی صالح معاشرتی نظام قائم ہی نہیں ہوسکتا۔''[1]

۱۔ نیشنلزم نے انسانیت میں غیر فطری تقسیم کر دی ہے۔ ہر قوم دوسری قوم کو ہیچ اور کمتر سمجھتی ہے۔ پروفیسر ولیم برنڈ (William Brend) لکھتا ہے:

''آج ایک براعظم کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک ذرخیز کھیت ہے، جس میں انسانوں نے نہایت نامعقولیت سے دیواریں کھڑی کر رکھی ہیں، یعنی وادیوں کی اطراف و جوانب سڑکیں، دریا وغیرہ جن کا مصرف اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ انھوں نے ایک گروہ کو دوسرے سے الگ کر رکھا ہے، اور جذبہ وطنیت وہ سیمنٹ ہے جو ان زندہ اینٹوں کو باہم مربوط کیے ہوئے ہے جس سے انسان خود ساختہ جیل خانوں میں محبوس ہیں۔''[2]

(Foundations of Human Conflicts P.57)

آگے چل کر یہی پروفیسر لکھتا ہے:

''وطنیت کا جذبہ اتحاد انسانی کے راستہ میں سب سے بڑا پتھر ہے..... انسان کے سامنے دو ہی راستے ہیں: یا تو یہ کہ وہ اپنی قومیت کو قائم رکھے اور اس طرح دنیا میں جنگ کا سلسلہ جاری رہے اور یا کسی قسم کے بین الاقوامی اتحاد کا راستہ اختیار کرے۔''[3] (P.75)

۳۔ نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث ہے۔ (Aldous Huxley) اپنی کتاب (Science liberty and peace) میں رقمطراز ہے:

نیشنلزم اخلاق کی تباہی کا باعث اس طرح بنتی ہے کہ اس کی رو سے عالمگیر انسانیت خدائے واحد اور احترام آدمیت کے تمام عقائد باطل قرار پا جاتے ہیں اور ان کی بجائے علیحدگی، تکبر، انانیت، خود اکتفائیت کے عقائد پیدا ہو جاتے ہیں۔

۴۔ نیشنلزم قوموں میں جاہلانہ عصبیت پیدا کرتی ہے۔ گورے کالے، مشرقی مغربی اور عربی و عجمی کا مسئلہ قومیت کا پیدا کردہ ہے۔ قومیت کے اس پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں:

''کیا انسان کے لیے اس سے زیادہ غیر معقول ذہنیت اور کوئی ہوسکتی ہے کہ وہ نالائق، بدکار اور شریر آدمی کو ایک لائق، صالح اور نیک نفس پر صرف اس لیے ترجیح دے کہ پہلا ایک نسل

۱۔ ایضاً ص ۲۳۹۔ ۲۔ بحوالہ انسان نے کیا سوچا از پرویز ص ۲۳۸۔

۳۔ ایضاً ص ۲۳۸۔

میں پیدا ہوا ہے اور وہ سرا کسی اور نسل میں؟ پہلا سفید ہے اور دوسرا سیاہ؟ پہلا ایک پہاڑ کے مغرب میں پیدا ہوا ہے اور دوسرا اس کے مشرق میں؟ پہلا ایک زبان بولتا ہے اور دوسرا کوئی اور زبان؟ پہلا ایک سلطنت کی رعایا ہے اور دوسرا کسی اور سلطنت کی؟ کیا جلد کے رنگ کو روح کی صفائی و کدورت میں کوئی دخل ہے؟ کیا عقل اس کو باور کرتی ہے کہ اخلاق و اوصاف انسانی کے صلاح و فساد سے پہاڑوں اور دریاؤں کا کوئی تعلق ہے؟ کیا کوئی صحیح الدماغ انسان یہ تسلیم کر سکتا ہے کہ مشرق میں جو چیز حق ہو وہ مغرب میں باطل ہو جائے؟ کیا کسی قلب سلیم میں اس تصور کی گنجائش نکل سکتی ہے کہ نیکی، شرافت اور جوہر انسانیت کو رگوں کے خون، زبان کی بولی، مولد و مسکن کی خاک کے معیار پر جانچا جائے؟ یقیناً عقل ان سوالات کا جواب نفی میں دے گی۔ مگر نسلیت، وطنیت اور اس کے بہن بھائی نہایت بے باکی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہاں ایسا ہی ہے۔"[1]

۵۔ نیشنلزم ایک خالص لادینی تحریک ہے اور مذہب کی جڑ پر تبر رکھتی ہے اور دلوں سے مذہب کا اثر زائل کرتی ہے۔ امریکی پروفیسر ہینز کوہن اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"اور اب میں اپنی بات کو غلط فہمی سے مبرا رکھنے کے لیے واضح کرتا ہوں کہ قومیت بنیادی طور پر ایک لادینی تحریک ہے۔ میرے نقطہ نظر سے قومیت کی تحریک ایک لادین معاشرے میں ہی پنپ سکتی ہے۔"[2]

ہکسلے اپنی کتاب (Ends and means) میں لکھتا ہے:

"ہر نیشنلزم ایک بت پرستانہ مذہب ہے جس میں مملکت نے خدا کی حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔"

J.M.Murray اپنی کتاب (Adam and eve) میں رقمطراز ہے:

"چونکہ انسانوں کے دل سے خدا کا عقیدہ نکل گیا ہے اس لیے اس خالی مکان پر نیشنلزم کے شیطان نے قبضہ کر لیا ہے۔ اب انسانوں کو ایک ایسے مذہب کی ضرورت ہے جو نیشنلزم کے جذبہ پر غالب آ سکے۔"[3]

---

1. اسلامی ریاست از سید ابوالاعلیٰ مودودی ص ۱۲۲۔
2. Nationalism in the middle east op. CIT P.64
3. P 66, 67 بحوالہ انسان نے کیا سوچا از علامہ پرویز صاحب ص ۲۴۳۔

امت کا تصور اور نیشنلزم

جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ نیشنلزم (قومیت) نسلی اتحاد' مشترکہ زبان' مشترکہ مذہب' جغرافیائی اشتراک' مشترکہ ثقافت و رسم و رواج' مشترکہ سیاسی جذبات اور جذبہ قومیت کی حدود میں مقید ہے۔ لیکن اسلام امت کا تصور پیش کرتا ہے جو خون' نسب' رنگ' زبان' وطن وغیرہ کی جملہ قیود سے بے نیاز ہو کر صرف ایک نظریہ سے وابستگی کے باعث وجود میں آتی ہے۔ وہ نظریہ اسلام ہے اور یہ نظریہ قومیت کی طرح نفرت' تعصب' غیر فطری تقسیم' اخلاقی گراوٹ' جنگ اور خدا سے بے نیازی پر مبنی نہیں بلکہ اتحاد بین الاقوامی پر مبنی ہے۔

امت اسلامیہ کی بنیاد

امت اسلامیہ کی اساس کلمہ شہادت لاَ اِلٰهَ اِلاَّ اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ. یعنی اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمدؐ اللہ کے رسول ہیں' پر ہے۔

پس امت اسلامیہ کی بنیاد توحید اور رسالت کا اقرار ہے۔ جو شخص توحید[1] اور رسالت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اقرار کر لیتا ہے وہ امت محمدیہؐ میں شامل ہو جاتا ہے۔ اسی کلمہ کے انکار سے دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔

ایک صحابی مقدادؓ بن الاسود نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ اگر میدان جنگ میں کسی کافر سے میرا مقابلہ ہو اور وہ تلوار سے میرا ہاتھ کاٹ دے' پھر کسی درخت کی اوٹ میں پناہ لے کر کہہ دے کہ میں مسلمان ہو گیا ہوں' تو کیا اسے قتل کیا جا سکتا ہے؟ حضورؐ نے فرمایا اسے مت قتل کرو۔ حضرت مقدادؓ نے عرض کیا کہ حضورؐ اس نے پہلے میرا ہاتھ کاٹا پھر اسلام کا اظہار کیا' کیا اسے قتل نہ کروں؟ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: اسے قتل نہ کرو' اگر تو نے اسے قتل کیا تو اس کے قتل سے پہلے جو تیری منزلت تھی وہ اس کی ہو جائے گی اور اس کا درجہ تجھے مل جائے گا۔[2]

حضرت اسامہ بن زیدؓ فرماتے ہیں کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہمیں ایک لشکر میں روانہ فرمایا۔ ہم دشمن قبیلے پر حملہ آور ہوئے۔ میں ایک شخص کے سر پر پہنچ گیا تو اس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا تاہم میں نے اسے برچھی مار دی۔ لیکن میرے دل میں شک بیٹھ گیا۔ میں نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا ذکر کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کیا اس کے لا الہ الا اللہ کہنے کے بعد تو نے اسے قتل کیا؟ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ! اس نے محض خوف سے کلمہ پڑھا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: هَلْ شَقَقْتَ قَلْبَهٗ کیا تو نے اس کا دل پھاڑ کر دیکھا تھا

---

[1] ملائکہ' کتب' آخرت اور تمام انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا توحید کے تقاضے ہیں۔ [2] مسلم۔

کہ اس کے دل سے آواز اٹھی تھی یا نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فقرہ کئی بار دُہرایا۔ میری یہ حالت ہو گئی کہ میں نے چاہا کہ کاش میں آج مسلمان ہوا ہوتا۔ (مسلم)

امت اسلامیہ کی رکنیت کا دروازہ ہر شخص کے لیے کھلا ہے کیونکہ اسلام کا پیغام عالمگیر ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَمَا اَرْسَلْنَاکَ اِلَّا کَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا[1] اور ہم نے تجھے تمام ہی لوگوں کے لیے خوش خبری دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر بھیجا ہے۔

امت اسلامیہ اصولی برادری ہے

جو شخص بھی اسلام کو قبول کر لیتا ہے تو وہ امت اسلامیہ کی عالمگیر برادری میں شامل ہو جاتا ہے۔ خون، نسب، رنگ، زبان اور وطن کے تمام رشتوں کو ختم کر دیتا ہے۔ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا تو جن لوگوں نے اس دعویٰ کو قبول کیا انھوں نے وطن کو ترک کیا، اعزہ و اقربا کو چھوڑا، وسائل روزی سے دست بردار ہونا پڑا اور ہجرت کر کے مدینہ میں چلے گئے تو وہی قریشی جو اپنے آپ کو نسلی اعتبار سے سب سے افضل سمجھتے تھے انھوں نے اوس اور خزرج کے افراد کے ساتھ سلسلہ مواخات قائم کر لیا۔ اوّل الذکر حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد تھے جو اپنے آپ کو عدنانی کہلاتے تھے۔ دوسرے یعرب بن قحطان کی اولاد تھے جو قحطانی کہلاتے تھے۔ اسلام نے قریش کو قریش سے منقطع کر دیا۔ غیر مسلم اوسی اور خزرجی سے مسلم اوسی اور خزرجی کو جدا کر دیا اور نسب کا تعلق ختم ہو گیا اور امتی تعلق باقی رہ گیا۔

جب جنگ بدر ہوئی تو امتی تعلق اور ابھر کر سامنے آ گیا۔ نسل اور نسب کے تمام رشتے کٹ گئے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ایک طرف تھے اور آپ کے چچا عباسؓ اور آپ کی صاحبزادی کے خاوند ابو العاصؓ دوسری طرف۔ حضرت علیؓ ایک طرف تھے تو ان کے چچا عباس اور بھائی دوسری طرف برسرپیکار تھے۔ حضرت ابوبکرؓ اسلام کی بقاء کے لیے لڑ رہے تھے اور ان کا لڑکا عبدالرحمٰن کفر کی سربلندی کے لیے کوشاں تھے۔ اسی طرح حضرت عمرؓ کے مقابلہ پر ان کے ماموں ابوالعاص بن ہشام بن مغیرہ تلوار اپنے ہاتھ میں لیے اسلام کو صفحۂ ہستی سے مٹانے کی سعی ناتمام کر رہے تھے۔ حضرت ابو حذیفہؓ اسلام کے لیے اپنی جان قربان کرنے کے لیے میدان میں اترے تھے اور ان کے والد عتبہ مخالفین اسلام کی طرف سے شمشیر بکف تھے۔

---

[1] سباء ۳۴:۲۸۔

امت اسلامیہ کے اوصاف

توحید پر ایمان

امت مسلمہ کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ خالص توحید پر ایمان لاتی ہے۔ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں جو خالص توحید پر ایمان رکھتی ہو۔ صرف اسلام ہی ہے جس نے توحید کا جامع تصور پیش کیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗٓ اَسْلِمُوْا وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِيْنَ۔[1] پس تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے سو اسی کے فرماں بردار ہو جاؤ اور عاجزی اختیار کرنے والوں کو خوش خبری دے۔

وَمِنْ آيَاتِهِ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ لَا تَسْجُدُوا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوا لِلّٰهِ الَّذِيْ خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۔[2] اور اس کی نشانیوں میں سے رات اور دن اور سورج اور چاند ہیں سورج کو سجدہ نہ کرو اور نہ چاند کو اور اللہ کو سجدہ کرو جس نے انھیں پیدا کیا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔

وَقَضٰى رَبُّكَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ۔[3] اور تیرے رب نے فیصلہ کیا ہے کہ اس کے سوائے کسی کی عبادت نہ کرو۔

قرآن مجید نے شرک کی ان تمام صورتوں سے احتراز کرنے کا حکم دیا ہے جو اس وقت دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں۔ ارشاد الٰہی ہے: اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهٖ شَيْئًا وَّلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ۔[4] کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور نہ اس کے ساتھ کسی کو شریک بنائیں اور نہ ہم میں سے کوئی کسی کو اللہ کے سوا رب بنائے۔

اس آیت کریمہ میں شرک کی تین صورتوں کا ذکر کر کے ان سے احتراز کا حکم دیا ہے۔ شرک کی ایک موٹی قسم یہ ہے کہ جس میں اللہ کے سوائے کسی اور چیز کی عبادت کی جائے جیسے اجرام فلکی، پتھر، بت، درخت وغیرہ۔

شرک کی دوسری قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ کسی دوسری چیز کو شریک بنایا جائے اور یہ تسلیم کیا جائے کہ دوسری چیزیں بھی خدائی صفات کی مالک ہیں۔ یہ دونوں شرک کی صورتیں اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ کے الفاظ سے رد کی گئی ہیں۔

شرک کی تیسری صورت یہ ہے کہ بندوں کو اپنا رب مانا جائے۔ شرک کی یہ صورت وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ سے باطل کی ہے۔

---

1. الحج ۲۲: ۳۴۔
2. حم سجدہ ۴۱: ۳۷۔
3. بنی اسرائیل ۱۷: ۲۳۔
4. آل عمران ۳: ۶۴۔

شرک کی اس صورت کا دوسری جگہ بھی ذکر ہے: اِتَّخَذُوْا اَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ[1] انھوں نے اپنے عالموں اور راہبوں کو اللہ کے سوائے رب بنا لیا ہے۔

جب یہ آیت نازل ہوئی تو عدی بن حاتم نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ! یہود اور نصاریٰ اپنے احبار اور رہبان کی عبادت تو نہیں کرتے۔ اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا یہ سچ نہیں ہے کہ یہ لوگ اپنے احبار اور رہبان کی کورانہ تقلید کرتے ہیں۔ حضرت عدی بن حاتم نے کہا: ہاں یارسول اللہؐ! ایسے ہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بڑے لوگوں کی کورانہ تقلید شرک میں داخل ہے۔

شرک کی ایک چوتھی قسم ہے جس کو قرآن مجید نے الگ بیان کیا ہے وہ نفسانی خواہشات کی پیروی کرنا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: اَرَءَيْتَ الَّذِي اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰهُ.[2] کیا تو نے اسے دیکھا کہ جو اپنی خواہش کو اپنا معبود بناتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں نفسانی خواہش کی پیروی کرنا بھی شرک میں داخل کیا گیا ہے۔

پس امت مسلمہ شرک کی ہر قسم کی آلودگیوں سے پاک ہے اور خدا ہی کے سامنے سر جھکاتی ہے۔

توحید کے مقتضیات پر ایمان

خدا کو ایک ماننے کے ساتھ ہی رسولوں، کتب، ملائکہ اور قیامت پر ایمان قائم ہو جاتا ہے۔ یہ توحید الٰہی کی فروع ہیں، جب انسان اصل کو پکڑ لیتا ہے تو فروع اس کے ہاتھ میں خود بخود آ جاتی ہیں۔ امت مسلمہ توحید الٰہی کے بلند مینار پر کھڑا ہو جانے کے بعد رسولوں، کتب الٰہی، ملائکہ اور قیامت پر ایمان لے آتی ہے کیونکہ ملائکہ وہ ہستیاں ہیں جو خدا سے حکم پا کر رسولوں کو حکم الٰہی سے آگاہ کرتی ہیں۔ رسول وہ ہستیاں ہیں جو احکام الٰہی کو لوگوں تک پہنچاتی ہیں۔ کتب احکام الٰہی کا مجموعہ ہیں۔ احکام الٰہی کا ماننا اور نہ ماننا بے سود ہو جاتا ہے جب تک جزا اور سزا کا تصور نہ ہو۔ یہ تصور قیامت کے ساتھ وابستہ ہے کہ جو شخص احکام الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرے گا وہ مرنے کے بعد اپنے کیے کا بہترین بدلہ پائے گا اور جو احکام الٰہی کو توڑے گا وہ اس کی سزا پائے گا۔

قرآن مجید میں آتا ہے: اٰمَنَ الرَّسُوْلُ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْهِ مِنْ رَّبِّهٖ وَالْمُؤْمِنُوْنَ كُلٌّ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ.[3] رسول اس پر ایمان لایا جو اسکے رب سے اس کی طرف اتارا گیا اور مومن بھی سب اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے: مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ. جو کوئی بھی اللہ اور پچھلے دن پر ایمان لاتا ہے اور اچھے کام کرتا ہے تو ان کے لیے ان کا اجر اپنے

1۔ التوبہ ۹:۳۱۔ 2۔ الفرقان ۲۵:۴۳۔ 3۔ بقرہ ۲:۲۸۵۔

رب کے ہاں ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ.[1] اور جو ایمان لاتے ہیں اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا اور آخرت پر یقین رکھتے ہیں۔

عالمگیر برادری کا تصور

اسلام قومیت اور عوامل قومیت کے برعکس ایک عالمگیر برادری کا نظریہ پیش کرتا ہے۔ اس نے انسان اور انسان کے درمیان کسی مادی اور حسی تفریق کو تسلیم نہیں کیا۔ جو بھی انسان اس دنیا میں پیدا ہوتا ہے وہ ایک ہی اصل کی فرع ہے اور لونی، نسلی، وطنی، لسانی، اقتصادی اور سیاسی تمام غیر عقلی تفریقات ہیں اور بنی نوع انسان کی ہلاکت اور بربادی کا سبب ہیں۔

اسلام کہتا ہے کہ سب انسان ایک ہی اصل سے ہیں، ارشاد الٰہی ہے:

يٰاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ خَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا وَّ نِسَآءً.[2] اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو جس نے تم کو ایک ہی اصل سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بہت سے مرد اور عورتیں پھیلائیں۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ اِلَّآ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا.[3] اور سب لوگ ایک ہی گروہ ہیں سو وہ اختلاف کرتے ہیں۔

وَاِنَّ هٰذِهٖٓ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّ اَنَا رَبُّكُمْ فَاتَّقُوْنِ.[4] اور کہ یہ تمہاری جماعت ایک ہی جماعت ہے اور میں تمہارا رب ہوں سو میرا تقویٰ کرو۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں۔

اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ.[5] ساری مخلوق عیال اللہ ہے اور اللہ سب سے زیادہ محبت اس سے کرتا ہے جو اللہ کی مخلوق سے سب سے زیادہ حسن سلوک کرتا ہے۔

اَللّٰهُمَّ رَبَّنَا وَرَبَّ كُلِّ شَيْءٍ اِنِّيْ اَشْهَدُ اِنَّ الْعِبَادَ كُلَّهُمْ اِخْوَةٌ.[6] اے ہمارے اور ہر چیز کے پروردگار میں گواہی دیتا ہوں کہ انسان سب آپس میں بھائی بھائی ہیں۔

اَلْاِسْلَامُ اَحْوَجُ اِلَى الْجَمَاعَةِ.[7] اسلام جماعتی نظام چاہتا ہے۔

گروہ بندی اور انسانی تفریق کے رد میں اللہ تعالیٰ قرآن مجید میں فرماتا ہے:

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا وَاخْتَلَفُوْا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ.[8] اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے

1۔ البقرہ ۲:۴۔ 2۔ النساء ۴:۱۔ 3۔ یونس ۱۰:۱۹۔ 4۔ المومنون ۲۳:۵۲۔

5۔ بیہقی کتاب الایمان۔ 6۔ احمد ابو داؤد۔ 7۔ کنوز الحقائق حرف الہمزہ۔ 8۔ ال عمران ۳:۱۰۵۔

پاس کھلی باتیں آ چکی تھیں اور انہی کے لیے بڑا عذاب ہے۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ فَرَّقُوۡا دِیۡنَهُمۡ وَ كَانُوۡا شِيَعًا لَّسۡتَ مِنۡهُمۡ فِیۡ شَیۡءٍ ؕ اِنَّمَاۤ اَمۡرُهُمۡ اِلَی اللّٰهِ ثُمَّ یُنَبِّئُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا یَفۡعَلُوۡنَ۔[1] وہ لوگ جنھوں نے اپنے دین کو ٹکڑے کیا اور کئی فرقے ہو گئے تیرا ان سے کوئی سروکار نہیں ان کا معاملہ اللہ کی طرف ہے پھر وہ ان کو بتا دے گا جو وہ کرتے تھے۔

اِنَّ فِرۡعَوۡنَ عَلَا فِی الۡاَرۡضِ وَ جَعَلَ اَهۡلَهَا شِيَعًا۔[2] فرعون نے ملک میں سرکشی اختیار کی اور اس کے رہنے والوں کو فرقے بنا رکھا تھا۔

تعصب کا استیصال

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جاہلانہ تعصب، نسلی، لونی، قومی، لسانی امتیازات کو مٹانے کے لیے آئے تھے۔ آپؐ کی بعثت سے قبل دنیا کی ہر قوم تعصب کے مرض میں مبتلا تھی عرب تو یہاں تک اپنے آپ کو دوسروں سے افضل سمجھتے تھے کہ دنیا کی تمام قوموں کو عجمی (ژولیدہ بیان) کے نام سے یاد کرتے تھے۔ پھر عربوں کے قبائل میں سے قریش اپنے آپ کو دوسروں سے برتر تصور کرتے تھے اور یہ تعصب عربوں کی رگوں میں یہاں تک رچ چکا تھا کہ اسلام لانے کے بعد بھی بعض اوقات دو قبائل کے افراد میں محض خاندانی تعصب کی وجہ سے جھگڑا چھڑ جاتا۔ یہود تو مسلمانوں کے اتحاد کو پارہ پارہ کرنے کے لیے ہمیشہ مسلمانوں میں قبائلی عصبیت کو ہوا دیتے تھے۔ اسلام آیا تو اس نے تعصب کی جڑ پر تبر رکھ دیا اور بنی نوع انسان کو اتحاد کی سلک میں منسلک کر دیا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عصبیت جاہلیہ کا رد کرتے ہوئے فرمایا:

لَیۡسَ مِنَّا مَنۡ دَعَا اِلٰی عَصَبِیَّةٍ وَلَیۡسَ مِنَّا مَنۡ قَاتَلَ فِی عَصَبِیَّةٍ وَلَیۡسَ مِنَّا مَنۡ مَاتَ عَلٰی عَصَبِیَّةٍ. (ابو داؤد) وہ شخص ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت کی دعوت دے اور وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے جو عصبیت پر جنگ کرے اور وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے جس کی موت عصبیت پر واقع ہو۔

عصبیت کی وضاحت خود رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمائی۔ واثلہؓ بن الاسقع کہتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا یارسول اللہ عصبیت کیا ہے۔ فرمایا: اَنۡ تُعِیۡنَ قَوۡمَکَ عَلَی الظُّلۡمِ (مشکوۃ باب التفاخر) عصبیت اس کا نام ہے کہ تم ظلم پر اپنی قوم کی ناجائز مدد کرو۔

"اے قوم قریش! اب جاہلیت کا غرور اور نسبت کا فخر خدا نے مٹا دیا ہے۔ تمام لوگ آدم کی نسل سے ہیں اور آدم مٹی سے بنا تھا۔

خدا کا فرمان ہے لوگو! میں نے تم کو مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمھارے قبیلے اور خاندان بنائے کہ آپس میں ایک دوسرے سے پہچان لیے جاؤ لیکن خدا کے نزدیک شریف وہ ہے جو زیادہ پرہیزگار ہو۔"

نسل، وطن، زبان اور رنگ کی تفریق کا خاتمہ

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر اپنے مشہور خطبہ میں فرمایا:

---

1. الانعام: ۱۵۹۔ 2. القصص ۲۸:۴۔

اَیُّھَا النَّاسُ اَلاَ اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ کَانَ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ اَلاَ لاَ فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی عَجَمِیٍّ وَلاَ لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلاَ لِاَحْمَرَ عَلٰی اَسْوَدَ وَلاَ لِاَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ اِلاَّ بِالتَّقْوٰی۔ [1] لوگو! ہاں بے شک تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ ایک ہے۔ ہاں عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر سرخ کو سیاہ پر اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیل نہیں مگر تقویٰ کے سبب سے۔

پھر فرمایا:

مَنْ نَصَرَ قَوْمَهٗ عَلٰی غَیْرِ الْحَقِّ فَھُوَ کَالْبَعِیْرِ الَّذِیْ رَدٰی فَھُوَ یُنْزَعُ بِذَنْبِہٖ۔ [2] جو شخص ناحق بات پر اپنی قوم کی مدد کرتا ہے وہ اس اونٹ کی طرح ہے جو کنویں میں گر جائے پھر اس کو دم سے پکڑ کر کھینچا جائے۔

فرمایا:

خَیْرُکُمُ الْمُدَافِعُ عَنْ عَشِیْرَتِہٖ مَالَمْ یَاثَمْ۔ [3] تم میں بہترین وہ شخص ہے جو اپنے قبیلے کی اس وقت تک مدافعت کرے جب تک کوئی گناہ کا کام نہ ہو۔

فرمایا:

اَنْسَابُکُمْ ھٰذِہٖ لَیْسَتْ بِمَسَبَّةٍ کُلُّکُمْ بَنُوْ آدَمَ۔ [4] تمہارے یہ نسب و نسل عار کا سبب نہیں ہیں تم سب کے سب آدم کی اولاد ہو۔

فرمایا:

لَیْسَ لِاَحَدٍ عَلٰی اَحَدٍ فَضْلٌ اِلاَّ بِدِیْنٍ۔ [5] یعنی کسی کو کسی پر فوقیت نہیں سوائے اس کے دین اور تقویٰ کے سبب سے۔

قرآن مجید میں آتا ہے: وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْ آدَمَ۔ [6] اور ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی ہے۔

اس آیت کریمہ میں کل روئے زمین کے انسانوں کو واجب الاحترام ٹھہرایا ہے۔

وَلاَ تُصَعِّرْ خَدَّکَ لِلنَّاسِ وَلاَ تَمْشِ فِی الْاَرْضِ مَرَحًا اِنَّ اللّٰہَ لاَ یُحِبُّ کُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ۔ [7] اور لوگوں سے تکبر سے اعراض نہ کر اور نہ زمین میں اکڑتا ہوا چل اللہ کسی خود پسند شیخی خورہ کو پسند نہیں کرتا۔

یہ آیت نظریہ قومیت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکتی ہے اور روئے زمین کے تمام انسانوں کے ساتھ محبت اور شفقت سے پیش آنے کی تعلیم دیتی ہے اور قومی برتری کی وجہ سے اترانے اور تکبر کو مذموم ٹھہراتی ہے۔

یٰاَیُّھَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِنْ ذَکَرٍ وَّ اُنْثٰی وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰہِ اَتْقٰکُمْ۔ [8] اے لوگو! ہم نے تمہیں مرد اور عورت سے پیدا کیا اور تمہاری شاخیں اور

---

1. مسند احمد۔ 2. ابو داؤد۔ 3. مشکوۃ باب المفاخر ص ۴۱۸۔
4. مشکوۃ باب المفاخر والعصبیۃ ص ۴۱۸۔ 5. مشکوۃ باب المفاخر۔
6. بنی اسرائیل ۱۷:۷۰۔ 7. لقمان ۳۱:۱۸۔ 8. الحجرات ۴۹:۱۳۔

قبیلے بنائے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچانو تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے شریف وہ ہے جو سب پرہیزگار ہے اللہ جاننے والا خبردار ہے۔

یہ آیت نسلی تفریق کا خاتمہ کرتی ہے۔ اس میں یہ وضاحت کی گئی ہے کہ روئے زمین کے تمام انسانوں کی اصل ایک ہے۔ نسل کے بڑھ جانے کی وجہ سے جو مختلف قبیلے بن گئے ہیں وہ صرف پہچان کا ذریعہ ہیں کہ فلاں شخص فلاں قبیلے سے تعلق رکھتا ہے اور فلاں شخص فلاں قبیلے سے۔ کسی خاص قبیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس کو عزت حاصل نہیں ہو جاتی۔ ہاں عزت کا ذریعہ صرف خدا خوفی ہے۔ جو شخص بھی متقی ہو گا خواہ کسی قبیلے یا نسل یا علاقے سے تعلق رکھتا ہو وہ مکرم و محترم ہو گا۔

مساوات

اسلام مساوات کا حامی ہے۔ تمام روئے زمین کے لوگوں کو ایک ہی اصل کی شاخیں قرار دیتا ہے۔ کسی شخص کو رنگ، نسب، وطن وغیرہ کی وجہ سے دوسرے پر فضیلت حاصل نہیں ہے۔ حضرت سلمان فارسیؓ امت اسلامیہ کے ایک فرد تھے ان کو اہل بیت میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس میں حضرت بلال حبشیؓ تھے جن کے متعلق کہا جاتا تھا کہ بلال ہمارا آقا ہے۔

اس میں حضرت صہیب رومیؓ تھے جنھیں حضرت عمرؓ نے اپنی جگہ نماز میں امامت کے لیے کھڑا کیا۔ اس میں حضرت حذیفہؓ کے غلام سالمؓ تھے جن کے متعلق حضرت عمرؓ نے انتقال کے وقت کہا تھا کہ اگر آج سالمؓ مولیٰ حذیفہؓ زندہ ہوتے تو خلافت کے لیے ان کو نامزد کرتا۔ اس میں حضرت زید بن حارثہؓ تھے جن کے نکاح میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود اپنی پھوپھی زاد بہن زینبؓ دے دی۔ اسؓ میں حضرت اسامہؓ تھے جن کو ایک ایسے لشکر کا قائد مقرر کر دیا جس میں بڑے بڑے صحابی تھے۔

امت وسط

قرآن مجید نے امت مسلمہ کو امت وسط کے الفاظ سے اعزاز بخشا ہے یعنی اعتدال پسند امت، افراط اور تفریط سے پاک۔ قرآن مجید میں آتا ہے: وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَٰكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا۟ شُهَدَآءَ عَلَى ٱلنَّاسِ وَيَكُونَ ٱلرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا۔[1] اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک اعلیٰ درجہ کا گروہ بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے گواہ بنو اور رسول تمھارے لیے گواہ ہو۔

راہ اعتدال پر چلنے کی وجہ سے امت مسلمہ کو خیر امت کہا گیا ہے۔ كُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔[2] تم سب سے اچھی جماعت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہو۔

مذہبی رواداری

اسلام مذہبی رواداری کا علمبردار ہے اور کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ دوسرے پر

1۔ البقرہ ۲: ۱۴۳۔ 2۔ ال عمران ۳: ۱۱۰۔

زبردستی اپنا عقیدہ ٹھونسے۔ ارشادِ الٰہی ہے: لَآ اِكْرَاهَ فِي الدِّيْنِ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ۔[1] دین میں کوئی زبردستی منوانا نہیں ہدایت کی راہ گمراہی سے واضح ہو چکی ہے۔

قُلِ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ فَمَنْ شَاءَ فَلْيُؤْمِنْ وَّمَنْ شَاءَ فَلْيَكْفُرْ.[2] اور کہہ حق تمھارے رب کی طرف سے ہے سو جو کوئی چاہے ایمان لائے اور جو کوئی چاہے انکار کرے۔

حدیث میں آتا ہے کہ نصاریٰ کا وفد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بوقت عصر حاضر ہوا تو آپؐ نے ان کو مسجد میں جگہ دی۔ جب ان کی عبادت کا وقت آیا تو آپؐ نے ان کو اپنے طریقہ پر مسجد میں نماز پڑھنے کی اجازت دی۔ جب مسلمانوں نے ان کو عبادت سے روکنا چاہا تو آپؐ نے منع فرمایا پھر تو وہ لوگ مشرق کی طرف منہ کر کے عبادت کرنے لگے۔[3]

امت مسلمہ کا نصب العین

امت مسلمہ کا نصب العین امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ.[4] تم بہترین امت ہو جو لوگوں کی بھلائی کے لیے پیدا کی گئی ہے تم بھلائی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ.[5] اور چاہیے کہ تم میں سے ایک جماعت ہو جو بھلائی کی طرف بلائیں اور اچھے کاموں کا حکم دیں اور برے کاموں سے روکیں اور وہی کامیاب ہونے والے ہیں۔

امت مسلمہ کی ذمہ داریاں

قیام امن

امت مسلمہ کی سب سے اہم اور بڑی ذمہ داری دنیا میں امن قائم کرنا ہے۔ اسلام کے لغوی معنی امن اور سلامتی کے ہیں۔ مسلم وہ ہے جو خدا اور اس کے بندوں سے صلح کرنے۔ بندوں سے صلح کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ نہ صرف ان کو نقصان پہنچانے سے مجتنب رہے بلکہ ان سے نیکی اور بھلائی کا سلوک کرے۔ اسلام کا یہ مفہوم امت مسلمہ پر قیام امن کی اہم ذمہ داری عائد کرتا ہے۔ قرآن مجید نے امت مسلمہ کی اس ذمہ داری کا کئی بار ذکر کیا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: اُدْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً.[6] سارے کے سارے لوگ صلح و امن میں داخل ہو جاؤ۔

1۔ البقرہ ۲:۲۵۶۔ 2۔ الکہف ۱۸:۲۹۔ 3۔ زاد المعاد۔
4۔ آل عمران ۳:۱۱۰۔ 5۔ آل عمران ۳:۱۰۴۔ 6۔ البقرہ ۲:۲۰۸۔

وَاِنْ جَنَحُوا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا۔[1] اگر وہ صلح کی طرف جھکیں تو تو بھی اس کی طرف جھک جا۔
اسلام جنگ کی اس وقت اجازت دیتا ہے جب دنیا کے امن کو خطرہ لاحق ہو۔

عدل کا قیام

معاشرہ کی بقا اور ارتقاء عدل پر مبنی ہے۔ اس وجہ سے اسلام نے عدل و انصاف پر بہت زور دیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ لِلّٰهِ شُهَدَآءَ بِالْقِسْطِ وَلَا یَجْرِمَنَّکُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓی اَلَّا تَعْدِلُوْا اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰی وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنَّ اللّٰهَ خَبِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ۔[2]
اے لوگو جو ایمان لائے ہو اللہ کے لیے کھڑے ہونے والے انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور کسی قوم کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو۔ انصاف کرو یہ تقویٰ سے قریب تر ہے اللہ کا تقویٰ کرو اللہ اس سے خبردار ہے جو تم کرتے ہو۔

شہادت حق

امت مسلمہ کا یہ فرض ہے کہ وہ ساری دنیا کے سامنے حق کی گواہی دے۔ وَکَذٰلِکَ جَعَلْنٰکُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَکُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَی النَّاسِ وَیَکُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَیْکُمْ شَهِیْدًا۔[3] اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک اعلیٰ درجہ کا گروہ بنایا ہے تاکہ تم لوگوں کے لیے گواہ بنو اور ہمارا رسول تمہارا گواہ بنے۔

یہ آیت مسلمانوں کو یہ تعلیم دیتی ہے کہ جو کام رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اپنی زندگی میں کرتے تھے ان کے اس دنیا سے چلے جانے کے بعد وہ کام ان کے ذمہ ہے۔ وہ اہم کام شہادت حق (اشاعت اسلام) ہے۔ یہ ذمہ داری اتنی اہم ہے کہ ایک پوری سورت اس مضمون پر نازل ہوئی تھی۔ وَالْعَصْرِ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ۔[4] زمانہ گواہ ہے کہ انسان نقصان میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے اور اچھے عمل کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کو صبر کی نصیحت کرتے ہیں۔

شہادت حق کے دو پہلو ہیں:

۱۔ قولی شہادت: یعنی اسلام کی تعلیم کو دنیا کے سامنے پیش کیا جائے۔
۲۔ عملی شہادت: اسلام کی تعلیم کے مطابق مسلمانوں کی عملی زندگی ہو۔

اتحاد عمل اور فرقہ بندی سے اجتناب

مسلمانوں کا یہ اہم فرضہ ہے کہ وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح رہیں اور اپنی صفوں

۱۔ الانفال ۸:۶۱۔ ۲۔ المائدہ ۵:۸۔
۳۔ البقرہ ۲:۱۴۳۔ ۴۔ العصر ۱۰۳:۱۔۳۔

میں انتشار نہ ہونے دیں کیونکہ اسی اتحاد میں مسلمانوں کی زندگی ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّ لَاتَفَرَّقُوا۔[1] اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور تفرقہ نہ کرو۔

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ[2] مومن بھائی بھائی ہیں۔

وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ تَفَرَّقُوْا مِنْ بَعْدِ مَاجَاءَ هُمُ الْبَيِّنٰتُ.[3] اور ان کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے تفرقہ کیا اور اختلاف کیا اس کے بعد کہ ان کے پاس کھلی باتیں آ چکی ہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

اَلْاِسْلَامُ اَحْوَجُ اِلَى الْجَمَاعَةِ.[4] اسلام جماعتی نظام چاہتا ہے۔

اَلْجَمَاعَةُ رَحْمَةٌ وَالْفِرْقَةُ عَذَابٌ.[5] جماعت رحمت ہے اور متفرق ہونا عذاب۔

تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِي تَرَاحِمِهِمْ تَوَادِهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى عُضْوٌ تَدَاعَى لَهٗ سَائِرِ جَسَدِهٖ بِالسَّهْرِ وَالْحُمّٰى.[6] تو مومنوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا جیسا بدن میں ایک عضو کو تکلیف ہو جائے تو سارے اعضاء بخار اور بیداری میں اس کے شریک ہو جاتے ہیں۔

اِنَّمَا اَهْلَكَ مَنْ كَانَ قَبْلَكُمُ الْاِخْتِلَافُ.[7] اگلے لوگوں کو اختلاف نے ہلاک کیا۔

غلامی کا انسداد

اسلام ہی وہ دین ہے جس نے ہر طرح کی غلامی کو ختم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ارشاد الٰہی ہے: فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ فَكُّ رَقَبَةٍ.[8] سو وہ اونچی گھاٹی پر چڑھنے کی ہمت نہیں کرتا اور تجھے کیا خبر کہ اونچی گھاٹی کیا ہے کسی گردن کا آزاد کرنا۔

یہ آیت امت مسلمہ کے لیے مشعل راہ ہے کہ وہ دنیا سے غلامی کا قلع قمع کریں اور بنی نوع انسان کو آزادی کی اس ارفع گھاٹی پر لے جائیں جس پر انسان ابھی تک نہیں چڑھا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کی غرض ہی انسان کی گردن کو ہر باریک سے باریک قسم کی غلامی سے آزاد کرانا تھی جیسا کہ قرآن مجید میں آتا ہے: وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ.[9] اور وہ ان سے بوجھوں کو اتارتا ہے اور وہ غلامی کے طوق بھی جو ان پر تھے۔

1۔ ال عمران ۳:۱۰۳۔ 2۔ الحجرات ۴۹:۱۰۔ 3۔ ال عمران ۳:۱۰۴۔
4۔ کنوز الحقائق حرف الہمزہ۔ 5۔ کنوز الحقائق حرف الجیم۔
6۔ بخاری کتاب الادب۔ 7۔ کنوز الحقائق حرف الہمزہ۔
8۔ البلد ۹۰:۱۱-۱۳۔ 9۔ الاعراف ۷:۱۵۷۔

مارکسزم

سوانح حیات کارل مارکس

یہ یہودی مفکر جس نے خیالات میں تلاطم برپا کر دیا۔ رائن لینڈ کے شہر ٹرائر (Trier) میں ۵ مئی ۱۸۱۸ء کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ یہودی وکیل تھا اور سارا خاندان مارکس کے نام سے موسوم تھا۔ جب کارل چھ سال کا ہوا تو اس کا خاندان برائے نام دائرہ عیسائیت میں داخل ہو گیا لیکن خاندان کا یہ نونہال ماحول کے اثرات سے بالکل آزاد تھا' اس پر تبدیلی مذہب کا کچھ اثر نہ ہوا چونکہ وہ خورد سالی ہی میں بے باک' ضدی اور ہٹ دھرم تھا' اپنی عقل کی پیروی کرتا تھا اور اپنی ذات کو بے خطا سمجھتا تھا۔ ابتداء ہی سے اس نے جذبات کو عقل کے تابع رکھا۔ یہی وہ خصائل تھے جنھوں نے اس کو نت نئی بدلنے والی دنیا میں ایک بے پناہ قوت بنا دیا۔

جب مارکس سترہ سال کا ہوا تو بان (Boun) یونیورسٹی میں داخل ہوا اور قانونی تعلیم حاصل کی۔ اس طالب علمی کے دور میں اس کو ایک رئیس کی لڑکی جنی (Junny) سے عشق ہو گیا۔ اس کی محبوبہ بھی اس سے محبت کرنے لگی اور لمبی کش مکش کے بعد ان کی شادی ہو گئی۔ کارل مارکس کی زندگی میں شاید یہی وہ ایام تھے جب اس کے جذبات میں تموج پیدا ہوا اور اس کی خشک طبیعت شعر و سخن کے مرغزاروں میں گلگشت کرنے لگی اور اس نے شعر کہنے شروع کیے اور معاشی جنگ کا یہ قائد پہلی مرتبہ شاعر کی حیثیت سے علمی دنیا میں ظاہر ہوا۔

۱۸۴۱ء میں ''ڈاکٹر آف فلاسفی'' کی ڈگری لینے کے بعد اس کے افکار میں زیادہ پختگی اور عمق پیدا ہوا۔ فلسفہ ہیگل کے حواریوں کی سوسائٹی میں شامل ہو گیا۔ اپنی علمی تشنگی کو ہیگل کے فلسفے سے سیراب کرنے لگا اور اس نے مذہبی اعتقادات کو خیر باد کہا۔ اس وقت سے آگے آگے اس پر الحاد اور دہریت کا گہرا رنگ چڑھتا چلا گیا اور اس کا طائر فکر نئی پرواز کے لیے پر تولنے لگا۔ پیرس میں اس کو ایک روزنامہ کی ادارت مل گئی' اس کے کالموں میں اس نے اپنے ارمان خوب نکالے۔ اس کے آتشیں قلم کی جولانیاں قانون کے احتساب سے محفوظ نہ رہ سکتی تھیں۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ حکومت انقلاب کے اس فتیلہ سوز اں کو آزاد چھوڑ دیتی' چنانچہ اس کا پرچہ قانونی گرفت میں آ کر بند ہو گیا۔ لیکن معاً اس کو دوسرا میدان عمل مل گیا۔ پیرس ہی میں ایک انتہا پسند اخبار جرمن زبان میں شائع ہوتا تھا' کارل

مارکس نے اس میں طبع آزمائی شروع کر دی لیکن قانون کی مضبوط گرفت نے اس کو یہاں بھی آرام سے سانس نہ لینے دیا۔ پرشیا کی حکومت کی سفارش پر مارکس کو پیرس سے نکال دیا گیا اور وہ برسلز (Brussels) آ گیا۔

لیکن اس کا پیرس میں قیام اس کی زندگی میں سنگ میل کی حیثیت رکھتا تھا' یہاں اس کی فریڈرک انگلز سے آشنائی ہو گئی۔ انگلز جرمنی کے ایک سوتی کارخانے کے مالک کا بیٹا تھا۔ باوجود سرمایہ دار ہونے کے وہ انتہا پسندانہ خیالات سے متاثر ہو گیا تھا۔ وہ مانچسٹر میں اپنے باپ کے کارخانے کی ایک شاخ کا نگران تھا اور رابرٹ اوون (Robert owen) کا دوست تھا۔ رابرٹ اوون جیسا کہ میں آگے چل کر بتاؤں گا۔ انگلستان میں اشتراکی خیالات کا پرچار کیا کرتا تھا۔ انگلز اشتراکی رجحانات تو پہلے ہی سے رکھتا تھا مگر مارکس سے مل کر وہ انقلابی اشتراکیت کا حامی ہو گیا اور مارکس کا رفیق کار بن گیا۔ اس رفاقت کا آغاز ۱۸۴۴ء میں ہوا اور یہ مرتے دم تک قائم رہی کیونکہ انگلز مارکسی خیالات کا علمبردار اور مبلغ بن گیا۔ ۱۸۴۵ء میں وہ اپنے پیر و مرشد کو انگلستان لے آیا' جہاں اس نے بعض جرمن تعلیمی سوسائٹیوں سے روشناس کرایا اور استاد اور شاگرد نے مل کر جرمن مزدوروں کی ایک انجمن قائم کی۔ ۱۸۴۷ء میں انھوں نے لندن میں مزدوروں کا ایک جلسہ منعقد کیا اور اشتراکی بین الاقوامی لیگ کی بنیاد رکھی' جس کی طرف سے اپنے اشتراکی منشور کا اعلان کیا۔

۱۸۴۸ء کا سال یورپ کی تاریخ میں انقلابی سال ہے اور جو جو انقلابات رونما ہو رہے تھے ان کے پیچھے مارکس کا دماغ کام کر رہا تھا۔ ان انقلابی سرگرمیوں کی وجہ سے اس کو بلجیم سے نکال دیا گیا لیکن ان انقلابی تحریکوں نے ان دروازوں کو کھول دیا جو مارکس پر بند تھے۔ چنانچہ وہ فرانس گیا اور پھر جرمنی جہاں کولون کے ایک شہر سے اخبار جاری کیا۔ مگر انقلابی گرد و غبار کے چھٹ جانے کے بعد فضا پھر صاف ہو گئی۔ قانون نے پھر حرکت کی اور مارکس کو جرمنی اور فرانس دونوں ممالک سے شہر بدر کر دیا گیا۔ وہ لندن چلا آیا اور مرتے دم تک یہیں رہا۔

مارکس کے لندن کے ایام بڑے پُر آلام تھے۔ ایک بڑے کنبے کی پرورش کا بوجھ اس پر تھا اور آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ اس نے سوہو کی ڈین سٹریٹ میں دو کمرے کرایہ پر لیے۔ اس کا گھر غربت اور افلاس کا آئینہ دار تھا اور امراض نے بھی ڈیرے ڈال رکھے تھے۔ وہ خود سرطان کی بیماری میں مبتلا تھا' اس کے علاوہ اور موذی امراض نے بھی اس کو شکار بنا رکھا تھا۔ ان تلخ حالات میں اس نے بسر اوقات کی اور یہ محض انگلز کی مالی امداد تھی کہ وہ قرض خواہوں کے روح فرسا تقاضوں سے نجات پاتا۔ اس نے ان ایام میں بڑی دماغی محنت کی۔ دن رات برٹش میوزیم میں گزارے اور اپنی انقلاب آفرین کتاب سرمایہ (Capital) کا مسودہ تیار کیا۔ اس عرصے میں اپنی گزر اوقات کے لیے نیویارک

کے بعض اخبارات کے لیے مضامین بھی لکھتا رہتا تھا۔

Capital کی پہلی جلد اس کی زندگی میں ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی۔ اگرچہ اس نے تصنیف کا کام بہت کیا اور بے شمار رسائل اور چھوٹی چھوٹی کتب لکھیں لیکن سرمایہ (Capital) کی تصنیف سے پہلے اس نے ایک اور مشہور کتاب لکھی جس کا نام "A critique of political economy" ہے۔

اگرچہ اس کی زندگی کے آخری ایام میں مالی تکالیف کم ہو گئیں اور اس کو اپنی تصانیف کی آمدنی کے علاوہ انگلز سے معین رقم سالانہ ملنے لگی مگر سارا خاندان افلاس سے چور ہو چکا تھا۔ ۱۸۸۱ء میں اس کی بیوی سرطان کی بیماری سے برسوں بیمار رہ کر انتقال کر گئی۔ اس کی موت کے دو سال بعد ۱۴ مارچ ۱۸۸۳ء کو اشتراکی انقلاب کا یہ آتشیں نفس قائد بھی اس دار فانی سے چل بسا۔

کارل مارکس کے پیشرو

جب نظام ربوبیت درہم برہم ہو جائے' جب چند کروڑ پتی کارخانہ دار سماج کے سینے میں اپنے آہنی پنجے گاڑ دیں' جب بندہ و آقا کی تمیز سے انسانی فلاح و سعادت کے راستے مسدود ہو جائیں' جب مزدور کو دن رات کی محنت شاقہ سے نان جویں بھی میسر نہ آئے اور دہقان اپنی کھیتی سے ایک دانہ بھی حاصل نہ کر سکے...... یہ اس بہیمی اور بربری نظام معیشت کے تنزل کا وقت ہوتا ہے اور اس کے تنزل اور انحطاط سے باغی روحیں پیدا ہوتی ہیں جن کی صدائے احتجاج میں اس کی موت مضمر ہوتی ہے۔ چنانچہ کارل مارکس اس معاشی انقلاب کا قائد تھا اور انقلابی اشتراکیت کا بانی مبانی بھی تھا لیکن انیسویں صدی کے آغاز سے بلکہ اس سے پہلے بھی ایسے لوگ پیدا ہوتے رہے جنھوں نے مزدوروں کے حقوق کی حمایت میں آوازیں اٹھائیں۔ کارخانوں میں کام اور محنت کی انسانیت سوز شدت میں افاقہ کرایا' اوقات کار میں تخفیف کے لیے جدوجہد کی' معقول اجرت کے لیے مالکان کارخانہ کو ترغیب دلائی۔ چونکہ ان تمام تحریکات کا کوئی نہ کوئی عنصر مارکسی اشتراکیت میں موجود ہے اور یہ مارکس کے اس ہنگامہ رستخیز کے لیے جو انیسویں صدی کے وسط میں بپا ہوا پس منظر کا کام دیتی ہیں۔ اس واسطے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان مشاہیر کا بھی ذکر کیا جائے جنھوں نے معاشی حالات کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور نہ صرف سرمایہ دارانہ نظام کے نقائص کو بے نقاب کیا' بلکہ ان کا حل بھی تجویز کیا۔ ان میں سے پہلے نمبر پر سینٹ سائمن (St. Simon) ہے۔ اس کی عمر کا عرصہ ۱۸۶۰ء سے لے کر ۱۹۲۵ء تک ہے۔ اس کو بعض معاشی مورخ "سوشلزم کا باپ" کہتے ہیں۔ اگرچہ اس قسم کا دعویٰ اور لوگوں نے بھی کیا' لیکن اولیت کا طغرائے امتیاز سینٹ سائمن کو حاصل ہے۔ اس نے صنعتی انقلاب کے آثار کو دیکھتے ہی بھانپ لیا کہ ایسے دور کا آغاز ہونے والا ہے جس میں صنعت و حرفت کو فروغ حاصل ہو گا۔ اس کے وسیع مطالعہ نے اس پر واضح کیا کہ اس صنعتی دور میں استحصال کا عمل عالمگیر صورت اختیار کر لے گا۔ اس نے

متعدد رسائل میں دو باتوں پر زور دیا: ایک یہ کہ دنیا سے میراث کا نظام مٹا دینا چاہیے اور دوسرے پیداوار دولت کے تمام وسائل حکومت کے قبضہ میں ہونے چاہئیں۔ یہ دونوں اصول اب انقلابی اشتراکیت میں موجود ہیں۔ میراث تو ایک جرم قرار دیا گیا ہے اور مارکس کے اصول کے مطابق ''عبوری'' عرصہ کے لیے حکومت ہی تمام اسباب معیشت کی واحد مالک ہوتی ہے۔ الغرض سینٹ سائمن کی اشتراکیت حکومتی اشتراکیت کا ابتدائی خاکہ ہے۔

اٹھارویں صدی کے اواخر میں فوریر (Fourier) (۱۷۷۲ء تا ۱۸۳۷ء) پیدا ہوا۔ گوناگوں اقتصادی خرابیاں سماج میں رونما ہو رہی تھیں۔ مگر جس چیز نے اس کو متاثر کیا وہ مقابلہ اور پیکار کا منظر تھا۔ اس نے دیکھا کہ ایک مزدور دوسرے مزدور سے' ایک سرمایہ دار دوسرے سرمایہ دار سے برسرپیکار ہے اور اس مقابلہ نے جامہ تہذیب کو تار تار کر دیا ہے۔ اس خرابی کے مداوا کے لیے اس نے اصول امداد باہمی کو وضع کیا۔ اس کا خیال تھا کہ امداد باہمی کی سوسائٹیوں کے قیام سے معاشی جنگ کا خاتمہ ہو جائے گا اور پیدائش دولت میں معتدبہ ترقی ہو جائے گی۔ اس وقت اس کا اندازہ تھا کہ ۹۸۶ و ۹۸۵ و ۲ سوسائٹیاں تمام دنیا کے لیے کافی ہوں گی۔ ان کے قیام سے نظام معیشت سے ''روح رقابت'' مٹ جائے گی اور اقتصادی عروج کے ساتھ ساتھ انسانوں میں اخوت اور تعاون کا جذبہ بھی ترقی کرتا چلا جائے گا۔

انگلستان میں رابرٹ اوون (Robert owen) (۱۷۷۱ء تا ۱۸۵۸ء) نے بھی امداد باہمی کے اصول کی تعلیم دی۔ وہ خود ایک مثالی آجر (Employer) تھا۔ اس نے اپنے تجربے کی بناء پر اس بات کو پیش کیا کہ اقتصادی تعاون ہی میں فلاح اور کامیابی کا راز ہے۔ اس نے سوسائٹیوں کی بجائے ایسی چھوٹی چھوٹی بستیوں (Settlements) کے قائم کرنے پر زور دیا جو اشتراکی اصول املاک پر بنی ہوں۔ انگلستان میں رابرٹ اوون کے اصول کو کافی شہرت نصیب ہوئی۔

مارکسی تحریک کیوں پھیلی؟

مارکسی اشتراکیت کا چوتھا نقیب لوئی بلانک (Louis Blanc) (۱۸۱۳ء تا ۱۸۸۲ء) ہے۔ اس نے جس اصول معیشت کو پیش کیا وہ زیادہ مفید اور قابل عمل تھا۔ اس کا اصول کار یہ تھا کہ اتحاد سے مقابلہ کی روح کو کچلا جائے لیکن اس سماجی اصلاح کی علمبردار حکومت ہو' وہ امداد باہمی کی سوسائٹیوں کو قائم کرے جو پیداوار دولت کے ہر شعبہ پر محیط ہوں اور اپنے گہرے اتحاد عمل سے سرمایہ داروں کا قلع قمع کر دیں۔

یہ مختلف تعلیمات تحریک عمومی کا رنگ اختیار نہ کر سکیں کیونکہ ان کی اساس اصول اتحاد پر تھی۔ وہ حاسہ اخلاقی کو بیدار کرنا چاہتی تھیں تا کہ کوئی ''من چلا'' ان سے متاثر ہو کر اشتراکیت کو عملی صورت

میں دنیا میں قائم کر دے۔ ان کے مخاطب زیادہ تر خود سرمایہ دار تھے یا اس وقت کی حکومتیں تھیں۔ یہ ناممکن تھا کہ سرمایہ دار اپنے ذاتی مفاد کو قربان کر دیتے اور مزدوروں کو پیداوار دولت میں مساوی حصہ دے دیتے۔ خصوصاً اس وقت جب کہ مزدور طبقہ کمزور و ناتواں تھا اور اپنے حقوق سے غافل تھا اور سرمایہ داروں کو ان سے کوئی کھٹکا نہ تھا۔ اسی طرح اس دور کی حکومتوں میں بھی اتنی جرأت نہ تھی کہ وہ قانون کے کلہاڑے سے سرمایہ داروں کے شجر ملعونہ کو کاٹ دیتیں۔ خصوصاً جب سرمایہ دار خود حکومت پر مسلط تھے نہ صرف ملوکیت میں بلکہ اب عصر جمہوریت میں بھی سرمایہ دار ہی حکومتوں پر مستولی ہیں۔ انہی کے جنبش ابرو سے قانون مدون اور منسوخ ہوتے تھے اور ہوتے ہیں اور کار مارکس کا قول ہے کہ ''جمہوری مجالس واضع قوانین کارخانہ داروں کی مجالس عاملہ کی حیثیت رکھتی تھیں۔''

اندریں حالات یہ ناممکن تھا کہ کوئی معاشی اصلاح کا اصول کامیاب ہو سکے یا عوام میں قبولیت حاصل کر سکے۔ خصوصاً وہ جس کا روئے سخن مستاجروں اور مالداروں یا حکومت سے ہو۔ یہی وجہ ہے کہ سینٹ سائمن، فوریئر، رابرٹ اوون، لوئی بلانک کی تعلیمات صدا بصحرا ثابت ہوئیں۔ ان کے مقابلے میں کارل مارکس کی تعلیم نے جس کی تہ میں یہی جذبہ کارفرما تھا تحریک عمومی کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس کی امتیازی صورت یہ تھی کہ اس کے مخاطب اہل دولت نہ تھے بلکہ وہ مظلوم طبقہ انسانیت تھا جو اپنی زندگی سے بیزار تھا اور اس کی مظلومیت اور بیزاری میں بغاوت کے تمام عناصر موجود تھے اور سرمایہ داروں کا روز افزوں استبداد اس مخفی جذبے کو نقطہ احتراق کی طرف لے جا رہا تھا۔ اب اس فتیلہ سوزاں کو فقط آگ دکھانا باقی تھا کہ اس کے شعلے چار دانگ عالم میں پھیل جائیں۔

کارل مارکس نے سالہا سال کے مطالعہ سے ان حالات کا جائزہ لیا اور عوام کی نفسیات کو خوب بھانپا چونکہ وہ خود زخم خوردہ تھا اور باوجود غیر معمولی استعداد اور قابلیت کے اس نے ساری عمر انتہائی غربت اور مسکنت میں کاٹی تھی اور جیسے اوپر بیان ہو چکا ہے قانون کے ہاتھوں بھی وہ مدت العمر نالاں رہا۔ اس واسطے اس کی تحریرات آتش فشاں پہاڑ کی طرح پھٹ پڑیں۔ اس کا ہر لفظ اس کے ''سوز یقین'' کا شعلۂ جوالا تھا جو لپک کر سرمایہ داری کے خرمن کو راکھ کرنا چاہتا تھا۔ اس کے فلسفہ معیشت نے افکار اور کردار میں ہیجان پیدا کر دیا۔ اس نے نہ صرف ایک نصب العین پیش کیا بلکہ ایک لائحہ عمل بھی دنیا کے سامنے رکھا۔ جیسا کہ آگے چل کر میں بتاؤں گا کہ اس فلسفے میں علمی اور عملی خامیاں ہیں اور یہ سماج کی تمام ضروریات پر حاوی نہیں لیکن اس میں کسی کو کلام نہیں کہ کارل مارکس نے ہی مزدوروں کو فعال عنصر کے رنگ میں پیش کیا اور تحریک اشتراکیت کی نوک پلک کو ٹھیک کیا۔ ناوی مفکرین اور فلاسفہ پر اس کو ایک اور فوقیت بھی حاصل ہے وہ یہ کہ اسی نے یہ آواز اٹھائی کہ دولت و ثروت کو معیار عزت تصور کرنا انسانیت کی جڑ پر تبر چلانا ہے اور دولت آفرینی میں مزدور سرمایہ دار سے فروتر نہیں۔

بلکہ ایک رنگ میں مزدور کی اجرت کو روسا اور امراء کی غیر مکتسب آمدنی (Unearned Income) پر اخلاقی برتری حاصل ہے۔ اگرچہ اس نظریے میں اس نے غلو کی آمیزش سے اپنی تعلیم کے افادی پہلو کو کمزور کر دیا اور سماج کو انقلابی شورشوں کا اکھاڑا بنا دیا' تاہم اشتراکیت کو سربلند کرنے میں وہ اپنے پیشروؤں پر گوئے سبقت لے گیا۔

اگر کارل مارکس کی انقلابی اشتراکیت نہ پیدا ہوتی یا پیدا ہوتے ہی عدم توجہ سے مٹ جاتی تو سرمایہ داروں کو ایک اور بلاخیز تحریک کا سامنا کرنا پڑتا' جوان کی معاشی دستبرد سے ملک کے زراعت پیشہ اور بے کار و بے کس علمی طبقہ میں نشوونما پا رہی تھی۔ یہ تحریک فوضویت (Anarchism) کے نام سے یاد کی جاتی ہے۔ اس کا بانی مبانی مائیکل بکونن (Michel bakunin) ہے جو روس کے روساء کے طبقے کا فرد تھا۔ یہ تحریک سرمایہ داری کے خلاف شدید ردعمل کے نتیجہ میں پیدا ہوئی۔ اس کے بانی کا دعویٰ تھا کہ حکومت ایک لعنت ہے' اس کے مٹا دینے سے ہی انسان کو فلاح نصیب ہو سکتی ہے۔ ہر آدمی اپنے معاملات میں خود مختار ہونا چاہیے۔ اس کے اقوال و افعال پر حد بندی کرنے والی کوئی بیرونی طاقت نہیں ہونی چاہیے۔ سماج کا ہر رکن فاعل مختار ہو اور اس کے حاسہ اخلاق کو اس کے افعال کی نگرانی کرنے کے لیے کافی سمجھا جائے کیونکہ اس کی بدولت سماج کے افراد اپنے تعلقات میں توازن پیدا کریں گے اور تصادم کا کھٹکا تک باقی نہ رہے گا۔ اسی تحریک کے متعلق ایک امریکن مصنف کا قول ہے کہ "سب سے اعلیٰ حکومت وہ ہے جو زیادہ سے زیادہ حکمرانی سے احتراز کرے۔" اس نیراجی تحریک کے حامی یورپ کے دوسرے ممالک میں بھی پیدا ہو رہے تھے۔ مثلاً فرانس میں پرودھن (Proudhn) اور اٹلی میں انریکو ملاٹسٹا (Enrico Malatesta) مادر پدر آزادی کی یہ ملعون تحریک بار آور نہ ہو سکی۔ اس پر کاری ضرب لگانے والا کارل مارکس تھا۔ اس کی بکونن (Bakunin) اور پرودھن (Proudhn) کے خلاف قلمی رزم آرائیاں تاریخ میں مشہور ہیں۔ اس لحاظ سے مارکسی اشتراکیت کو فوضویت اور رابرٹ اوون کی اخلاقی اشتراکیت میں برزخ کی پوزیشن حاصل ہے۔ اگرچہ اس کا دامن بھی امن سوز بجلیوں سے معمور ہے اور اس نے اگر سرمایہ داری کی عمارت کو مسمار کیا ہے تو کاشانہ غریب کو بھی امن اور آسودگی سے محروم رکھا ہے۔ مگر نیراجی تحریک کے مقابلے میں اس کو اعتدال کا درجہ حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کو اس وقت دلپذیری نصیب ہوئی اور مزدوروں کی انجمن نے بین الاقوامی صورت اختیار کر لی اور روس میں جو انقلاب ہوا وہ مارکسی اشتراکیت کے نام پر تھا' نہ کہ فوضویت کے نام پر۔ ایک انگریز مصنف نے خوب کہا ہے کہ روس کے انقلاب کے پیچھے لینن (Lenin) کا ہاتھ تھا اور مارکس کی آواز تھی۔"

کارل مارکس کی تصنیفات

مارکس کی زندگی شدید کشمکش کی زندگی تھی۔ دانشور اس کو "وبائی جرثومہ" تصور کرتے تھے اور ان کی احتسابی قوتیں اس کے تعاقب میں لگی رہتی تھیں۔ طویل تگ و دو کے بعد اس کو انگلینڈ میں امن کی زندگی نصیب ہوئی۔ مگر یہاں بھی اس کو فکر معاش کا فکر دامن گیر رہتا تھا' اور اس کے خلاف اس کے پاس ایک ہی ذریعہ تھا' وہ اس کا زرخیز دماغ تھا یا اس کا برق رفتار قلم۔ اپنی خامہ فرسائی سے اس نے دفتروں کے دفتر سیاہ کر دیے۔ مگر اس کی تصنیفات میں تین چیزیں قابل ذکر ہیں کیونکہ ان میں اس کا فلسفہ محفوظ ہے اور علمی دنیا میں بھی ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ یہ اشتراکی منشور (Communist manifesto)' نظام معیشت پر تنقید (Critique of political economy) اور سرمایہ (Capital) ہیں۔

اشتراکی منشور کو اوّلیت کا درجہ حاصل ہے کیونکہ یہ مارکسی اشتراکیت کا سنگ بنیاد ہے۔ اس میں دنیا کے مزدوروں کے لیے پیغام عمل ہے اور سرمایہ داروں کے لیے دعوت مبارزت۔ اس کی تصنیف و ترتیب میں کارل مارکس اور انگلز دونوں شامل تھے اور یہ منشور اشتراکی بین الاقوامی کے پہلے جلسے کے لیے جو لندن میں ۱۸۴۷ء میں ہوا' لکھا گیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب "افق مغرب" پر انقلاب کے بادل چھائے ہوئے تھے اور مزدور طبقہ سین سائمن' فوریر اور اوون کی ضعیف اور التجائی اشتراکیت سے بیزار ہو کر کسی انقلابی آواز کے لیے گوش بر آواز تھا۔ قلب و دماغ کی دنیا انقلابی تخم ریزی کے لیے بالکل طیار تھی۔ ایسے وقت میں ایک انقلاب آفرین لائحہ عمل کو جتنی بھی قبولیت نصیب ہو کم ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اشتراکی منشور کا شائع ہونا تھا کہ مزدور اپنے آقاؤں کے خلاف مشتعل ہو گئے اور اشتراکیت کو بحث و نظر کی الجھنوں سے نکل کر عملی جامہ نصیب ہوا۔ اس میں مزدوروں کو بتلایا گیا کہ وہ اپنے غاصب آقاؤں کے املاک پر چھاپہ ماریں اور منصوبہ بازیوں کے قدیم طریق کو چھوڑ کر میدان عمل میں اتر آئیں۔ ان کی امید باندھنے کے لیے ایک فلسفہ بھی پیش کیا گیا' جس میں یہ بتایا کہ انسانی تاریخ طبقاتی تصادم کی مسلسل داستان ہے اور کسی نظام معیشت و معاشرت کو قرار اور سکون حاصل نہیں۔ سلبی اور ایجابی طاقتیں آپس میں ٹکراتی ہیں اور ان کے پیکار اور ٹکراؤ سے ایک "مثبت نظام" پیدا ہو جاتا ہے۔ پھر ایک وقت پر جا کر اس میں سلبی اور ایجابی پہلو پیدا ہو جاتے ہیں اور اس کے ساتھ ہی پھر تصادم کا دور شروع ہو جاتا ہے۔ "پیکاری ارتقاء" کا یہ فلسفہ ہیگل سے مستعار تھا۔ فرق صرف اتنا تھا کہ ہیگل نے اس کو اعیان کی دنیا تک محدود کر دیا تھا مگر کارل مارکس نے اس کو سماج پر چسپاں کیا اور تمام تاریخ کو اس فلسفہ کی عینک سے دیکھا اور اس کو ہر دور میں قوی اور ضعیف' بندہ و آقا امیر و غریب' زردار اور نادار برسرپیکار نظر آئے۔ اسی مشاہدے کی بناء پر اس نے مزدوروں کے لیے جانفزا پیشگوئی کی کہ آنے والا دوران کی خوشحالی اور کامرانی کا دور ہے اور اگر اس کو جلد لانا ہو تو وہ اس میں ممد ہو سکتے ہیں یعنی مزدور

سرمایہ داروں کے خلاف سلب ونہب کا عمل شروع کر دیں۔ اس ڈاکہ زنی کی فلسفیانہ تعلیم نے مزدور طبقہ پر جادو کا کام کیا اور وہ کامیابی کی امید سے متوالے ہو گئے۔

اس منشور کے چار حصے ہیں: پہلے حصے کا عنوان "بورژوا اور پرولتاری" ہے۔ اس حصہ میں تاریخ کی مادی تعبیر کے نظریے کو وضاحت سے پیش کیا گیا ہے اور اس کے ساتھ ہی طبقاتی جنگ کا تصور بھی بیان ہے۔ "بورژوا" طبقے کو غاصب اور حکومت کو اس کا آلہ کار قرار دیا گیا ہے۔ اس میں مصنفین نے بتلایا ہے کہ دولت کی پیداوار اور اس کا تبادلہ دو ایسے موثرات ہیں جو سماج کی تشکیل کے ذمہ دار ہیں۔ سماج میں رائج الوقت اخلاق اور مذہب بھی انہی موثرات کی پیداوار ہوتے ہیں۔ چونکہ اس وقت یہ دونوں عوامل سرمایہ داروں کے قبضہ اقتدار میں ہیں۔ اس واسطے قانون، مذہب اور اخلاق بھی ان کے غاصبانہ جذبات اور رجحانات کے آئینہ دار ہیں اور اپنی ذات میں کوئی مستقل حیثیت نہیں رکھتے۔

دوسرے حصے کا عنوان "پرولتاری اور اشتمالی" ہے۔ اس میں مارکس اور اس کے رفقاء کار کی ان سرگرمیوں کا ذکر ہے جو ان کو نئے نظام معیشت کے قائم کرنے کے لیے کرنی تھیں۔ مثلاً پرولتاری طبقہ کو منظم کرنا اور بورژوا کو شکست دے کر معاشی نظام سے بے دخل کرنا اور سیاسی تفوق حاصل کرنے کے بعد ذاتی ملکیت کے اصول کو منسوخ کرنا۔

تیسرے حصے کا عنوان "اشتراکی اور اشتمالی لٹریچر" ہے۔ اس میں قدیم اشتراکیت (Socialism) اور اشتمالیت (Communism) پر شدید جرح کی گئی ہے اور بتلایا گیا ہے کہ اخلاقی اور مذہبی نوع کی اشتراکیت یا اشتمالیت ایک مقدس پانی ہے، جس سے ارباب کلیساء سرمایہ داروں کے حرص وآز کو بپتسمہ دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ تحریکیں بے نتیجہ ثابت ہوئیں۔

چوتھے حصے میں مزدوروں کو اتحاد عمل کی دعوت ہے اور سرمایہ داروں کو دعوت مبارزت۔ اس میں غیر مبہم الفاظ میں مزدوروں کو کارخانہ داروں کے خلاف ابھارا گیا ہے۔ ان کو کہا گیا ہے کہ ان کے ہنگامہ عمل سے ان کے آقا لرزہ براندام ہو جائیں گے اور ان کی آہنی بیڑیاں کٹ کر گر جائیں گی۔

کارل مارکس کی دوسری مشہور تصنیف نظام معیشت کی تنقید (Critique of political economy) ہے۔ اس میں اقتصادی حالات و کیفیات کی علمی بحثیں ہیں۔ اس میں مسئلہ قدر زائد (Theory of surplus value) پر روشنی ڈالی گئی ہے، تا کہ جو انقلابی روح اشتراکی منشور کے ذریعہ پھونکی گئی ہے اس کے لیے سند جواز مل سکے۔ چونکہ اس میں علمی بحثیں ہیں اس واسطے اس کا اسلوب بیان ثقیل ہے۔ اس میں اشتراکی منشور کی سی ولولہ انگیزی نہیں اور اس تصنیف کا مدار ایڈم سمتھ (Adam smith) اور ریکارڈو (Recordo) کے اقتصادی نظریوں پر ہے۔

تیسری تصنیف سرمایہ (Capital) ہے۔ اس کا اجمالی نقشہ پہلی دونوں تصنیف میں موجود

ہے۔ بالفاظ دیگر یہ ''منشور'' کی اشتمالیت اور (Critique) کے اقتصادی تصورات کا مرکب ہے۔ مارکس کی تجویز تھی کہ یہ کتاب چار جلدوں میں شائع ہو۔ پہلی جلد میں سرمایہ کی تخلیق کا مسئلہ بیان کیا جائے' دوسری جلد میں سرمایہ کی گردش کا ذکر ہو' تیسری جلد میں سرمایہ دارانہ دولت آفرینی کے مسئلہ پر بحث کی جائے اور آخری یعنی چوتھی جلد میں ''مسئلہ قدر زائد'' (Theory of surplus value) کو شرح وبسط سے بیان کیا جائے۔ لیکن یہ تجویز پروان نہ چڑھ سکی کیونکہ اس کی حینِ حیات میں صرف پہلی جلد ۱۸۶۷ء میں شائع ہوئی' اور بیس سال کے بعد اس کا انگریزی زبان میں ترجمہ ہوا۔ دوسری اور تیسری جلد کے لیے اس نے مواد فراہم کیا' لیکن یہ تصنیفِ تشنہ تکمیل رہی۔ اس کی موت کے بعد اس کے وفادار رفیق کار انگلز نے دوسری جلد کو ۱۸۸۵ء میں شائع کیا۔ اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ تیسری جلد ۱۸۹۴ء میں اور اس کا انگریزی ترجمہ ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا۔ چوتھی جلد شائع نہ ہو سکی۔ بعض نقادوں کا خیال ہے کہ مارکس کے پاس صرف ایک جلد کا سیر کن مواد تھا اور اس کے نظریے میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ اس کے لیے اتنا مواد میسر آ سکے جس سے باقی ساری جلدیں اس کی خواہش کے مطابق ترتیب پا سکیں۔ اس کتاب یعنی ''سرمایہ'' میں اصول جنگ اور نفی جنگ دونوں کا طویل ذکر ہے۔ مگر اعداد وشمار کے انبار اور نگارش کی گرانی نے اس کتاب کو معمہ بنا دیا ہے اور یہ ایک اچھے لکھے پڑھے انسان کی سمجھ سے بھی باہر ہے اور اصولِ اشتراکیت کے متعلق جتنا علم موجود ہے وہ ان بے شمار کتب کی بدولت ہے جو اس کی تشریح میں لکھی گئی ہیں۔

کمیونزم کا تاریخی پس منظر

باوجود اس اقرار کے کہ تمام عمرانی تحریکات جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے' اپنے مقاصد میں ناکام رہیں اور ان کی یورش کے باوجود سرمایہ داری کو فروغ حاصل رہا۔ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ان سب میں سے کسی کو اگر کچھ کامیابی حاصل ہوئی ہے تو وہ کیمونزم ہے۔ اس سے میری مراد فقط یہ ہے کہ اس کے سوا دوسری تحریکات کسی ملک میں بھی بروئے کار نہ آئیں۔ اور اگر آئیں تو محدود پیمانے پر اور بہت قلیل عرصہ کے لیے اور جلد دست برد زمانہ سے مٹ گئیں۔ اس کے برعکس کارل مارکس کے نظریے کو عالمگیر اشاعت نصیب ہوئی۔ روس میں نفاذ پذیر ہوا' جو رقبے میں دنیا کے بیشتر ممالک سے وسیع ہے اور ماسکو کی سرپرستی میں دنیا کے دوسرے حصوں میں اشتراکی مراکز قائم ہو گئے۔ اگرچہ روسی کیمونزم میں بھی انحراف کا رنگ آ گیا ہے اور بعض متعصب کیمونسٹ سٹالن کے طرزِ عمل کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے تھے۔ تاہم لوگ اس کے معاشی نظام کو کیمونزم کہنے پر مجبور ہیں۔ انحراف کے باوجود ماسکو کے ارباب اختیار کارل مارکس ہی کو اپنا امام سمجھتے ہیں۔ اپنے انحراف کو فروعی تصور کرتے ہیں اور اس کے لیے بھی

ضرورتِ وقت کی سند پیش کرتے ہیں۔ اس واسطے کمیونزم زیادہ تفصیلی بحث کی مستحق ہے کیونکہ سرمایہ داری اور اس کے گوناگوں مظاہرات کا فقط یہی ایک حریف ہے اور جو لوگ مذہب سے منحرف ہو کر سرمایہ داری کو مٹانا اور معاشی خوشحالی پیدا کرنا چاہتے ہیں وہ کمیونزم کے دامن ہی سے وابستہ ہیں اور ان میں سے اکثر و بیشتر ماسکو کے مکتب ہی سے درسِ عمل لیتے ہیں۔

کمیونزم کے اجزائے ترکیبی

کمیونزم کو دوسرے عمرانی تصورات کے مقابلے میں زیادہ پذیرائی محض اس وجہ سے نصیب ہوئی کہ اس کے ترکیبی عناصر میں زیادہ توازن ہے۔ یہ تمام دوسری تحریکات کے موٹے موٹے اصولوں پر محیط ہے۔ جب کارل مارکس نے اپنا تصور معاش وضع کیا تو اس نے رائج الوقت تصورات اور نظریات سے کماحقہ استفادہ کیا۔ یہ انیسویں صدی کا وسط تھا اور انگلینڈ میں ریکارڈو (Recardo) اور ایڈم سمتھ (Adam smith) علم الاقتصاد کے استاد سمجھے جاتے تھے اور انھوں نے کرایہ (Rent) اور اجرت (Waqes) کے متعلق انسانیت نواز نظریات قائم کیے اور وہ علمی حلقوں میں بہت ہی مقبول ہو رہے تھے۔ ادھر فرانس میں والٹیر (Voltaire) اور روسو (Rousseav) کے سیاسی تصورات نے انقلاب برپا کر دیا تھا۔ قدیم جبر و استبداد مٹ چکا تھا۔ سیاست پر آزادی' مساوات اور اخوت کے نئے نقوش مرتسم ہو چکے تھے اور عوام میں بیداری پیدا ہو گئی تھی۔ جرمنی پر ہیگل (Hegel) کا فلسفہ مسلط تھا۔ لوگ سٹیٹ کے ساتھ الوہیت کو وابستہ کرنے لگ گئے تھے اور سٹیٹ کی ہمہ گیری میں اپنی روحانی اور مادی نجات سمجھتے تھے۔ کارل مارکس کے ظہور کے وقت خیالات کے یہ تین دھارے مغرب میں بہہ رہے تھے اور یہ ناممکن تھا کہ مارکس ان سے متاثر نہ ہوتا۔ چنانچہ یہ اثر پذیری تھی کہ اس کے نظریے کا خمیر انگلینڈ کے اقتصادیات' فرانس کے سیاسیات اور جرمنی کے مابعد الطبیعیات سے اٹھایا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونزم میں فلسفہ' اقتصاد اور سیاست تینوں چیزیں موجود ہیں۔ مارکس کا کمال اور شرف اولیت اس میں ہے کہ اس نے ان تینوں عناصر کو ایسا متوازن کر دیا کہ ان کے باہمی ملاپ سے ایک تصور حیات وجود میں آ گیا۔ یہی اس کی شہرت کا راز ہے۔

ہیرلڈ لاسکی (Harold laski) لکھتا ہے کہ "کمیونزم نصب العین بھی ہے اور لائحہ عمل بھی۔ یہ خوبی اور برتری فلسفہ' اقتصاد اور سیاست کے امتزاج سے پیدا ہو گئی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی ایک عنصر بھی مفقود ہوتا تو اس کی علمی اور عملی حیثیت میں فرق آ جاتا۔"

ان اجزائے ترکیبی کی مناسبت سے کمیونزم کے بھی تین پہلو ہیں:

۱۔ تاریخ کی مادی تعبیر (Materialistic interpretation of history) اس کو فلسفہ کی حیثیت حاصل ہے۔

۲۔ نظریہ قدر زائد (Theory of surplus value) یہ کمیونزم کا اقتصادی پہلو ہے۔

۳۔ طبقاتی جنگ (Class war) یہ مارکس کی سیاست ہے' جس سے ذاتی ملکیت (Private property) مٹ کر کمیونزم بروئے کار آتی ہے۔

اجزائے ترکیبی پر مفصل بحث آئندہ صفحات میں ہو گی۔

کیپٹلزم (سرمایہ داری) کی تشریح

یہ ظاہر ہے کہ یہ تینوں پہلو حادثۂ مارکس کے ذہن میں نہیں آ گئے تھے' بلکہ تاریخ اور عمران کے عمیق مطالعہ کے بعد وہ اس بات کے قائل ہوا کہ ایک سہ گانہ نظریہ حیات دنیا کے سامنے پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونزم پر بحث کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ ان حالات کو پیش کیا جائے جن کے مطالعہ سے مارکس نے اپنا نظریہ مستنبط کیا۔ یہ حالات سرمایہ داری (Capitalism) کے عروج و زوال سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے تفصیلی بیان سے کمیونزم کا پس منظر تیار ہو جائے گا اور اس کے خدوخال زیادہ نمایاں ہو جائیں گے۔ بالفاظ دیگر یہ سارا بیان اس کی شہرہ آفاق کتاب سرمایہ (The capital) کا ملخص ہو گا۔ کیونکہ جب تک ''عمل'' کی تفصیل معلوم نہ ہو ردعمل کا ادراک مشکل ہو جاتا ہے اور اس میں فلسفے کی یبوست پیدا ہو جاتی ہے۔ اس میں کس کو کلام ہو سکتا ہے کہ کمیونزم کیپٹلزم کے خلاف ردعمل ہے اور اگر نظام سرمایہ داری کا اس رنگ میں ارتقاء اور عروج نہ ہوتا جس رنگ میں ہوا یا کارل مارکس سے پہلے ہی اس کے دھارے کا رخ کسی اور جانب پھر جاتا تو یقیناً اس کا ردعمل مختلف ہوتا اور اس کا نظریہ بھی وہ نہ ہوتا جو آج ہم تک پہنچا ہے۔ کمیونزم میں انقلاب کی چنگاریاں ان مظالم کا پتہ دیتی ہیں جو سرمایہ دار اپنے عروج کے آغاز سے مزدوروں پر ڈھاتے چلے آئے ہیں۔ اسی طرح اس کی تھیوری کا ہر پہلو کیپٹلزم کے کسی نہ کسی ظلم وستم کے خلاف ردعمل (Reaction) کا حکم رکھتا ہے۔

کارل مارکس کا قول ہے کہ تاریخ کا ہر دور اپنے بطن میں آنے والے انقلاب کے جراثیم رکھتا ہے۔ جس طرح نظام جاگیرداری (Feudalism) سے نظام سرمایہ داری پیدا ہوا' اسی طرح نظام سرمایہ داری سے نظام اشتراکیت کی نمود ہوئی اور یہ تغیر اس وقت رونما ہوا جب نظام سرمایہ داری انسانی تمدن و حضارت کے لیے سم قاتل ثابت ہونے لگا اور اس نظام کے اندر ایسے زہریلے میلانات پیدا ہو گئے جو اس کے شیرازے کو ہر لحظہ بکھیر رہے تھے۔ اس کے افتراق اور انتشار سے بقول مارکس کمیونزم نے جنم لیا۔ اس سارے ارتقاء کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم سرمایہ داری کو آغاز سے انجام تک دیکھ لیں۔ اس روئداد کو شروع کرنے سے پہلے یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ موضوع بحث اور عرضہ اعتراض ''سرمایہ'' نہیں بلکہ نظام سرمایہ داری ہے۔ ''سرمایہ'' تو محض دولت آفرینی کے عوامل میں سے ایک عامل ہے اور اس سے مراد تمام وسائل و آلات ہیں جو دولت کی پیداوار میں ممد ہوتے ہیں۔ اس

کے برعکس نظام سرمایہ داری سے مراد یہ ہے کہ سرمایہ کی ملکیت سے ایک انسان ذرائع پیداوار دولت پر قابض ہو جائے اور تمام دوسرے عوامل اس کے اجرتی غلام ہو کر رہ جائیں۔ جب ایک خاندان کسی صنعت (Industry) میں مصروف ہے اور اس کے ممبر اپنی محنت سے اپنا پیٹ پالتے ہیں۔ گو ان کا سارا کاروبار دولت آفرینی کے عمل کے مترادف ہے مگر اس میں سرمایہ داری کا کوئی شائبہ نہیں۔ لیکن اگر ان کے کام کو فروغ حاصل ہو اور وہ اپنے کام کو وسیع کرنے کے لیے اپنے کنبے کے لوگوں کے علاوہ دوسرے لوگوں کو بھی اُجرت پر رکھ لیں اور اپنی ضروریات سے زیادہ پیدا کر کے منڈیوں میں اپنا مال بیچیں اور نفع اندوزی سے دولت جمع کریں' تو یہ سارا کام سرمایہ داری کے عنوان میں آ جائے گا کیونکہ سرمایہ داری میں بندہ و آقا اور اجیر و مستاجر کا ہونا ضروری ہے۔ اس طرح دیہات میں جب تک کسان زراعت کا کام خود سرانجام دیتا ہے یا اس کے اپنے لوگ اس کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور اپنی پیداوار سے وہ اپنی ضروریات کی کفالت کرتے ہیں تو ان کے فعل پر سرمایہ داری کا اطلاق نہیں ہو سکتا لیکن اس کے مقابلے میں ایک رئیس زمیندار ہے' اس کے پاس بہت زمین ہے' وہ اس کی کاشت کے لیے دوسروں کو اپنا ملازم رکھتا ہے' یہ لوگ کام کر کے اپنی مزدوری حاصل کرتے ہیں اور پیداوار کا مالک خود رئیس زمیندار ہوتا ہے۔ کل پیداوار اس کی ذاتی ضروریات سے کہیں زائد ہوتی ہے۔ وہ ایک کثیر مقدار منڈی میں فروخت کرتا ہے اور حاصل کردہ روپے سے اپنے کاروبار کو جاری رکھتا ہے۔ یہ عمل بھی نظام سرمایہ داری متصور ہو گا۔

ایک اور بات قابل غور یہ ہے کہ جس طرح نظام سرمایہ داری میں سرمایہ دار اپنے کارخانوں کی پیداوار کو منڈیوں میں بیچتا ہے اسی طرح مزدور اپنی محنت اور ہنر کو بطور جنس کے کارخانہ داروں کے پاس بیچتے ہیں۔ جس طرح دوسری اشیاء کی قیمت میں مدوجزر ہوتا ہے اسی طرح مزدور کی اجرت میں اتار چڑھاؤ کا منظر دیکھنے میں آتا ہے۔ لیکن مزدور جس جنس کو بیچتا ہے اس کی نوعیت مختلف ہے اور اس کو اپنی جنس کے خریدار یعنی کارخانہ دار کی شرائط کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ اگر منڈیوں کا بھاؤ نرم ہو تو سرمایہ دار اپنی اشیاء فروختنی کو روک کر انتظار کر سکتا ہے مگر مزدور ایسا نہیں کر سکتا کیونکہ اس کی زندگی کا دار و مدار اسی پر ہے کہ جتنا کماتا ہے اتنا ہی کھا لیتا ہے اور اس کے پاس کوئی اندوختہ نہیں جس پر تکیہ کر سکے۔ اس کی نارمل اجرت یعنی اس کی جنس کی قیمت بہت ہی تھوڑی ہوتی ہے کیونکہ اس کا مالک اس سے استحصال بہت کرتا ہے اور جو کچھ اس کو اجرت کے نام سے دیتا ہے وہ اس کی روح و تن کے اتحاد کے لیے بھی کافی نہیں ہوتا۔ اس طرح کارخانہ دار کی دولت میں روز افزوں ترقی ہوتی جاتی ہے اور اس کی نسبت سے مزدور کمزور اور بے بس ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسی نسبت سے "محنت" کے بیچ و شرا میں سرمایہ دار کا پلہ بھاری ہوتا چلا جاتا ہے اور جو قیمت وہ مقرر کرتا ہے وہی مزدور کو لینی پڑتی ہے۔

کیپٹلزم کا ارتقاء

محنت کی ارزانی سے سرمایہ دار بڑے بڑے کارخانے قائم کرتے ہیں جن میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں مزدور اُجرت پر کام کرتے ہیں۔ اس طرح ''محنت'' اور ''سرمایہ'' میں بُعد پیدا ہوتا چلا جاتا ہے اور مرورِ زمانہ سے محنت میں تو اجتماعی رنگ پیدا ہونے لگتا ہے کیونکہ جب ہزاروں کی تعداد میں مزدور ایک ہی جگہ کام کریں گے اور ان کے مفاد میں بھی اشتراک ہوگا تو تدریجاً ان میں یگانگت پیدا ہوتی چلی جائے گی لیکن اس کے برعکس بڑے بڑے کارخانوں کے ظہور سے چھوٹے سرمایہ دار پس کر خاک ہو جائیں گے اور انجام کار مزدوروں کی کسی صف میں آ شامل ہوں گے اور میدانِ مقابلہ میں چند سرمایہ دار رہ جائیں گے۔ پیدائش دولت میں تو اشتراکی رنگ ہوگا مگر تقسیم دولت میں انفرادیت کا عنصر غالب ہوگا۔ یعنی لاکھوں نفوس اکٹھے مل کر دولت آفرینی کے عمل میں شبانہ روز مشغول ہوں گے مگر جب تقسیم دولت کا وقت آئے گا تو اس کا بیشتر حصہ چند کارخانہ داروں میں تقسیم ہو جائے گا۔ جوں جوں یہ نظام معیشت اس ڈگر پر چلتا جائے گا یہ پہلو نمایاں ہوتا چلا جائے گا کہ تخلیق دولت اجتماعی اصولوں پر ہی ہو رہی ہے اور تقسیم دولت میں انفرادیت کارفرما ہے۔ یہ وہ تضاد (Contradiction) ہے جو نظام سرمایہ داری میں پیدا ہو کر اس کی ہلاکت کا موجب بن جاتا ہے اور اسی باطنی ٹکراؤ سے اشتراکی انقلاب کے شرارے پھوٹ نکلتے ہیں۔

جب کوئی نظام انسانی حقوق کی پامالی پر استوار ہوتا ہے تو اس کے بطن میں کئی انقلاب پرورش پانے لگ جاتے ہیں۔ ابھی ہم ایک ایسے تضاد کا ذکر کر چکے ہیں جو مزدور اور سرمایہ دار کے خونین تصادم کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور اس آویزش کا ہر معرکہ سرمایہ داری کے لیے پیغام اجل ہوتا ہے لیکن اس نظام کی خودکشیاں اسی پر ختم نہیں ہو جاتیں بلکہ ان میں گوناگوں ترقیاں ہوتی چلی جاتی ہیں۔ مزدور تو نادانستہ اپنے اندر اتحادِ عمل کا رنگ پیدا کرتے چلے جاتے ہیں مگر سرمایہ دار ان سے بدظن ہو کر اس کی تخریب کے درپے ہوتا ہے چونکہ اس کی ساری پیداوار منڈی کے لیے ہوتی ہے اور معاشی منصوبہ بندی (Economic planning) کے فقدان کی وجہ سے اس کی مقدار پیداوار کو طلب و ضرورت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا اور اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ رسد (Supply) طلب (Demand) سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے۔ اس سے منڈی کے بھاؤ گر جاتے ہیں اور سرمایہ دار کے متوقع منافع میں بھاری کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اب اس کا ایک علاج یہ ہے کہ کچھ کارخانے بند ہو جائیں۔ اس کے لیے کارخانہ داروں میں مقابلہ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ''مقاتلہ'' شروع ہو جاتا ہے اور عیار سرمایہ دار اپنے حریفوں پر عرصہ حیات تنگ کر کے ان کو میدانِ عمل سے نکال دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملک کے وسائل حیات پر چند سرمایہ دار قابض ہو جاتے ہیں۔ وہ پیدائش دولت کے عمل کی زیادہ سے زیادہ اصلاح اس طرح

کرتے ہیں کہ مشینی ایجادات کو کام میں لاتے ہیں۔ اس کی زد غریب مزدور پر پڑتی ہے کیونکہ ایک مشین کئی مزدوروں کو بے کار کر دیتی ہے اور جو رہ جاتے ہیں ان کو اوقاتِ کار میں پہلے سے زیادہ عرق ریزی کرنا پڑتی ہے۔ ایک طرف بے کاری کا دور دورہ شروع ہو جاتا ہے' دوسری طرف جو کارخانوں میں رہ جاتے ہیں وہ المناک صعوبتوں اور مشکلات میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

سرمایہ داروں کے انسانیت سوز حیلے

لیکن سرمایہ دار اپنے عمل غصب کے نتائج سے دیر تک محفوظ نہیں رہتے۔ ان پر ایک وقت ایسا آتا ہے جب وہ محسوس کرنے لگتے ہیں کہ ان کا تیار کردہ مال نہیں بکتا' اور جو سرمایہ اس میں صرف ہوا ہے وہ سب اکارت گیا ہے۔ اس کساد بازاری کے صدمے سے بہت سے سرمایہ دار دیوالیہ ہو جاتے ہیں۔ ان کی زبوں حالی کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں اور اس سے بڑے بڑے بنک بھی ٹوٹ جاتے ہیں اور اسی میں سرمایہ داری کی ہلاکت ہے۔ اس کی روک تھام کے لیے سرمایہ دار بعض نہایت انسانیت سوز افعال کے مرتکب ہوتے ہیں' وہ پیدا شدہ مال کو منڈیوں سے روک لیتے ہیں اور مصنوعی ذرائع سے رسد کو کم کر دیتے ہیں تاکہ بھاؤ چڑھ جائے اور اگر مال کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو اس کو خود ضائع کر دیتے ہیں۔ برازیل میں لاکھوں ٹن کافی (Coffee) دریائے ایمزان میں غرق کی جاتی رہی ہے اور اسی طرح مسسپی میں کروڑوں ٹن دودھ دریا بُرد ہوتا رہا تاکہ اس کی قیمت کے گرنے سے سرمایہ داروں کے سرمایہ میں کوئی معتدبہ کمی نہ آ جائے۔ اسی طرح اور علاقوں میں جہاں سرمایہ داری کو غلبہ حاصل ہوتا ہے وہاں اناج اور دیگر ضروریات زندگی کی اشیاء کو جلا دیا گیا تاکہ سرمایہ داروں کے خزانوں میں کمی واقع نہ ہو۔ ہلاکت آفرینی کا عمل اسی پر ختم نہیں ہوتا بلکہ کارخانوں سے مزدوروں کو نکال دیا جاتا ہے اور جن کو رکھا جاتا ہے ان کو قوت لایموت سے بھی کم لینے پر مجبور کر لیا جاتا ہے۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ ''سرمایہ داری'' کے ارتقاء سے سرمایہ دار اور مزدور دونوں تباہی کی طرف جا رہے ہوتے ہیں۔ جب حالات اور خراب ہوتے ہیں تو سرمایہ دار آپس میں اتحاد کر لیتے ہیں اور ان کے اس اتحاد سے اجارہ داری (Monopol) معرضِ وجود میں آتی ہے۔ اس سے مقابلہ کا دائرہ بہت محدود ہو جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک ہی چیز تیار کرنے والے کارخانہ دار مل جاتے ہیں' لیکن چونکہ یہ اتحاد عالمگیر چھوڑ ملک گیر بھی نہیں ہوتا' اس واسطے جب ایک ہی ملک میں کئی ''اجارے'' پیدا ہو جاتے ہیں تو پھر ان میں ٹھن جاتی ہے۔ اب میدانِ مقابلہ میں حریفوں کی تعداد تو یقیناً تھوڑی ہوتی ہے مگر ان کا مقابلہ بہت شدید ہوتا ہے اور اس کے مہلک اثرات کی گیرائی بھی پہلے سے زیادہ ہوتی ہے۔ ان کی چپقلش سے لاکھوں انسان مفلس و قلاش ہو جاتے ہیں اور ملک میں معاشی ابتری پھیل جاتی ہے۔

امپیریلزم کا آغاز

جس طرح صنعت و حرفت میں ہوس زر کی وجہ سے باہمی تصادم ہوتا ہے اسی طرح بنک (Banks) بھی آپس میں برسرپیکار ہوتے ہیں۔ چھوٹے بنک ٹوٹ جاتے ہیں اور سرمایہ کی فراہمی کا کام سمٹ کر چند بنکوں کے پاس آ جاتا ہے۔ ان بنکوں کے مالک بھی سرمایہ دار ہی ہوتے ہیں۔ کچھ عرصے کے بعد یہ بنک بھی ایک دوسرے میں مدغم ہو جاتے ہیں تاکہ مقابلے کی شدت کم ہو اور ہلاکت سے بچنے کی صورت نکل آئے چونکہ تمام سرمایہ کا منبع بنک ہوتے ہیں اس واسطے عمل ادغام کے بعد جو بنک قائم رہتے ہیں وہ ملک کے اقتصاد پر مستولی ہو جاتے ہیں۔ کارخانے' منڈیاں اور مواد خام کے ذخائر سب ان کی گرفت میں ہوتے ہیں۔ وہ جس رنگ میں چاہتے ہیں معاشی مشینری کو چلاتے ہیں۔ ملک کی حکومت بھی ان کے سامنے سرنگوں ہو جاتی ہے۔ اگرچہ حکومت پر جمہوریت کا سنہری نقاب چڑھا ہوا ہوتا ہے مگر اس کے پیچھے یہی چند سرمایہ دار ہوتے ہیں جو ملک پر حکومت کر رہے ہوتے ہیں۔ مجالس آئین ساز کے نمائندے ان کے آوردہ اور پروردہ ہوتے ہیں اور تمام ملک میں قانون کی مشینری ان کے ارادے کے مطابق چلتی ہے۔ نظام سرمایہ داری ترقی کرتا کرتا اس سٹیج پر پہنچتا ہے۔ جس کو شہنشاہیت (Imperialism) کہتے ہیں۔ یہاں سے مزدور اور سرمایہ دار کی آخری جنگ شروع ہو جاتی ہے۔

امپیریلزم کے دور کے آغاز کے ساتھ ہی عمل استحصال کا دائرہ اتنا وسیع ہو جاتا ہے کہ تمام دنیا اس کی زد میں آ جاتی ہے اور سرمایہ دار دور دراز ممالک میں اپنی تجارتی آماجگاہ بنا لیتا ہے۔ وہاں سے مواد خام لاتا ہے اور اپنے کارخانے کی مصنوعات وہاں لے جا کر بیچتا ہے کیونکہ اس کا اپنا ملک اس کی ہوس زر اور انتفاع کے لیے کافی نہیں ہوتا۔ وہ اپنی حرص کی پیاس بجھانے کے لیے دوسرے غریب ممالک کا قصد کرتا ہے اور ان ممالک کو ترقی دینے کا درس دیتا ہے چنانچہ وہاں ریلیں اور سڑکیں بنائی جاتی ہیں۔ مدارس کا اجراء ہوتا ہے۔ جنگل کاٹ کر کھیتی باڑی کا کام شروع ہو جاتا ہے۔ زمین کے مدفون خزائن و دفائن کو باہر لایا جاتا ہے اور ان کی بدولت کارخانے قائم ہو جاتے ہیں۔ قلیل مدت میں صنعتی تہذیب کے تمام پہلو رونما ہو جاتے ہیں۔ یہ مفلوک الحال ملک کالونی (Colony) کہلاتا ہے۔ اس کے محکوم باشندے مجبور ہوتے ہیں کہ اپنے آباد کرنے والوں کو اپنا آقا سمجھیں اور اس کے تابع فرمان رہیں۔

سرمایہ داروں کی رقابت اور جنگ کا آغاز

اس طرح نو آبادیات کی طرح پڑتی ہے۔ ایک سرمایہ دار ملک کی استعماری سرگرمیاں دوسرے ملک کے سرمایہ داروں کو اس عمل کی طرف متوجہ کرتی ہیں اور یہ لوگ بھی غیر آباد اور پسماندہ

ممالک کی تلاش میں گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں اور وہ بھی دنیا کا کوئی نہ کوئی گوشہ ہتھیا کر اس کے مالک بن جاتے ہیں اور اپنے ملک کی دولت میں دن دونی رات چوگنی ترقی کرتے چلے جاتے ہیں۔ اسی طرح سرمایہ دار ممالک کا تمام روپیہ اکناف عالم میں پھیل جاتا ہے اور مجہول الحال ممالک ان کی سیم وزر کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ان کی غلامی میں زندگی بسر کرتے ہیں۔ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ تمام زمین کے حصے بخرے ہو جاتے ہیں۔ چونکہ سرمایہ داری کے آئین ھل من مزید اصول کارفرما ہے۔ اس لیے جو سرمایہ دار ممالک نو آبادیات سے محروم ہیں وہ دوسروں کی نو آبادیات چھیننے کے لیے کوشاں ہو جاتے ہیں اور اپنی عسکری قوت بڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ معاشی رقابت جنگ کا سبب بنتی ہے یہ جنگ ہی اس نظام کے لیے پیغام اجل ثابت ہوتی ہے۔ ادھر دولت مند طبقے میں روز افزوں دولت میں اضافہ کی وجہ سے قارونی اور شدادی صفت پیدا ہو جاتی ہے عیش وعشرت کی وجہ سے ملک کی اخلاقی حالت تباہ ہو جاتی ہے اور مزدور کی حالت دن بدن پتلی ہوتی جاتی ہے۔ اس سے ملک میں شدید طبقاتی جنگ کی داغ بیل پڑنا شروع ہو جاتی ہے۔

الغرض سرمایہ دار دو محاذوں پر مصروف پیکار ہوتا ہے۔ ایک وہ محاذ جس میں اس کا حریف مقابل خود اس کا ہم مشرب یعنی سرمایہ دار ہوتا ہے دوسرے محاذ پر اس کو مزدوروں کی منظم قوت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ یہ اس کی اپنی بداعتدالیاں ہی ہیں جو مزدوروں میں بیداری پیدا کر کے انھیں منظم کر دیتی ہیں اور مزدور اپنی زندگی کی بقا کے لیے اپنے ظالم آقا و مستاجر کے خلاف صف آراء ہو جاتا ہے۔

سرمایہ داری اور تمدن کا تصادم

ان ناگوار حالات کی روک تھام کے لیے سرمایہ دار بہت ہاتھ پاؤں مارتے ہیں' مگر ان کا ذہن وفکر اتنا ماؤف ہو جاتا ہے کہ ان کا ہر اقدام ایک نئے فتنے کا پیش خیمہ ہوتا ہے اور حق تو یہ ہے کہ ایک انسانیت سوز نظام سے تعمیری اور اصلاحی مساعی کی توقع کرنا فعل عبث ہے۔ چونکہ ایجاد و اختراع سے ملک کی دولت میں افزائش ہوتی ہے اور اس سے انجام کار منڈی کے بھاؤ میں مزید گراوٹ کا اندیشہ ہوتا ہے اس واسطے سرمایہ دار اجارہ دار (Monopolists) ایجادات کی روک تھام میں لگ جاتے ہیں۔ لینن نے اپنی کتاب میں ایک اسی قسم کا واقعہ ذکر کیا ہے' وہ لکھتا ہے کہ امریکہ میں کسی نے بوتل سازی کی مشین ایجاد کی' جس نے بوتلوں کی صنعت میں ایک انقلاب پیدا ہو گیا۔ ایک جرمن اجارہ دار نے اس ایجاد کی پٹینٹ (Patents) خرید لیے اور ان کو چھپا دیا' تاکہ یہ ایجاد صورت پذیر نہ ہو جائے۔ اسی طرح انگلستان میں کیمیکل فرم کے مشہور عالم مالک لارڈ ملچیٹ (Lord melchett) ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۳ء میں لیکچر اور اخبار کے ذریعے سے اس بات کا پروپیگنڈا کرتا رہا کہ ایجادات و اختراعات انسانی بہبود کے لیے زہر قاتل ہیں' اس واسطے ان کو قانوناً ممنوع قرار دیا جائے۔ اہل کلیسا جو

سرمایہ داروں کے وظیفہ خوار تھے اپنی نمک حلالی کا ثبوت دیتے رہے' وہ اپنے گرجاؤں اور معبدوں میں اجتماعی دعائیں کرتے رہے کہ اختراعی قوت انسان سے سلب ہو جائے۔ اسی طرح ماہرین معاشیات اور اخلاقی واعظین بھی اس بات کا پرچار کرتے رہے کہ ایجادات کا سیلاب تہذیب انسانی کو تباہ کر دے گا۔

قصہ مختصر سرمایہ دار ایک سٹیج پر جا کر تمدن کو فنا کرنا چاہتا ہے اور بربریت اور وحشت کو واپس لانا چاہتا ہے کیونکہ اس میں اس کو اپنا تحفظ نظر آتا ہے۔ مگر یہ تمام حیلے بہانے اس کو مکافات عمل کی گرفت سے نہیں بچا سکتے اور وہ کشاں کشاں ہلاکت کی وادی کی طرف بڑھتا چلا جاتا ہے اور دنیا اس کی تباہی و بربادی کو برای العین دیکھ لیتی ہے۔

سرمایہ داروں کی خودکشی کے واقعات

اقتصادی تاریخ میں ۱۹۳۲ء کا سال انتہائی کساد بازاری کا سال تھا' جب دنیا کے بڑے بڑے سرمایہ دار موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا ہو گئے اور سرمایہ داری کے تضادات (Contradictions) واشگاف ہو گئے اور سرمایہ دار ممالک یعنی امریکہ' انگلستان' جرمنی اور فرانس نے اپنے کارخانوں اور کانوں کی پیداوار کو بقدر نصف کم کر دیا تاکہ مصنوعات کی گرتی ہوئی قیمتیں کسی ایک نقطے پر رک جائیں۔ لیکن تباہی کا سیلاب اس طرح نہ رکنا تھا اور نہ رکا اور دنیا کے کاروبار اور تجارت میں ایک جانکسل جمود پیدا ہو گیا اور کئی کروڑ پتی سرمایہ دار مختلف ممالک میں دیوالیہ ہو گئے۔ ان میں سے بہتوں نے خودکشی کر لی۔ چند سرمایہ داروں کے نام قابل ذکر ہیں کیونکہ وہ اپنے اپنے میدانِ سرمایہ داری میں ارفع مقام تھے اور ان کے اس فعل سے نہ صرف اخباری دنیا میں سنسنی پھیل گئی بلکہ صنعت و حرفت اور تجارت پر ایک لرزہ طاری ہو گیا۔

کوڈک کیمرہ (Kodak camera) سے کون واقف نہیں۔ اس کے اشتہارات ہر ملک کے ہر شہر کے ہر کوچے میں دیکھے جاتے تھے مگر یہ فرم بھی ۱۹۳۲ء کی کساد بازاری کا شکار ہو گئی اور اس کا مالک ایسٹ مین (East man) ایسا متوحش ہوا کہ اس نے خودکشی میں اپنی نجات سمجھی۔

کروگر (Kreuger) کا نام محتاج تعارف نہیں۔ دنیا کے ہر حصے میں اس کے کارخانہ جات کی بنی ہوئی دیا سلائیاں استعمال ہوتی تھیں اور جہاں جہاں یہ دیا سلائی روشن ہوئی اس کا نام بھی روشن ہو گیا۔ لیکن یہ فرم بھی معاشی سیلاب کے گرداب میں غرق ہو گئی اور اس کے مالک کروگر (Kreuger) نے انتہائی بے چارگی کی حالت میں اپنے آپ کو گولی کا نشانہ بنا لیا۔

اسی طرح شکاگو میں سوِفٹ (Swift) نامی ایک سرمایہ دار تھا۔ یہ گوشت کی تجارت کرتا تھا اور اس کی تجارتی مہمات تمام مہذب دنیا پر چھائی ہوئی تھیں۔ ارجنٹائن اور آسٹریلیا میں اسکے ڈپو (Depot) قائم تھے اور اس میدان میں اس کا کوئی ہمسر نہ تھا لیکن اس کی بعید از قیاس دولت بھی اس

کو المناک انجام سے محفوظ نہ رکھ سکی۔ عالمگیر کساد بازاری سے اس کے کاروبار کو شدید صدمہ پہنچا۔ معاشی بدحالی سے نجات نہ پا سکنے کی صورت میں اپنے فلک بوس منجل (Skyscraper) سے چھلانگ لگا دی۔

نظام معاشیات

یہ حادثات انفرادی نہ تھے بلکہ ایک عالمگیر معاشی بدحالی کی خوفناک علامات تھیں جس نے نظام معاشی کو اندر ہی اندر کھوکھلا کر دیا تھا۔ اِدھر سرمایہ داروں کی بساط اُلٹی جا رہی تھی اُدھر مزدور اور دہقان بھی اس معاشی بدحالی کا شکار ہو رہے تھے۔ سرمایہ دار ممالک میں بے روزگاری حیرت انگیز سرعت کے ساتھ بڑھ رہی تھی۔ امریکہ میں ۱۹۳۳ء کے وسط میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ نفوس بے کار تھے' جرمنی میں پچاسی لاکھ' جاپان اور انگلستان میں تینتیس لاکھ لوگ بے روزگاری کا شکار تھے۔ بعض ماہرین معاشیات کا اندازہ ہے کہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۳ء میں تمام دنیا میں بیس کروڑ انسان بے کار تھے۔ یہ اعداد و شمار سرمایہ داری کے اضمحلال اور ضعف کی واضح تشریح ہیں چونکہ اس نظام کی مضرت اس کی منفعت سے بڑھ گئی تھی اور خدائی قانون کے ماتحت اس کا مٹنا مقدر ہو چکا تھا اور اس کا علاج انسانی طاقت سے باہر تھی۔ سرمایہ داروں کے پرانے حربے اب بیکار تھے۔ نہ وہ خود سنبھل سکتے تھے اور نہ مزدور کے آتش انتقام کو سرد کر سکتے تھے۔ بقول لینن سرمایہ داروں نے اپنے سلب و نہب سے اپنے گورکن (Grave diggers) خود پیدا کر لیے۔ اب جو تصادم دنیا میں برپا ہے یہ درحقیقت عمرانی تصورات کی جنگ ہے۔ صاحب بصیرت عالمگیر جنگ کی تباہیوں میں ایک نئے نظام کے آثار دیکھ رہے تھے جس میں معاشی استحصال ظلم اور جرم کے نام سے منسوب ہو گا اور انسان اپنی حلال کی کمائی سے سماج میں احترام کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔

کارل مارکس نے بھی سرمایہ داری کا بصیرت افروز تجزیہ کیا اور اس کی ہلاکت کی پیش بینی کی اور اس کا فقرہ Expropriators will be expropriated یعنی غاصب اپنے مقبوضات سے محروم کیے جائیں گے' علمی دنیا میں زبان زد خلائق ہے۔ ایچ۔ جی ویلز (H.G.Wells) کا قول ہے کہ "کارل مارکس نے عمرانی حالات کا خوب جائزہ لیا۔ مرض کی تخصیص بھی بے خطا کی۔ مگر جب نسخہ لکھنے کا وقت آیا تو بجائے کوئی دوائی تجویز کرنے کے جنتر منتر تجویز کر دیا۔"

انسانی عوارض کی تشخیص کے لیے انسانی عقل کافی ہے' لیکن ان کا علاج اس کے بس کا روگ نہیں۔ اس واسطے کارل مارکس کا مجوزہ نسخہ شفا ردِ عمل سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتا۔ اس لیے اس میں تمام وہ خامیاں اور نقائص موجود ہیں جو اس ماؤف معاشرے میں تھیں۔ جس نے مارکس کے ذہن و فکر کو متاثر کیا۔ سرمایہ داری کے دور میں جذبۂ معاونت سرد پڑ گیا تھا۔ مذہب اس کو زندہ کرنے کے لیے ایسی

تعلیمات پیش کرتا ہے جن پر عمل پیرا ہو کر انسان اخلاق فاضلہ کے اعلیٰ مقام پر جا پہنچتا ہے۔ وہ از خود ہراس عمل سے پرہیز کرتا ہے جس سے دوسرے انسان کے حق آسائش زندگی پر تجاوز ہوتا ہو۔ وہ اپنی خوشحالی قوم وملت کی خوشحالی میں تلاش کرتا ہے۔ اس واسطے حکومت کو جبری تعاون کے لیے قوانین مدون نہیں کرنا پڑتے لیکن کمیونزم کا طریق بالکل مختلف ہے۔ اس کے نظریے کے ماتحت اخلاقی حس اندر سے بیدار نہیں کی جاتی' یعنی انسان کے دل کے اندر کوئی ایسا تغیر نہیں پیدا ہوتا کہ وہ خود اپنے مال و دولت کو انسانی بہبود کے لیے وقف کر دے اور جارحانہ اقدام سے نفرت کرے' بلکہ اخلاقی شعور کو قانون کے زور سے دل پر وارد کیا جاتا ہے۔ یعنی حکومت مجبور کرتی ہے کہ انسان اپنے وافر مال کو اس کے سپرد کر دے۔ چونکہ یہ عمل طوعی نہیں ہوتا اس واسطے اس میں اخلاقی برتری نہیں ہوتی۔ لوگ مجبوراً کارِ خیر کرتے ہیں۔ اس کے لیے حکومت کو گرفت کا وسیع سلسلہ قائم کرنا پڑتا ہے۔ کمیونزم کی ارفع منزل کبھی بھی نہیں آئی کہ انسان اتنے اچھے انسان بن جائیں کہ سٹیٹ بے ضرورت ہو کر ساقط ہو جائے۔ چونکہ کمیونزم کی یہ ارفع منزل عملاً کبھی بھی پائی نہیں جا سکتی اس لیے اشتراکی حکومت کو بدستور سخت گیر رہنا پڑتا ہے اس لیے سارا نظام فکری باعمل ہو جاتا ہے۔

اس کے سارے فلسفے کی جان اس کا وہ حصہ ہے جو طبقاتی جنگ سے متعلق ہے' اسی محور پر اس کے سارے دلائل و براہین چکر لگاتے ہیں۔

کمیونزم کے اجزائے ترکیبی

بقول ہیرلڈ لاسکی کمیونزم نصب العین بھی ہے اور طریقہ کار بھی۔ اس جملہ سے اس نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ایک مکمل نظام حیات ہے۔ سوشلزم اس کی ابتدائی صورت ہے۔ اگرچہ عام گفتگو میں یہ دونوں مترادف سمجھے جاتے ہیں لیکن علمی اور نظری لحاظ سے یہ فرق ہے کہ سوشلزم ترقی پذیر ہو کر کمیونزم میں متبدل ہو جاتی ہے۔ اس صورت میں ہی یہ ایک مکمل نظام فکر کہلا سکتا ہے۔

برٹرانڈرسل کا قول ہے کہ "کمیونزم نے مذہب کی نفی کر کے ایک اور لادین مذہب بنا لیا ہے۔ اس لیے اس کا "مذہب" تاریخی مادیت ہے۔ اس کی سیاست طبقاتی جنگ ہے۔ اس کی معاشیات قدر زائد کا نظریہ ہے۔"

تاریخی مادیت کا یہ مطلب ہے کہ ہر دور میں انسانی زندگی کا مرکز اور محور اس دور کا نظام پیداوار دولت ہے۔ جس طرح اہل مذہب کا دعویٰ ہے کہ مذہب انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں پر اثر انداز ہو کر ان کی تشکیل کرتا ہے' اسی طرح پیداوار دولت کا نظام کیمونزم کے نظریہ کے مطابق اپنے زمانے کے افکار کی تشکیل کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اس دور کا مذہب اور نظام اخلاق بھی اس نظام پیداوار دولت

کے تابع ہوتے ہیں۔ کیمونسٹوں کے نزدیک سرمایہ داری کے نظام میں دولت آفرینی کا تصور غیر محدود ہے اس لیے سرمایہ دار پر کوئی قدغن نہیں ہوتی۔ سرمایہ داری کے دور کا مذہب بھی غیر محدود ملکیت کے حق میں فتوے صادر کرتا ہے اور حق ملکیت کو مقید یا محدود کرنے کو الٰہی قوانین کی خلاف ورزی قرار دیتا ہے چاہے غیر محدود ملکیت سے دولت چند ہاتھوں میں مرتکز ہوتی چلی جائے اور سارا معاشرہ سرمایہ داروں کا معاشی غلام بن کر رہ جائے۔ چنانچہ یورپ میں عیسائیت نے امارت اور ثروت کو لعنت قرار دے کر غرباء کو افلاس سے مانوس کر دیا ہے اور اہل ثروت کو مال و دولت جمع کرنے کی کھلی چھٹی مل گئی۔ جب کبھی سرمایہ داروں کے سلب و نہب کے خلاف آواز اٹھی' اہل کلیساء نے اس کو خدائی قوانین کی نافرمانی قرار دے کر اس کو دبا دیا۔ حکومت بھی کلیساء کے فتاویٰ پر پابند ہو کر مزدوروں کو اپنے حق لینے سے روکتی رہی۔ ان پامال شدہ حقوق کی بحالی کے لیے کمیونزم نے مزدوروں کو کے لیے ابھارا۔ اس طرح کمیونزم کی سیاست یعنی طبقاتی جنگ نے جنم لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سرمایہ دار ممالک میں بھی مزدوروں کو ہڑتال کا حق عطا ہوا۔ اسی طرح ان کی مزدوریوں کی شرحیں متعین ہوئیں اور سرمایہ داروں کی تالہ بندی پر قدغن لگا دی گئی۔

طبقاتی جنگ کے جواز کے لیے قدر زائد کا نظریہ بروئے کار آیا۔ اس کا یہ مفہوم ہے کہ ایک مزدور جتنا کام کرتا ہے اس کام کی قیمت کا عشر عشیر اس کو ملتا ہے۔ مثلاً اگر وہ روزانہ چالیس پچاس روپے کا کام کرتا ہے تو اس کو روزانہ دو یا چار روپے ملتے ہیں' باقی رقم یعنی چھتیس یا چھیالیس روپے کارخانہ دار لے جاتا ہے۔ اس طرح کارخانہ دار سرمایہ دار بنتا چلا جاتا ہے اور اس کی دولت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی چلی جاتی ہے اور اسی رفتار سے مزدور کی ناداری میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ ایک وقت ایسا آ جاتا ہے جب سرمایہ دار اور مزدور کے درمیان ایسی وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے کہ سرمایہ دار اپنے آپ کو اعلیٰ انسان سمجھنے لگتا ہے اور مزدور ادنیٰ انسان متصور ہونے لگتا ہے۔ چونکہ استحصال کا ڈراما کارخانہ کے اندر ہر وقت موجود رہتا ہے اس لیے سرمایہ دار اور مزدور میں مغائرت ترقی کرتے کرتے عداوت تک پہنچ جاتی ہے اور اس طرح ٹکراؤ کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے چونکہ کارخانہ میں مزدور کی عددی قوت کہیں زیادہ ہوتی ہے اور کارخانہ دار عددی لحاظ سے بہت کمزور صورت میں ہوتا ہے۔ اس لیے مزدور کی عزت نفس بیدار ہو جاتی ہے۔ استحصال کا منظر بڑا اشتعال انگیز ہوتا ہے۔

یہ المناک کیفیت کچھ عرصہ رہتی ہے' حتی کہ نقطہ احتراق آ جاتا ہے۔ اس وقت کمیونزم کی سیاست یعنی طبقاتی جنگ کا آغاز ہو جاتا ہے۔

یہ طبقاتی جنگ سرمایہ داری کے خاتمہ اور کمیونزم کے آغاز پر منتج ہوتی ہے۔ اس کو کمیونزم کا معاشی انقلاب کہتے ہیں۔

کمیونزم اور اسلام کا موازنہ

کمیونزم	اسلام
ا۔ کمیونزم کا موضوع صرف مادہ ہے اور اسی پر اس نظریہ کی بنیاد ہے	ا۔ اسلام کا بنیادی موضوع توحید باری تعالیٰ ہے۔ اس کی تمام تعلیمات اسی موضوع کے اردگرد گھومتی ہیں۔
۲۔ انسان صرف ایک طبعی جسم ہے، موت کے بعد فنا ہو جائے گا۔	۲۔ انسان صرف طبعی جسم سے عبارت نہیں بلکہ وہ جسم اور روح سے مرکب ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے جسم کی پرورش کے لیے ہر قسم کا سامان پیدا کیا ہے اسی طرح روح کی تربیت کے لیے انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے وحی کا مصفا پانی نازل کیا۔ انسان جو اعمال بجالاتا ہے۔ اس کی جزا و سزا قیامت کے دن ملے گی۔
۳۔ انسان کا مسئلہ صرف روٹی ہے۔	۳۔ انسان کا مسئلہ صرف روٹی نہیں ہے۔ یہ مادی مسائل میں سے ایک اہم مسئلہ ہے جس کو اسلام نہایت ہی اعلیٰ رنگ میں حل کرتا ہے۔ جس کی مثال دوسرے انسانی نظریات میں نہیں پائی جاتی۔ اگر انسان کا مطمح حیات صرف روٹی ہو تو حیوان اور انسان میں کیا فرق رہتا ہے۔ حیوان بھی چند دن کھا پی کر مر جاتا ہے۔ اسلام انسان کی زندگی کا مقصد عبودیت الٰہی قرار دیتا ہے اور روٹی اس مقصد کے حاصل کرنے کا ایک وسیلہ ہے۔ عبودیت الٰہی سے یہ مراد نہیں ہے کہ انسان پانچ دفعہ مسجد میں حاضر ہو کر نماز ادا کرے بلکہ عبودیت الٰہی سے مراد یہ ہے کہ انسان کی زندگی کا ہر لمحہ اللہ تعالیٰ کی تعلیم کے مطابق بسر ہو۔

۔ دنیا مجموعہ اضداد ہے کہ ہر چیز دوسری چیز کی ضد ہے اور اضداد کی جنگ سے ایک نئی چیز پیدا ہوتی ہے جیسے سرمایہ اور محنت کی باہمی جنگ سے اشتراکیت پیدا ہوئی ہے۔

۴۔ دنیا مجموعہ اضداد ہے لیکن مارکسزم کی تشریح کے مطابق نہیں۔ اسلام نے اضداد کو حق اور باطل یا نور اور ظلمت کے ناموں سے تعبیر کیا ہے۔ یہ دونوں طاقتیں باہم جنگ آزما رہتی ہیں۔ ہر طاقت دوسری طاقت کو مغلوب کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اسلام کے نزدیک انجام کار حق کی فتح ہوتی ہے اور باطل مغلوب ہوتا ہے۔

۵۔ کمیونزم دنیا کو دو طبقوں میں تقسیم کرتی ہے۔ ایک طبقہ کو تہس نہس کرتی ہے اور دوسرے طبقہ کو حکمرانی کا تاج پہناتی ہے۔

۵۔ اسلام طبقاتی تقسیم کو بنظر حقارت دیکھتا ہے اور وحدت نسل انسانی کا پیغام دیتا ہے۔

۶۔ کمیونزم ذاتی ملکیت کو موجب فساد قرار دیتا ہے۔

۶۔ اسلام ذاتی ملکیت کو قیود اور شرائط کے ساتھ جائز قرار دیتا ہے اور اس جائز اور حلال دولت کو اسلام فضل الٰہی اور حسنہ قرار دیتا ہے۔

۷۔ انسان اس طاقت کے سامنے بے بس ہے جو جنگ اضداد کے پیچھے کام کر رہی ہے جس کا نام اشتراکی تاریخی وجوب رکھتے ہیں۔

۷۔ انسان اس دنیا پر حکمران ہے۔ تمام چیزیں اس کے تابع ہیں۔

سوشلزم

سوشلزم کیا ہے؟

گزشتہ تاریخی تبصرے کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ سوشلزم کی تعریف کیا ہے؟ اس کی جامع اور مانع تعریف کے متعلق بہت معرکہ آرائیاں ہوئی ہیں۔اس کے مخالفوں کا تو کیا ذکر' اس کے حامی ایک تعریف پر متفق نہیں ہو سکے۔ یہی وجہ ہے کہ سوشلسٹوں کی باہمی نزاع سے ان میں کئی ایک جماعتیں پیدا ہو گئیں اور اس تحریک کو شدید نقصان پہنچا اور کسی ایک ملک یا خطہ زمین میں بھی یہ بار آور نہ ہو سکی۔ کسی نے اس کو صرف فلسفہ سمجھا اور اس کے عمرانی پہلوؤں کو نظرانداز کر دیا۔ کسی نے اس کو محض معاشی نظریہ خیال کیا اور اس کے لیے موزوں سیاسی نظام سے اغماض برتا اور یہ پنپ نہ سکی اور ایک ایسی جماعت پیدا ہوئی جس نے اس کو فقط سیاسی انقلاب تک ہی محدود رکھا۔ غرض جتنے منہ اتنی باتیں۔ ان لفظی نزاعوں نے بعض اوقات خونین تصادم کی صورت اختیار کر لی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو نظریہ انسانی حیات کے گوناگوں پہلوؤں پر محیط ہونے کا مدعی ہو اس کی ماہیت کو چند الفاظ یا چند فقرات میں محدود نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک عمرانی تصور ہے۔ اس کے دو پہلو ہیں: ایک سلبی اور ایک ایجابی۔ سلبی سے مراد اس کی پیشرو نظام کے خلاف بغاوت ہے اور ایجابی سے مراد نئے معاشی نظام کی تاسیس ہے۔ ابتداء میں سلبی پہلو بہت نمایاں ہوتا ہے اور دوست دشمن دونوں کی نظریں اس پر گڑی ہوتی ہیں۔ انسانی فطرت کچھ ایسی واقع ہوئی ہے کہ تعمیر سے زیادہ تخریب سے متاثر ہوتی ہے۔ سوشلزم کے مخالفوں نے اس کے سلبی رخ کو بگاڑ کر اور فساد کے رنگ میں پیش کر کے سماج میں اس کے خلاف ایک رو چلائی۔ اس رو کا سدباب کرنے کے لیے حامیان سوشلزم نے لامحالہ اسی پہلو پر اور زور دیا اور قدیم نظام پر شدید نکتہ چینی کی' اس کی خامیوں کو بے نقاب کیا اور اس کے زوال کو سماج کی نجات قرار دیا۔ اس طرح اس کے خلاف آتش انقلاب کو مشتعل کیا۔ بالفاظ دیگر سوشلزم کے منفی پہلو کو اجاگر کیا۔ اس کشمکش میں ایجابی اور مثبت پہلو نظروں سے اوجھل رہا۔ سوشلسٹوں میں اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ وہ سلبی پروگرام پر متفق نہ ہو سکے۔ بعض اپنی مخالفت کو اخلاقی احتجاج تک محدود رکھنا چاہتے تھے۔ وہ سماج کے مصائب و آلام سے یقیناً متاثر تھے اور سرمایہ دار طبقے کی چیرہ دستیوں سے ایک ٹیس محسوس کرتے تھے۔ مگر یہ کافی سمجھتے تھے کہ غالب طبقے سے انسانیت اور اخلاق کے نام پر اپیل کی جائے کہ وہ اپنے جور و تعدی سے

باز آئے۔ ایک دوسرا طبقہ بھی تھا جو اس طرز عمل کو ناکافی خیال کرتا تھا۔ وہ اس بات کے حق میں تھا کہ اپنی صدائے احتجاج کو عملی جامہ پہنایا جائے۔ اگرچہ یہ لوگ بھی کھلی بغاوت سے محترز تھے مگر وہ چاہتے تھے کہ آئینی تحریک سے معاشی خرابیوں کی اصلاح کی جائے۔ حکومت کی قانون ساز مشین پر اثر ڈال کر ایسے قوانین وضع کیے جائیں جن سے سرمایہ داروں کی قوت زوال پذیر ہو کر بالکل مٹ جائے۔

باوجود اس اختلاف کے یہ تمام اشتراکی معتدل مزاج تھے کیونکہ یہ سیاسی بغاوت اور فوری انقلاب کو نامناسب سمجھتے تھے لیکن ایسے لوگ ۱۸۴۸ء تک پورے زور سے اپنے اپنے رنگ میں سرگرم عمل رہے اور تالیف وتصنیف سے اپنے خیالات ونظریات کی تبلیغ کرتے رہے لیکن اس کے بعد کارل مارکس اور انگلز منصۂ شہود پر آئے۔ انھوں نے اپنے مشہور عالم "اشتراکی منشور" سے سماج میں انقلابی اور باغیانہ جذبات پیدا کر دیے' یعنی اپنی نوزائیدہ تحریک کے جو کمیونزم کے نام سے معروف ہے سلبی پہلو کو بغاوت کی صورت دے دیں اور اس پر زور دیا کہ محض اپیل اور التجاء سے متمول طبقہ اپنے غلبے اور تفوق سے دستبردار نہیں ہوگا کیونکہ یہ انسانی فطرت کے خلاف ہے کہ خود بخود محض اخلاقی پند و نصائح سے دولت اور ثروت کو خیر باد کہہ دے اور زبردست طبقہ کو مساوات کی سطح پر لے آئے۔ یہ تحریک اپنی آغوش میں سیاست اور تمدن کے لیے ہزاروں فتنے لیے ہوئے تھی۔ امتیاز کے طور پر اس کو کمیونزم یا مارکسی اشتراکیت کہتے ہیں' لیکن ان دنوں اس کو بالشویزم کے نام سے بھی پکارا جاتا ہے۔ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ نام زیادہ مروج ہے۔ کمیونزم کی اصطلاح (اشتمالیت) لغوی لحاظ سے بھی تحریک کے مقاصد اور اغراض کی آئینہ دار ہے مگر بالشویزم کو ایسی کوئی مناسبت حاصل نہیں' یہ نام محض ایک پارٹی کے نام کی وجہ سے مشہور ہو گیا ہے۔

انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز میں لینن نے مارکس کے نظریے کو عملی جامہ پہنانے کی انقلابی کوشش کی۔ اس طرح روس میں ایک پارٹی پیدا ہو گئی تھی جو زار کے انسانیت سوز نظام کو مٹا کر اشتراکی نظام قائم کرنا چاہتی تھی۔ اس پارٹی کا نام ڈیموکریٹک (Democratic) پارٹی تھا۔ اس کے سالانہ اجلاس کبھی لندن' کبھی پیرس اور کبھی برلن میں ہوتے تھے لیکن ۱۹۰۳ء میں برسلز میں سالانہ اجلاس ہوا۔ اس میں طریق کار پر سخت اختلاف ہوا اور پارٹی کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ ایک وہ جو انقلاب اور خون ریزی کو برا خیال کرتے تھے۔ یہ لوگ تعداد میں کم تھے۔ یہ منشویک (Menshevik) کہلانے لگے۔ منشویک روسی لفظ ہے جس کے معنی اقلیت کے ہیں۔ دوسری پارٹی جو انقلاب اور خون ریزی کے حق میں تھی' وہ بالشویک (Bolshevik) کے نام سے موسوم ہو گئی۔ یہ لوگ تعداد میں زیادہ تھے۔ بالشویک کے لفظی معنی اکثریت کے ہیں اور ان کا لیڈر لینن تھا اور چونکہ بالشویک پارٹی کے لائحہ عمل کو مارکس کے نظریہ سے کامل اتفاق تھا اور چونکہ لینن نے ہی ۲۴ اکتوبر ۱۹۱۸ء کو روس

میں مستقل انقلاب برپا کیا اور منشویکوں کے لیڈر کرنسکی کو بھاگنا پڑا۔ اس واسطے لینن اور اس کے رفقاء کار کارل مارکس اور انگلز کے جانشین سمجھے جاتے ہیں اور ان کی پارٹی کے نام سے کمیونزم (اشتمالیت) بالشویزم بھی کہلانے لگ گئی ہے۔

اگرچہ سوشلزم (اشتراکیت) کو کمیونزم اور بالشویزم کے معنوں میں بھی استعمال کیا جاتا ہے اور ان کے معنوی اختلاف کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ مگر فکری اور عملی لحاظ سے ان دونوں میں بہت فرق ہے' اس کو میں آگے چل کر واضح کروں گا۔ مگر اس موقع پر اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ تاریخ عمرانیات میں کارل مارکس سے پہلے سوشلزم (اشتراکیت) کا دور تھا جبکہ سرمایہ داری کے خلاف جذباتِ نفرت پیدا ہو چکے تھے۔ اس کے علمبرداروں کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ انھوں نے اپنے رنگ میں کارل مارکس اور انگلز کے لیے زمین تیار کی۔ ان کی تحریک سے قلب و دماغ بہت متاثر ہوئے اور جب کارل مارکس سٹیج پر آیا' وہ تخم ریزی کا وقت تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ۱۸۴۸ء میں اس کی آواز کا اٹھنا تھا کہ چار سو آگ لگ گئی۔ اس سے پہلے کمیونزم کا پھلنا پھولنا ناممکنات میں سے تھا کیونکہ جب تحریک سوشلزم کا آغاز ہوا اس وقت سرمایہ داری کا نظام پورے عروج پر نہیں پہنچا تھا۔ نئی میکانکی ایجادیں ابھی ہو رہی تھیں اور کارخانے قائم ہو رہے تھے اور مزدور جماعت کی شکل اختیار کر رہے تھے لیکن سرمایہ داری نے اپنے پر پرزے نہیں نکالے تھے اور مزدوروں میں بھی پورا شعور پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس واسطے ان حالات میں انقلابی خیالات کے پرچار کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی اور نہ کوئی ایسی ہنگامہ خیز تحریک کامیاب ہو سکتی تھی۔

سوشلزم کی پانچ خصوصیات

سوشلزم (اشتراکیت) کوئی فلسفیانہ تصور حیات نہیں اور نہ کوئی مستقل نظام فکر ہے۔ اس کے حامی سماج کی خاص رنگ میں تعمیر و تشکیل چاہتے تھے' مگر ان کا لائحہ عمل بہت غیر موثر تھا کیونکہ ولولہ انگیز نہ تھا۔ اس میں واعظانہ رنگ تھا اور عوام جو کسی ہمہ گیر تجربہ کار کی ریڑھ کی ہڈی ہوتے ہیں۔ پہلے ہی کلیسا کے پند و نصائح سے خوب سیر ہو چکے تھے کیونکہ ارباب کلیسا' خود معاشی استحصالی اور امراء کے سلب و نہب کے موید تھے اور اپنے اثر و رسوخ کو محض اس بات میں صرف کرتے تھے کہ ستم رسیدہ لوگ اپنے افلاس سے مانوس رہیں اور اپنی فاقہ مستیوں میں روحانی انبساط محسوس کریں۔ ان حالات میں معاشی مصلحین کا وجود کچھ زیادہ امید افزاء ثابت نہ ہوا تاہم ان کی اشتراکی تحریک کی بعض خصوصیات ہیں جو کارل مارکس کی انقلابی اشتراکیت سے پہلے اس کی طغرائے امتیاز تھیں۔

پہلی خصوصیت

اس کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ملی مفاد کو انفرادی مفاد پر فائق سمجھتی ہے۔ اشتراکی قائدین

اس بات کا پرچار کرتے تھے کہ خودغرضی سماج کے مفاد کو نقصان پہنچاتی ہے اور ملی وحدت کو رقابت میں بدل دیتی ہے کیونکہ فرد اسی صورت میں سماج کا مفید رکن ہو سکتا ہے جب اس کے اعمال سماجی ترقی کے خلاف اثر انداز نہ ہو رہے ہوں اور اس کی ترقی سے سماج میں انحطاط اور تنزل واقع نہ ہو رہا ہو چونکہ سرمایہ دارانہ نظام ملی یگانگت پیدا کرنے کی بجائے سماج کو دو مخالف گروہوں میں تقسیم کر دیتا ہے' اور ان میں بالادست طبقہ اسی میں اپنا دوام اور قیام سمجھتا ہے کہ دوسرا طبقہ اس کا دست نگر رہے۔ اس لیے ایسا نظام سماج کے لیے سراسر خطرناک ہے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ حکومت معاشی وسائل پر قابض ہو جائے اور سماج کے افراد میں توازن قائم رکھے۔ افلاطون کو سوشلسٹ کہا جاتا ہے حالانکہ اس کی فکر غیر اقتصادی تھی اور اس کے معاشی فلسفے کا اساسی اصول یہ تھا کہ حکومت کو کلی اختیارات حاصل ہوں اور افراد ایک خاص ضابطے کے ماتحت رہیں اور ایک دوسرے سے مزاحم نہ ہوں بلکہ اخوت و مودت' شفقت اور امداد باہمی کے رشتے میں منسلک رہیں۔ سیاسی نقطہ نگاہ سے اشتراکیت کا یہ اصول ریاستی غلبے کا اصول ہے۔ اس کی تخلیق افلاطون نے کی۔ روسو نے اس کا احیاء کیا اور فشتے اور ہیگل نے اس کو فلسفے کے پیرہن میں دنیا کے سامنے پیش کیا اور جرمنی میں ٹرٹشک اور برن ہارڈی نے اس کو سیاسیاتِ عالم میں نافذ کیا۔ لیکن نظری اور عملی لحاظ سے اس اصول میں بہت سقم ہیں۔ حکومت جب تمام شعبہ ہائے حیات پر مسلط ہو جائے تو فرد محض ایک کل پرزہ ہو کر رہ جاتا ہے' اس کی ذہنی اور دماغی ترقی رُک جاتی ہے اور گفتار و کردار کی آزادی بالکل مٹ جاتی ہے۔ اس کے علاوہ "ملی حکومت" محض تصور ہی تصور رہ جاتا ہے اور عملاً ایک خاص جماعت اشتراکی لباس میں تمام سماج پر حاوی ہو جاتی ہے اور دوسری جماعتوں کو ضعیف کرتی چلی جاتی ہے اور اگر ان جماعتوں میں بیداری پیدا ہو جائے تو پھر پیکار اور کشمکش کی صورت پیدا ہو جاتی ہے' جس کا انسداد سوشلزم کا مقصد وحید ہے۔ اس سے صاف عیاں ہے کہ سوشلزم خود اپنے عمل سے "ملی وحدت" کو انتشار اور تصادم میں بدل دیتی ہے۔

دوسری خصوصیت

سوشلزم کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ یہ سماج میں معاشی مساوات پیدا کرنے کی تحریک ہے۔ یہ اس کا اخلاقی پہلو ہے اور مفلوک الحال لوگوں کے لیے بہت جاذب توجہ ہے اور خود تحریک کی بنیاد ہے۔ سرمایہ داری میں انفرادیت ہوتی ہے اور ہر فرد اپنے اعمال و افکار میں آزاد ہوتا ہے اور سماج میں ایک قسم کی روح مسابقت کارفرما ہوتی ہے۔ اسی بناء پر ایک خاص طبقہ معاشی دوڑ میں آگے نکل جاتا ہے اور دوسرا طبقہ پیچھے رہ جاتا ہے۔ لیکن سوشلزم کے علمبردار چاہتے ہیں کہ یہ کیفیت پیدا نہ ہو۔ یعنی تمام افراد کے لیے وسائل زندگی مساوی ہوں۔ افراط و تفریط نہ رہے اور اُجرتی غلامی مٹ جائے۔ بندہ و آقا اور آجر اور مستاجر کی انسانیت سوز حربوں کا خاتمہ کر دیا جائے کیونکہ جب تک یہ حالت پیدا نہ

ہو سوسائٹی کے حالات خوشگوار نہیں ہو سکتے اور تنافر اور تفاخر کی حالت قائم رہتی ہے اور جن ممالک میں انفرادیت زوروں پر ہے وہاں سوسائٹی کی اقتصادی حالت میں شدید تفاوت نظر آتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ کچھ کچھ وقفوں کے بعد کارخانہ داروں اور مزدوروں کے تصادم سے سوسائٹی کا امن برباد ہوتا رہتا ہے۔ جس سے سیاست اور اقتصاد کو بھی صدمہ پہنچتا ہے اور بعض اوقات یہ جنگ اتنا طول کھینچتی ہے کہ تمام کاروبارِ زندگی جامد اور ساکن ہو جاتے ہیں۔ انگلستان میں ۱۹۲۶ء میں مزدوروں نے عمومی ہڑتال (General strike) کر دی اور تمام ملک کی معیشت نزع کی حالت میں مبتلا ہو گئی اور حکومت نے سینکڑوں جتن کیے اور اس امن شکن اور لرزہ خیز ہڑتال کا خاتمہ کیا۔ جہاں اور جس جگہ دولت کی تقسیم غیر منصفانہ ہو وہاں نہ صرف معاشی عسرت اور تنگ دستی کا عالم ہو گا بلکہ سیاست اور حکومت بھی اخلاقی رواداری سے عاری ہو گی اور قانون بھی حرکت میں آئے گا تاکہ اقتصادی ناہمواری کے عواقب کو جبراً دبا دیا جائے اور اربابِ ثروت و اختیار کے دبدبے اور تفوق کو قائم رکھا جائے۔ جب قانونی گرفت مضبوط ہو جائے گی ملک کی ذہنی اور علمی ترقی رک جائے گی اور ملک کا مقتدر طبقہ تعلیم کو بھی ایسے سانچوں میں ڈھال لے گا جس سے مرعوب ذہنیت کے لوگ پیدا ہوں اور سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف اپنے جی میں کوئی دکھ محسوس نہ کرتے ہوں۔ جب علمی انحطاط کا یہ عالم ہو تو مذہبی ادارے بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اگر مذہبی رہنما سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف آواز اٹھائیں تو بھی قانون کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں اور اگر وہ ایسا نہیں کرتے اور غالب طبقے کے ہمنوا اور ثناء خوان ہو جاتے ہیں تو سماج کی حالت دگرگوں ہو جاتی ہے۔

الغرض بے رحم سرمایہ داری کے یہ "بدنتائج" ہیں۔ اشتراکی رہنما ان حالات کو بدلنا چاہتے ہیں۔ ان کا مقصد بے شک بہت بلند ہے اور اس سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ مگر ان کی تحریک کا نقطہ آغاز جذبہ نفرت ہے۔ وہ یہ نہیں کرتے کہ روساء اور شرفاء کی اصلاح کریں، ان کے نظریہ حیات کو بدلیں یا گرے ہوئے طبقہ کو اٹھائیں بلکہ وہ بڑھے ہوئے طبقہ کو گرانا چاہتے ہیں تاکہ املاک و جائیداد میں ہمواری پیدا ہو جائے۔ اس سے ملک میں فتنہ و فساد کی آگ لگ جاتی ہے۔ پہلے پہل ہڑتالیں ہوتی ہیں، پھر یہی طریقہ کار ترقی پذیر ہو کر بغاوت کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ دراصل اشتراکیت کا دامن منظم فکر و عمل سے خالی ہے۔ اس کے رہنما نہ تو اپنے پاس کوئی ایسا پروگرام رکھتے ہیں جس کی نشر و اشاعت سے بالادست طبقے کی اصلاح ہو اور وہ اپنی معاشی روش و مسلک کو بدلنے پر راضی ہو جائیں اور ایک صحت مند نظام پیدا ہو جائے اور نہ مزدور کو متمرد اور باغی بنانا ان کے نصب العین کا جزو ہے کیونکہ جن رہنمایانِ اشتراکیت یعنی سینٹ سائمن، فوریر اور رابرٹ اوون کا ذکر ہو چکا ہے وہ ہرگز اس بات کے حق میں نہ تھے کہ مزدور علم بغاوت بلند کریں اور کارخانوں کو میدانِ جنگ بنا دیں۔ ان کی

تجاویز اصلاح کا مقصد یہ تھا کہ بغیر کسی ہنگامہ آرائی کے مزدور کو حق آسائش مل جائے۔ مگر فکری اور عملی نقائص کی وجہ سے ان کا لائحہ عمل یعنی تحریک اشتراکیت پروان نہ چڑھ سکی۔ فکری اور نظری خامیوں کا پردہ اس طرح چاک ہوا کہ ان کو قبولیت نہ ہوئی اور ان کے معترضین نے ان کو پنپنے نہ دیا اور سب سے زیادہ مہلک نقص یہ تھا کہ اشتراکیت کا پروگرام یا تو سرے سے مفقود تھا' یا اتنا ادھورا اور غیر جاذب تھا کہ مزدوروں کی جماعت بندی نہ کر سکا۔ ان کو یہ کہہ دیا کہ تم کو سرفراز و سربلند کیا جائے گا اور کارخانہ داروں کو جاہ و حشمت سے دست بردار ہونا پڑے گا۔ لیکن یہ بتانے سے قاصر رہے کہ یہ عمل میں کس طرح آئے گا۔ یہی وجہ ہے کہ مساوات کی لفظی تبلیغ سے جو شعور اور بیداری پیدا ہوئی اس سے کارل مارکس اور انگلز نے فائدہ اٹھایا اور اشتراکیت کو ایک انقلابی تحریک بنا دیا۔ لوگ پہلے سے سرمایہ داروں سے کبیدہ خاطر ہو چکے تھے اور اشتراکیت کے مکتبوں میں درس مساوات بھی حاصل کر چکے تھے۔ لیکن اب عملی انقلاب دیکھنا چاہتے تھے اور جب انقلاب کی آواز اٹھی تو اس انقلابی آواز کے پیچھے ہو گئے۔

تیسری خصوصیت

سوشلزم کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اپنے پیشرو سرمایہ داری نظام کو منسوخ کرنا چاہتی ہے کیونکہ ان دونوں کا منشور ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ سرمایہ داری کو مٹانا اس تحریک کا معاشی پہلو ہے اور میرے خیال میں یہ بہت اہم پہلو ہے۔ کیونکہ جب تک کیپٹلزم قائم ہے اور اس کے اصول کارفرما ہیں سوشلزم کی کوئی صورت بھی وجود میں نہیں آ سکتی۔ سوشلزم اس نعرہ جنگ سے شروع ہوتی ہے کہ "سرمایہ ایک سماجی ڈاکہ زنی ہے اور سرمایہ دار ڈاکو اور قزاق ہے' جس نے اپنی ڈاکہ زنی لوٹ کھسوٹ اور تمام وسائل پیداوار پر قبضہ جما کر سماج کے کثیر حصے بے بس اور ناتواں کر دیا اور اپنے قارونی خزانے بھر لیے ہیں اور اپنی قزاقی کو قانون و سیاست کی مدد سے جائز قرار دے لیا ہے اور اس کا آغاز اس خیال سے ہوتا ہے کہ نجی ملکیت اور حصول دولت میں ملک کا قانون مخل نہیں ہو سکتا' بلکہ اس کا فرض ہے کہ کسب معاش کی انفرادی کوششوں کا محافظ و نگران ہو اور جو قوت ان میں مزاحم ہو اس کو دست آہنی سے کچل دے۔ سرمایہ داروں کے نزدیک آزادانہ دولت کمانا اور ضرورت سے زیادہ کسب زر سے زر اندوزی کرنا ایک جائز اقتصادی فعل ہے' چاہے اس کے نتیجے میں سوسائٹی کا بیشتر حصہ افلاس کا شکار ہو جائے۔ وہ اس بات سے نہیں گھبراتے کہ مفلوک الحال لوگوں کی تعداد دن بدن بڑھ رہی ہے اور روز افزوں بے روزگاری سے ملک کا امن تباہ ہو رہا ہے اور ملک میں امراض اور وباؤں نے ڈیرا ڈال دیا ہے۔ ان کے بنائے ہوئے قانون میں کوئی دخل نہیں دے سکتا مگر جب مفلس اور بدحال طبقہ اپنی زندگی کو قائم رکھنے کے لیے نان و نفقہ کا مطالبہ کرے اور ظالمانہ روش کے خلاف احتجاج کرے تو سرمایہ داروں کا قانون اس احتجاج کی سرکوبی کے لیے حرکت میں آ جاتا ہے۔ سوشلزم کے علمبردار سرے سے اس بات کے

شدید مخالف ہیں کہ کسی کو نجی املاک پیدا کرنے کا حق حاصل ہو۔ وہ اس کو سماجی قزاقی کا نقطہ آغاز خیال کرتے ہیں اور اپنے پہلے حملے سے اس اصول کو مٹا دینا چاہتے ہیں' اور اس کی بجائے تمام وسائل حیات اوران کی پیداوار اور تبادلہ کو حکومت کے سپرد کرنا چاہتے ہیں۔ اس تحریک کی زد براہ راست سرمایہ داروں پر پڑتی ہے۔ ان سے جبراً ان کے املاک چھین لیے جاتے ہیں۔ ملک کی صنعت و حرفت اور تجارت کی مالک ملک کی حکومت ہوتی ہے۔ بنک' ڈاک خانے' ریلوے' تار گھر اور تمام وہ ادارے جن پر ملک کی معاشی اور سیاسی زندگی کا دار و مدار ہے حکومت کے قبضے میں دے دیے جاتے ہیں۔ اس کے بعد حکومت ہی سرمایہ کی واحد مالک ہوتی ہے اور ملک میں مالک اور مزدور کا کوئی امتیاز نہیں رہتا۔ ہر ایک فرد مجبور ہوتا ہے کہ وہ اپنی قوت اور استعداد کے مطابق کام کرے اور اپنے کام کا معاوضہ حکومت سے حاصل کرے۔ چونکہ کوئی کاروبار انفرادی صورت میں نہیں چلایا جا سکتا اور چونکہ معاوضہ فقط ضروریات زندگی کا کفیل ہوتا ہے اس واسطے نہ یہ خطرہ ہوسکتا ہے کہ کوئی فرد پس انداز کر سکے گا اور نہ یہ کھٹکا باقی رہتا ہے کہ کوئی شخص اپنا ذاتی کاروبار چلا سکے گا۔ ملک کے تمام باشندے حکومت کی وسیع مشین کے پرزے ہو جاتے ہیں اور اپنا اپنا مفوضہ کام سرانجام دیتے ہیں۔ تصادم و پیکار کی بجائے تعاون و تعامل ہوتا ہے۔

ایک ملک گیر اقتصادی منصوبہ الفاظ میں پیش کرنا تو آسان ہے مگر اس کو عملی جامہ پہنانا بہت مشکل ہے۔ اس راہ میں سوشلسٹ رہنماؤں نے بڑی کوشش کی ہے۔ مگر معاشی فلاح نظروں سے اوجھل ہے۔ اشتراکیت کا سرمایہ داروں کو بے دخل کرنا ہمیشہ محل نظر رہا ہے اور رہے گا۔ کارل مارکس کے لائحہ عمل کی اشاعت سے پہلے اس کے اشتراکی پیشرو کسی ایک طرز عمل پر متفق نہ ہو سکے۔ بعض ان میں سے ایسے معتدل مزاج اور امن پسند تھے کہ وہ سرمایہ داروں سے اپیل کرنا کافی سمجھتے تھے اور خیال کر لیتے تھے کہ سرمایہ دار خود بخود اپنے املاک و مقبوضات سے دست بردار ہو جائیں گے۔ فوریر (Frowrier) کے متعلق تاریخ میں مذکور ہے کہ وہ روزانہ گھر میں بیٹھ جایا کرتا اور ایک گھنٹہ انتظار کرتا رہتا کہ کوئی بنی نوع انسان کا ہمدرد سرمایہ دار اس کے پاس آ کر اس کو اپنا تمام مال و متاع سپرد کر جائے گا تاکہ وہ اپنی معاشی اصلاح کے اصول کے مطابق امداد باہمی کے گروپ (Phalanx) قائم کر دے یہ اور ایسے ہی دوسرے معاشی مصلحین خیالات کی دنیا میں بستے تھے۔ ان سے سماج کی فلاح کی کوئی توقع نہیں ہوسکتی تھی لیکن ایک دوسرا طبقہ تھا جو اس بات کے حق میں تھا کہ سرمایہ داروں سے ان کا سارا اندوختہ چھین لیا جائے کیونکہ مال مسروقہ ہے اور سماج سے چرایا ہوا ہے' اس کو چھین کر سماج کو دے دیا جائے چونکہ اس سے بدامنی اور شورش کا اندیشہ تھا اس واسطے ان میں سے بعض کی یہ تجویز تھی کہ سرمایہ داروں کو کچھ بطور تلافی دیا جائے تاکہ یہ لوگ اشتراکیت کے خلاف بغاوت نہ کر سکیں' یا کم از کم

اخلاقیات سے اپیل نہ کرسکیں کہ ان کے چھینے ہوئے اموال کے بدلے ان کو بسر اوقات کے لیے بھی کچھ نہیں ملا۔ یہ تجویز گو بظاہر بہت پُرامن معلوم ہوتی تھی مگر اصل میں اشتراکیت کے اصول اساسی سے انحراف کے مراوف تھی۔ جب سرمایہ مال مسروقہ ہے جب سرمایہ دار سماجی ڈاکو ہے تو اس سے اس کا مال چھیننا اور پھر اس کو کچھ واپس دے دینا اس بات کا ثبوت ہے کہ اشتراکی یا تو سرمایہ کو بالکل سرقہ نہیں سمجھتے اور اگر سمجھتے ہیں تو ڈاکو کو "لوٹے ہوئے مال" کے کچھ حصہ کا حق دار ضرور خیال کرتے ہیں۔ یہ دونوں صورتیں بے اصولے پن پر مبنی ہیں۔ اس پر ایک اور اعتراض وارد ہوتا ہے وہ یہ کہ سرمایہ داروں سے ان کے اموال چھین کر قومی خزانہ قائم کرنا اور پھر اس خزانے سے ان کو حصہ رسدی دینے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ یہ خزانہ کم ہو جائے گا۔ اس کے علاوہ یہ مشکل بھی درپیش ہوگی کہ کتنا چھین کر واپس دیا جائے۔ ان حقائق کی روشنی میں یہ اصول کہ سرمایہ داروں سے چھین کر کچھ ان کو بھی دیا جائے یا ان کے کاروبار کو خرید لیا جائے بالکل ناقابل عمل ہے۔

اب دوسری صورت یہ ہے کہ سرمایہ داروں سے ان کے اموال قانون کی طاقت سے چھین لیے جائیں اور ان سے حکومت تمام معاشی کاروبار خود چلائے لیکن یہ اسی وقت ہوسکتا ہے جب ملک میں انقلاب رونما ہو جائے جیسا روس میں ہوا اور اس کے نتیجہ میں تمام صاحب املاک اپنے اموال سے محروم کر دیے جائیں اور ان کو مجبور کر دیا جائے کہ وہ دوسروں کی طرح کام اور محنت سے اپنی معاش کمائیں اور جو اجرت حکومت نے مقرر کی ہے اس پر قانع ہو جائیں لیکن انقلاب سوشلزم کے اصول کے خلاف ہے۔ اس سے میری مراد وہ سوشلزم ہے جو کارل مارکس سے پہلے تھی اور اس وقت بھی ایسے سوشلسٹ موجود ہیں جو کارل مارکس کے نصب العین سے تو متفق ہیں مگر اس کے اصول کار کے مخالف ہیں۔ یعنی وہ انقلاب برپا کرنے کے حق میں نہیں ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ قانون کے ذریعہ سرمایہ داری کی خرابیاں دور کی جائیں مگر تاریخ اس بات کی شاہد ناطق ہے کہ قانون کا دائرہ عمل محدود ہے وہ صرف کلیدی قسم کی صنعت وحرفت کو سرمایہ داروں کے اقتدار سے آزاد کرا سکتا ہے اور وہ بھی تدریجی رنگ میں۔ مگر اس قسم کا ہمہ گیر اشتراکی نظام پیدا نہیں کرسکتا جو اشتراکیوں کا مطمح نظر ہے۔

الغرض اشتراکیت (جو کارل مارکس کے اصول کار سے متفق نہیں) کے نصب العین اور لائحہ عمل میں تضاد ہے۔ وہ انقلاب کو ناپسند کرتی ہے مگر سماج کی تشکیل اس طور سے کرنا چاہتی ہے جو انقلاب کی مقتضی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوشلسٹ کسی جگہ بھی باوجود قانونی اقتدار کے کامیاب نہیں ہوئے۔ جنگ عظیم کے بعد ان کو جرمنی اور اٹلی میں کافی غلبہ نصیب ہوا مگر وہ کوئی نظام معاش بروئے کار نہ لا سکے اور اگر یہ کامیاب ہو جاتے تو نازی ازم اور فاشی ازم کی تحریکیں کبھی پیدا نہ ہوتیں۔ معاشی مورخوں کا پختہ خیال ہے کہ مسولینی اور ہٹلر کا عروج سوشلسٹوں کی ناکامی سے ہوا ہے اور یہ اس واسطے

بے نیل مرام رہے کہ ان کے نظریات ان کے عمل سے ہم آہنگ نہ تھے۔ انگلستان میں بھی یہ لوگ ناکام رہے اور ناکام چلے جاتے ہیں۔ ان کے قائد رامزے میکڈانلڈ کا قول ہے کہ سوشلزم سرمایہ داروں کے اموال و املاک غصب کرنے سے قائم نہ ہو سکے گی۔ ۱۹۲۵ء میں سوشلزم کے حامیوں کی ایک تحقیقاتی کمیٹی بیٹھی، اور وہ بڑے غور و خوض کے بعد اس نتیجہ پر پہنچی کہ جبری قبضہ انجام کار مضر ثابت ہو گا۔ اس سے عدل و انصاف کا خون ہو گا کیونکہ کسی سرمایہ دار سے زیادہ اور کسی سے کم مال چھینا جائے گا اور جس سے زیادہ چھینا جائے گا وہ یقیناً دوسرے کے مقابلے میں مظلومیت محسوس کرے گا۔ اس کے علاوہ ملک کا اقتصادی نظام درہم برہم ہو جائے گا اور معاشی ابتری پھیل جائے گی اور سوشلزم کی مخالف قوتیں زیادہ طاقت ور ہو کر اشتراکی پروگرام کو تباہ کر دیں گی۔

چوتھی خصوصیت

سوشلزم کی چوتھی خصوصیت یہ ہے کہ یہ مالکان اراضیات کو بھی اپنے مقبوضات سے محروم کرنا چاہتی ہے۔ یہ خصوصیت اس نظریے پر مبنی ہے کہ زمین خدا کی ہے، اس کے بنانے میں اسکے مالک کا کوئی حصہ نہیں، نہ اس کی محنت اس میں صرف ہوئی ہے نہ اس کا سرمایہ۔ یہ خدا کی طرف سے بنی نوع انسان کو بطور بخشش کے عطا ہوئی ہے۔ اس واسطے یہ تمام انسانوں کی مشترکہ ملکیت ہے۔ یہ ڈاکہ زنی ہو گی کہ ایک انسان اپنی قوت و طاقت سے کسی خطہ زمین کا مالک بن جائے اور دوسرے انسان اس کے اجرت خوار ہو کر اس کا کام کریں اور جب وہ چاہے ان کو نکال کر دوسروں کو اپنا ملازم رکھ لے اور اسی طرح اس رئیس کے مرنے کے بعد اس کی اولاد اس کی زمینوں کی مالک ہو جائے اور دوسرے لوگ بطور کارندے کام کریں اور اس کی پیداوار کا واحد مالک وہ خود ہو اور اپنی مرضی سے جتنا اپنے کام کرنے والوں کو دینا چاہے دے اور محنت کشوں کو اجرت کی مقدار میں کلام نہ ہو۔

اشتراکیت کے اصولوں کے مطابق یہ نظام وحشیانہ اور انسانیت سوز ہے کیونکہ حقیقی طور پر کوئی انسان ایک انچ زمین کا مالک نہیں ہو سکتا اور جو آج کل قابض نظر آتے ہیں اور زرعی رئیس کہلاتے ہیں وہ ڈاکو اور چور ہیں۔ اس واسطے ان کو بے دخل کرنا اشتراکی تحریک کا مدعا و ملتجاء ہے اور یہ تحریک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک دیہات میں یہ حال ہو کہ ایک انسان سینکڑوں ہزاروں انسانوں کی معاش پر قابض ہو اور ان کی حالت کارخانہ کے مزدوروں سے بھی بدتر ہو لیکن یہ تعجب خیز ہے کہ اشتراکیت کو اس میدان میں ناکامی ہوئی ہے۔ صنعتی شہروں میں تو مزدوروں کی انجمنیں قائم ہیں اور وہ تحریک کے لیے بطور بیج کے ہیں مگر دیہات میں کسانوں اور کاشت کاروں کی کوئی ایسی انجمن نہیں بن سکی اور دیہات اشتراکی اثر و نفوذ سے محفوظ چلے آتے ہیں بلکہ خود اشتراکی رہنماؤں نے یہ صورت حال دیکھ کر اپنی پالیسی میں ترمیم کر لی ہے اور ''ذاتی ملکیت'' کے اصول کو منسوخ نہیں کیا، صرف اتنا کیا کہ بڑے بڑے

روساء کی زرعی جائیدادوں کو چھین کر چھوٹے چھوٹے کاشت کاروں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کو مالکانہ حقوق تفویض کر کے ان سے صرف ٹیکس کے طور پر کچھ حصہ پیداوار وصول کیا جائے۔ ۱۸ء ۱۹۱۷ء میں روس میں بالشویک انقلاب ہوا۔ کارخانوں کو ضبط کر لیا گیا۔ شہروں میں ذاتی جائیداد کے قانون کو منسوخ کر دیا مگر دیہات میں بڑی بڑی جاگیروں کو چھین کر چھوٹے کاشتکاروں میں بانٹ دیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اشتراکیت کے اصول شہروں میں تو نافذ کیے جاتے ہیں مگر دیہات میں جہاں استحصال کم ظالمانہ نہیں ہوتا ان پر اصولوں کا اطلاق ادھورا ہوتا ہے بلکہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ حق ملکیت کو قانونی سند دے کر روسی اشتراکیت نے شکست کا اعتراف کر لیا۔ اس معاشی ستم سے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ اشتراکیت کا بنیادی اصول کہ ملکیت کا حق صرف حکومت کو حاصل ہے تقریباً ناقابل عمل ہے۔ اس کا دائرہ عمل صنعتی شہر ہیں، دیہات میں اس کا نفاذ نہیں ہو سکتا۔

۲۔ جہاں مخالفت کا خطرہ نہ ہو یا کم ہو وہاں اشتراکی اصول عمل میں لائے جاتے ہیں، اور جہاں مخالفت کا اندیشہ ہو اور جن پر ان کی زد پڑ رہی ہے وہ قانون کی گرفت سے محفوظ رہ سکتے ہوں وہاں ان پر خط تنسیخ کھینچ دیا جاتا ہے۔

۳۔ اشتراکی چھوٹے مالکان پر اساسی اصول چھوڑ کر اپنے ساتھ ملا لیتے ہیں تاکہ ان کی مدد سے بڑے بڑے مالکوں کے املاک پر دھاوا بولا جا سکے۔ گویا طریق کار اساسی نظریے سے زیادہ حالات سے متاثر ہوتا ہے۔

پانچویں خصوصیت

اشتراکی تحریک کی پانچویں خصوصیت یہ ہے کہ یہ سماج کے کاروبار میں مقابلے کی روح کو نابود کرنا چاہتی ہے۔ سرمایہ داری کا امتیازی نشان مقابلہ اور مسابقت ہے۔ ایک کارخانہ دار دوسرے کارخانہ دار سے آگے بڑھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ مزدور آپس میں ایک دوسرے سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ ان سب سے زیادہ تصادم محنت اور سرمایہ میں ہے، جس سے ملک کا امن خطرے میں رہتا ہے اور مزدوروں کی انجمنوں پر قانون کا تازیانہ لہراتا رہتا ہے۔ باوجود قانونی گرفت کی مضبوطی کے اقتصادی جھگڑے مہیب صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے مزاج میں جور و ستم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا ہے اور اس سے سماجی فتنے آئے دن پیدا ہوتے رہتے ہیں لیکن اشتراکیت وسائل حیات کی مشترکہ پیداوار سے اور حق ملکیت کے چھیننے سے اور قانون میراث کی تنسیخ سے سوسائٹی میں توازن پیدا کرنا چاہتی ہے۔ جب تمام باشندگانِ ملک حکومت کے اجرت خوار ہیں اور ان کی اجرت کی مقدار ان کے کام کی مقدار کے ساتھ وابستہ ہے اور حکومت مجبور ہے کہ ہر بالغ سے کام لے تو اس کا

لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ مقابلے کی روح ختم ہو جائے گی۔

بادی النظر میں یہ اصول بہت دلآویز نظر آتا ہے اور سرسری نظر سے دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ اشتراکیت کا مقصد عالمگیر اخوت کا قیام ہے۔ بے شک اس کا مقصد یہی ہے۔ وہ روحِ مسابقت کو چاہتی ہے۔ مگر اس اصول کے اطلاق سے تمام سماج پر مردنی اور کاہلی چھا جاتی ہے۔ تمام ہنگامے سرد پڑ جاتے ہیں۔ کاہلی اور سہل انگاری پیدا ہو جاتی ہے۔ ذہنی ترقیات کا دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ کارخانہ جات کے منتظمین اپنے کام میں کوئی دلچسپی محسوس نہیں کرتے۔ کام میں تنزل کے آثار پیدا ہو جاتے ہیں۔ انجام کار ملک کی اقتصادی حالت میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور اقتصادی خوشحالی کے مٹنے سے اشتراکیت ہی مٹ جاتی ہے۔ یہ اشتراکیت پر ایک علمی اعتراض ہے۔ روس نے پچھلی جنگ میں اس کی ایک حد تک درستی کی ہے کیونکہ ملک اور معاشرہ معاشی بدحالی کا شکار نہیں ہوا لیکن اس حقیقت سے کس کو انکار ہے کہ روس میں بھی ماہرین کا طبقہ برسراقتدار ہے۔ اسی وجہ سے بعض عمرانی مفکر روس کے اشتراکی انقلاب کو Managerial revolution کہتے ہیں۔

سوشلزم اور کمیونزم میں فرق

سوشلزم کے چند امتیازات کی تشریح گزر چکی ہے جو سماجی، معاشی اور سیاسی زندگی پر حاوی ہیں۔ معاشرتی زندگی میں سوشلزم ایسے مدارج کو مٹانا چاہتی ہے جو سرمایہ کی کمی و بیشی پر مبنی ہو۔ وہ امارت اور غربت کو مٹا کر سوسائٹی کے افراد کو انسانیت کی ایک سطح پر کھڑا کرنا چاہتی ہے۔ اس کا نصب العین سماجی مساوات قائم کرنا ہے۔ اس کے حصول کے لیے وہ سیاسیات میں مؤثر اصلاح کرنا چاہتی ہے۔ اس کو انفرادی ملکیت سے عداوت ہے۔ وہ ایسی آزادی اور حریت کو مساوات کا دشمن سمجھتی ہے۔ جس کے بل بوتے پر چند افراد یا سوسائٹی کے چند طبقے امورِ مملکت پر حاوی ہو جائیں اور قانون کی آڑ میں زیردستوں کو ابھرنے نہ دیں۔ تحریک سوشلزم کے آغاز تک آزادی کا ایک ہی مفہوم تھا اور وہ یہ کہ ہر آدمی اپنے اپنے دائرۂ عمل میں آزاد ہے اور اگر چند افراد اپنی قوتِ بازو سے یا مال و دولت میں آگے بڑھ جاتے ہیں اور دوسرے انہی کوتاہیوں اور خامیوں کی وجہ سے محتاج اور پسماندہ رہتے ہیں تو یہ عین مقتضائے فطرت ہے۔

الغرض سرمایہ دار کے نزدیک مقابلہ اور مسابقت ہی سماجی زندگی کی روح ہے اور اگر بعض افراد اس معاشی مقابلے میں ناکام رہتے ہیں تو یہ ان کا اپنا قصور ہے نہ کہ ان افراد کا جو معاشی دوڑ میں کامیاب و کامران ہیں۔ بادی النظر میں یہ اصول بڑا دلآویز معلوم ہوتا ہے لیکن حامیانِ سوشلزم نے اس کی مخفی خامیوں کو طشت ازبام کیا۔ انھوں نے حالات کا جائزہ لیا اور سوسائٹی کی روز افزوں اخلاقی

پستی اور غربت و افلاس کے وجوہ کا تجزیہ کیا تو ان پر یہ بات واضح ہوئی کہ سوسائٹی کا قیام وثبات اور افراد کا معاشی مقابلہ دو متضاد چیزیں ہیں۔ مقابلہ کو اصول زندگی تسلیم کرنا سوسائٹی کے وجود سے انکار کے مرادف ہے۔ سوسائٹی تو اسی صورت میں سوسائٹی کہلا سکتی ہے جبکہ اس کے افراد میں یک جہتی' یک رنگی اور یک آہنگی ہو۔ ان کے اعمال اور مقاصد میں ربط ہو۔ وہ سب ایک لڑی میں منسلک ہوں اور ایک ہی مطمح نظر کے حصول کے لیے ایک ہی شاہراہ پر گامزن ہوں۔ اگر اس کے برعکس ان کے مفادات میں تصادم ہو اور اعمال میں رقابت ہو، ایک فرد کی کامیابی دوسرے کی ناکامی پر منتج ہو تو یہ سوسائٹی نہیں بلکہ ایسے افراد کا ہجوم ہے جو آپس میں برسرپیکار ہیں۔ یہ سماجی تفاوت اسی وقت مٹ سکتا ہے جب سماج کو مقدم اور افراد کو موخر کیا جائے۔ انفرادی مفاد سماجی مفاد کے تابع ہو۔ اگر چند افراد یا چند طبقے وسائل پیداوار پر قابض ہو جائیں کہ وہ سماجی زندگی کی نقیض ہیں اور دوسرے طبقے کو حقوق زندگی سے محروم کر دیں تو ایسے افراد یا طبقوں کو قانون کی قوت سے سماج کے تابع کرنا چاہیے۔ سوشلزم کا یہ بنیادی اصول ہے کہ سماج کو افراد پر فوقیت حاصل ہے اور تمام قوانین بھی اسی اصول کے ماتحت بنتے اور نافذ ہوتے ہیں۔

چند ظاہری مشابہتوں کی بناء پر بعض اور تحریکوں کو سوشلزم کا نام دے دیا جاتا ہے۔ اگر سوشلزم کی خصوصیات مذکورہ پیش نظر رہیں تو یہ غلط فہمی پیدا نہیں ہوتی۔ بایں ہمہ دانستہ یا نادانستہ کسی فرعی مماثلت کی وجہ سے یہ غلط فہمی پیدا ہو جاتی ہے اور کئی ایک ایسی تحریکیں ہیں جن کو سوشلزم سے دور کا واسطہ بھی نہیں مگر وہ سوشلزم متصور ہوتی ہیں۔ مثلاً دہریت' لادینی' مادیت' جمہوریت اور آزاد محبت کو سوشلزم کے نام سے پکارا جاتا ہے یا ان کو سوشلزم کی اساس تصور کیا جاتا ہے۔ بے شک سوشلزم میں خدا کے عقیدے کی کوئی جگہ نہیں۔ اس تحریک کے قائدین دہریے اور بے دین تھے اور ہیں۔ وہ مذہب کو وحشت اور بربریت گردانتے ہیں۔ وہ مادی زندگی کے علاوہ کسی اور زندگی کے قائل نہیں۔ وہ مادہ کے علاوہ کسی ہستی کو مدبر الامر نہیں مانتے۔ وہ روح کی ابدیت اور ازلیت کے منکر ہیں۔ یہ سب کچھ ٹھیک ہے مگر فقط روحانیت سے انکار اور مذہب کی مخالفت سوشلزم نہیں ہے۔ ایک دہریہ لازمی طور پر سوشلسٹ نہیں سمجھا جا سکتا۔ جب تک سوشلزم کے سیاسی اور معاشی اصول کا قائل اور حامی نہ ہو۔ اب تو ایک ایسا طبقہ پیدا ہو رہا ہے جو سوشلزم کا حامی ہے مگر مذہب کا منکر نہیں' بلکہ اشتراکی اصول مساوات کو مذہب کا جزو لاینفک سمجھتا ہے اور جدید توجیہات سے مذہب کو اشتراکیت کا حامی ثابت کر رہا ہے۔ سوشلزم میں اساسی اور بنیادی چیز خدا سے انکار یا مذہب سے پیکار نہیں' بلکہ اس کا مرکزی اصول یہ ہے کہ سرمایہ داری کو مٹا کر سماج میں وحدت پیدا کی جائے اور پیداوار دولت اور تقسیم دولت کو اس طرح عمل میں لایا جائے کہ ظالمانہ تفاوت مٹ جائے۔

اسی طرح جمہوریت کو سوشلزم سمجھنا بھی فاش غلطی ہے۔ یہ نظام حکومت امریکہ اور انگلینڈ میں رائج ہے۔ مگر کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہاں سوشلزم کا دور دورہ ہے۔ اسی جمہوریت کی پناہ میں وہاں سرمایہ داری پورے زوروں پر ہے کیونکہ جمہوریت افراد کو سیاسی آزادی بخشتی ہے۔ ہر ایک کو ووٹ کا حق حاصل ہوتا ہے مگر پیداوار اور تقسیم دولت سرمایہ داروں کے رحم و کرم پر موقوف ہے۔ یہ برائے نام سیاسی آزادی اقتصادی غلامی میں گم ہو کر رہ جاتی ہے اور مزدور طبقہ بطور حق کے کسی چیز کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ اگر سرمایہ داروں نے کچھ مراعات بخشی ہیں اور اوقات کار اور اجرت کار میں کمی بیشی کی ہے اور مزدور انجمنیں قائم ہوئی ہیں تو یہ سب مل کر بھی سوشلزم نہیں کہلا سکتے۔ یہ سب اصلاحات سرمایہ داروں کے ہتھکنڈے ہیں نہ کہ سوشلزم کا آغاز۔ ان سے مطمئن ہو کر مزدور اپنے حقوق سے غافل ہو جاتے ہیں۔ اس لیے کارخانوں میں مزدوروں کے لیے چند آسائیوں اور سہولتوں کو فراہم کرنا کسی صورت میں بھی سوشلزم نہیں کہلا سکتا کیونکہ سوشلزم کا آغاز تو پیشرو نظام معاشیات کو پہلے منسوخ کیا جائے اس کے بعد اس کے کھنڈرات پر اشتراکی اصول کے ماتحت سماج کی تعمیر کی جائے۔ جو اصلاحات یا ترمیمات سرمایہ داری کو علیٰ حالہ چھوڑ دیتی ہیں وہ نہ اشتراکیت کے نام سے موسوم ہو سکتی ہیں اور نہ وہ اشتراکی اصلاحات کہلانے کی مستحق سمجھی جا سکتی ہیں۔

اسی طرح آزاد محبت کو اشتراکیت سمجھ لینا غایت درجہ کی بے خبری ہے۔ روس میں اشتراکی نظام کے قیام سے سوسائٹی میں بعض فحاشی پیدا ہو گئیں اور نکاح و فسخ نکاح کی بے حرمتی ہونے لگی۔ مگر اس سے یہ استنباط نہیں ہو سکتا کہ جنسی تعلقات کی بے قاعدگیاں اشتراکیت کے اصول میں سے ہیں۔ اشتراکیت ان سے بالکل الگ ہے۔

اجتماعی ملکیت اور سوشلزم

بعض ایسی تحریکیں ہیں جو بڑی حد تک اشتراکیت کے ساتھ مشابہت رکھتی ہیں۔ یہ Collectivism یعنی اجتماعی ملکیت اور کمیونزم (اشتمالیت) ہیں۔ جو لوگ لاعلمی سے اشتراکیت کو محض امداد باہمی کا اصول سمجھتے ہیں وہ اجتماعی ملکیت کو اس سے الگ نظام نہیں سمجھتے۔ اجتماعی ملکیت کی روشن مثالیں ریل، ڈاک خانہ، بنک، واٹر ورکس، ٹیلیگراف، ٹکسال اور دیگر اسی نوع کے ادارے ہیں۔ یہ کسی شخص واحد کی ملکیت نہیں ہوتے، ان پر حکومت کلی طور پر قابض ہوتی ہے اور کوئی بڑے سے بڑا سرمایہ دار ان کے چلانے میں شریک نہیں ہوتا۔ ان میں تمام کارندے حکومت کے مشاہراہ دار ہوتے ہیں۔ ان سے جو نفع حاصل ہوتا ہے وہ حکومت کے خزانے میں داخل ہوتا ہے۔ اسی طرح جو خسارہ ہوتا ہے اس کا بار بھی حکومت کے خزانے پر پڑتا ہے۔ محض اس وجہ سے کہ ان اداروں میں شخصی سرمایہ لگا نہیں ہوتا۔ یہ اشتراکی ادارے نہیں کہلا سکتے۔ ان کو اس انداز پر چلانے سے حکومت کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہوتا کہ وہ

سرمایہ داروں کو ضعیف کر کے ملک کے منفعت بخش کاروبار کو اشتراکی ڈگر پر چلائے بلکہ ان کی نوعیت ہی اس طرح کی ہے کہ یہ اسی صورت میں سودمند ہو سکتے ہیں کہ ان کے چلانے میں مقابلہ و مسابقت نہ ہو۔ جہاں مقابلہ آیا وہیں ان کی افادیت مفقود ہو گئی۔ بڑے تلخ تجارب کے بعد حکومت اور رعایا اس نتیجہ پر متفق ہوئے کہ ان اداروں میں پرائیویٹ افراد کا دخل نہیں ہونا چاہیے۔

جن لوگوں نے انگلستان کی تاریخ معاشیات کا مطالعہ کیا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ جب تک نوٹ اور سکے بنانے کا حق مختلف بنکوں کو تفویض تھا آئے دن ملک میں معاشی فساد برپا رہتا تھا اور کئی بنک دیوالیہ ہو جاتے تھے۔ کثیر التعداد لوگ بنکوں کے ٹوٹنے سے مفلوک الحال ہو جاتے تھے اور حکومت کو بھی شدید صدمہ پہنچتا تھا۔ اس لیے اور حکومت کو مجبوراً اسے اپنے ہاتھ میں لینا پڑا' یہی حال دوسرے اداروں کا ہوا اور یہ سب اس وقت اور اس زمانے میں ہوا جب اشتراکیت معرض وجود میں بھی نہیں آئی تھی۔ ہر سرمایہ دار خود حکومت کی ملکیت کلی پر رضامند تھے حالانکہ اشتراکیت کا نقطہ آغاز یہ ہے کہ سرمایہ داروں کا استیصال کیا جائے۔ اس کا وجود سرمایہ داروں کی موت ہے۔ اس کے علاوہ یہ چند مخصوص اداروں پر بس نہیں کرتی بلکہ ہر قابل ذکر کاروبار کو اپنی لپیٹ میں لیتی ہے۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس کے رہنما وسائل پیداوار کو تدریجاً قومی تحویل میں لینے کو ترجیح دیتے ہیں اور سرمایہ داروں کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنا کاروبار حکومت کی تحویل میں دے دیں اور وہ اس میں مستاجر مزدور کی حیثیت سے کام کریں۔ اس کے برعکس Collectivism یعنی اجتماعی ملکیت کے کسی اصول کا سرمایہ داروں سے تصادم نہیں ہوتا بلکہ یہ سرمایہ دار ہی ہوتے ہیں جو ان اجتماعی اداروں سے زیادہ مستفیض ہوتے ہیں۔ ایک کارخانہ دار ریل' ڈاک اور ٹیلیگراف سے جتنا فائدہ اٹھاتا ہے وہ ایک غریب کو کبھی نصیب نہیں ہوتا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ عوام کو ان کی اتنی ضرورت ہی پیش نہیں آتی۔

اس کے علاوہ ایک اور بات ہے جو اجتماعی ملکیت اور اشتراکیت میں خط فارق کی حیثیت رکھتی ہے وہ یہ کہ ان تمام اجتماعی اداروں میں اجرت کے تعین کا اصول سراسر سرمایہ دارانہ ہوتا ہے' اور مشاہروں میں اتنا تفاوت ہوتا ہے جس سے سرمایہ داری کی خصوصیت ظاہر ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ ان میں ملازم رکھنے کا اصول بھی اشتراکیت کے اصول سے منافی ہے۔ ان میں معقول مشاہرہ پانے والے زر اندوزی کے عمل سے خود سرمایہ دار ہو جاتے ہیں اور اپنی ملازمت کے ساتھ ساتھ یا عرصہ ملازمت کے اختتام پر جلب منفعت کے دوسرے کاروبار شروع کر دیتے ہیں اور قوت لایموت پانے والے ملازم ہمیشہ افلاس کی سطح پر زندگی بسر کرتے ہیں اور ان کی اولاد بھی اسی ماحول میں پیدا ہوتی اور مر جاتی ہے اور سوسائٹی میں المناک تفاوت قائم رہتا ہے۔

الغرض اجتماعی ملکیت کا مقصد معاشی اصلاح نہیں بلکہ یہ مصلحت وقت کی پابند ہے۔ اقتضاء

زمانہ کے ساتھ ساتھ حکومت اپنے اختیار کو وسیع کرتی چلی جاتی ہے اور کلیدی نوع کی صنعت وحرفت کو اپنے قبضہ میں لے لیتی ہے لیکن اس توسیع اقتدار سے سرمایہ داری کے غلبے میں کوئی فرق نہیں آتا۔ اگر ان تمام حکومتی اداروں کا بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو فوراً معلوم ہو جائے گا کہ ان سے ملک کو وہ فائدہ حاصل نہیں ہوتا جو ہونا چاہیے کیونکہ حکومت کی ہیئت ترکیبی میں سرمایہ داری کی روح مضمر ہوتی ہے اور اس کے ارباب حل وعقد تمام حکومتی کاروبار کو سرمایہ دارانہ اندازے سے چلاتے ہیں' جن سے بالآخر خود ان کو فائدہ ہوتا ہے اور عامۃ الناس ویسے کے ویسے ہی محروم رہتے ہیں۔ یہ صریح غلطی ہوگی اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ میدانِ صنعت وحرفت میں حکومت کی مداخلت سے سرمایہ داری پر کوئی کاری ضرب لگی ہے اور ان کا منافع محدود ہو جاتے ہیں۔ یہ تو اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ پہلے سے تمام انواع و اقسام کے کاروبار دو عنوانوں میں منقسم ہوں۔ ایک حکومتی اور دوسرا نجی۔ اگر ایسا ہو تو ایک کی توسیع سے دوسرے میں لازمی طور پر کمی آ جائے گی۔ اگر ایسا ہوتا تو یقیناً سرمایہ دار اجتماعی ملکیت سے کمزور ہو جاتے اور ان کی استبدادی قوت کمزور ہو جاتی اور ان کی نجی تجارتیں سکڑ کر رہ جاتیں لیکن صورتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے۔ کاروبار کی دنیا میں کوئی معین اور ابدی تقسیم نہیں' بلکہ آئے دن نئی معاش کی راہیں نکلتی رہتی ہیں اور سرمایہ دار ان پر قابض ہوتا جاتا ہے۔ مثلاً ایجنسی کے کام کو لیجیے۔ اس کو دولت آفرینی سے براہ راست کوئی واسطہ نہیں لیکن تدریجی نشوونما سے یہ تمام دنیا پر حاوی ہو گیا ہے اور کاروباری سرگرمیاں اس کی بدولت قائم ہیں اور یہ حکومت کے دست تصرف سے آزاد ہے حالانکہ تقسیم دولت کا موثر ذریعہ ہے۔ جب تک نجی کاروبار کو قانوناً بند نہ کیا جائے' محض اجتماعی ملکیت کا اصول معاشی خوشحالی کا ضامن نہیں ہو سکتا۔ بڑی وسیع اور ہمہ گیر صنعتوں کو اپنے قبضہ میں لینے کے بعد حکومت سرمایہ داروں کو آزاد چھوڑ دیتی ہے وہ براہ راست حکومت کی ملکیتی سے مستفیض ہو رہے ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس حکومت جن کاموں پر ہاتھ ڈالتی ہے ان میں اس کو اتنا سرمایہ لگانا پڑتا ہے جو بڑے سے بڑے سرمایہ دار کو بھی متذبذب کر دیتا ہے اور آج تک کوئی مثال نہیں ملتی جب سرمایہ داروں نے ریل' ڈاک' خانہ' ٹیلی گراف' ٹکسال اور دیگر ایسے اداروں کو حکومت کے قبضے میں چلے جانے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہو' بلکہ قانون ساز ایوانوں میں سرمایہ داروں کی اکثریت قانون کو اسی جانب چلاتی ہے۔ حالانکہ جب ملک کے کاروبار میں اشتراکیت کا خفیف سا رنگ پیدا ہونے لگے یا اس کے لیے ملک کے عوام کا مطالبہ ہو تو ارباب اختیار آتش زیرپا ہو جاتے ہیں اور عوام کے مطالبہ کو آہنی قوت سے دبا دیا جاتا ہے۔ اس اصلاحی تحریک کو نذرِ دار و رسن کر دیتے ہیں۔

مندرجہ بالا حقائق کی روشنی میں اجتماعی ملکیت کو اشتراکیت متصور کرنا ایک لغو اور علمی مغالطہ ہے اور جب تک ان کے درمیانی اختلاف کو واضح نہ کر لیا جائے کسی ایک کے حسن وقبح کی تمیز بھی نہیں

ہو سکتی۔ اس صریح مغالطہ کی منظم نشر و اشاعت کا سہرا انگلستان کی فیبین سوسائٹی (Fabian society) کے سر پر ہے۔ اس کے مایہ ناز اور مشہور عالم قائد سڈنی وب اور بیٹرس وب (Sydny webb & Beatrice webb) اور ''برنارڈ شا'' ہیں۔ دنیائے تصنیف و تالیف میں ان کا پایہ بلند ہے۔ ان کی تحریرات کو ذوق و شوق سے پڑھا جاتا ہے۔ یہ کارل مارکس کی معاشی اصلاح سے خوب واقف ہیں اور در پردہ قائل بھی ہیں۔ مگر زمانہ اور ماحول کی مصلحتوں سے مجبور ہو کر انھوں نے بہت تحریف کی ہے اور مارکس کی انقلابی تحریک پر اعتدال اور رجعت پسندی کا نقاب چڑھا دیا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جنھوں نے اس خیال کی تبلیغ کی ہے کہ اجتماعی ملکیت ہی اشتراکیت ہے اور اقتصادی فلاح کے لیے یہ غصب و ضبط کو مذموم خیال کرتے ہیں کیونکہ اس سے امن تباہ ہوتا ہے۔ یہ مقابلہ کو جائز خیال کرتے ہیں۔ یہ نجی کاروبار کے مخالف نہیں اور نہ اس بات کے موید ہیں کہ حکومت ہی خود قانون سے کوئی فوری تبدیلی پیدا کر دے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ حالات کی رو سرمایہ داری کے خلاف ہے۔ جس طرح نظام جاگیرداری مٹ گیا ہے اسی طرح سرمایہ دار بھی مرور زمانہ سے کمزور ہو جائیں گے اور جو نظام تباہی کے گڑھے میں گرنے والا ہو۔ اس کو کسی انقلاب کے ذریعہ مٹانا بہت خطرناک اور معاشرہ کو اتنا نقصان پہنچے گا۔ اشتراکی قائدین اس کی تلافی نہیں کر پائیں گے۔

کمیونزم اور سوشلزم میں فرق

جس طرح اجتماعی ملکیت اور سوشلزم میں جعلی مشابہت معلوم ہوتی ہے اور ایک عامی انسان فیبین سوسائٹی کے دانشوروں کے پراپیگنڈہ کی وجہ سے دونوں تحریکوں میں فرق نہیں کر سکے۔ اسی طرح کمیونزم اور سوشلزم میں اکثر التباس ہو جاتا ہے۔ میں نے پہلے کسی موقع پر ان کے فرق پر سرسری روشنی ڈالی ہے۔ اس موقع پر جب کہ سوشلزم اور دوسری معاشی تحریکوں کے تباین اور تخالف کا موضوع زیر بحث ہے، میں مناسب سمجھتا ہوں کہ کیمونزم (اشتمالیت) اور سوشلزم (اشتراکیت) کے باہمی اختلاف پر سیر حاصل بحث کروں تاکہ یہ ایک دوسرے سے نمایاں علیحدہ نظر آئیں۔ اس تفصیلی بیان کی ضرورت کچھ اس وجہ سے بھی ہے کہ نہ صرف روزمرہ گفتگو میں بلکہ تحریروں میں بھی ان دونوں اصطلاحات کو غیر ذمہ دارانہ طور پر استعمال کیا جاتا ہے اور ان کے امتیازی اوصاف عام نظروں سے اوجھل رہتے ہیں حالانکہ یہ ایک کھلا راز ہے کہ انگلستان میں لیبر پارٹی کو سیاسی وقعت حاصل ہے اور کئی دفعہ جنگ عظیم کے بعد یہ پارٹی حکومت بھی کر چکی ہے۔ اس کا نصب العین اور اصول کار سرمایہ داروں سے مختلف ہیں کیونکہ ان کی اصلاح کا میلان اشتراکی ہے۔ بایں ہمہ کیمونسٹوں پر اس پارٹی کے دروازے بند ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کیمونسٹوں نے ڈیڑھ اینٹ کی الگ مسجد بنائی ہوئی ہے۔ اگر لیبر پارٹی کا کوئی رکن اشتمالی رجحان کا اظہار کرے اور انقلابی لائحہ عمل کو ترجیح دے تو اس کو فوراً پارٹی سے نکال دیا جاتا ہے۔ یہ

حالات اس بات کا ثبوت ہیں کہ سوشلزم اور کمیونزم میں مغائرت ہے اور علمی زاویہ نگاہ سے دیکھنے والا اور مطالعہ کرنے والا اس کو نظرانداز نہیں کر سکتا۔

لینن نے اپنی کتاب State and revolution میں اس پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ جو چیز عام طور پر سوشلزم سمجھی جاتی ہے وہ کارل مارکس کے نزدیک کمیونسٹ سوسائٹی کی ابتدائی اور ادنیٰ شکل ہے اور طویل ارتقاء کے بعد سوشلزم کمیونزم کے درجے تک پہنچتی ہے۔ ان میں اتنا ہی فرق ہے جو جرثومہ تولید اور کامل انسان میں فرق ہوتا ہے۔ کمیونسٹ نظام من کل الوجوہ ایسا نظام ہے جو مارکس قائم کرنا چاہتا تھا۔ اس کے خدوخال میں سرمایہ داری کا کوئی شائبہ تک نہیں رہتا۔ اس کے برعکس سوشلزم اس کے لیے بمنزلہ ہیولیٰ کے ہے۔ اس کے اندر سرمایہ داری کے کچھ نہ کچھ عناصر ضرور دکھائی دیتے ہیں۔ مگر زندہ سوشلزم وہی ہوگی جو کمیونزم کی تکمیل سے پہلے کسی نقطہ پر جامد نہ ہو۔ جہاں یہ ساکن ہوئی وہیں اس میں جمود و تعطل پیدا ہو جائے گی اور سرمایہ داری عود کر آئے گی جو سوشلزم کمیونزم پر آ کر ختم نہیں ہوتی وہ حکومتی سرمایہ داری (State capitalism) مشکل اختیار کر جاتی ہے اور سماجی زندگی پر اس کے اثرات تقریباً ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے قدیم سرمایہ داری کے۔

کمیونزم اور سوشلزم میں اقتصادی' سیاسی اور سوشل اختلافات مندرجہ ذیل ہیں:

پہلا فرق یہ ہے کہ سوشلزم صرف زمین اور سرمایہ کی نجی ملکیت کے اصول کو منسوخ کرتی ہے باقی اشیاء میں یہ اصول کارفرما نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس کمیونزم نجی املاک کو سرے سے اڑا دیتی ہے اور کمیونسٹ نظام میں کوئی شخص کسی چیز کو بھی اپنی ذاتی ملک نہیں سمجھ سکتا۔ اس کا اثاث البیت (گھریلو سامان) بھی اس کی جائیداد متصور نہیں ہوتا' یعنی وہ اس کو جلب زر کا ذریعہ نہیں بنا سکتا۔ اصول اشتراک کو انسانی زندگی کے ہر ممکن پہلو پر مسلط کر دیا جاتا ہے۔ یہ اسی غلو کا نتیجہ ہے کہ کمیونزم کے معترضین نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ یہ بیوی اور بچوں میں بھی اشتراک کی مقتضی ہے اور جو سوسائٹی اس اصول پر استوار ہوتی ہے اس میں ازدواجی تعلقات کی وہ نوعیت نہیں ہوتی جو عام معروف ہے۔ اسی طرح والدین اور اولاد کا رشتہ بھی منقطع نہیں تو ضعیف ضرور ہو جاتا ہے۔ کمیونسٹ ملک میں خاندانی زندگی حقیقت اور عملیت سے معرا ہوتی ہے اور محبت و قرابت عنقا ہو کر رہ جاتے ہیں جہاں یوم ولادت ہی سے بچے پبلک دایہ خانوں میں داخل کر دیے جائیں اور ان کی پرورش اور تربیت کا سارا بوجھ حکومت کے کندھے پر ہو اور ماں باپ محض دیکھنے کے ہی مجاز ہوں وہاں گھریلو زندگی کیسے ہو سکتی ہے۔ جن لوگوں نے اس معاشی بدعت کا روحانی پہلو سے مطالعہ کیا ہے وہ یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ کمیونزم میں ایک فرد کی روح بھی اپنی روح نہیں ہوتی۔ الغرض کمیونزم زندگی کے ہر شعبے پر محیط ہوتی ہے مگر سوشلزم صرف آلات پیدائش دولت کو مشترک ملکیت قرار دیتی ہے۔

دوسرا فرق تقسیم دولت سے متعلق ہے۔ سوشلزم ہر کام کرنے والے کو اس کے کام کی نوعیت و مقدار کے مطابق معاوضہ دیتی ہے۔ اس میں انفرادیت کا عنصر پایا جاتا ہے۔ کمیونزم ہر ایک کو اس کی ضروریات و حاجات کے مطابق اجرت دیتی ہے۔ کام کی مقدار کو مزدوری کے تعین میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ رامزے میکڈانلڈ اپنی کتاب تحریک اشتراکیت (The socialist movement) میں رقمطراز ہے کہ کمیونزم اس مفروضے پر مبنی ہے کہ دولت کا ایک مشترکہ ذخیرہ ہے اور سماج کے ہر فرد کو اجازت ہے کہ وہ اپنی ضروریات اور حاجات کی تکمیل کے لیے اس ذخیرے میں سے جتنا چاہے لے لے اس کی محنت اس کی مزدوری پر کوئی اثر نہیں ڈالتی۔ کمیونزم اور سوشلزم میں اجرت کا یہ اصول بھی بنیادی اختلاف کی حیثیت رکھتا ہے۔ سوشلزم کا اصول یہ ہے کہ ہر ایک آدمی سے اس کی صلاحیت کار کے مطابق کام لیا جائے اور اس کو اس کے کام کے مطابق اجرت دی جائے۔ کمیونزم اس پر صاد کرتی ہے کہ ہر آدمی اپنی اہلیت و قابلیت کے مطابق کام کرے۔ مگر اس کے نزدیک اجرت کے تعین کے وقت اس کی ضروریات کو ہی دخل ہو اور اجرت اس کی ضروریات کی کفیل ہو سکے۔ لینن بھی یہ کہتا ہے کہ مزدوری کو محنت کے مطابق دینا سرمایہ داری کی ایک ہلکی سی صورت ہے لیکن وہ مصلحت وقت کو نظر انداز نہیں کرتا۔ وہ اس بات کا حامی ہے کہ عبوری عرصہ میں مزدوری کو اسی اصول کے مطابق دینا ضروری ہو گا۔ ہاں جب نظام کمیونزم درجہ کمال کو پہنچ جائے اس وقت مزدوری ضروریات کو مدنظر رکھ کر دینی چاہیے چونکہ اس اصول اجرت میں خطرناک نقائص تھے اور یہ پیدائش دولت پر اثر انداز ہو رہے تھے اور اسی کی بدولت افراد کام میں سست ہو رہے تھے۔ اس لیے سٹالن نے اجرت کے اصول کو سوشلزم کے اصول کے مطابق کر دیا ہے۔ اب روس میں کام کرنے والے اپنے کام کی نوعیت اور مقدار کے مطابق معاوضہ پاتے ہیں۔ اگر ضروریات کو پیش نظر رکھا جائے تو اس کا لازماً یہ نتیجہ ہو گا کہ کارندے کام سے غافل ہو جائیں گے اور اپنی ضروریات کو بڑھا چڑھا کر پیش کریں گے اور عملاً صورت یہ ہو جائے گی کہ ہر ایک سے اتنا کام لیا جائے جتنی اس کو کام سے رغبت ہو اور اس کو معاوضہ اتنا دیا جائے جتنے کی وہ خواہش کرے۔ اگر اس کو اور اختصار سے بیان کیا جائے تو یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ ایک سے کچھ کام نہ لیا جائے اور ہر ایک کو سب کچھ دیا جائے۔ اگر اس اصول کو نافذ کیا جائے گا تو دولت کی پیداوار یک قلم رک جائے گی اور ملک میں قحط و افلاس کی بلا نازل ہو جائے گی۔ حیرت کا مقام ہے کہ لینن جیسا باعمل رہنما اور دیدہ ور قائد جس نے حالات کی رعایت سے اپنے اصول میں رد و بدل کر لیا اور ان کو عملیت کا جامہ پہنانے میں کوشاں رہا وہ بھی مارکس کے اصول اجرت کا قائل رہا۔ وہ ایک جگہ لکھتا ہے کہ سوسائٹی کو اس بات کی ضرورت نہ ہو گی کہ وہ اشیاء کا اندازہ لگائے تاکہ ان کی تقسیم میں سہولت ہو۔ تمام قسم کی چیزیں بافراط ہوں گی اور ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق مل جائے گا۔ یہ تصور خیالی ہی خیالی ہے۔ کمیونزم روس

میں ''جنت ارضی'' پیدا نہیں کر سکی جس میں ہر ایک کو اس کی ضرورت کے مطابق ملنے کا وعدہ لینن نے کیا تھا۔

تیسرا فرق تقسیم دولت کے اصولی فرق سے پیدا شدہ ہے۔ یہ ''تبادلہ'' دولت سے متعلق ہے۔ سوشلزم مسکوکات اور کرنسی کے استعمال کو ناگزیر سمجھتی ہے لیکن کمیونزم کے نزدیک ان کا وجود عبث اور لایعنی ہے۔ جس طرح جنگل میں جانوروں کو مسکوکات اور کرنسی کی ضرورت نہیں اسی طرح کمیونسٹ سوسائٹی میں بھی افراد کو اس سے کوئی سروکار نہیں ہوتا۔ جب ہر شخص اپنی ضروریات اور حاجات کو پورا کر رہا ہے تو اس کو روپوں پیسوں کی کیا ضرورت ہو سکتی ہے۔ اگر کسی ملک میں کمیونزم اپنی پوری شکل میں نافذ ہو جائے تو کرنسی کا سارا نظام بھی منسوخ ہو جائے گا اور آمدنی (ماہانہ ہو یا سالانہ) کا تصور بھی مٹ جائے گا اور ہر آدمی کو اس کی ضروریات کی تسکین کے لیے قومی ذخائر سے سامان مل جایا کرے گا اور تہذیب عہد عتیق کی طرف لوٹ جائے گی جو بربریت کے نام سے موسوم ہوتا ہے۔ جب تک سوشلزم رہتی ہے تہذیب و تمدن میں کوئی گہرا خلل واقع نہیں ہوتا۔ یہ اپنے پیشرو نظام کی اصلاح یافتہ تصویر ہوتی ہے۔ اس میں صرف ان طور و طریقہ کو بدلا جاتا ہے جو سوسائٹی میں عدم مساوات کا رنگ پیدا کر دیتے ہیں لیکن کمیونزم کے حامی اس پر قناعت نہیں کرتے' وہ سب اداروں کو تہ و بالا کر دیتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کرنسی اور مسکوکات بھی ان کی انقلابی اصلاح کی نذر ہو جاتے ہیں۔

چوتھا فرق۔ پہلے تین اختلاف تو اقتصادی تھے جو پیدائش دولت' تقسیم دولت اور تبادلہ دولت سے متعلق تھے لیکن چوتھا فرق سیاسی ہے اور اس کا تعلق سٹیٹ (حکومت) کے وجود اور عدم وجود سے ہے۔ سوشلزم کا کوئی اصول حکومت سے نہیں ٹکراتا بلکہ اس کے علمبردار اس کے بقاء اور قیام کو دل سے چاہتے ہیں۔ ان کے نزدیک حکومت انسانی اعمال اور سماجی تعلقات میں توازن پیدا کرنے کے لیے لابدی چیز ہے۔ اس کے برعکس کمیونزم حکومت کے وجود کو اپنے اصولِ معاش کے منافی سمجھتی ہے۔ کمیونسٹ سمجھتے ہیں کہ جیسے جیسے ان کے اصول جڑ پکڑتے جائیں گے حکومت کا نظام مٹتا چلا جائے گا اور اس کا کامل استیصال کمیونزم کی معراج ہوگا۔ انگلز لکھتا ہے کہ سٹیٹ کا وجود ہمیشہ سے قائم نہیں' یہ غالب طبقے کا ایک آلہ کار ہے اور جب سوسائٹی میں طبقے اور جماعتیں مٹ جائیں گی تو سٹیٹ کا وجود فنا ہو جائے گا۔ کمیونسٹ سٹیٹ کو عارضی نظام کے طور پر گوارا کرتے ہیں اور اس وقت تک رکھتے ہیں جب تک سوسائٹی کمیونزم کے سانچے میں پوری طرح ڈھل نہیں جاتی۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جب ایسا ہو جاتا ہے اس وقت نہ پولیس کی ضرورت باقی رہے گی نہ قانون فوجداری کی اور تعزیرات اور عدالتوں کے دفتر بے معنی ہو کر رہ جائیں گے۔ جب ہر ایک فرد خوش حال ہو جائے گا تو تمام قسم کے جھگڑوں کا سدباب ہو جائے گا۔ یہ فرق بھی اساسی اختلاف کی حیثیت رکھتا ہے اور مذکورہ بالا امتیازات کے نتیجہ میں پیدا ہو

جاتا ہے۔ اگر واقعی تمام لوگ خوشحال ہو جائیں، اور کسی چیز کی قلت نہ رہے اور کوئی بھی ایسا خطرہ نہ رہے جس سے کوئی شخص متاع حیات سے محروم کیا جا سکے تو حکومت اور اس کے قانونی اداروں کا مٹ جانا ناگزیر ہو جائے گا کیونکہ حکومت اس اصول پر مبنی ہے کہ سوسائٹی کے افراد کے حقوق میں ٹکراؤ کا ہر وقت امکان ہے۔ لوٹ مار کا ہر وقت کھٹکا ہے۔ یہ خدشہ ہر وقت لاحق ہے کہ اعزہ و اقرباء میں بھی اختلاف رونما ہو کر سوسائٹی کے امن کو برباد کر دے۔ یہ خوف بھی ہے کہ بعض صاحب اختیار ایسے ہوں جو سوسائٹی میں فتور ڈالتے رہیں۔ ان خطرات کے ازالے کے لیے ضروری ہے کہ قانون کی سلطانی ہو اور قانون کے وضع نفاذ اور تعبیر کے مختلف ادارے ہوں۔ انہی کا نام حکومت ہے۔ اگر کوئی شخص یہ فرض کر لے کہ سوسائٹی کو کوئی خطرہ نہیں اور افراد اتنے مرفہ الحال ہیں کہ ان سے نقض امن کا کوئی خدشہ نہیں تو وہ یقیناً یہی خیال کرے گا کہ حکومت انسانی حیات میں حشو و زوائد کی حیثیت رکھتی ہے چونکہ کمیونزم کے حامی یہی خیال کرتے ہیں۔ اس واسطے وہ حکومت کے تصور سے متنفر ہیں۔ اس سے اتنا ہی ثابت ہوتا ہے کہ اس معاملے میں ان کے اصول میں کوئی تضاد نہیں۔ یعنی وہ ''جنت ارضی'' کے خیال کے ساتھ قانونی تعزیر کے خواہاں نہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ آیا کمیونزم کا خواب کبھی شرمندہ تعبیر بھی ہو سکتا ہے یا نہیں؟ چونکہ ایسا ہو نہیں سکتا لہٰذا حکومت کے وجود کی ضرورت اظہر من الشمس ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سوشلزم حکومت کو بنظر استحسان دیکھتی ہے اور اس کے استحکام و استقلال کی متمنی ہے۔ سوشلزم کا رجحان ہمہ گیر حکومت (Totalitarian state) کی قیام کی طرف ہے۔ اس کے برعکس کمیونزم تراج (انارکزم) کی طرف مائل ہے۔ یعنی سوشلسٹ اپنے اصول کے مطابق حکومت قائم کر لیتے ہیں تو ایسی حکومت بالکل مجاز ہوتی ہے کہ سماجی زندگی کے تمام شعبہ جات پر حاکم و نگران ہو اور افراد مجبور ہوتے ہیں کہ اس کے تابع فرمان رہیں۔ اس کے برعکس کمیونزم حکومت کے تصور کو مٹانے کے لیے حکومت کے اختیارات کو سلب کرتی چلی جاتی ہے اور ایک ایسا وقت آتا ہے کہ اس کو بالکل معدوم کر دیا جاتا ہے۔ سوشلسٹوں کی ساری تان معاشی نظم و نسق پر ٹوٹتی ہے اور کمیونسٹوں کا سارا زور ''آزادی'' پر خرچ ہوتا ہے۔ سوشلسٹوں کے نزدیک مثالی حکومت وہ ہے جو زیادہ ٹیکس عائد کرے اور زیادہ سے زیادہ اپنے خزانے کو عامۃ الناس کی بہبود پر صرف کرے۔ کمیونزم میں ٹیکس کے تصور کی کوئی گنجائش نہیں کیونکہ نہ کوئی حکومت ہو گی اور نہ ٹیکس لگانے کی کوئی ضرورت ہو گی' کیونکہ افراد کو بقدر ضرورت خود بخود مل جایا کرے گا۔

پانچواں فرق مساوات کے قیام کے متعلق ہے۔ سوشلزم بے شک سرمایہ دارانہ تفاوت کو ظالمانہ اور غیر انسانی سمجھتی ہے لیکن اس کے نظریہ مساوات میں وہ ہمہ گیری نہیں جو کمیونزم میں ہے۔ سوشلزم میں قابلیت اور اختیار کے لحاظ سے مدارج کا ہونا ناگزیر ہے۔ وہ کوئی ایسی ہمواری اور برابری

پیدا کرنا نہیں چاہتی جس میں سب افراد باوجود اپنے مختلف دماغی اور جسمانی اوصاف کے ایک سطح پر ہوں۔ سب کی آمدنی برابر ہو۔ سب کا طرزِ زندگی یکساں ہو اور سماج میں کسی قسم کی کوئی تمیز نہ ہو۔ وہ صرف ایسے اختلاف و تفاوت کو مٹانا چاہتی ہے جس کا منبع محض ثروت و دولت کی کمی اور زیادتی ہو اور جس کا منظر سرمایہ دار معاشرے میں دیکھا جا سکتا ہے۔ مگر کمیونزم تمام مدارج کو یک قلم منسوخ کرنے کے حق میں ہے۔ اگر سوشلزم کے اصول میں جبری اور ہمہ گیر مساوات کا اصول شامل کر دیا جائے تو وہ کمیونزم کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کمیونزم کے نفاذ اور استحکام میں جبر و تشدد غالب ہوتا ہے۔ اس کے برعکس سوشلزم میں ایک تدریجی اصلاح کارفرما ہوتی ہے اور طویل عرصے کے بعد سوشلسٹ نظام پوری طرح جلوہ گر ہوتا ہے۔

چھٹا فرق طریق کار کا ہے اور یہ پانچویں فرق کی فرع ہے چونکہ باقی اختلافات علمی ہیں اور یہ فرق عمل کا ہے اس واسطے یہ زیادہ نمایاں ہے اور اکثر کے نزدیک تو یہی بنیادی فرق ہے۔ لہٰذا سوشلزم کو کمیونزم سے ممتاز کرتا ہے اور باقی سارے فرق اس کے فروع ہیں۔ کچھ بھی ہو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ ایک عامی انسان اس کو زیادہ محسوس کرتا ہے چونکہ سوشلزم تدریج کی قائل ہے اس لیے ملک کا معتدبہ حصہ بے خبری اور لاعلمی میں سوشلسٹ نظام اختیار کرتا چلا جاتا ہے چونکہ کمیونزم اپنی ساری اصلاحات کو جبر اور تعدی سے نافذ کرتی ہے اس واسطے اس کی آمد سے ملک میں اضطراب کی لہر دوڑ جاتی ہے اور مزدور انقلابی نعرے لگاتے ہیں۔ سرمایہ داروں کے وسائل پیدائش پر قابض ہو جاتے ہیں۔ سوشلزم اور کمیونزم دونوں کا مطمح نظر تو ایک ہے مگر موخر الذکر اس کو فوری بروئے کار لانے کے حق میں ہے۔ اس کے لیے تشدد لازمی ہے۔ اس کے بعد کمیونزم پرولتاری آمریت کو قائم رکھتی ہے اور تمام حکومتی اداروں کو ظلم کی یادگار قرار دے کر نیست و نابود کر دیتی ہے۔ سوشلسٹ پارلیمنٹ میں قانون وضع کرتے ہیں۔ قانون کی رو سے ملک کی اقتصادی زندگی کو بہتر بناتے ہیں۔ کلیدی صنعتوں پر سرکاری قبضے سے سرمایہ دار کی سطوت زوال پذیر ہو جاتی ہے اور آہستہ آہستہ معاشی تفاوت کم اور معاشی مساوات زیادہ سے زیادہ نظر آنے لگتی ہے لیکن کمیونزم کے نعرہ ہائے جنگ غریب لوگوں کے گھروں سے اٹھتے ہیں اور انقلاب میں منتقل ہو کر کارخانوں اور حکومت کے ایوانوں سے جا ٹکراتے ہیں۔ گلی کوچے مقتل بن جاتے ہیں اور تمام ملک میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ اس عمل تخریب کے بعد تعمیر کا کام شروع ہوتا ہے۔ جب روس میں کمیونسٹ انقلاب برپا ہوا تو یہی خونی سماں نظر آتا تھا۔ الغرض سوشلزم اور کمیونزم میں شدید اختلاف لائحہ عمل کا ہے۔ ایک ارتقاء کی حامی ہے اور دوسری انقلاب کی علمبردار۔

سوشلزم کے آئینی اور پرامن نفوذ کی مثالیں کہیں نہیں ملتیں کیونکہ کسی ملک میں اشتراکیت کا پروگرام عمل میں نہیں آیا۔ مگر کمیونزم کے نفاذ کا نظارہ روس میں لوگوں نے دیکھا اور انقلابیوں نے جس

طرح خون کی ندیاں بہائیں اس کی یادیں اب بھی روس کی زمین پر بطور یادگار قائم ہیں۔ پروفیسر چارلس سرولیا نے اپنی کتاب Impressions of soviet Russia میں اس معاشی حزنیہ (Tragedy) کے مختلف پہلوؤں کو بے نقاب کیا ہے۔ انسانی خون کی ارزانی کے نظارے کو اعداد و شمار سے واضح کیا ہے۔ وہ اپنی کتاب کے صفحہ ۸۱ پر کشت و خون کی ایک فہرست درج کرتا ہے جو سماج کے تمام طبقوں پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعہ سے کمیونزم کے انقلابی میلان کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے' وہ فہرست مندرجہ ذیل ہے:

طبقہ مقتولین	تعداد مقتولین
بشپ	۲۸
پادری	۱۲۱۹
پروفیسر اور ٹیچر	۶۰۰۰
ڈاکٹر	۹۰۰۰۰
آفیسر	۵۴۰۰۰۰
فوجی سپاہی	۲۶۰۰۰۰
پولیس کے سپاہی	۷۰۰۰۰
مالکان اراضیات	۱۲۰۹۵۰
علمی اور کسبی طبقہ	۳۵۵۲۵۰
مزدور	۱۹۳۲۹۰
کاشت کار	۸۱۵۱۰۰

ساتواں فرق جو سوشلزم کو کمیونزم میں فرق کرتا ہے وہ دائرہ عمل کا ہے۔ سوشلزم ابتداء" ایک ملک میں اپنا نظام نافذ کرنے کے لیے منتخب کرتی ہے لیکن کمیونزم کی نظر ساری دنیا پر ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ بیک وقت سارے ممالک میں طبقہ جاتی جنگ چھیڑ دینے کے حق میں ہے کیونکہ ایک ملک پر قناعت کرنا اپنے مقصد کے خلاف سمجھتی ہے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں یہ فرق صاف طور پر واضح ہو گیا۔ محارب ممالک سوشلسٹ کے اپنی اپنی فوج میں بھرتی ہو کر اپنے اپنے ملک کی طرف سے جنگ میں شریک ہوئے۔ اس کے برعکس کمیونسٹ نہ صرف جنگ میں شریک نہ ہوئے بلکہ عدم شرکت کا پرچار کرتے رہے اور قانون کی آہنی گرفت میں آ گئے۔ سوشلسٹ اس داعیہ سے جنگ میں کود پڑتے کہ اپنے ملک کی فلاح و صلاح باقی سب چیزوں سے بالا ہے اور ملک کو بچانا ان کے معاشی عقیدے کا نقیض نہیں۔ یہ ملکی عصبیت کا مظاہرہ تھا۔ کمیونسٹ اس اصول پر جنگ سے الگ رہے کہ یہ جنگ سرمایہ

داروں کی جنگ ہے اور یہ نظام سرمایہ داری کے باطنی تضادات سے پیدا ہوئی ہے اور اسی کے لیے وہ عرصہ سے منتظر تھے۔ اب جب کہ اس کا عمل ظہور پذیر ہوا ہے اس میں کسی رنگ میں شامل ہونا خود کیمونزم کو جھٹلانا ہے۔ سٹالن اور ٹراٹسکی میں یہی اختلاف تھا۔ اوّل الذکر نے برسر اقتدار آ کر عالمگیر انقلاب برپا کرنے کے خیال کو اپنے لائحہ عمل سے خارج کر دیا اور اس بات پر مصر ہوا کہ پہلے روس کی حالت کو بہتر کیا جائے۔ یہ مارکس کے اصول کی روشنی میں کیمونزم کو جھٹلانا ہے اور کیمونزم سے سوشلزم کی طرف لوٹنا ہے۔ ٹراٹسکی جو کٹر مارکسی تھا اس رجوع سے متفق نہ ہو سکا۔ اور اسی اختلاف کی بدولت اس کو ملک سے مفرور ہونا پڑا۔ جنگ عظیم سے پہلے سٹالین نے جو فوجی تیاریاں کر رکھی تھیں ان کو دوسرے ممالک کے کیمونسٹ حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ ملک گیری اور عسکری نظام کیمونزم کے نظریے کے مخالف ہیں۔ کیمونزم مزدوروں اور سرمایہ داروں میں جنگ برپا کرنے کی حامی ہے، مگر ملکی جنگوں کی سخت مخالف ہے۔ سوشلزم کو بھی جنگ سے نفرت ہے اور امن کی حامی ہے لیکن اس کے بطن میں بھی قومیت پرستی اور ملکی عصبیت کا جذبہ چھپا ہوا ہے کہ جونہی جنگ چھڑتی ہے اور ملک و قوم مضطرب نظر آتے ہیں سوشلسٹ اپنی امن پسندی کو بالائے طاق رکھ کر میدان میں کود پڑتے ہیں۔ پچھلی جنگ عظیم میں مسولینی جو مشہور سوشلسٹ قائد اور ایڈیٹر تھا اور جس کی ذات سے اطالوی سوشلسٹوں کی بڑی امیدیں وابستہ تھیں اٹلی کی حفاظت کے لیے جنگ کا شدید حامی ہو گیا اور خود شریک جنگ ہوا۔ دوسری جنگ عظیم میں بھی خود انگلستان میں ایسی روشن مثالیں ملتی ہیں۔ جب دارالعوام میں اعلانِ جنگ کا مسئلہ زیر بحث تھا، لیبر پارٹی اور سوشلسٹ پارٹی کے ممبروں نے بڑھ چڑھ کر جنگ کے حق میں تقریریں کیں۔ مگر دو کیمونسٹ مسٹر میکسٹن اور مسٹر گیلیکر (Gallicher) اعلان جنگ کے مخالف رہے۔

سوشلزم اور کیمونزم میں یہ فرق اس واسطے اہم ہے کہ اس کی روشنی میں دونوں قسم کی حکومتوں کی خارجہ پالیسی کے میلان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ الغرض کیمونزم بین الاقوامی نظریات میں کھو جاتی ہے اور سوشلزم ملکی عصبیت سے مغلوب ہو کر اس نظریہ سے منحرف ہو جاتی ہے اور اس پر نیشنل سوشلزم کا رنگ چڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔

سنڈیکیت

سنڈیکیت (Syndicalism)

سرمایہ داری کے خلاف عالمگیر بغاوت پیدا ہو چکی تھی' اور اس بغاوت کا مؤسس اعلیٰ کارل مارکس تھا لیکن امتدادِ زمانہ سے اور مختلف ممالک کے مخصوص حالات کے مطابق اس بغاوت نے مختلف صورتیں اختیار کر لیں۔ ان کے بعض مظاہر کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب ہم ایک اور تحریک کی طرف متوجہ ہوتے ہیں جو سنڈیکیت (Syndicalism) کے نام سے معروف ہے۔ اگرچہ اس وقت یہ اپنی اصلی صورت میں کہیں بھی موجود نہیں تاہم اس کی تاریخی اہمیت مسلّم ہے۔ اس کا زاد بوم فرانس ہے۔ اس کا آغاز انجمن مزدور سے ہوا اور اس انجمن کو برقرار رکھنے اور اس کو ترقی دینے کے لیے مناسب اصول وضع کیے گئے۔ یعنی سنڈیکیت کا جنم کسی نظریے سے نہیں ہوا' اور جو نظریے اب اس سے متعلق بتلائے جاتے ہیں وہ بعد میں بنائے گئے تاکہ یہ انجمن مزدور جس کے بطن سے یہ تحریک پیدا ہوئی قائم رہے۔ کیونکہ ہر منظم تحریک کے لیے کچھ اصول وضع کرنے لازمی ہیں کیونکہ اصول اس کے لیے بمنزلہ خوراک اور غذا کے ہوتے ہیں اور ان سے اس تحریک کی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ سوشلزم اور انارکزم کا معاملہ بالکل برعکس ہے۔ یہ دونوں تحریکیں ایک نظریے سے پیدا ہوئیں اور تنظیم بعد میں وجود میں آئی' تاکہ اس نظریہ کو عملی جامہ پہنایا جا سکے۔ آگے چل کر سنڈیکیت اور دوسری معاشی تحریکوں کے فرق پر سیر حاصل بحث ہوگی لیکن یہ وہ فرق ہے جو ان کی پیدائش میں مضمر ہے اور اس کا ذکر ابتداء میں کر دیا گیا ہے۔

یہ تحریک فرانس میں کیوں پیدا ہوئی؟ اس کے بھی تاریخی وجوہ ہیں۔ ۱۸۷۰ء کی جنگ نے تمام معاشی تحریکات کا قلع قمع کر دیا اور تقریباً سات سال تک ملک میں کوئی عمرانی اصلاح کی آواز تک بلند نہ ہوئی۔ آخر ۱۸۷۷ء میں Jules Geiesde نے تحریک سوشلزم کو از سرِ نو زندہ کیا۔ لیکن سوشلسٹ کئی جماعتوں میں بٹ گئے اور ان کے اصول اور طریقہ کار میں گہرا اختلاف رونما ہو گیا۔ جو آئینی طریق کے حامی تھے' ان کے بعض لیڈر پارلیمنٹ میں منتخب ہو کر اشتراکی اصولوں سے منحرف ہو گئے بلکہ خود انھوں نے اشتراکیت کو کچلنا شروع کر دیا۔ انحراف کے مسلسل واقعات سے اشتراکی جماعت میں یہ خیال راسخ ہو گیا کہ سیاست ان کی تحریک میں پیچیدگیاں پیدا کرنے کی ذمہ دار ہے اور راہنما اپنی شاہراہ سے ہٹ کر سیاست میں جذب ہو جاتے ہیں اور اپنے سیاسی غلبہ کو قائم رکھنے کے لیے وہ خود

تحریک کے دشمن ہو جاتے ہیں۔

جوں جوں یہ خیال جڑ پکڑتا گیا' سیاست سے نفرت بڑھتی چلی گئی اور انجام کار یہ طے پایا کہ انجمن مزدور (Trade union یا Syndicate) کو مرکزی حیثیت حاصل رہے اور اس کے قول و عمل میں سیاست دخل انداز نہ ہونے پائے۔ خیالات کی اس رو سے سنڈیکیت پیدا ہوئی۔ یہ مزدور کو پیدائش دولت کا عامل (Factor) سمجھتی ہے۔ یہ انڈسٹری (صنعت و حرفت) کی اصلاح اور تنظیم کی خواہاں ہے اور پیدائش دولت کے عمل کو آسان اور دلپذیر بنانا چاہتی ہے۔ یہ محض مغالطہ ہے کہ اس کا مقصد فقط اجرت کی شرح کو بڑھانا ہے۔ مزدوروں کی تنظیم ہی اس تحریک کا مرکز و محور ہے' باقی کام اور محنت کی اصلاح کا خیال بعد کی چیزیں ہیں تاکہ مرکز قوی سے قوی تر ہوتا چلا جائے۔ سیاست کو کلی طور پر ترک کر دینے کے بعد اس کا محاذ جنگ خود کارخانے ہو جاتے ہیں اور اس جنگ کی کئی شکلیں ہیں اور ان تمام کا مقصد وحید یہ ہے کہ سوسائٹی اور ریاست دونوں مفلوج ہو کر رہ جائیں اور انجمن مزدور (Syndicats) ملک میں کامل مقتدر ہو جائے۔

جمہوری بگاڑ اور فساد میں اس تحریک کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ ابتداء میں تو یہ غیر قانونی قرار دی گئی اور اس کے حامیوں کو شدید مصائب کا سامنا کرنا پڑا۔ مگر ۱۸۸۴ء میں حکومت نے مجبور ہو کر ان مزدور انجمنوں کو رام کرنے کے لیے ان پر مربیانہ توجہ مبذول کرنا شروع کی اور مالی امداد سے یہ کوشش کی کہ یہ اپنا میدان عمل سماجی اصلاح بنا لیں۔ مزدوروں میں بے اطمینانی اور اضطرابی پھیلانے کی بجائے ان کو تعلیم دیں مزدور اپنے حقوق کے حصول کے لیے پُرامن رہیں لیکن یہ مصلحت آمیز نرمیاں کارگر ثابت نہ ہوئیں کیونکہ جس تحریک کا خمیر بغاوت سے اٹھایا گیا تھا وہ قانون کے دائرے میں نہیں رہ سکتی تھیں۔ نتیجہ اس کے برعکس ہوا۔ یہ تحریک انتہا پسندوں کی قیادت میں آ گئی۔ ۱۸۹۵ء میں انارکسٹ اس تحریک کے رہنما ہو گئے اور انھوں نے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی جو (Confederation gererale Du C.G.T-travail) کے نام سے مشہور ہے۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ سیاسی سرگرمیوں کو ترک کر کے صنعتی شورش پیدا کی جائے۔ اس کے لیڈر جو انارکسٹ تھے انھوں نے اپنے اصول کار کو بدل لیا تھا۔ اس واسطے وہ اب سنڈیکلسٹ کہلاتے تھے کیونکہ انارکزم میں سیاست ہی سیاست ہوتی ہے اور سنڈیکلزم میں سیاست بالکل مفقود شدت عمل اور انتہا پسندی میں دونوں یکساں ہیں۔ مگر معاشی عقیدے کے لحاظ سے سنڈیکیت کمیونزم سے زیادہ مشابہ ہے۔

اجتماعی ملکیت (Collectivism) کا معاشی مطمح نظر یہ ہے کہ ملک کی دولت سب کی ملکیت ہے۔ انارکزم چاہتی ہے کہ یہ کسی کی ملکیت نہ ہو۔ سنڈیکیت اس کے برعکس یہ چاہتی ہے کہ ملک کی دولت صرف منظم مزدوروں کے قبضے میں ہو کیونکہ دولت کے اصلی پیدا کرنے والے یہی لوگ

ہیں۔ سنڈیکیت تمام عمرانی مسائل کا مزدور کی نظر سے مطالعہ کرتی ہے اور اصول کار اور مآل کار کو وضع کرنے میں بھی مزدور اور فقط مزدور ہی پیش نظر ہوتا ہے۔ نظریہ کے لحاظ سے یہ کمیونزم سے مشابہ ہے۔ شورش پسندی اور انقلاب آفرینی میں یہ انارکزم کے ہم پلہ ہے مگر بایں ہمہ یہ ان دونوں سے مختلف ہے۔ کیونکہ یہ انقلاب کا آغاز صرف کارخانوں سے کرتی ہے۔ چاہے اس کی شکل ہڑتال ہو چاہے یہ ہو کہ مزدور کارخانوں کو مسمار کر دیں اور اگر اس کا فوری امکان نہیں تو مزدور اس طرح سے کام کریں کہ کارخانہ دار کو خسارہ ہو۔ اس کی کئی صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً اتنے انہماک سے کام کیا جائے کہ کام تو عمدہ ہو مگر مقدار بہت ہی قلیل ہو اور مالک کی لاگت بہت بڑھ جائے۔ یا اتنی عجلت سے کیا جائے کہ مقدار میں اضافہ تو ہو جائے مگر مال خراب ہو۔ ایک یہ بھی صورت ہو سکتی ہے کہ مزدور اور کارخانہ داروں کے دوسرے ملازم کارخانہ کی اشیاء کے خراب ہونے کا پروپیگنڈا کریں اور خریداروں کو کارخانہ سے بدظن کر دیں۔ الغرض کارخانہ دار کو دیوالیہ بنانے کی ہر ممکن صورت سنڈیکیت کے منشور میں آ جاتی ہے۔ بظاہر طریق کار سے کمیونزم اور انارکزم میں بہت اختلاف ہے۔ ان دونوں تحریکوں کا میدان عمل اور محاذ جنگ سنڈیکیت سے زیادہ وسیع ہے۔ سوشلزم کا اختلاف بھی واضح ہے کیونکہ سوشلزم آئین کے دائرہ میں رہ کر کام کرنے کی حامی ہے جب سے سنڈیکیت کا پہلا حملہ سٹیٹ پر پڑتا ہے اور اس کے حامی ملک کے قانون سے کسی نیکی کی توقع نہیں رکھتے کیونکہ انارکسٹوں کی طرح ان کا بھی یہ عقیدہ ہے کہ قانون ایک لعنت ہے جو سرمایہ داروں نے سوسائٹی پر مسلط کر رکھی ہے۔ پھر یہ ہم بتلا آئے ہیں کہ سنڈیکیت کا آغاز سوشلسٹ جماعتوں کے فتور سے ہوا ہے اور جب سوشلسٹ لیڈروں کی آئین پسندی نے تمام مزدوروں کو سیاست سے بدظن کر دیا تو مزدور انجمنوں (Syndicate) نے ٹھان لی کہ سیاست کو بالکل خیرباد کہہ دیا جائے کیونکہ یہ مخرب اخلاق ہے اور مقصد کے حصول میں ایک روک۔

سنڈیکی نظریے کی تشریح اس تحریک کے حامیوں کے مقاصد سے ہو سکتی ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

اوّلاً: سنڈیکیت کا پیرو طبقاتی جنگ کو بطور اذعانی عقیدہ (Dogma) کے تسلیم کرتا ہے اور اس جنگ کو شدید ترین صورت میں لڑنے کا قائل ہے۔ ایک کمیونسٹ بھی اس کو ناگزیر سمجھتا ہے۔ لیکن فرق یہ ہے کہ کمیونسٹ یہ خیال کرتا ہے کہ یہ فلسفہ تاریخ کی ایک شاخ ہے اور سنڈیکیت کا حامی اس کے علمی پس منظر کا قائل نہیں۔ وہ خود اس کو لائحہ عمل سمجھتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس جنگ کو چلانے میں ہر قسم کے مجرمانہ تشدد کو روا رکھتا ہے۔

ثانیاً: سنڈیکیت کا علمبردار ایک کمیونسٹ کی طرح اس بات کو جائز اور مباح تصور کرتا ہے کہ سرمایہ داروں سے ان کے املاک جبری طور پر چھین لیے جائیں اور ان کی کسی رنگ میں تلافی نہ کی جائے۔ اسی طرح وہ مالکانِ اراضیات کو سرمایہ داری کا مظہر سمجھ کر ان کی آراضی بھی جبراً حاصل کرنا چاہتا

ہے اور کاروبار میں ہر قسم کے مقابلے کو ممنوع قرار دیتا ہے۔

ثالثاً: وہ کمیونزم کے نظریہ ''اقدار زائد'' (surplus value) کو تسلیم کرتا ہے۔ مانتا ہے کہ پیدائش دولت کے عمل میں مزدور کو اپنے کام کی مقدار کے مطابق معاوضہ نہیں ملتا۔ اس کی اجرت قوت لایموت کا حکم رکھتی ہے۔ حالانکہ اس کی محنت و کاوش سے جو دولت وجود میں آتی ہے وہ کہیں بڑھ چڑھ کر ہوتی ہے۔ اس کی قلیل اجرت کو چھوڑ کر جو دولت فاضل رہ جاتی ہے وہ سب کی سب سرمایہ دار سمیٹ کر لے جاتا ہے لیکن یہاں بھی کمیونسٹ کے ساتھ اس کو کامل اتفاق نہیں' وہ اس نظریے کو اس واسطے نہیں مانتا کہ یہ ٹھیک ہے بلکہ اس کو محض آلہ کار کے طور پر استعمال کرتا ہے کیونکہ اس کی تشہیر سے مزدوروں میں سخت ہیجان پیدا کیا جا سکتا ہے۔ سنڈیکیت کا مدعا فقط یہ ہے کہ مزدور آمادہ بغاوت ہو جائیں اور سرمایہ داروں کے خلاف علانیہ میدان جنگ میں اتر آئیں۔ اس لیے اس کے نزدیک جواز اور عدم جواز کا کوئی مسئلہ نہیں۔ وہ ہر اس چیز کو اپنے پروگرام میں شامل کرنے کے لیے تیار ہے جو مزدوروں میں اشتعال پیدا کر دے۔ یہ نظریہ بھی کمیونسٹ پروگرام سے مستعار ہے کیونکہ اس سے سرمایہ دار ظالم ثابت ہوتا ہے۔ اس کے برعکس کمیونسٹ اس نظریہ کے علمی فوائد اور نقصان پر بحث کر کے ثابت کرتے ہیں کہ سرمایہ داری میں ایسا ہوتا ہے اور ہو رہا ہے کہ یہ مزدور کے حقوق پر کھلا ڈاکہ ہے۔ وہ اس کی علمی حیثیت کو مقدم اور عملی پہلو کو موخر قرار دیتے ہیں۔ مگر جیسے بیان ہو چکا ہے سنڈیکیت کے حامی اس کے علمی پہلو کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے۔ وہ اس پر محض اس لیے زور دیتے ہیں کہ وہ مزدوروں کو مشتعل کر کے سرمایہ داروں کے خلاف لڑا سکیں۔ کمیونزم کوئی کم تباہ کن تحریک نہیں۔ لیکن سنڈیکیت محض تخریب ہی تخریب ہے۔ اس تحریک کا سلبی پہلو تو بالکل عیاں ہے مگر ایجابی پہلو بالکل مفقود ہے۔ یہ حیرت کا مقام ہے کہ فرانس جو تہذیب و تمدن اور علوم و فنون کا گہوارہ رہا ہے اس میں ایک ایسی عمرانی تحریک پیدا ہو جو سرمایہ داری کو مٹانے کے لیے تو بے تاب ہو' اور اپنے انقلابی پروگرام کو عالمگیر بنانے کے لیے ہر انتہا پسندی کو جائز سمجھے اور جذبات نفرت کو ہوا دے کر اقتصادی زندگی کو مفلوج کر دے۔

مندرجہ بالا کوائف سے ظاہر ہے کہ سنڈیکیت ایک ایسی تحریک ہے جس میں زمام قیادت کسی خاص راہنما کے پاس نہیں ہوتی اور اس کی جنگ کی شکل یہ ہے کہ مزدور کارخانوں میں داخل ہو کر سب نظم و نسق کو درہم برہم کر دیں اور کارخانہ داروں کو موت کے گھاٹ اتار دیں اور ملک کے تمام کارخانوں میں یہی خونی منظر دیکھنے میں آئے۔ اس میں کسی کو کلام نہیں ہو سکتا کہ اس تحریک کا وجود اس بات کا بین ثبوت ہے کہ یہ نہایت ناگوار اور انسانیت سوز کاروائیوں کا ردعمل ہے اور جوں جوں مزدور کی زندگی ناقابل برداشت ہوتی جائے گی اسی قدر وہ جذبہ نفرت سے مغلوب ہوتا چلا جائے گا اور وہ عقل کو بالائے طاق رکھ کر انتقام لینے پر آمادہ ہو جائے گا۔ اب اگر یہ سوال کیا جائے کہ سنڈیکیت جیسی انتہا

پسندانہ تحریک کے موجبات کیا ہیں؟ تو اس کا جواب اس تحریک کی تاریخ میں مضمر ہے اور اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مزدور پہلے پہل امید اور امنگ کے ساتھ سوشلزم کے جھنڈے کے نیچے جمع ہوئے اور ہر قسم کی قربانی کے لیے تیار تھے تاکہ سرمایہ داروں کی ظالمانہ حکمرانی ختم ہو۔ ان کو اپنے لیڈروں پر کامل اعتماد تھا۔ جب عمل کا وقت آیا تو لیڈروں نے غداری کی۔ اپنے ذاتی مفادات اور سربلندی کی تکمیل کے لیے تحریک کو پس پشت ڈال دیا۔ اس غداری سے وہ نہ صرف سرمایہ داری سے اور متنفر ہو گئے بلکہ قیادت کے اصول سے بدظن ہو گئے اور ان کے ذہن میں یہ بات راسخ ہو گئی کہ لیڈر کبھی معاون و مددگار نہیں ہو سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ سنڈیکی تحریک میں قائد کا وجود ناپید ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس میں خونخواری اور خون ریزی ہے اور اس کی جنگ میں کوئی نظم و ترتیب نہیں۔ اس کے علاوہ جمہوری حکومت کی بدعنوانیوں نے مزدوروں کو سیاسی تنظیم کے اصول سے بھی متنفر کر دیا اور وہ اتنے مضطرب ہو گئے کہ ان کا نظریہ صرف کسوٹ بن گیا۔ بڑے بڑے کارخانوں میں مزدوروں کی تباہ حالی نے انتہائی غم و غصہ پیدا کر دیا اور جب اس کو سرمایہ دار کے خلاف صف آراء ہونے کا موقع ملا تو اس کی تمامتر توجہ صرف اس بات پر مرتکز ہو گئی کہ رائج الوقت نظام پارہ پارہ ہو جائے اور اس کی آتش انتقام خون سے سرد ہو۔ اس ہنگامہ خیزی اور انقلاب آفرینی کے ساتھ ساتھ مزدور کے دل میں ایک امید موجزن ہوتی ہے کہ سرمایہ داروں کی تباہی سے وہ کارخانوں پر قابض ہو جائے گا' ملک کی دولت کا بے روک ٹوک مالک بن جائے گا اور اس کی پُر آلام زندگی عیش و نشاط میں بدل جائے گی۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی بدولت مزدوروں کی بغاوت نے سنڈیکیت کی صورت اختیار کر لی۔ جس میں نہ کوئی قیادت و رہنمائی کا اصول ہے اور نہ لائحہ عمل میں تعمیر کے اصول کو مدنظر رکھا جاتا ہے۔ جذبات کی بے راہ روی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا اور تحریک کے پیچھے ایک ہی ہیجان ہے اور وہ یہ کہ سرمایہ داروں پر دھاوا بول کر سوسائٹی کے نظام کو پارہ پارہ کر دیا جائے۔ ایسی تحریک کی ناکامی و نامرادی اظہر من الشمس ہے کیونکہ مزدوروں کا سرمایہ داروں کے خلاف ایک نعرہ جنگ پر اکٹھا ہو جانا تو بالکل ممکن ہے اور یہ بھی قیاس ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی ہجومی یورش سے کارخانوں کو تباہ کر دیں' اگر یہ شورش وسیع پیمانے پر رونما ہو جائے مگر یہ کبھی نتیجہ خیز نہیں ہو سکتا کیونکہ اس تمام ہنگامے میں اثبات کا پہلو کوئی بھی نہیں۔ کیا مزدور تباہ شدہ کارخانوں کو ازسرنو چلا سکتے ہیں؟ کیا ان میں اتنی صلاحیت کار ہے کہ پیدائش دولت کے تمام عوامل کو از روئے کار لا سکیں گے تاکہ ملک افلاس و ہلاکت کا شکار نہ ہو جائے۔ کیا وہ کاروبار اور تجارت کی باریکیوں کو سمجھ سکتے ہیں اور دوسرے ممالک کے ساتھ جو اس طوائف الملوکی سے محفوظ ہیں تاجرانہ تعلقات استوار رکھ سکتے ہیں؟ چونکہ یہ تحریک تہس نہس کرنے پر ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اس واسطے اس کا مستقبل نہایت تاریک ہے۔ اس کی کامیابی چھوٹے سے چھوٹے پیمانے پر بھی

ناممکنات میں سے ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسری عمرانی تحریکیں کسی نہ کسی ملک میں چھوٹے بڑے پیانے پر کچھ عرصہ کے لیے کامیاب ہوئیں مگر سنڈیکیت ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ اِدھر اس نے سر اٹھایا' وہیں قانون کی قوت نے اس کو کچل دیا۔

جب کوئی عمل حد اعتدال سے متجاوز ہو جائے تو اس کے عواقب بہت ہولناک ہوتے ہیں۔ جس طرح سرمایہ داری کی بے اعتدالیوں نے مختلف احتجاجی اور باغیانہ تحریکیں پیدا کیں اور سنڈیکیت بھی انہی میں سے ایک ہے' اسی طرح سنڈیکیت کی حد سے بڑھی ہوئی شدت اور امن سوزی نے بھی ایک خطرناک ردعمل پیدا کر دیا اور یہ فسطائیت کی شکل میں ظاہر ہوا۔ جنگ عظیم کے بعد اٹلی کی حکومت بہت کمزور ہو گئی تھی اور بالشویک نظریہ لوگوں کے دماغوں پر غلبہ پا رہا تھا۔ سوشلسٹ پارٹی کو ملک میں کافی اقتدار نصیب ہو چکا تھا۔ پارلیمنٹ میں بھی اس کا زور تھا' مگر سوشلسٹ لیڈروں کی غداری نے مزدوروں کی آتش بغاوت کو اور بھی مشتعل کر دیا تھا۔ اطالوی آمر مسولینی بھی ان قائدین میں سے تھا جنھوں نے زمانے کی ہوا کے رخ کے ساتھ اپنے اصولوں کو بدل لیا۔ اب کیا تھا' ملک میں ہلڑ مچ گیا۔ مزدوروں کی شورش نے سنڈیکیت کی شکل اختیار کر لی' اور ہر کارخانے میں ہڑتال کا بازار گرم ہو گیا۔ مزدوروں نے کارخانے مسمار کرنے شروع کر دیے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عوام بھی ان کی حرکات سے بیزار ہو گئے۔ حکومت پہلے ہی سے ایسے موقع کی تاک میں تھی کہ لوگوں کی پشت پناہی حاصل ہو اور وہ مزدوروں کی سنڈیکی تحریک کو کچل کر رکھ دے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ مسولینی نے اقتدار حاصل کر کے اور قانون کو ہاتھ میں لے کر اس پر ایسی ضربیں لگائیں کہ یہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی اور ایک ایسا نظام حکومت وضع کیا جس کے ہوتے ہوئے مزدور کبھی معمولی سے معمولی انجمن نہیں بنا سکتے تھے۔ یہ نظام فسطائیت (فاشزم) کے نام سے مشہور ہے اور اس کو عملی جامہ پہنانے والا مسولینی ہے۔

عمرانی مبصرین کا خیال ہے کہ یہ نظام مزدوروں کی خونی شورش کی وجہ سے معرضِ وجود میں آیا اور جہاں سنڈیکیت وجود میں آئی وہاں سرمایہ دارانہ حکومت فسطائی ہتھکنڈوں اور قانون کی طاقت سے اس کو توڑ دے گی۔ وہاں سرمایہ دارانہ حکومت فسطائی چولا پہن کر اور قانون کی بے پناہ طاقت کو عمل میں لا کر مزدور انجمنوں کو توڑ دے گی اور ہمیشہ کے لیے اس کو ممنوع قرار دے گی۔ فسطائیت حکومت اور سرمایہ دار کے ''عسکری اتحاد'' کا نام ہے۔ یہ اسی وقت بروئے کار آتا ہے جب مزدور بے قابو ہو کر ملک کے لیے خطرے کا موجب بن جاتے ہیں۔

گلڈ سوشلزم

(Guild Socialism)

سنڈیکیت فرانس میں پیدا ہوئی اور اٹلی میں جنگ عظیم کے بعد کچھ عرصہ کے لیے بروئے کار آئی۔ مگر انگلستان میں اسے کوئی قبولیت نصیب نہ ہوئی۔ انگلستان میں ایسے نوجوانوں کا ایک طبقہ پیدا ہو گیا جو حالات حاضرہ سے بیزار اور انقلاب کے خواہاں تھا۔ مگر انقلاب سے ان کی دلچسپی علمی حد تک محدود تھی۔ ان کی علمی سرگرمیوں سے ایک نظریہ پیدا ہوا' جو "گلڈ سوشلزم" کہلاتا ہے۔ اس کو فیبئن ازم (Fabianism) جس کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور سنڈیکیت میں برزخ کی حیثیت حاصل ہے۔ ۱۹۱۲ء میں یہ پیدا ہوا اور دس سال تک علمی بحث و تمحیص کا موضوع بنا رہا۔ ۱۹۱۵ء میں National guilds league (نیشنل گلڈز لیگ) بنی' جس کا کام یہ تھا کہ اس نظریے کا مزدوروں میں پرچار کرے۔ اس کے مشہور لیڈر ہابسن (Mr.S.G.Hobson) اور کول (G.D.N.Cole) تھے۔ اس کے اصول کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سنڈیکیت کی طرف زیادہ مائل ہے۔ یہ اصول مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ گلڈ سوشلزم (پیشہ ورانہ اشتراکیت) کے حامی صنعت و حرفت میں کامل آزادی چاہتے ہیں۔ یعنی وہ انڈسٹری (صنعت و حرفت) کو سرمایہ کے غلبے کارخانوں کے ضبط اور حکومت کے جبر و اختیار سے آزاد کرانا چاہتے ہیں اور ان کا نصب العین یہ ہے کہ ہر پیشہ اور صنعت اپنے اپنے دائرے میں مختار کل ہو۔

۲۔ ہر پیشے اور صنعت سے وابستہ لوگوں کی ایک الگ تنظیم ہونی چاہیے تاکہ وہ لوگ منظم ہو کر اپنے اپنے پیشے کو احسن طریق سے چلا سکیں اور اپنے نگران خود منتخب کریں۔ وہ اپنے اوقات کار متعین کریں۔ اسی طرح اجرت اور قیمت کو بھی یہ لوگ خود مقرر کریں تاکہ اشیاء کی پیدائش اور ان کی خرید و فروخت میں کسی قسم کی روک پیدا نہ ہو اور دولت آفرینی کا عمل ایک خاص نہج پر چلتا رہے۔

۳۔ ان تمام پیشہ ورانہ تنظیموں کو ایک ملک گیر نظام سے وابستہ کر دیا جائے تاکہ اس کی بدولت ان سب میں ہم آہنگی رہے اور تجارتی اور صنعتی پالیسی کا نفاذ اس قومی ادارہ کی طرف سے ہو۔ یہ معاشی منصوبہ بندی کی شکل ہے۔ اگر ایک اعلیٰ قومی ادارہ نہ ہو تو مختلف پیشوں میں

توازن مٹ جائے گا اور بجائے تعامل و تعاون کے تصادم کا رنگ آ جائے گا اور قیمتوں کے تقرر کا مسئلہ بھی لا ینحل ہو کر رہ جائے گا۔

۴۔ یہ ظاہر ہے کہ معاشی منصوبہ بندی (Economic planning) زندگی کے گوناگوں پہلوؤں پر محیط نہیں ہو سکتی چونکہ دولت کی پیدائش اور افزائش ایسی ہی اہم ہے جیسے اس کا استعمال اس واسطے ایک ایسا ادارہ جو اقتصادیات کے صرف ایک پہلو یعنی دولت آفرینی کا نگران ہو وہ مختار مطلق ہو کر ملک میں بدامنی پیدا کر دے گا۔ اس واسطے ضروری ہے کہ ایک اور متوازی سیاسی ادارہ ہو' جو غیر اقتصادی مسائل پر غور کرے اور ان کا حل سوچے' بیرونی پالیسی کا محافظ ہو اور ان عوام کا نگہبان ہو جو Consumers کہلاتے ہیں۔ یعنی خود دولت پیدا نہیں کرتے بلکہ کارخانوں اور منڈیوں سے خرید کر استعمال کرتے ہیں۔ یہ سیاسی ادارہ اس بات کا مجاز ہو کہ پیشہ ورانہ تنظیموں (Producers guilds) کو حدِ اعتدال سے متجاوز نہ ہونے دے۔

اس تحریک کی یہ چوتھی شق دو عملی کا رنگ پیدا کر دیتی ہے اور یہی چیز اس کو سنڈیکیت سے الگ کرتی ہے کیونکہ سنڈیکیت میں سیاست کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ ہر قسم کی تنظیم کا زاویہ نگاہ معاشی اور اقتصادی ہوتا ہے اور کسی وقت بھی سیاست دخیل کار نہیں ہو سکتی اور اس دو عملی سے نقصان کا بہت ڈر ہے۔ اگر ان دونوں تنظیموں میں ٹکراؤ ہو جائے تو کارخانوں میں طوفانِ بدتمیزی پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ چونکہ کارخانوں پر ایک قسم کا سیاسی احتساب ہو گا اس واسطے ان میں خاص بددلی پیدا ہو جائے گی۔ اختراع اور ایجاد کا دروازہ بند ہو جائے گا اور کچھ عرصے کے بعد صنعت پر تعطل اور جمود طاری ہو جائے گا۔ دولت کی پیداوار کم ہو جائے گی۔ جس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ قیمتیں چڑھ جائیں گی اور عوام کو معاشی تکلیف کا سامنا ہو گا۔ اس کے علاوہ اس دو عملی میں ایک بہت بڑی قباحت یہ ہے کہ پیشہ ور تنظیمیں Producers guilds کارخانوں پر مسلط ہو جائیں گی۔ اس طرح وہ تمام ضروریاتِ زندگی اور دیگر وسائل حیات پر بھی قابض ہوں گے۔ اس معاشی اقتدار کو معقول حدود میں مقید رکھنا بہت مشکل کام ہے اور Consumers councils بھی اس کے سامنے عاجز ہوں گی چونکہ ان دونوں میں رقابت ہو گی اور دونوں ایک دوسرے کو مغلوب رکھنے کی فکر میں ہوں گی' اس کا لازمی نتیجہ یہ ہو گا کہ ان کی باہمی رقابت خانہ جنگی کی صورت اختیار کر لے گی اور ملک میں ہنگامہ برپا ہو جائے گا۔ اگر یہ صورت حال نہ بھی پیدا ہو تب بھی آپس کی کشمکش اور معاندانہ و حریفانہ سرگرمیاں ضرور اپنا رنگ لائیں گی۔ ملک کی دولت کم ہونی شروع ہو جائے گی اور انجام کار ملک دیوالیہ ہو جائے گا۔ ۱۹۲۰ء میں انگلستان میں تعمیراتی تنظیم Builders guild قائم ہوئی۔ تعمیرات کے لیے وسیع میدان تھا اور لوگ

بھی مخالف نہ تھے۔ تاہم دو سال بھی نہ گزرنے پائے کہ سارا کھیل ختم ہو گیا' اور ملک کا کثیر سرمایہ اس اقتصادی تجربے کی نذر ہو گیا۔

تدریجی سوشلزم

(Fabian Socialism)

۱۸۸۴ء میں انگلستان کے چند مفکرین سڈنی ویب' مسز ویب' جارج برنارڈ شاہ' بیٹرائس پوٹر' سڈنی الیور' گراہم والس' مسز اینی بیسنٹ' ایچ جی ویلز' کول اور لاسکی وغیرہ نے ایک انجمن کی بنیاد ڈالی' جس کے بنیادی اصول حسب ذیل ہیں:

۱۔ بڑی بڑی صنعتوں کو حکومت اپنی تحویل میں لے لے تاکہ اجارہ داریاں ختم ہو جائیں۔
۲۔ عوام پر ٹیکس بہت ہلکے ہونے چاہئیں۔
۳۔ ریاست کا وجود معاشرتی نظم و نسق کے لیے ضروری ہے۔
۴۔ سیاسی امور میں مرد اور عورتیں مساوی حقوق رکھتی ہیں۔
۵۔ سرمایہ دار مزدور طبقے کو حقوق ادا نہیں کرتا۔
۶۔ اقتصادی انقلاب تدریجی اور آہستہ آہستہ لایا جائے تاکہ معاشرہ میں کسی قسم کی بدامنی پیدا نہ ہو۔ وہ مارکسزم کی طرح لوٹ کھسوٹ اور خون خرابے کے قائل نہ تھے۔
۷۔ تدریجی سوشلزم کے نظریہ کی بنیاد مادہ نہیں ہے بلکہ وہ روحانی اقدار کو معاشرہ کے لیے ضروری قرار دیتا ہے۔

انگلستان میں تدریجی سوشلزم کا اثر

لیبر پارٹی تدریجی سوشلزم (Fabian Socialism) کی پیداوار ہے اور ۱۹۱۵ء میں ویب نے ہی لیبر پارٹی کا منشور مرتب کیا تھا۔ معاشرتی اصلاحات کے لیے فیبیس تحقیقاتی ادارے قائم ہوئے۔ لیبر حکومتوں نے فولاد اور کوئلے کی صنعت کو قومیانے کا کارنامہ سرانجام دیا۔

انارکزم کا علمی تجزیہ

ظلم کو بقا نہیں کیونکہ یہ منشاء قدرت کا نقیض ہیں۔ تاریخ ظالموں اور جابروں کے عبرت آموز انجام سے معمور ہے۔ جس طرح بعض اشخاص ظلم و تعدی کے پیکر ہوتے ہیں اور دنیا کو قوت بازو سے تسخیر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی طرح بلکہ اس سے بڑھ کر بعض ایسے مسالک اور نظریات پیدا

ہو جاتے ہیں۔ جن کی تباہ کاریاں بڑے سے بڑے قاہر فاتحین سے بڑھ کر ہوتی ہیں۔ فاتح انسانوں کے جسم کو مغلوب کرتا ہے مگر ہلاکت آفریں نظامات اور نظریات انسانوں کے دل و دماغ کو مسموم اور ان کی فطرت کو مسخ کر دیتے ہیں۔ لیکن اس تخریبی عمل کو دوام نصیب نہیں ہوتا۔ جونہی اس میں افراط کی کیفیت پیدا ہوتی ہے' اس کے خلاف اتنا ہی شدید ردِعمل شروع ہو جاتا ہے اور جب تک ظلم قائم رہتا ہے اس کے خلاف جدوجہد جاری رہتی ہے۔ انسانی حیات کے ہر شعبے میں عمل اور روعمل کا چکر چلتا نظر آتا ہے۔ اسی طرح دنیا میں کوئی نظام چاہے سیاسی ہو یا معاشی' جب ظلم کی طرف مائل ہو جاتا ہے تو وہی لوگ جو ظلم کا نشانہ بنے ہوئے ہوتے ہیں اس کے خلاف سربکف کھڑے ہو جاتے ہیں۔

ہم مختلف معاشی نظاموں کے مختلف پہلوؤں پر تبصرہ کر رہے ہیں اور یہ نظامات قائم بالذات نہیں ہیں بلکہ سماجی فساد کے نتیجے میں پیدا ہوئے ہیں۔ اس لیے بعض تحریکات مثلاً کمیونزم اور سوشلزم معاشی فساد سے پیدا ہوئی ہیں۔ اس لیے ان کا اقتصادی پہلو ان کے سیاسی پہلو سے زیادہ نمایاں ہے۔ ان میں اقتصاد مقدم اور سیاست مؤخر ہے۔ مگر مذکورہ بالا عنوان کے تحت ہمیں ایک ایسے نظام فکر کا ذکر کرنا ہے جو سارے سماج کو محیط ہے' مگر تنقیدی نقطہ ونظر سے اس کا سیاسی پہلو اس کے معاشی پہلو پر غالب نظر آتا ہے۔ سماج میں بیک وقت معاشی اور سیاسی رجحانات کارفرما ہوتے ہیں اور جب یہ نقطہ حد اعتدال سے ہٹ جاتے ہیں تو اس سماج میں معاشی اور سیاسی دونوں قسم کی خرابیاں رونما ہو جاتی ہیں اور ان کے ازالے کے لیے جو تحریکات پیدا ہوتی ہیں وہ بھی بیک وقت معاشی اور سیاسی پہلوؤں پر مشتمل ہوتی ہیں لیکن بعض میں سیاسی پہلو غالب ہوتا ہے اور بعض میں معاشی پہلو۔ اسی لحاظ سے ان کی مجوزہ اصلاحات میں بھی یہ فرق قائم رہے گا جس اصلاحی اور احتجاجی تحریک میں سیاسی رنگ غالب ہے وہ لامحالہ اپنی اصلاح کو بھی سیاست سے شروع کرے گی۔ اب جس تحریک کا تذکرہ پیش نظر ہے اس میں سیاست کو اوّلیت حاصل ہے اسی طرح اس کو ایسے سرپھرے لوگوں کا گروہ چلتا پھرتا نظر آتا ہے اور ان کی معاشی اصلاحات ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ یہ تحریک انارکزم (نراج) کے نام سے معروف ہے اور مذکورہ صدر تحریکات کی طرح اس کے متعلق بھی کچھ غلط فہمیاں رائج ہیں اور اس کے مرکزی اصول عام نظروں سے اوجھل ہیں۔

جونہی انارکزم (Anarchism) کا نام آتا ہے ایک عام سننے والے کے سامنے امن کو تہ و بالا کرنے والی کارروائیوں کا منظر سامنے آ جاتا ہے جو دائیں بائیں بم پھینک رہے ہیں اور ارباب اختیار کے علاوہ عوام کو بھی اپنے پستولوں اور ریوالوروں کا نشانہ بنا رہے ہیں اور تمام ملک میں آگ اور خون کی ہولی کھیل جاری ہے۔ اس لرزہ خیز تصور سے قوی سے قوی انسان بھی لرزہ براندام رہ جاتا ہے۔ حالانکہ انارکزم کی یہ تصویر بالکل خیالی اور گمراہ کن ہے۔ ایک انارکسٹ بم پھینکتا ہے' وہ سازشیں بھی کرتا

ہے وہ ملک کے قانون کے خلاف علم بغاوت بھی اٹھاتا ہے' اپنے نظریہ کے حصول کے لیے خونریزی سے گریز نہیں کرتا' لیکن وہ اپنی ان انسانیت سوز کاروائیوں کو قزاق اور رہزن کی کاروائیوں سے اشرف اور ارفع سمجھتا ہے جب کوئی رہزن کسی مسافر پر چھاپہ مارتا ہے تو اس کا مقصد صرف اتنا ہوتا ہے کہ وہ اس کے مال پر قبضہ حاصل کر لے اور اگر قبضہ حاصل کرنے میں انسانی خون گرانا پڑتا ہے تو وہ اس سے نہیں چوکتا۔ مگر جونہی وہ یہ کاروائی کر لیتا ہے تو اس کا مشن بھی پورا ہو جاتا ہے۔ رہزنوں اور ڈاکوؤں کا کام قافلوں کو لوٹنا ہے اور بس۔ مگر انارکسٹ کہتا ہے کہ میری خون ریزیوں میں ایک اصولی تعمیر مضمر ہے اور جو مجھے ڈاکو سے مشابہ سمجھتا ہے۔ تو وہ اپنی حالت کا اظہار کرتا ہے۔ میرے قتل و خون کی زد ظالموں اور جابروں پر پڑتی ہے جنھوں نے اپنے عمل استحصال سے بنی نوع انسان کو کمزور اور لاغر کر دیا ہے۔ میرا حریف و مقابل ظالم ہے نہ کہ ایک معصوم انسان۔ میں اپنے انقلابی عمل سے ذاتی منفعت اور سربلندی کا طلبگار نہیں ہوں۔ میں جابر طاقتوں کے خلاف نبرد آزما ہوں' تا کہ ان کے مٹنے سے بنی نوع انسان کو آرام کا سانس نصیب ہو۔ میں قزاق نہیں ہوں۔ میں مجاہد ہوں اور میرے جہاد میں انسانیت کی بھلائی ہے۔ جب ایک حکومت دوسری حکومت کے خلاف جنگ چھیڑ کر گولہ بارود کو کام میں لاتی ہے تو کوئی اس کو ڈکیتی اور قزاقی نہیں کہتا اور نہ حملہ آور اس کو ایسا سمجھتا ہے۔ حالانکہ اس کے حملے سے لاکھوں انسان اور خطاکاروں سے زیادہ معصوم انسان موت کے گھاٹ اتر جاتے ہیں کیونکہ اس جنگ کا مقصود صرف کسی علاقے کا الحاق ہوتا ہے۔ اس کے برعکس میری گولی صرف ظالم کے سینے میں لگتی ہے۔ میرا مقصد پاک اور بلند ہے اور جونہی سماجی ظلم کا قلع قمع ہوتا ہے۔ میں ایک امن پسند شہری کی طرح نئے نظام کا خادم بن کر مصروف کار ہو جاتا ہے۔

انارکسٹ اس سے زیادہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ لیکن اس سے اس کی امن سوزیاں جائز نہیں سمجھی جا سکتیں اور نہ وہ بنی انسان کا محسن کہلا سکتا ہے' کیونکہ انسانی خون کے دھبے محض خوبصورت نعروں سے چھپ نہیں سکے۔ لیکن یہ بھی غلط طریق ہے کہ انارکزم پر تنقید خون ریزی سے کی جائے کیونکہ مارنا اور قتل کرنا اپنے اپنے موقع اور محل کے لحاظ سے اچھا یا برا ہوگا۔ جب کوئی بے گناہ انسان اپنے حملہ آور کے مقابلے میں ڈٹ جاتا ہے اور تحفظ ذات میں اس کو قتل کر دیتا ہے' تو یہ قتل فعل قبیح نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح ایک قوم کی قوم کسی خون آشام حملہ کے خلاف نبرد آزما ہوتی ہے تو مدافعت میں اس کو کشت و خون کرنا پڑتا ہے۔ اتلاف جان دونوں طرف سے ہو رہا ہوگا۔ مگر ظالم حملہ آور کا ہر فعل جور و ستم پر مبنی ہوگا۔ دنیا کا کوئی قانون اس کو جائز قرار نہیں۔ اس کے مقابلے میں مدافعین کے ہر فعل قانون کی نظر میں جائز ہوگا۔ اسی طرح اگر انارکسٹ کے اصولوں کو غلط اور گمراہ کن ثابت کر دیا جائے تو اس کی تمام کاروائیاں بھی قابل مذمت ثابت ہو جائیں گی۔

انارکزم کے نظریے کی بنیاد ہر منظم اور جبری حکومت کی شدید مخالفت پر ہے۔ انارکزم کے

لفظی معنی "کیش لاحکومتی" کے ہیں۔ انارکسٹ تمام مروجہ حکومتوں کو انسانوں کے لیے مضر اور نقصان دہ خیال کرتے ہیں، حتیٰ کہ جمہوریت کے لیے بھی ان کے منشور اور لائحہ عمل میں کوئی جگہ نہیں۔ کیونکہ جمہوریت میں اکثریت کو اقتدار نصیب ہوتا ہے اور اقلیت بعض اوقات حکمران اکثریت کی کرہاً تابع فرمان ہوتی ہے اور ملک کا قانون بھی حاکم طبقہ کے مفادات کا حامی ہوتا ہے اور اقلیت قانون کے پنجہ گرفت میں ہوتی ہے۔ اگر انارکسٹ کسی نظام حکومت کو گوارا کر سکتے ہیں تو اس نظام کو جو قوم کے ہر فرد کی رائے سے معرض وجود میں آیا ہو اور اس کو نہ پولیس کی ضرورت ہو نہ قانونِ فوجداری کی' کیونکہ ان دونوں اداروں کا وجود اس بات کا ثبوت ہے کہ ملک کے بعض طبقے حکمرانوں کے مخالف ہیں اور حکومت کو تمام ملک کی متفقہ تائید و حمایت حاصل نہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو انارکسٹوں کے اصول کے مطابق یہ کہنا بے جا ہے کہ ملک کو آزادی حاصل ہے۔ آزادی صرف اس طبقے کو ہو گی جو صاحب اقتدار ہے اور جو محکوم ہیں وہ حقیقی آزادی سے محروم ہیں۔ انارکزم کے نزدیک اس دنیا میں صرف آزادی ہی مطلوب و مقصود ہے۔ باقی سب نعمتیں ادنیٰ درجہ رکھتی ہیں اور جو نظام حکومت حقیقی آزادی سے لوگوں کو محروم کرتی ہے اور نا قابل قبول ہے۔

انارکزم اور کمیونزم

انارکزم معاشی لحاظ سے کمیونزم سے مشابہ ہے۔ یہ پیدائش دولت اور تقسیم دولت کو قومی نظام کے ماتحت رکھنے کے حق میں ہے لیکن اس کے ساتھ ہی فرد کی آزادی پر غلو سے کام لیتی ہے اور یہیں سے اس نظریے میں تضاد پیدا ہو جاتا ہے۔ کمیونزم ملی ملکیت کی حامی ہے مگر اس کے ساتھ فرد کو جماعت کے ماتحت رکھتی ہے۔ ان دونوں اصولوں میں گو ایک عقلی ربط ہے' لیکن یہ بالکل بے جوڑ چیز معلوم ہوتی ہے کہ ہر فرد کو قوم پر فوقیت بھی دی جائے اور ملی ملکیت کو بھی بہترین اقتصادی منصوبہ قرار دیا جائے۔ سوشلزم اور انارکزم کا فرق اس لحاظ سے زیادہ نمایاں ہے۔ سوشلزم کے حامی کہتے ہیں کہ فردی آزادی کا یہ تصور بالکل بے معنی ہے کہ ایک شہری کو انتخابات کے موقع پر رائے دینے کا حق ہو اور اس کی رائے سے ایک طبقہ حکمران بن جائے اور جب جمہور کی آراء ان کے خلاف ہوں تو ان کو مسند اختیار چھوڑنی پڑے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ ایک سیاسی فریب ہے کیونکہ جب تک اجیر و مستاجر اور بندہ و آقا کی تقسیم ہے آقا اور مستاجر ہی دوسرے طبقے کے دونوں سے فائدہ اٹھائیں گے اور بندہ و مزدور بے چارے ہمیشہ آزادی سے محروم رہیں گے لیکن جب وسائل حیات قوم کے قبضے میں ہوں گے اور کوئی واحد مالک و قابض باقی نہ رہے گا تو ہر شخص صحیح معنوں میں آزاد ہو گا' لیکن انارکسٹ اس کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے۔ وہ کہتے ہیں کہ اشتراکی نظام حکومت میں سرمایہ داری کے تمام رجحانات آ جائیں گے۔ وہ بھی ایک قاہر و جابر حکومت ہو گی اور افراد کو اپنے قانون کا غلام بنائے رکھے گی اور جب تک اس کا ذرا بھی خدشہ ہے

ایسی حکومت کبھی آزادی کے اصول کی علمبردار نہیں ہو سکتی۔

سطور بالا سے صاف عیاں ہے کہ انارکزم کو کمیونزم اور سوشلزم دونوں سے سیاست میں شدید اختلاف ہے اور اس اختلاف کا منبع آزادی کے جداگانہ مفہوم میں ہے۔ انارکزم ہر فرد کو مطلق العنان دیکھنا چاہتی ہے اور معمولی سے معمولی قید و بند کو آزادی کا نقیض سمجھتی ہے۔ اس کے برعکس کمیونزم اور سوشلزم کے نزدیک آزادی کا مفہوم محدود ہے۔ ان کا اس بارے میں نصب العین فقط اتنا ہے کہ کوئی فرد وسائل حیات سے محروم نہ رہے۔ ہر ایک کی اساسی ضروریات کی کفالت سوسائٹی کے ذمے ہو لیکن اقتصادی مشین کے چلانے میں ہر فرد ایک پرزہ ہے وہ فاعل مختار نہیں۔ اس کو ایک نظام میں ہو کر کام کرنا ضروری ہے۔

مائیکل بکونن

انارکزم اور کمیونزم میں نمایاں فرق یہ ہے کہ مقدم الذکر کا نقطہ آغاز سیاست اور موخرالذکر کا نقطہ آغاز اقتصاد ہے۔ ان دونوں کے موسس یعنی مائیکل بکونن اور کارل مارکس ہم عصر تھے۔ کچھ عرصہ ان میں تعامل رہا' مگر طبائع کے اختلاف نے ایک دوسرے کا حریف بنا دیا اور عمرانی تحریکوں کے یہ دو رہنما ساری عمر ایک دوسرے کے جان لیوا بنے رہے اور منصوبوں اور سازشوں سے ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کے درپے رہے۔ بکونن کارل مارکس کے علم و فضل کا قائل تھا اور اس کی بصیرت افروز گفتگو کا دل سے معترف تھا' اور جب تک اس کے ساتھ رہا ہمیشہ اس کے آگے زانوئے تلمذتہ کرتا رہا۔ مگر اس کی آتش مزاجی نے اس کو مارکس کے طریقہ کار سے متنفر کر دیا۔ وہ کارل مارکس کو فریب کار سمجھتا تھا اور کارل مارکس اس کو جذباتی اور دیوانہ خیال کرتا تھا۔

ان دونوں نے سرمایہ داری کے نظام کے خلاف پرچم بغاوت لہرایا۔ سرمایہ داری کے اجزائے ترکیبی سیاست اور معیشت تھے اور دونوں ایک دوسرے کے لیے تقویت کا موجب تھے۔ سیاست کو سرمایہ سے اور سرمایہ کو سیاست سے فروغ حاصل تھا۔ یہ تاریخ کا حیرت زا معمہ ہے کہ ان دونوں نے سماج کے بدترین نظام کو دیکھا اور حالانکہ دونوں کی مساعی کا یہ مقصد ہے کہ افلاس و فلاکت اور فقر و فاقہ کو دور کر کے عوام کو خوش حال بنایا جائے۔ مگر ایک نے اپنی تعمیر کا سنگ بنیاد سیاست اور دوسرے نے معیشت کو بنایا۔ ایسا کیوں ہوا؟ اس کا جواب دونوں کے سوانح حیات سے ملتا ہے۔

کارل مارکس کو شروع سے لے کر آخر تک معاشی مصائب کا سامنا رہا۔ وہ فارغ التحصیل ہوا تو اس کو حسب منشاء ملازمت نہ ملی۔ ملک کے معاشی نظام میں اسے کوئی بھلائی نصیب نہ ہوئی۔ حالانکہ اس سرزمین میں اس نے نااہلوں کو مرفہ الحال دیکھا۔ اس کی تلاش معاش ہمیشہ ناکام رہی۔ کمیونزم کے زیر عنوان اس کی زندگی کے تجزیے سے صاف معلوم ہو جاتا ہے کہ مارکس کے مصائب کی ابتداء معاشی

مسائل سے ہوئی۔ اس میں شک نہیں کہ وہ سیاسی استبداد کے ہاتھوں بھی پریشان رہا۔ مگر اس کے قلب پر پہلا نقش تنگ دستی کا تھا۔ نقش اوّل اقتصادی تنگی کا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے فکر کی جولانیاں تمامتر اسی میدان میں رہیں اور اس کا تیار کردہ نظام بھی معاشیات پر مبنی ہے...... لیکن اس کے برعکس مائیکل بکونن کو ابتداء میں کوئی معاشی مشکلات پیش نہ آئیں۔ وہ روس کے کھاتے پیتے خاندان کا نونہال تھا۔ عیش و نشاط کے سامان کی کوئی کمی نہ تھی۔ جب وہ ۱۸۱۴ء میں پیدا ہوا' اس کا باپ سفیرانہ خدمات سے سبکدوش ہو کر اپنی اسٹیٹ میں آ کر آرام کے دن بسر کر رہا تھا۔ اس نے قومی سکول میں تعلیم پائی اور اٹھارہ سال کی عمر میں رجمنٹ میں اعلیٰ عہدے پر ملازم ہو گیا۔ یہ ۱۸۳۰ء کا زمانہ تھا جب روس کی فوجوں نے پولینڈ کی بغاوت کو بڑے زور سے کچل دیا تھا۔ پولینڈ کی دہشت زدگی نے اس نوجوان افسر کے دل پر گہرا اثر کیا اور وہ دل ہی دل میں سیاسی غلبہ اور مطلق العنانی کا سخت دشمن ہو گیا۔ یہ جذبہ نفرت اتنا قوی ہو گیا کہ اس کو ضبط نہ رہا اور اس کا باغیانہ میلان حکام کے علم میں آ گیا۔ فوجی افسر کے لیے یہ سنگین جرم تھا۔ اس پر دو سال مقدمہ چلتا رہا۔ آخر کار وہ اپنے کمیشن سے دست بردار ہو کر ماسکو آ گیا اور فلسفہ کی تعلیم میں مشغول ہو گیا۔ دوسرے طلباء فلسفہ کی طرح وہ بھی ہیگل کے فلسفہ کا شکار ہو گیا لیکن تھوڑے عرصہ کے بعد اس کو اپنے استاد کے خیالات و افکار میں سقم نظر آنے لگے۔ سیمابی طبیعت کا تو تھا ہی' فوراً ہیگل کو خیرباد کہا اور انقلابی ہو گیا۔ ۱۸۴۲ء میں سوئٹزرلینڈ آ گیا۔ یہاں کے سیاسی حالات نے اسے مجبور کیا کہ وہ اس ملک سے ہجرت کر جائے۔ چنانچہ وہ پیرس آ گیا' یہاں تین سال رہا اور پرودن (Prowdhon) اور جارج سینڈ (George sand) سے ملاقات ہوئی۔ ان کے خیالات سے بہت متاثر ہوا اور پرودن کا حلقہ بگوش ہو گیا۔ اس کے بعد اس کی زندگی کا وہ دور آتا ہے جس میں اس نے کارل مارکس اور اس کے نظریے کے خلاف جی بھر کر آتش فشانی کی۔ اس کے ساتھ ہی جس ملک میں جاتا وہاں کی حکومت کے خلاف بغاوت کی آگ مشتعل کر دیتا۔ یورپ کی تمام حکومتیں اس کو خطرے کی نظر سے دیکھنے لگیں اور انھوں نے اپنی تمام قوتوں کو اس کے کچلنے میں وقف کر دیا۔ ۱۸۵۰ء سے لے کر اپنی موت کے سال یعنی ۱۸۷۶ء تک وہ حکومتی نظام کے خلاف برسرپیکار رہا۔ ''خوف غماز' عدالت کا خطرہ' وار کا ڈر'' یہ تین چیزیں تھیں جنھوں نے اس کی زندگی کو داستانِ الم بنا دیا اور ان سب کے پیچھے روس کی حکومت کا ہاتھ تھا۔ وہ یورپ کے ہر ملک میں قانون سے ٹکرایا اور قید ہوا۔ آخری مرتبہ جب وہ آسٹریا میں قید تھا تو روس کی حکومت نے خواہش کی کہ یہ انقلابی قیدی اس کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ آسٹریا کی حکومت نے بکونن کو روس کے حوالے کر دیا۔ وہ پیٹر اور پال کے قلعہ میں قید کر دیا گیا۔ یہاں سختیوں سے اس کی صحت خراب ہو گئی۔ مگر جسم کی لاغری سے اس کی روح میں کوئی ضعف نہ آیا۔ اس کے سوانح نگار لکھتے ہیں کہ ان تمام مصیبت کی گھڑیوں میں اس کو ایک ہی فکر لاحق رہتی اور وہ یہ کہ کہیں جسمانی صعوبتوں سے مغلوب ہو کر وہ اپنے اصول سے منحرف نہ ہو جائے

اور حکومت کے سامنے جھک نہ جائے۔ دنیا میں تو اس کے خیال کا کوئی چرچا نہ ہوا' مگر وہ آخر دم تک اپنے خیالات پر ڈٹا رہا۔ روس کی حکومت نے دس سال کی قید کے بعد اس کو سائبیریا میں جلاوطن کر دیا۔ جہاں سے بھاگ کر وہ انگلستان آ گیا ور وہاں سے پھر یورپ آ گیا اور اپنے مشن کو جاری رکھا لیکن باوجود انتہائی جدوجہد کے اس کو کارل مارکس کے مقابلے میں کامیابی نصیب نہ ہوئی اور مزدوروں کی بین الاقوامی انجمن میں اس کو کوئی وقعت نہ ملی اور آخر کار اس کا جسم اتنا کمزور ہو گیا کہ اس کو شورشوں سے الگ ہونا پڑا اور ۱۸۷۶ء تک وہ گوشہ نشین رہا اور بے نیل مرام اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

ان مختصر حالات سے عیاں ہے کہ بکونن کی زندگی مارکس کی زندگی سے کہیں زیادہ طوفانی تھی۔ ان دونوں کی کشمکش میں بھی فرق نظر آتا ہے۔ حالات کے اختلاف نے نظریوں میں بھی اختلاف پیدا کر دیا۔ اگرچہ بکونن سیاسی غلبہ کے مظالم لیکن افلاس کے مناظر بھی اس کی آنکھوں کے سامنے تھے۔ مگر سیاسی سطوت کی قہرمانیوں نے اس کو اتنا انقلابی بنا دیا کہ وہ ساری عمر سیاسی استبداد کے خلاف سینہ سپر رہا۔ اندریں حالات وہ تصنیف کا کام بھی تعمیری انداز میں نہ کر سکا۔ اس کی کتب میں انارکزم کا ایک خاکہ نظر آتا ہے۔ مارکس کی طرح وہ کسی منظم فلسفے کا بانی نہیں کہلا سکتا۔ اس کا فکر ہمیشہ ہنگامی سیاست سے ٹکراتا رہا۔ اقتصادی حالات ہمیشہ نظر انداز رہے۔ اس کی تصانیف کا موضوع نظری ہے اور وہ مابعد الطبیعاتی بحثوں میں الجھا ہوا نظر آتا ہے اور جب کبھی اس نے حالات حاضرہ کا محاسبہ کرنے کی کوشش کی تو معاشی حالات سے زیادہ سیاسی حالات سے متاثر ہوا اور اس بات کو فراموش کر دیتا کہ سیاست کا جبر و استبداد خود معاشی فساد کا نتیجہ ہے۔ کارل مارکس ہمیشہ چٹان کی طرح اس خیال پر جما رہا کہ سیاست فی نفسہ کچھ نہیں۔ معاشی نظام کا ایک پرتو ہے۔ اس کی ذہنی شناخت کا بکونن کی فکر سے بالکل الگ تھلگ تھی۔

بکونن کی تصنیفات و تالیفات میں کوئی خاص ترتیب نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ بھی اس کی زندگی کے حالات ہیں۔ جو شخص ہمیشہ اسیر یا مفرور رہا ہو اس کو باقاعدہ تصنیف و تحقیق کا موقع میسر کیسے آ سکتا تھا۔ اس کا شاہکار ''خدا اور اسٹیٹ'' ہے۔ یہ عنوان مصنف کا اپنا وضع کردہ نہیں' بلکہ ان اشخاص کا ہے جنھوں نے اس کی منتشر تحریرات کو مدون کیا۔ وہ ''خدا اور اسٹیٹ'' کو انسانی ترقی کے راستے میں رکاوٹ کی صورت میں پیش کرتا ہے مثلاً وہ رقمطراز ہے:

> ''سٹیٹ سوسائٹی نہیں ہے' یہ فقط اس کی تاریخی شکل ہے۔ ایسی ہی وحشیانہ ہے جیسے خیالی۔ یہ تمام ممالک میں قتل و غارت' تشدد' جبر یا بالفاظ دیگر جنگ اور فتح کے ملاپ سے ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اس کے بعد اقوام کی قوت واہمہ نے خداؤں کے وجود کو تراش لیا۔ یہ ابتدائے آفرینش سے اب تک بہیمانہ قوت اور فاتحانہ عدم مساوات کے لیے آسمانی وجہ جواز ہے۔ سٹیٹ اختیار کا نام ہے۔ یہ

جبر استبداد کا پیکر ہے۔ یہ قوت کا مظاہرہ ہے۔ اس کا تسلط خفی نہیں ہوتا۔ یہ اپنے حریف کے خیالات کو تلقین سے نہیں بدلتی۔ یہ نیکی کے نفاذ کے لیے بھی جبری حکم صادر کرتی ہے اور اس جبر و قہر کے لزوم سے اس نیکی کی شکل کو بگاڑ دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کا ہر شاہی فرمان جذبات حریت کو مشتعل کرتا ہے اور اس کے ردِعمل میں باغی تحریکیں پیدا ہو جاتی ہیں کیونکہ ہر نیکی جو بنوک سنان نافذ کی جائے بدی میں منتقل ہو جاتی ہے اور یہی انسانی اخلاقیات کے اصول ہم کو بتلاتے ہیں اور یہ اس وجہ سے بھی ہو جاتا ہے کہ جبر چاہے کسی رنگ میں ہو احترام آدمیت کے منافی ہے۔ حریت' اخلاق اور انسانی وقار کا صحیح مفہوم یہ ہے کہ انسان نیکی کرتا ہے۔ اس وجہ سے نہیں کہ تعزیر کا تازیانہ اس کے سر پر لہرا رہا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ نیکی کرنے والے کی اپنی مرضی ہے اور اس کو نیکی سے جبلی الفت ہے۔"

اس اقتباس سے اس کا فلسفہ اور اس کا اندازِ فکر ظاہر ہے۔ اس کے ہر لفظ سے سٹیٹ کی نفرت ٹپکتی ہے اور اس نفرت پر اخلاق اور فلسفے کا غلاف چڑھا ہوا ہے لیکن صالح اور صحت مند معاشرہ کی تشکیل کیونکر ہو گی؟ اس کا سراغ ہمیں اس کی تصنیفات میں کہیں بھی نہیں ملتا۔ اگر انارکسٹ نظام کے علمی اور عملی پہلوؤں سے واقفیت حاصل کرنی ہو تو اس کے شاگردوں کی تحریرات کا مطالعہ ازبس ضروری ہے۔ کروپٹکن (Kropotkin) کی تصنیفات میں انارکزم کی کافی تشریح موجود ہے۔

انارکزم کی تشریح

کروپٹکن اپنے خیالات کی خاطر اپنے قائد کی طرح کافی عرصہ اسیر زنداں رہا' اور قانون کے ہاتھوں بہت صدمے اٹھائے۔ اس کی مشہور کتابیں "Fields factories and work shops" اور "The conomest of bread" ہیں۔ ان میں اس نے اپنے معاشی نظریے کی تصریح کی ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ اگر پیدائش دولت کو علمی اصولوں پر چلایا جائے اور کام کو آسان بنایا جائے تو تھوڑے کام سے بھی تمام آبادی کے لیے کافی کچھ پیدا کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اس میں مبالغہ آمیزی ہے تاہم اس میں حقیقت کی بھی نمایاں جھلک موجود ہے۔ اگر تہذیب و حضارت کی ترقی اصولِ مساوات کے منافی نہیں تو ضروری ہے کہ دولت آفرینی کا عمل زیادہ سے زیادہ خوشگوار ہونا چاہیے اور مزدوروں کو فراغت اور فرصت ضرور میسر ہونی چاہیے۔ اگر سوسائٹی کے افراد کا سارا وقت کسب معاش میں صرف ہو جاتا ہے تو علوم اور فنونِ لطیفہ کی ترقی یک قلم رک جاتی ہے کیونکہ یہ وہ پودے ہیں جو فراغت کی زمین میں بوئے جاتے ہیں اور وہیں نشوونما پا کر بار آور ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ملک

کی فضا میں کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوتی۔ جب مزدور اپنے کام سے مطمئن ہوں گے تو ان کو کسی امن سوز کاروائی کی ضرورت محسوس نہ ہو گی۔

کروپٹکن کے اصول کے مطابق کارخانوں کے طریقہ کار میں کافی اصلاح ہونی ضروری ہے بلکہ ضروری ہے۔ وہ اس بات کے حق میں ہے کہ اُجرتی نظام بالکل اڑا دیا جائے' کیونکہ معاوضے کا تخیل خود اپنے اندر جبر کا پہلو لیے ہوتا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ جب تک کام نہ کرو گے کچھ نہیں ملے گا۔ گویا مزدور کام پر مجبور اور مکلف ہوتے ہیں۔ حالانکہ انارکزم کا اصول اس بات کا مقتضی ہے کہ کام اور معاوضہ دو الگ الگ ادارے ہونے چاہئیں' ان کو لازم اور ملزوم قرار دینا سرمایہ داری کا دوسرا نام ہے۔ مزدور کام اس واسطے کرے کہ یہ اس کا طبعی میلان ہے اور کام کے بغیر وہ بے آرامی محسوس کرتا ہے۔ انارکسٹ کہتے ہیں کہ کام انسان سے اضطراری طور پر صادر ہوتا ہے اور انسان کو بیکار بٹھا دینا اس کی انسانیت کو کچلنے کے مترادف ہے۔ اگر انسانی اخلاق کی خاطر خواہ تربیت کی جائے تو مزدور کبھی بھی کام سے جی نہیں چرائے گا' بلکہ کام کرنے میں حظ و لطف محسوس کرے گا۔ اسی طرح معاوضے کا سوال بالکل نہ ہونا چاہیے۔ جو کچھ مزدور کو ملتا ہے وہ کام کے بدلے میں نہ ملنا چاہیے' بلکہ اس واسطے ملنا چاہیے کہ ضروریات زندگی کا ملنا اس کی حیات کے قیام و بقا کے لیے ضروری ہے۔ اگر یہ صورت حالات پیدا ہو جائے تو نہ پولیس کی ضرورت رہتی ہے' نہ قانون فوجداری کی' نہ عدالت کا خطرہ ہوتا ہے نہ دار کا ڈر اور دولت آفرینی کا عمل حسن و خوبی کے ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ یہ ایک مثالی تصور ہے اور کبھی بار آور نہیں ہوا۔ دنیا میں خال خال ایسے انسان ہوں گے جن کو کام اور محنت سے الفت و شغف ہو' اور اس کے بغیر ان کی زندگی ناقابل برداشت ہو جائے۔

اس کے علاوہ انارکزم کے اصول پر اور کئی اعتراض وارد ہوتے ہیں۔ مثلاً یہ اصول نفسیات کو فراموش کرتی ہے۔ انسانی جبلتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسان میں نیکی کے ساتھ بدی کا میلان بھی موجود ہے۔ اس زمانے میں ڈاکٹر فرائیڈ نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ انسان کو قدرت نے جارحانہ جبلت (Aggressive Instinct) بھی ودیعت کی ہے اور اس نے اپنی کتاب (Civilisation and its discontent) میں اِس بات پر زور دیا ہے کہ اس جبلت کو بالکل دبا دینا بھی انسانی مسرت کی نفی ہے۔ اب اگر انارکزم کے اصول کے مطابق تمام حکومتوں اور ان کے قوانین کو منسوخ کر دیا جائے تو دنیا میں طوفان بے تمیزی برپا ہو جائے اور تمدن و تہذیب کے گہوارے بدامنی اور فساد کے مرکز بن جائیں۔ قانون کی ضرورت اظہر من الشمس ہے۔ یہ قانون کا خوف ہی ہے جو قاتل کے ہاتھ کو روکتا ہے۔ یہ قانون کے نفاذ کی بدولت ہی ہے کہ تختہ دار پر قاتل کا منظر دوسروں کے باعث عبرت ہے۔ یہ قید و بند کی صعوبتیں ہی ہیں جو اسیروں کو نیک چلنی کا سبق دیتی ہیں۔ پھر قانون کا تازیانہ ہی ہے جو شرفاء کو بدقماشوں کے ظلم سے محفوظ رکھتا ہے۔

فسطائیت

آٹھویں صدی قبل مسیح سے ۴۵۵ء تک رومتہ الکبریٰ ایک عظیم سلطنت تھی؛ جس کا پرچم اقتدار مصر و ایران کی سرزمینوں پر لہراتا تھا۔ اٹلی اس کا مرکز تھا۔ ۸۰۰ء میں اس عظیم سلطنت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ ہر حصے کے الگ الگ حکمران ہو گئے۔ انیسویں صدی میں قوم پرستی کی ہوا چلی تو ہر قوم نے نئے جوش و خروش اور ولولے سے اپنی تنظیم شروع کر دی۔ میزنی (Mazzni) نے اٹلی کو ازسرنو متحدہ قوم بنانے پر زور دیا۔ امراء اور روساء نے اس آواز کو اپنے لیے خطرہ محسوس کرتے ہوئے ۱۸۳۰ء میں اس کو جلاوطن کر دیا۔ اس نے فرانس میں جا کر پناہ لی اور نوجوانانِ اٹلی کے نام سے ایک جماعت بنائی؛ جس نے اٹلی کے اتحاد کے لیے پراپیگنڈا شروع کر دیا۔ اس پراپیگنڈا کا یہ اثر ہوا کہ یورپ کے کئی ملکوں میں ''متحدہ اٹلی'' کے کئی ہمدرد پیدا ہو گئے۔ آخر کار ۱۸۸۶ء میں جزیرہ سارڈینیا کے رئیس ڈاکٹر عمانوئیل کو اٹلی کا واحد حکمران تسلیم کر لیا گیا اور تمام صوبے اس کے زیر حکومت آ گئے اور اٹلی وحدت کی لڑی میں منسلک ہو گیا۔

۱۸۸۳ء میں اٹلی نے آسٹریا اور جرمنی سے دوستی کا معاہدہ کیا جو اتحاد ثلاثہ کے نام سے مشہور ہے۔ ۱۹۱۴ء کی جنگ عظیم میں اٹلی اس معاہدہ سے انحراف کر کے فرانس اور برطانیہ کا حلیف بن گیا۔ ۱۹۱۷ء میں آسٹریا کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھائی؛ لیکن پھر برطانیہ اور امریکہ کی مدد سے اٹلی نے آسٹریا اور ہنگری کو شکست دی۔ جنگ کے خاتمہ پر برطانیہ اور امریکہ کے وعدوں کے مطابق وہ کچھ نہ ملا جو اس کو ملنا تھا۔

فاشزم

اتحادیوں کی وعدہ خلافی کا یہ ردِعمل ہوا کہ اٹلی میں اتحادیوں کے خلاف جماعتیں بننا شروع ہو گئیں۔ ان جماعتوں میں سب سے زیادہ اہم فاشسٹ جماعت ہے۔ اس جماعت کا مطمح نظریہ تھا کہ اٹلی کو اشتراکیت کی زد سے بچانے کے لیے اشتراکیت اور جمہوریت کے ملے جلے اصول کے مطابق حکومت قائم کی جائے۔

اس نظریہ کے مقابل پر خالص اشتراکی نظریہ بھی کام کر رہا تھا۔ دونوں نظریوں کے حامیوں میں بلوے ہوئے۔ ۱۹۱۹ء میں اٹلی میں سیاسی بحران پیدا ہو گیا۔ مزدوروں کی ہڑتالوں نے اٹلی کی معاشی

حالت کو تباہ و برباد کر دیا۔ اشتراکیت کی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے روسی اشتراکیت کے نمونے پر
پنچائتیں بنائی گئیں، مگر کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ گویا اٹلی میں اشتراکیت کامیاب نہ ہو سکی۔ کمیونسٹ پارٹی
کے بہت سے حامی الگ ہو کر فاشسٹ جماعت سے مل گئے۔ مئی ۱۹۲۱ء میں فاشسٹ پارٹی کے ۳۳ آدمی
پارلیمنٹ کے ممبر منتخب ہوئے، ان میں سے ایک مسولینی تھا۔

اسی سال فاشسٹ جماعت کی ایک کانفرنس منعقد ہوئی جس میں مسولینی کو قائد تسلیم کر لیا گیا
اور اس نے یہ اعلان کیا کہ وہ اٹلی کو اشتراکی خطرہ سے بچانا چاہتا ہے۔ اٹلی میں اس جماعت کو بے حد
مقبولیت حاصل ہو گئی اور عوام مسولینی کے ہر اشارہ پر جان دینے کو تیار تھے۔ اس مقبولیت سے فائدہ اٹھا
کر ۲۷ جون ۱۹۲۲ء کو ۲ لاکھ فسطائی رضاکاروں کی مدد سے مسولینی نے روم پر حملہ کر کے شاہی محل کا
گھیراؤ کر لیا، اور بادشاہ نے خوف کے مارے مسولینی کو وزارت بنانے کی دعوت دی۔ اس طرح اٹلی
میں سیاسی انقلاب رونما ہوا اور آہستہ آہستہ تمام سیاسی جماعتوں کو ختم کر دیا گیا۔

مسولینی اقتدار حاصل کرنے کے بعد افریقہ کے شمالی ساحل کے علاوہ یورپ میں یوگوسلاویہ
سے البانیہ اور یونان تک رومتہ الکبریٰ کی حدود وسیع کرنا چاہتا تھا۔ مئی ۱۹۳۶ء میں حبشہ پر حملہ کر کے
اٹلی سے ملا لیا۔ پھر ۱۹۳۹ء میں البانیہ پر قبضہ کر لیا۔ ۱۹۳۹ء میں جب ہٹلر نے پولینڈ پر دھاوا بولا تو
مسولینی نے ہٹلر سے اتحاد کر کے برطانیہ اور فرانس کے خلاف اعلان جنگ کر دیا۔ پہلے یونان کو زیر کیا،
پھر یوگوسلاویہ کو مطیع بنایا۔ ادھر ہٹلر کو ہر محاذ پر کامیابی حاصل ہو رہی تھی۔ اس نے سارا یورپ اور آدھا
روس فتح کر لیا۔ آخر کار ۱۹۴۵ء میں فسطائیت کو ہر محاذ پر شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ مسولینی کی پارٹی کے
ممبر اس کے خلاف ہو گئے، شاہ اٹلی نے اسے معزول کر کے پھانسی پر لٹکا دیا۔ ادھر ہٹلر نے ۹ مئی ۱۹۴۵ء
کو خودکشی کر لی۔

فسطائیت کے اصول و نظریات

فاشزم کا اپنا کوئی اصول اور نظریہ نہیں، چند مختلف مفکرین کے خیالات کو جمع کر کے ایک
نظریہ کی بنیاد رکھ دی، جس کا نام فاشزم رکھ دیا۔ فاشزم پر میکاولی، ہابس، فشٹے، ہیگل، نطشے اور مارکس اثر
انداز ہوئے ہیں۔ یہ سب فلسفی ریاستی اقتدار اور مرکزیت کے قائل تھے۔ اس وجہ سے یہ کہنا بیجا نہ ہوگا
کہ فاشزم بھی انسانی زندگی کے ہر شعبہ پر ریاستی اقتدار کی حامی ہے، اور وہ ایک ایسا کلیاتی نظام قائم کرنا
چاہتی ہے جس میں ریاست کو مکمل طور پر غلبہ حاصل ہو، ایسا غلبہ جس سے معاشرہ اور ریاست کا الگ
تصور نہ ہو سکے۔

تاہم اگر فاشزم کا مطالعہ کیا جائے تو حسب ذیل اصول سامنے آتے ہیں:

ا۔ عمل

فاشزم اس امر کی حامی ہے کہ کامیابی محض عقیدہ اور نظریہ پر یقین رکھنے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ کامیابی کا دار و مدار عمل پر ہے۔ چنانچہ مسولینی کہتا ہے ''میرا پروگرام عمل کرنا ہے باتیں بنانا نہیں۔'' مزید کہتا ہے ''فسطائیت حقیقت پر مبنی ہے' بالشویزم نظریے پر مبنی ہے' ہم محض اور حقیقی بننا چاہتے ہیں۔''

۲۔ جبر و تشدد

فاشزم کا دوسرا اصول جبر و تشدد ہے۔ فسطائی جبر و تشدد سے اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں اور جنگ کو لازمی قرار دیتے ہیں۔ مسولینی کہتا ہے: ''فاشزم عوام کے لیے حکومت ہے جو ان کے سروں پر قائم ہے' اور اگر ضرورت پڑے تو ان کے خلاف حکومت کرے گی۔''

۳۔ جمہوریت کی مخالفت

فاشزم جمہوریت کی مخالف ہے۔ چنانچہ مسولینی کہتا ہے: فاشزم یہ تسلیم نہیں کرتی کہ اکثریت محض اس لیے کہ یہ اکثریت ہے انسانی معاشرے کی راہنمائی کرے۔ فاشزم تمام جمہوری طریقوں کو رد کرتی ہے۔ مثلاً انتخابات' سیاسی پارٹیاں' پارلیمانی طرز حکومت' اکثریت کے مطابق فیصلے اور قوانین وضع کرنا' ووٹ یا رائے دہندگی' عوام کی مرضی یا رائے عامہ وغیرہ۔ یہ جمہوریت کو جاہلوں کی حکومت گردانتی ہے کیونکہ عوام کی اکثریت جاہل افراد پر مشتمل ہوتی ہے۔''

''فاشیت تعداد کی اس حیثیت سے کہ وہ انسانی معاشرے کا تعین کرنے والی عامل ہو سکے انکار کرتی ہے اور موقتی مشورہ کے ذریعہ تعداد کے حکومت کرنے کے حق کو بھی وہ تسلیم نہیں کرتی۔''[1]

۴۔ حریت انسانی کی مخالفت

فاشزم انسانی حریت اور مساوات کی قائل نہیں۔ فسطائی ریاست ہیگل کے اخلاقی تصور ریاست پر یقین رکھتی ہے کہ ریاست سے الگ ہو کر انسان کا کوئی روحانی اور اخلاقی وجود نہیں ہے۔ اس لیے ریاست کے منشاء کے خلاف کسی قسم کی انفرادی آزادی کا وجود نہیں۔

۵۔ بین الاقوامیت کی مخالفت

فاشزم بین الاقوامیت کی مخالفت ہے اور صرف قومی طاقت اور ملکی ہوس گیری کی قائل ہے۔ مسولینی کا یہ نظریہ تھا کہ اٹلی کو اپنی حدود سے نکل کر دوسرے ممالک پر قبضہ کرنا ضروری ہے اور یہ مقصد صرف جنگ کے ذریعہ ہی حاصل ہو سکتا ہے۔

1۔ اسلام کا نظریہ حیات مصنفہ خلیفہ عبدالحکیم ص ۳۷۲۔

۶۔ چیدہ افراد کا غلبہ

فاشزم چیدہ (Elite) کی حکومت پر یقین رکھتی ہے جو ایک قائد کے تحت حکومت کرتے ہیں۔ فسطائی کہتے ہیں کہ صرف قوم کی اقلیت ہی قومی مفاد کو سمجھتی ہے اور ان کی تکمیل کرنے کی اہل ہوتی ہے۔

۷۔ امن کی مخالفت

فاشزم امن کے افادہ پر یقین نہیں رکھتی۔ مسولینی اپنے فلسفہ امن و جنگ کے متعلق کہتا ہے:
''فاشیت امن پسندی کو جو ایثار کے پردہ میں بزدلانہ تساہل پسندی و نفس کشی کا ایک حیلہ ہے ترک کرتی ہے۔ جنگ انسان کی تمام توانائیوں کو ان کی انتہائی حد تک پہنچاتی ہے اور ان اشخاص پر مہر شرافت ثبت کرتی ہے جو مردانہ وار اس کا مقابلہ کرتے ہیں۔ تمام دیگر آزمائشیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں جو انسان کو موت و زیست کی متبادل صورتوں میں خود اپنے آپ سے مقابل نہیں ہونے دیتی۔ لہٰذا وہ تمام اصول جو بہر قیمت امن کے دعویٰ دار ہیں وہ فاشیت کے ساتھ میل نہیں کھاتے اور اس قسم کے تمام بین الاقوامی یا مجالسی ادارے بھی خواہ وہ خاص سیاسی صورت حال سے عہدہ برا ہونے کے لیے کتنے ہی مفید تسلیم کیے جائیں فاشیت کے اقتضا سے بیگانہ ہیں۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتلاتی ہے کہ جب کبھی قوموں کے ذہن و دماغ میں جذباتی تصوری یا عملی لحاظات کا ہیجان ہوا تو یہ ادارے زمین دوز ہو گئے۔''[۱]

۸۔ ہمہ گیر مملکت (Totalitarian State)

فاشزم مملکت کو اوّلیت قرار دیتی ہے اور افراد کو اس کے حصول کا ذریعہ۔ اس وجہ سے فسطائی حکومت ہر قسم کے اقتدار اور اختیارات کی مالک ہوتی ہے اور افراد کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہیں ہوتی۔ ان کا صرف یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ بلاچون و چرا حکومت کی اطاعت کریں۔ مسولینی کا مشہور قول ہے: ''ہر چیز مملکت میں ہے۔ کوئی چیز اس کے خلاف نہیں اور کوئی چیز اس سے باہر نہیں۔ یہ ہمہ توانا، ہمہ جائی اور ہمہ گیر ہے۔''[۲]

۹۔ قومی اتحاد

فاشزم کا سارا زور قومی یک جہتی اور اتحاد پر ہے اور یہ اتحاد صرف قائد کی کورانہ تقلید سے ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے قائد کا ہر حکم ماننا فسطائیوں کا جزو ایمان ہے۔ قائد پر کسی قسم کی تنقید کرنا قومی اتحاد کے منافی ہے۔

۱۔ اسلام کا نظریہ حیات مصنفہ خلیفہ عبدالحکیم ص ۳۷۵۔
۲۔ اسلام کا نظریہ حیات مصنفہ خلیفہ عبدالحکیم ص ۳۷۶۔

۱۰۔ ایک پارٹی

فسطائی ایک سے زائد پارٹیوں کو قومی اتحاد کے منافی سمجھتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ صرف ایک پارٹی ہی قومی اتحاد کو برقرار رکھ سکتی ہے۔ اس وجہ سے فسطائی نظام میں کوئی دوسری پارٹی جنم نہیں لے سکتی اور جو موجود ہو وہ ختم کر دی جاتی ہے۔

۱۱۔ بااختیار قائد

فاشزم حکومت کے نظام کو چلانے کے لیے ایک بااثر اور بااختیار قائد ضروری سمجھتی ہے۔ وہ قدرت تامہ اور اختیارات کاملہ کا مظہر ہوتا ہے اور وہ بے چون و چرا غیر مشروط اطاعت کا مدعی ہوتا ہے اور وہ یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ "میں مملکت ہوں۔"

۱۲۔ قوم پرستی

فاشی نظام قوم اور نسل کی برتری پر موقوف ہے۔

نازیت

(Nazism)

پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کو شکست کا سامنا کرنا پڑا، جس سے جرمن قوم کا وقار ختم ہو گیا۔ سیاسی اور معاشی بحران کی وجہ سے عوام کی حالت دگرگوں ہو گئی تھی۔ تمام ملک کی تجارت چند ہاتھوں میں سمٹ کر آ گئی، جن میں یہودی نمایاں تھے۔

ایک طرف ملک کی یہ شکست حالت اور دوسری طرف کمیونزم کا خطرہ بڑھتا جا رہا تھا۔ ان حالات میں مغربی طرز پر جرمنی کو ایک دستور دے دیا گیا، جس کے تحت ویمر جمہوریہ کی بنیاد پڑی۔ یہ دستور جرمن قوم کے مزاج اور روایات کے مطابق نہ تھا۔ اس وجہ سے اس کو مقبولیت عامہ حاصل نہ ہوئی۔ ۱۹۱۹ء سے لے کر ۱۹۳۳ء تک اکیس وزارتیں بدلیں۔ ان حالات میں نازی تحریک کی بنیاد ایک معمولی شخص انٹن ڈریکسر نے ڈالی۔ شروع میں چند آدمی شامل ہوئے۔ ان میں سے ایک ایڈولف ہٹلر تھا، جو بعد میں اس تحریک کا روح رواں بنا اور عظیم شخصیت کے روپ میں ظاہر ہوا۔ بعد میں یہ تحریک سیاسی شکل اختیار کر گئی اور جسے قومی اشتراکی جماعت (National socialist party) کا نام دے دیا گیا۔ اس میں متوسط طبقہ کے لوگ شامل ہو گئے۔ سرمایہ داروں نے اس تحریک کو اپنے لیے خطرہ کا الارم سمجھا اور اس سے الگ رہے۔ ہٹلر نے اس تحریک کو عوام تک پہنچانے کے لیے دن رات کوشش کی، جس

کے نتیجہ میں گرفتار ہوا۔ اسی اثناء میں ہٹلر نے اپنی مشہور کتاب کیمپف (Mien kampf) تحریر کی۔

۱۹۳۲ء میں جرمن پارلیمنٹ کے انتخابات ہوئے تو نازی پارٹی نے دو سو تیں نشستیں حاصل کیں۔ ہنڈن برگ نے ہٹلر سے کہا کہ وہ فان پاپن کے ماتحت وائس چانسلر (نائب وزیراعظم) کا منصب سنبھال لے۔ لیکن اس نے انکار کر دیا اور پورے اختیارات سنبھالنے کا مطالبہ کیا۔ فان پاپن مستعفی ہو گئے۔ ۲۴ نومبر ۱۹۳۲ء کو ہٹلر نے اس شرط پر چانسلر کا منصب قبول کیا کہ اسے پورے اختیارات دیے جائیں۔ چنانچہ ۳۰ جنوری ۱۹۳۳ء کو اسے کامل اختیارات کے ساتھ چانسلر بنا دیا گیا۔ ہنڈن برگ کی وفات پر ہٹلر نے صدارت کا منصب بھی سنبھال لیا اور اس نے جرمن فسطائیت کی بنیاد رکھی۔

نظری طور پر اطالوی فسطائیت اور جرمن نازیت میں کوئی فرق نہیں' تاہم جغرافیائی اور قومی اور ملکی حالات کے مدنظر شدت اور تاکیدیت کا فرق ہے۔ اس کے حسب ذیل چند اصول قابل ذکر ہیں۔

۱۔ اصول قیادت

نازی ازم سلطنت کی ترقی کے لیے ایک بااختیار قائد کے وجود کو لازمی قرار دیتی ہے۔ اس کا ہر حکم بلاچون و چرا ماننا ضروری ہے۔ نازیوں کا یہ خیال ہے کہ بعض مخصوص اشخاص حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔

۲۔ کلیاتی نظام

اس تحریک نے ریاستی اقتدار اور کلیاتی نظام کا نعرہ بلند کیا تاکہ قوم کو طاقتور بنایا جائے۔

۳۔ نسلیت

نازی جرمن اپنی جرمن قوم کو ہی دنیا کی سب سے اعلیٰ قوم تصور کرتے تھے۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ جرمن قوم ہی حکومت کرنے کے لیے پیدا ہوئی ہے۔ فشٹے نے جرمن قوم کے خدائی منصب پر فائز ہونے کی تبلیغ کی ہے۔

۴۔ جمہوریت کی مخالفت

نازیت جمہوریت کی مخالف ہے۔ وہ چند مخصوص آدمیوں کی قیادت پر ایمان رکھتی ہے۔ پھر ان چند مخصوص آدمیوں پر ایک اعلیٰ قائد ہوتا ہے۔ وہ مخصوص قائدین صرف اعلیٰ قائد کے سامنے جواب دہ ہوتے ہیں۔ ہٹلر اپنی کتاب "میری جدوجہد" میں لکھتا ہے:

"قومی مملکت کو چاہیے کہ پوری حکومت کو درست کرنے کی انتھک کوشش کرے اور سیاسی قیادت اکثریت کے اقتدار کے اصول سے آزاد ہو تاکہ وہاں جمہور کے بجائے فرد یعنی مقتدر قائد کا

مسلمہ اقتدار قائم ہو سکے۔ فیصلہ صادر کرنے والی قوت کوئی اکثریت نہ ہو بلکہ وہ محض ذمہ دار اشخاص کی ایک جماعت ہونی چاہیے۔ اس طرح لفظ ''کاؤنسل'' اپنے قدیم مفہوم پر عود کر آئے گا۔ ہر آدمی کے ساتھ کونسلر ہوں گے لیکن فیصلہ صرف ایک ہی آدمی دیا کرے گا۔''[1]

۵۔ امن کی مخالفت

نازیت بین الاقوامیت اور امن و رواداری کی مخالف ہے۔ اس کے نزدیک جس قوم میں قوت اور شجاعت ختم ہو جاتی ہے تو وہ امن و رواداری کی تعلیم دینا شروع کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ کسی قوم کے زوال کی نشانیاں ہیں۔ قوموں کی ترقی کے لیے جنگ ناگزیر ہے۔

۶۔ مرکزیت

نازی حکومت میں حکومت کا نظام مکمل مرکزیت کے اصول کے تحت چلایا جاتا ہے۔ تمام انجمنیں اور ادارے حکومت کے ماتحت ہیں' ان کا کوئی الگ وجود نہیں ہے۔

۷۔ بقائے اصلح

نازی اسپنسر کے اصول بقائے اصلح کو تسلیم کرتے ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ بقائے اصلح کی جنگ افراد کے درمیان نہیں بلکہ والٹر ہیگھاٹ کے نظریہ کے تحت قوموں کے مابین ہوتی ہے۔ اس جنگ میں وہ قوم کامیاب ہوتی ہے جو اتحاد اور یک جہتی کی لڑی میں منسلک ہوتی ہے۔

اسلامی حکومت اور فاشزم اور نازی زم کا موازنہ

اسلامی حکومت	فاشی اور نازی نظام
۱۔ اسلامی حکومت میں تمام انسان برابر ہیں۔	ا۔ فاشی اور نازی نظام کی اساس ایک خاص قوم اور نسل کی برتری پر موقوف ہے۔ حکمران طبقہ دوسرے لوگوں سے افضل ہے۔
۲۔ اقتدار اعلیٰ اللہ تعالیٰ کو حاصل ہے اور سربراہ مملکت خدا کے اقتدار اعلیٰ کا امین ہوتا ہے۔	۲۔ حکومت کا قائد ایک آمر ہوتا ہے جس کے ہاتھ میں ہر قسم کے اختیارات ہوتے ہیں۔
۳۔ اسلامی حکومت میں قانون اللہ کی کتاب ہے۔ رئیس مملکت اس قانون کے تابع ہوتا ہے۔	۳۔ فاشی اور نازی نظام میں ڈکٹیٹر کا ہر حکم قانون ہوتا ہے' وہ کسی قانون کے تابع نہیں ہوتا۔
۴۔ اسلامی حکومت میں قائد عوام کے مشورہ سے کام کرتا ہے۔	۴۔ فاشی اور نازی نظام میں قائد عوام کے مشورہ کا محتاج نہیں۔

[1] اسلام کا نظریہ حیات مصنفہ خلیفہ عبدالحکیم ص ۳۷۳' ۳۷۴۔

۵۔ قائد عوام کے سامنے جواب دہ ہے۔	۵۔ قائد عوام کے سامنے جواب دہ نہیں۔
٦۔ اسلامی حکومت میں قائد کی اطاعت صرف معروفات میں جائز ہے۔	٦۔ فاشی اور نازی نظام میں قائد مطاع کل ہے۔
۷۔ اسلامی حکومت صرف دفاع کے لیے لڑائی کو جائز قرار دیتی ہے۔	۷۔ فاشی اور نازی نظام ملک گیری کے لیے لڑائی کو ضروری قرار دیتا ہے۔
۸۔ اسلامی حکومت عوام کی اخلاقی' روحانی اور مادی ترقی کی ضامن ہوتی ہے۔	۸۔ فاشی اور نازی نظام صرف عوام کی مادی ضروریات کا ضامن ہوتا ہے۔

انسانی تمدن کی اصلاح و درستی کے لیے تاریخ کے مختلف ادوار میں مختلف کوششیں ہوئی ہیں۔ ان میں سے وہ مساعی جو مادی محاذ سے ہوئیں ان کا ذکر گزشتہ صفحات میں آ چکا ہے۔ ان کے تاریک اور روشن پہلوؤں کا ہم جائزہ لے چکے ہیں اور ہم پر یہ بات واضح ہو گئی ہے کہ ان میں نور سے زیادہ ظلمت کا عنصر ہے۔ ان عمرانی تحریکات کے بانی انقلاب کے نعرے بلند کرتے ہوئے میدان عمل میں اترے اور انھوں نے ببانگ دہل یہ دعویٰ کیا کہ وہ سماج کے تمام مصائب کا ازالہ کر دیں گے اور دنیا ارضی جنت سے ہم کنار ہو جائے گی لیکن ہوا یہ کہ یا تو پہلے امراض اور مصائب اور بھی زیادہ راسخ ہو گئے یا ان کی جگہ بعض زیادہ مہلک امراض نے لے لی۔ حقیقت یہ ہے کہ تمام عمرانی فساد مادیت کے غلبے اور روحانیت کے فقدان سے پیدا ہوا۔ اس کا علاج مادیین کی قوت سے باہر ہے۔ ازالہ مرض تو اسی وقت ہو گا جب مادی میلانات ضعیف ہو جائیں گے اور ہوا و ہوس کی جگہ بے نفسی اور بے غرضی پیدا ہو جائے گی۔ یعنی جب تزکیہ نفس اور تصفیہ افکار ہو جائے گا۔ روحانی انقلاب صرف مذہب ہی پیدا کر سکتا ہے۔ مذہب انسانی معاشرت پر کس طرح اثر انداز ہوتا ہے؟ یہ موضوع بالتفصیل ایک ضخیم کتاب کا محتاج ہے۔ اس موقع پر ضمناً اتنا کہہ دینا بے جا نہ ہو گا کہ مذہب ہر قسم کی اصلاح کرتا ہے اور اس زمین کی بھی اصلاح کرتا ہے جس سے نخل تمدن پیدا ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو تمدن مذہب کی نگرانی میں پروان چڑھتا ہے وہ شیریں اثمار ہوتا ہے۔ اس پر حسد و عناد' رقابت و جفا کاری کے پھل نہیں لگتے۔ ایسے تمدن کی غایت زر طلبی اور زر اندوزی نہیں ہوتی اور نہ اس کے پروگرام میں حصول غلبہ و اقتدار کی کوئی گنجائش ہوتی ہے یعنی صرف نجات اخروی۔ جب اس زندگی میں اقتدار اعلیٰ کا حصول مطلوب و مقصود ہو کہ اس دنیا کے تمام جھگڑے مٹ جاتے ہیں اور ان کے مٹنے سے وہ تمام بیماریاں دور ہو جاتی ہیں جن سے انسانی تمدن آج رو بزوال ہے۔ قرآن کریم تعلیم دیتا ہے کہ انسان کو اس دنیا میں کیسے رہنا چاہیے اور صالح تمدن کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ اسلام کا بتایا ہوا نسخہ کیمیا ہی انسانوں کے حیات بخش ہے۔

جتنی عمرانی تحریکات اٹھیں وہ باوجود بلند بانگ دعاوی کے انسانی فلاح سے قاصر ہیں۔

تخریب سے شروع ہوئیں اور تخریب ہی میں ختم ہو گئیں۔ اب ان کا المناک انجام ہمارے سامنے ہے۔ ہم مستقبل میں ان سے خیر و برکت کی کیا توقع کر سکتے ہیں۔ انھوں نے دنیا میں ایک نوع کی بربریت کو دور کر کے دوسری قسم کی بربریت کو رائج کر دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اب ان میں سے اکثر قصہ پارینہ ہو کر رہ گئی ہیں۔ جس تمدن کے خلاف یہ اٹھی تھیں اس کے حامیوں نے ان خامیوں کو فوراً بھانپ لیا اور ان کو اپنی عیاری اور چابکدستی سے موت کی نیند سلا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ باوجود سرمایہ داری کو مذموم و مقہور سمجھنے کے دنیا کو اب تک اس سے کامل نجات نصیب نہیں ہوئی۔ کارخانوں میں اب بھی لاکھوں کروڑوں انسان سرمایہ داروں کے ظلم و ستم کے تحت بہیمانہ زندگی گزار رہے ہیں۔ حکومت سب کچھ دیکھتی ہے مگر کوئی امداد نہیں کر سکتی۔

اس وقت تک ہم تمام قابل ذکر عمرانی تحریکات کے اصول اور طریق کار اور ان کے اچھے اور برے پہلوؤں کا جائزہ لے چکے ہیں۔ ہم یہ بتا چکے ہیں کہ یہ کیوں پیدا ہوئیں۔ اب اس کا اعادہ کرنا عبث ہے کہ یہ تمام تحریکیں ناکام رہیں۔ انھوں نے عوام میں ایک ہیجان پیدا کیا۔ ان میں سے بعض کو عملی صورت میں آنے کا موقع بھی ملا اور بعض ناقابل عمل ہونے کی وجہ سے ابتداء ہی میں مردود ہو کر رہ گئیں لیکن جن کا تجربہ کیا گیا وہ بھی ناقص ثابت ہوئیں اور معاشی حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی نہ پیدا کر سکیں۔ آج بھی اگر کوئی بالغ نظر مبصر عمرانی حالات کا جائزہ لے تو اس کو وہی عوارض نظر آئیں گے جو ان تحریکات کے ظہور سے پہلے تھے۔ عمل استحصال بدستور ہے۔ سوسائٹی اسی غیر منصفانہ تفریق میں بٹی ہوئی ہے۔ احترام آدمیت کہیں نظر نہیں آتا اور ثروت و دولت ہی میں عزو وقار سمجھا جاتا ہے۔ ان تحریکات کے بالمقابل اسلام ایک ایسا نظریہ حیات پیش کرتا ہے جو انفرادی زندگی سے لے کر بین الاقوامی زندگی پر حاوی ہے اور زندگی کے تمام مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔ اس نظریہ حیات کو اپنانے کے ساتھ ہی دنیا کے تمام مسائل حل ہو سکتے ہیں۔

باب نہم

مسلمانوں کے مسائل اور ان کا حل

شورائی (جمہوریت) کا فقدان

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل نظام شاہی تھا۔ شاہی نظام بھی اس قسم کا کہ ہر قسم کی آزادی سلب تھی۔ تفکر پر پہرے تھے۔ کوئی فرد شاہی حکم پر نہ تنقید کر سکتا تھا اور نہ اس حکم کے بجا لانے سے انکار کر سکتا تھا۔ ہر فرد کو طوعاً کرھاً حکم شاہی پر عمل کرنا ہوتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نظام حکومت پر ایک بڑا احسان ہے کہ آپ نے شاہی نظام کی جگہ شورائی نظام کی بنیاد ڈالی۔ اس نظام کی بنیاد الہامی تھی۔ خدا سے حکم پا کر اس نظام کو رائج کیا گیا ہے۔ ارشاد الٰہی ہے وَاَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ[1] اور (انسان) کا یہ فرض ہے کہ آپس میں باہمی مشاورت کر کے (حکومتی) کاروبار چلائیں۔

دوسری جگہ آتا ہے وَشَاوِرْھُمْ فِی الْاَمْرِ فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَی اللّٰہِ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الْمُتَوَکِّلِیْنَ[2] (اے محمدؐ) ان سے (حکومتی) کاموں میں مشورہ لے۔ پھر جب آپ رائے پختہ کر لیں تو خدا پر اعتماد کیجئے بے شک اللہ اعتماد کرنے والوں سے محبت کرتا۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں مَاشَاوَرَ قَوْمٌ اِلَّا ھُدُوْا۔[3] جس قوم نے مشورہ کیا اس قوم نے فلاح پائی۔

فرمایا یَدُ اللّٰہِ عَلَی الْجَمَاعَةِ. جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے یعنی جماعتی فیصلوں کو اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہوتی ہے۔

حضرت ابن عباسؓ بیان کرتے ہیں کہ جب شوریٰ کا حکم آیا تو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا اگرچہ اللہ اور اس کا رسول شوریٰ سے بے نیاز ہیں مگر شوریٰ کا یہ حکم اس لیے ہے تاکہ امت کے لیے رحمت ہو۔ اس کے بعد امت کا جو فرد رائے اور مشورہ طلب کرے گا کبھی اعلیٰ درجہ کی

1۔ الشوریٰ: ۳۸۔ 2۔ آل عمران: ۱۵۸۔

3۔ طبرانی۔ کنوز الحقائق حدیث ۸۷۔

راہنمائی سے محروم نہ ہوگا اور جو شوریٰ کو ترک کرے گا وہ کبھی غلط راہ سے نہ نکلے گا۔[1]

حضرت عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ وہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اگر ہم کوئی چیز کتاب وسنت میں نہ پائیں تو کیا کریں۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قانون جاننے والے عبادت گزار سے مشورہ کرو، پھر یہ ہدایت فرمائی لَا تَمْضُوا فِيْهِ رَأيَ خَاصَّةٍ[2] یعنی ایسے موقعہ پر کسی شخص کی انفرادی رائے کو نافذ نہ کرنا۔

حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے مَارَأَيْتُ بَعْداً أَكْثَر مَشْوَرَةِ أَصْحَابِهِ مِنَ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ یعنی میں نے کسی شخص کو نہیں دیکھا جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے بڑھ کر اپنے اصحاب سے مشورہ کرتا ہے۔

بزرگان دین کی نظر میں شوریٰ کی اہمیت

ایک مرتبہ حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کو لکھا کہ:

''رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قانون شوریٰ پر عامل تھے تم بھی اس پر عمل کرنا۔''[3]

خلفائے راشدین کا یہی تعامل تھا کہ جب کوئی اہم مسئلہ پیش آتا تو لوگوں کو مسجد میں جمع کیا جاتا اور ان کے سامنے پیش آمدہ مسئلہ رکھ دیا جاتا تو ان سے رائے طلب کی جاتی۔ کثرت سے جو طے ہوتا وہی فیصلہ نافذ کرایا جاتا۔

علامہ شوکانی یمانی لکھتے ہیں کہ:

''مسلمان اجتماعی نظم کے ساتھ شوریٰ سے کام لیتے تھے۔ جلد بازی اور مطلق العنانی کے ساتھ انفرادی رائے سے کام لینا ان کی روایات میں داخل نہیں ہے۔''[4]

علامہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں کہ:

''شوریٰ کی روح یہ ہے کہ جماعت کے افراد میں سے ہر فرد اپنے علم اور قابلیت کے مطابق اپنی آراء اور خیالات پیش کر دیتا ہے ایک دوسرے کے نظریات آپس میں ملتے ہیں اور اس سے ایک اچھا فیصلہ ہاتھ میں آ جاتا ہے۔''[5]

شوریٰ کی بھی کئی صورتیں ہیں جن کا ذکر ''اسلامی حکومت کے اوصاف باب پنجم'' میں ہو چکا ہے۔ حالات اور واقعات کے مطابق جو بھی صورت ہو، حکمران کا یہ فرض ہے کہ اس کے مطابق مشورہ سے کام لے۔

1۔ بیہقی شعب الایمان عن ابن عباس۔ 2۔ اعلام الموقعین جلد ۱ صفحہ ۵۴۔
3۔ تفسیر مظہری جلد ۲ صفحہ ۱۶۱۔ 4۔ فتح القدیر جلد ۴ صفحہ ۵۲۶۔
5۔ تفسیر مظہری آل عمران جلد ۲ صفحہ ۱۶۴۔

جب ہم اسلامی دنیا پر نظر دوڑاتے ہیں تو میرے نزدیک سوائے بنگلہ دیش کے کسی ملک میں حقیقی شورائی (جمہوری) نظام نہیں۔ کسی نہ کسی پہلو میں خامی ضرور پائی جاتی ہے۔ بنگلہ دیش میں جمہوری عمل کا میں اس واسطہ سے قائل ہوں۔ وہاں انتخاب حکمران نہیں کراتے بلکہ انتخاب سے تین ماہ قبل حکومت ختم ہو جاتی ہے اور آئین کی رو سے چیف جسٹس زمام اقتدار سنبھال لیتا ہے وہ انتخابی ٹیم کا انتخاب کر لیتا ہے۔ منصفانہ انتخاب کرا کے اکثریتی پارٹی کو اقتدار سونپ دیتا ہے۔ اس سے بڑھ کر صاف شفاف انتظام کیا ہوسکتا ہے کہ ایک غیر جانبدار پھر چیف جسٹس کی زیر نگرانی انتخاب ہو رہا ہے۔

جمہوری (شورائی) نظام کے فقدان کے وجوہ

اسلامی دنیا میں جمہوری (شورائی) نظام کے فقدان کا ایک سبب جاگیرداری اور سرمایہ داری ہے یہ دونوں ایسا شجرہ ملعونہ ہے جس کے نیچے جمہوریت کا پودہ کبھی پنپ ہی نہیں سکتا۔ جاگیرداری اور سرمایہ داری ایسی دو بیماریاں ہیں جو جسد معاشرت کو گھن کی طرح کھا جاتی ہیں۔ ریاست اپنے انجام کو پہنچ جاتی ہے۔

کسی جاگیردار کی جاگیر میں جا کر دیکھیں کہ وہاں کے رہنے والے بہائم کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان میں عزت نفس ہے نہ ان میں خودداری نہ ان کے دل و دماغ میں آگے بڑھنے کی آرزو ہے۔ وہ صرف یہی سمجھتے ہیں وہ اس جاگیردار کے غلام ہیں۔ اسی کی غلامی میں زندگی کے پُر الام ایام گزار کر اس دنیا سے رخصت ہو جائیں گے۔ وہ لوگ جاگیردار کو اربابا من دون اللہ خیال کرتے ہیں اور جاگیردار اپنے آپ کو ان کا "رب" خیال کرتا ہے۔ جاگیردار کی چھوٹی سی سلطنت میں سب کچھ وہی ہوتا ہے جو قدیم دور میں کسی ریاست کا حکمران اپنی رعایا سے سلوک کرتا ہے۔ دراصل ریاست کے اندر چھوٹی سی ریاست ہے اور بڑی ریاست اس ریاست کی محافظ ہے تاکہ بڑی ریاست کا حکمران جاگیردار کے تعاون سے حکومت کر سکے۔ یہی حالت ایک سرمایہ دار کی ہے جو عوام کا خون چوس کر کارخانے لگاتا ہے پھر ان مظلوم عوام کو اپنے کارخانوں میں ملازم رکھ لیتا ہے اور معمولی سی اجرت دے کر ان کے ہنر کو خرید لیتا ہے۔ اگر کوئی مزدور اپنی زبان پر حرف شکایت لائے تو اس کو جلتی ہوئی بھٹیوں میں پھینک دیا جاتا ہے۔ یہی جاگیردار اور سرمایہ دار مزید اپنے تحفظ کے لیے اپنی دولت کے بل بوتے پر حکومت کے ایوانوں میں پہنچ جاتے ہیں اور اپنے تحفظ کے لیے قانون پاس کر لیتے ہیں وہ ملک کا آئین بن جاتا ہے۔ ان کچلے ہوئے انسانوں سے یہ توقع رکھنا کہ وہ نظام جمہوریت کے محافظ ہوں گے۔ جمہوریت ترقی کرے گی اور اس کو استحکام نصیب ہوگا۔ عبث خیال ہے۔ جمہوریت تو عوامی حکومت کا نام ہے۔ اور آزادانہ انتخاب کے ذریعہ لوگ ایوان حکومت میں آئیں لیکن اس کے برعکس سرمایہ دارانہ اور جاگیردارانہ نظام میں مفاد پرست لوگوں کا غلبہ ہے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی حفاظت

اس دور میں ذرائع ابلاغ اور سائنسی ترقی نے تمام دنیا کو ایک گاؤں کی شکل میں بدل دیا ہے۔ اس وجہ سے انسانی حقوق کی پامالی کے خلاف تحریکیں اٹھتی ہیں۔ ان سے لوگ متاثر ہوتے ہیں تو اسلامی ممالک میں بھی سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف عوام میں بے چینی جنم لیتی ہے بعض اوقات حکومت کے اندازے کے خلاف لوگ ووٹ ڈال دیتے ہیں۔ سرمایہ دارانہ اور جاگیر دارانہ نظام کی حفاظت کے لیے فوج کے جرنیل میدان سیاست میں آ جاتے ہیں۔ اگر عدالت کا دروازہ کھٹکھٹایا جائے تو اعلیٰ عدالتیں نظریہ ضرورت کے تحت اس کے اقتدار کو قانونی جواز دے دیتی ہیں حالانکہ جمہوریت کی محافظ عدالتیں ہوتی ہیں۔ اس طرح اب جرنیل اور سرمایہ دار اور جاگیردار ایوان پر قابض ہیں۔ کہیں بھی سیاسی بے چینی پیدا ہوتی ہے۔ فوج متحرک ہو جاتی ہے اور عوام ہنگامہ پروروں کا سر کچل دیتی ہے۔ یہ جرنیل از خود میدان سیاست میں نہیں آتے بلکہ ایک سرمایہ دارانہ نظام کا علمبردار ملک یعنی امریکہ اس جرنیل کی پشت پر ہوتا ہے۔ اب حقیقی جمہوریت کو کچلنے کے لیے سرمایہ دار جاگیردار جرنیل اور امریکہ اکٹھے ہو گئے ہیں۔ امریکہ کو عوامی حکومت پسند نہیں کیونکہ عوام سے آنے والا حکمران عوام کی خواہشات کے تابع ہوتا ہے۔ وہ امریکہ کا تابع مہمل نہیں بن سکتا۔ اس لیے امریکہ اپنے مفاد کی خاطر سرمایہ داروں، جاگیرداروں اور جرنیلوں کی حکومت کا سربراہ بن گیا ہے۔

اب اس شیطانی چکر میں اسلامی ممالک میں کب جمہوریت کا پودہ پنپ سکتا ہے۔ اب تو انتخابات میں ایک نیا رجحان پیدا ہوا ہے اگر انتخابات میں حکمرانوں کے اندازے کے خلاف نتیجہ آ رہا ہے تو نتائج ہی بدل دیے جاتے ہیں اگر کوئی جرنیل لوگوں کی آنکھوں میں دھول ڈالنے کے لیے اور اپنی سربراہی کو قانونی جواز دینے کے لیے ریفرنڈم کرواتا ہے تو پانچ صد ڈالے ہوئے ووٹوں کو کم از کم پچانوے فیصد میں تبدیل کر دیا جاتا ہے۔ اگر چیف الیکشن کمشنر سے کوئی صحافی دھاندلی کے متعلق سوال کر بیٹھے تو چیف صاحب نہایت معصومانہ انداز میں جواب دیتے ہیں اگر میری جگہ کوئی اور بھی ہوتا تو یہی نتیجہ نکلتا۔ یہ ہے ایک جاگیرداری اور سرمایہ داری نظام حکومت جس میں عوام کی حکومت آخری سانس لے رہی ہے۔ جب عوام میں سیاسی شعور ہی مر جائے تو کوئی ملک کیونکر ترقی کر سکتا ہے۔ پس اسلامی ممالک میں یہی مصیبت ہے۔ یا وہاں سرمایہ دارانہ نظام حکومت ہے یا آمرانہ نظام حکومت یا شاہی نظام حکومت تو اسلامی ممالک کیونکر ترقی کر سکتے ہیں سب سے بڑا مسئلہ اسلامی ممالک میں جمہوریت کا فقدان ہے۔

علم کا فقدان

دنیا کے جتنے مذاہب ہیں ان میں سے سب سے زیادہ علم کا پرچارک اسلام ہے۔ سب سے پہلی وحی جو رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہوئی وہ علم کی اہمیت پر دلالت کرتی ہے ارشاد الٰہی

ہے۔ اَلَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ یَعْلَمْ۔[1]
جس نے انسان کو قلم کے ذریعے علم سکھایا انسان کو وہ باتیں سکھائیں جو اس کو معلوم نہیں تھیں۔
دوسری جگہ آتا ہے۔ قُلْ هَلْ یَسْتَوِی الَّذِیْنَ یَعْلَمُوْنَ وَالَّذِیْنَ لَا یَعْلَمُوْنَ۔[2] (اے محمدؐ) آپ کہہ دیجئے کیا علم والے اور نہ جاننے والے (جاہل) برابر ہو سکتے ہیں۔ وَمَنْ کَانَ فِیْ هٰذِهٖ اَعْمٰی فَهُوَ فِی الْاٰخِرَةِ اَعْمٰی وَاَضَلُّ سَبِیْلًا (بنی اسرائیل: ۷۲) اور جو کوئی اس دنیا میں اندھا ہے (یعنی علم کے نور سے محروم ہے) تو وہ آخرت میں بھی اندھا ہی رہے گا۔
رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں تَعَلَّمُوْا الْعِلْمَ لِاَنَّهٗ مَعَالَمُ الْحَلَالِ وَالْحَرَامِ۔[4] علم سیکھو وہ حلال اور حرام میں تمیز سکھاتا ہے۔
فرمایا وَلْیُفْشُوْا الْعِلْمَ وَلْیَجْلِسُوا حَتّٰی یُعَلَّمَ مَنْ لَا یَعْلَمُ فَاِنَّ الْعِلْمَ لَا یَهْلِکُ حَتّٰی یَکُوْنَ سِرًّا۔[5]
اور عالموں کو علم پھیلانا چاہیے تعلیم دینے کے لیے بیٹھنا چاہیے تاکہ جو لوگ علم سے محروم ہیں ان کو تعلیم دیں اس لیے جہاں علم پوشیدہ ہوا بس وہ مٹ گیا۔
فرمایا اَفْضَلُ الْعِبَادَةِ طَلَبُ الْعِلْمِ۔[6] بہترین عبادت علم کا طلب کرنا ہے۔
فرمایا طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَةٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ۔[7]
فرمایا تَفَکُّرُ سَاعَةٍ خَیْرٌ مِنْ عِبَادَةِ سَبْعِیْنَ سَنَةٍ۔[8] ایک گھڑی کا غور و فکر ستر سال کی عبادت سے بہتر ہے۔
اب مذکورہ آیات اور احادیث کو پیش نظر رکھیں تو واضح ہو جائے گا کہ اسلام علم کے حصول پر کتنا زور دیتا ہے۔
انسان کائنات کی دیگر مخلوقات سے افضل اسی وجہ سے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے۔ عقل کی غذا علم ہے۔ اگر عقل کو یہ غذا نصیب نہ ہو تو وہ مر جاتی ہے جس طرح دنیا کی مختلف اشیاء کی ربوبیت کے لیے ایک غذا ہوتی ہے۔ مثلاً پودوں کی دیگر غذاؤں کے علاوہ پانی اہم غذا ہے اگر پودے کو دیگر غذائیں دیتے رہو لیکن پانی نہیں دیا تو وہ پودا مر جائے گا۔ اسی طرح انسان کی عقل کی غذا علم ہے اگر اس کو علم نہ دیا جائے تو عقل مر جائے گی اور اس میں قوت ممیزہ ختم ہو جائے گی۔ تو مردہ عقل والا انسان اور حیوان برابر ہیں اس وجہ سے اسی قسم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں بہائم سے تشبیہ دی ہے اور اندھا قرار دیا ہے۔

1۔ العلق: ۴-۵۔ 2۔ الزمر: ۹۔ 3۔ بنی اسرائیل: ۷۲۔ 4۔ جامع بیان العلم۔
5۔ صحیح بخاری کتاب العلم۔ 6۔ کنوز الحقائق حرف الھمزہ۔
7۔ سنن ابن ماجہ باب فضل العلماء۔ 8۔ کنوز الحقائق حرف التاء۔

علم کی اہمیت اور فضیلت بیان کرنے کے بعد اسلامی دنیا کی علمی حالت کا جائزہ لینا ہے تو جب اسلامی دنیا پر نظر دوڑاتے ہیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی ممالک پر جہالت کے بادل چھائے ہوئے ہیں۔ دینی علوم میں علماء اپنے بزرگانِ دین کے علمی سرمایہ پر تکیہ لگائے بیٹھے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ علمی سرمایہ اپنے اپنے ادوار میں روشنی کا مینار تھا۔ زمانہ کے تقاضوں کے مطابق مسائل حل کیے جاتے تھے۔ زمانے کے تقاضے کے مطابق آیات قرآنی کی تفسیر کی جاتی تھی۔ صرف اس علمی سرمایہ پر تکیہ لگانا اور زمانہ کے تقاضے کے مطابق علم کو آگے نہ بڑھانا جہالت کے مترادف ہے۔ ہمارے علماء اس سرمایہ کو پڑھتے ہیں اور اس دور کے نئے مسائل کا حل نہیں ڈھونڈتے اور نہ اجتہاد سے کام لیتے ہیں نہ تفکر سے کام لیتے ہیں۔ چند خوش نصیب حضرات نے اس طرف توجہ کی تھی تو وہ علماء کی تکفیر کے تیروں سے اتنے نڈھال ہوئے تو وہ قوم کے دیگر مسائل میں مصروف ہو گئے گو انھوں نے اس دور میں نئی سوچ کے دروازے کھولے لیکن علماء نے تکفیر کا سنگ گراں نئی سوچ کے کھلے ہوئے دروازوں کے سامنے رکھ دیا تاکہ کوئی بھی ان دروازوں سے نئی روشنی حاصل نہ کر سکے۔ بہرحال میں اتنا ضرور کہوں گا کہ چند علماء نے کوشش کی ہے لیکن یہ کوشش اتنی نہیں جتنی یہ دور تقاضا کرتا ہے۔

اس کے بعد ہیومینٹی (عمرانی) علم کی طرف آیئے علم تاریخ، علم سیاسیات، علم اقتصادیات ہیومینٹی علم کی اہم ترین شاخیں ہیں۔ مسلمانوں میں ابن خلدون پیدا ہوا جس نے اپنے دور میں تاریخ کا ایک نیا رجحان دیا۔ اس رجحان کو اہل مغرب نے تو قبول کر لیا تو ثانی مفکر پیدا ہوا لیکن جن کی دولت تھی وہ اس سرمایہ سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ اس طرح گزشتہ دور میں امام غزالی، امام رازی، ابن تیمیہ، ابن رشد جیسے فلاسفر پیدا ہوئے۔ ہمارے اس دور میں ایک بھی ان کے پایہ کا کوئی مفکر نہیں ہے۔ مفکر ہی قوموں کو ہی منزل کی نشان دہی کرتے ہیں اور قومیں ان پر گامزن ہو کر ترقی کرتی ہیں۔ جب کسی قوم کے پاس فکر کی دولت ہی نہیں اس نے خاک ترقی کی راہ پر چلنا ہے اور منزل مقصود تک پہنچنا ہے۔ جس قوم نے ترقی کا رستہ ہی اختیار نہیں کیا تو اس سے ترقی کی امید لگانا عبث ہے۔

ابھی اسلامی دنیا سیاسی نظام اور اقتصادی نظام میں الجھی ہوئی ہے اور کسی نتیجہ پر پہنچ نہیں پائی۔ حالانکہ اسلام نے انسانی ہدایت کے لیے واضح طور پر نشان مقرر کر دیے ہیں۔ ان معالم پر چلنے سے خود بخود سیاسی اور اقتصادی نظام کی گتھیاں سلجھ جاتی ہیں لیکن ذاتی مفادات اور بیرونی دباؤ نے ہمارے حکمرانوں کو اندھا کر رکھا ہے۔

اب آیئے سائنسی علوم کی طرف

اسلام وہ دین متین ہے جس نے تسخیر کائنات کی دعوت ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا مِّنْهُ إِنَّ فِي ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ [1] اور کام میں

[1] الجاثیہ: ۱۳۔

لگا دیا ہے۔ تمھارے لیے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے بے شک اس میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لیے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے اَلَمۡ تَرَوۡا اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَمَا فِى الۡاَرۡضِ وَاَسۡبَغَ عَلَيۡكُمۡ نِعَمَهٗ ظَاهِرَةً وَّبَاطِنَةً (لقمان: ۲۰) کیا تم نہیں دیکھتے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام چیزوں کو جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہیں تمھارے لیے مسخر کر دیا ہے (تمھارے کام میں لگا دیا ہے) اور اس نے تم پر اپنی ظاہری اور باطنی نعمتیں پوری کر دی ہیں۔

اسلام مسلمانوں پر مظاہر قدرت پر مشاہدہ اور تحقیق لازم قرار دیتا ہے کیونکہ کائنات کے رموز کا انکشاف مشاہدات اور تجربات پر مبنی ہے ارشاد الٰہی ہے۔ قُلِ انۡظُرُوۡا مَاذَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ۔[1] کہہ مشاہدہ کرو کہ آسمانوں اور زمین میں کیا ہے۔

اَفَلَا يَنۡظُرُوۡنَ اِلَى الۡاِبِلِ كَيۡفَ خُلِقَتۡ وَاِلَى السَّمَآءِ كَيۡفَ رُفِعَتۡ وَاِلَى الۡجِبَالِ كَيۡفَ نُصِبَتۡ وَاِلَى الۡاَرۡضِ كَيۡفَ سُطِحَتۡ۔[2] کیا وہ اونٹوں کی طرف نہیں دیکھتے کہ وہ کس طرح پیدا کیے گئے اور آسمانوں کی طرف وہ کیسا بلند کیا گیا اور پہاڑوں کی طرح وہ کس طرح کھڑے کیے گئے، اور زمین کی طرف کہ وہ کس طرح بچھائی گئی۔

قرآن مجید نے جس مطالعہ اور مشاہدہ کی دعوت دی ہے وہ استقرائی ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ جزئیات کے مطالعہ و تجزیہ سے کلیات اخذ کیے جائیں یہی سائنس کی راہ ہے۔

قرآن مجید نے اس حقیقت کو بار بار پیش کیا ہے کہ تمام کائنات میں ایک ہی قانون دائر و سائر ہے اور تمام مخلوق ایک ہی ضابطہ و قانون کے تحت ہے۔ ارشاد الٰہی ہے۔ فَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَبۡدِيۡلًا وَلَنۡ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰهِ تَحۡوِيۡلًا۔[3] سو تو اللہ کے طریق میں کوئی تبدیلی نہیں پائے گا اور نہ تو اللہ کے طریق کو ٹلتا ہوا پائے گا۔

یہ آیت ظاہر کرتی ہے کہ کائنات کی ہر چیز ایک ہمہ گیر اور دائم و قائم قانون اور ضابطہ کے ماتحت ہے یہی وہ اصول ہے جس نے سائنس کو ترقی دی ہے گو قرآن مجید سائنس کی کتاب نہیں ہے لیکن اس نے تمام لوگوں کو تسخیر کائنات کی دعوت دی ہے یہی علم سائنس کی بنیاد ہے اور اس دعوت کے پیش نظر مسلمانوں نے صرف دینی اور عمرانی علوم کی طرف توجہ نہیں کی بلکہ سائنس کی ہر شاخ میں انھوں نے تحقیق کی جس کا اقرار یورپ کے تمام محققین اور مورخین نے بھی کیا ہے۔ یورپ کی سائنسی ترقی مسلمانوں کی ہی مرہون منت ہے۔ یورپ کے طلباء اسپین اور دیگر اسلامی ممالک میں سائنسی اور عمرانی علوم پڑھنے کے لیے گئے۔ وہاں سے پڑھ کر واپس لوٹے اور مسلمانوں کے سائنسی نظریات پر مزید تحقیق کی اور علم کی ہر شاخ کو آگے بڑھایا آج کے دور کی سائنس کا اصل ماخذ مسلمانوں

---

[1] یونس ۱۰: ۱۰۱۔ [2] الغاشیہ ۸۸: ۱۷۔ [3] فاطر ۳۵: ۴۳۔

کی ایجادات ہیں۔ اس بات میں بھی کوئی شک نہیں کہ قومیں علم سے ہی ترقی کرتی ہیں۔ جب وہ علم سے غافل ہو جاتی ہیں تو تنزل کا شکار ہو جاتی ہیں۔ ایک دور میں یونان علوم کی آماجگاہ تھا اور یونان ہی ترقی یافتہ تھا۔ جس قوم نے بھی علم میں ترقی کی اسی قوم کے ہاتھ میں زمام اقتدار رہا۔ یہی قرآن مجید کا فیصلہ ہے وَالَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَا يَسْتَوُنَ وہ لوگ جو جانتے ہیں اور وہ لوگ نہیں جانتے برابر نہیں ہو سکتے۔

قُلْ هَلْ يَسْتَوِى الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ (زمر:۹) کہہ دیجئے کیا علم والا اور نہ جاننے والا (جاہل) برابر ہو سکتے ہیں۔

دوسری جگہ آتا ہے۔ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا۔[1] جسے اللہ نے علم و حکمت سے سرفراز کیا اسے بڑی دولت حاصل ہو گی۔

اسلامی دنیا کا سب سے بڑا المیہ ہی یہ ہے کہ وہ سائنسی علوم میں بہت پسماندہ ہے نہ ہی یورپین اقوام مسلمانوں کو اس راستہ پر گامزن دیکھنا پسند کرتی ہیں۔

جب تک مسلمان سائنسی علوم میں ترقی نہیں کرتے اس وقت تک ترقی کی منازل طے نہیں کر سکیں گے یہی وہ درس ہے جو قرآن مجید نے مسلمانوں کو دیا ہے۔ یہی ترقی کی راہ ہے اور مسلمانوں نے اس سبق کو بھلا دیا۔ جو قوم تسخیر کائنات کے دروازے اپنے اوپر بند کر لے تو وہ قوم زندہ رہنے کے قابل نہیں ہے اور نہ وہ ترقی کی منازل پر گامزن ہو سکتی ہے۔

سائنسی علوم میں ترقی نہ کرنے کی وجہ

حریصانہ ذہنیت: اسلامی دنیا کسی نہ کسی شکل میں استعمار پسند حکومتوں کی غلام رہی ہیں اور غلامی ایک ایسی لعنت ہے جو انسان کی دل و دماغ کی استعدادوں کو مسخ کر دیتی ہے۔ قوم اپنی قومی کردار سے عاری ہو جاتی ہے۔ بنی اسرائیل ایک عرصہ فرعون کی غلام رہی۔ اللہ تعالیٰ نے رہائی کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو بھیجا۔ انھوں نے بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نجات دلائی۔ لیکن ان میں بحیثیت قوم کئی برائیاں پیدا ہو گئیں۔ جذبہ شجاعت سرد پڑ گیا تھا اور حریصانہ ذہنیت پیدا ہو گئی تھی۔ اس وجہ سے چالیس سال تک صحرا سینا میں حیران سرگردان پھرتے رہے۔ یہی حالت مسلمانوں کی ہے ایک عرصہ تک غلامی کی حالت میں رہنے کی وجہ سے بے شمار برائیاں پیدا ہو چکی ہیں ان برائیوں میں سے ایک برائی حریصانہ ذہنیت ہے۔ اس ذہنیت نے سائنسی ترقی پر اثر ڈالا ہے۔ تمام اسلامی دنیا میں ہر والدین کی یہی خواہش ہے کہ اس کا بچہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد مقابلہ کا امتحان دے کر وقار، عزت اور دبدبے والے عہدے پر فائز ہو تاکہ معاشرہ میں اس کی شان بڑھے۔ پھر والدین کی خواہش ہوتی ہے اس کا بچہ ڈاکٹر اور انجینئر بن جائے اور خوب روپیہ کمائے۔ کمائے بھی روپیہ کسی اس ملک میں جا کر جہاں زیادہ تنخواہ ملتی ہے۔ تاکہ گھر میں خوش حالی آئے اور دولت کی ریل پیل ہو۔ اس طرح حصول عزت و وقار

1 البقرہ ۲:۲۶۹۔

اور دبدبہ اور دولت کے لیے ذہین بچے دولت والے شعبوں میں چلے جاتے ہیں۔ تیسرے درجے کے بچے سائنس کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لیے رہ جاتے ہیں۔ وہ بھی اعلیٰ ڈگری حاصل کرنے کے بعد امریکہ، انگلستان یا کسی دوسرے ملک کا رخ کر لیتے ہیں۔ ان میں سے جو اپنے ملک میں رہ جاتے ہیں محکمہ تعلیم میں آتے ہیں۔ وہ پڑھانے کے بجائے اپنے گریڈوں کے چکر میں پڑ جاتے ہیں کہ محکمہ تعلیم میں کوئی اثر والا عہدہ مل جائے۔ تو استاذ وہاں جانے کو ترجیح دے گا۔ اس طرح اعلیٰ تعلیم یافتہ استاد کے علم سے قوم کے بچے محروم رہتے ہیں۔ پاکستان کے کالجوں سکولوں میں دیکھئے سکولوں میں تو ایک بھی سائنس کی اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والا پڑھاتے ہوئے نہیں دیکھو گے۔ حالانکہ نویں دسویں ہی ایسی دو کلاسیں ہیں جہاں بچے کو علم کا شعور پیدا ہونا شروع ہوتا ہے۔ وہاں بی ایس سی، بی ایڈ پرانے علم کے ساتھ پڑھا رہے ہیں۔ اس طرح بچے میں سائنسی ورک ہی پیدا نہیں ہوتا۔ میں بحیثیت استاد اور اپنے مشاہدے کی بناء پر وثوق سے کہتا ہوں جو اساتذہ پی ایچ ڈی ہیں وہ شاذ ہی سال اوّل کو پڑھاتے ہوں۔ حالانکہ بچے کی ذہنی پرورش کے لیے یہی درجہ بہتر ہوتا ہے۔ اس طرح تمام اعلیٰ تعلیم والے اساتذہ معاشرے کے لیے غیر مفید بن گئے ہیں۔

دوم۔ کالجوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے والوں کے لیے موزوں لیبارٹریز اور لائبریریاں ہی نہیں۔ ایک بچہ باہر سے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے آتا ہے۔ حکومت اس سے کماحقہ فائدہ حاصل نہیں کر پاتی۔ چند سالوں کے بعد اس کا علم بوسیدہ ہو جاتا ہے۔ جب تک محکمہ تعلیم میں اساتذہ کے گریڈ دوسرے محکموں کے گریڈوں سے زیادہ پرکشش نہیں بنائے جاتے۔ اساتذہ کو تحقیق کے لیے مناسب ماحول اور سہولتیں مہیا نہیں کی جاتیں۔ جب تک اساتذہ کی حریصانہ ذہنیت ختم نہیں کی جاتی جب تک اعلیٰ دماغوں پر بیرونِ ملک جلب زر کے لیے جانے پر پابندی نہیں لگائی جاتی۔ اس وقت تک کسی اسلامی ملک میں سائنس کا پودہ نشوونما نہیں پا سکتا۔ اسلامی حکومتوں کے سامنے مسلمانوں کا سنہری سائنسی دور ہونا چاہیے اور بچوں کو اس دور سے آگاہ کرنا چاہیے تاکہ ان میں تحقیق کا جذبہ پیدا ہو۔ تمام اسلامی دنیا میں محکمہ تعلیم جہالت کا مرکز ہے جہاں عالم پیدا نہیں کیے جا رہے بلکہ تاجر اور سیاست دان[1] پیدا کیے جا رہے ہیں۔

ایک سازش کے تحت اب ایک اور نقص محکمہ تعلیم میں آ رہا ہے وہ ہے تعلیم کو پرائیویٹ ہاتھوں میں دیا جانا۔

دنیا کی واحد سپر پاور (امریکہ) نے یہ تجویز دی ہے کہ ہماری ترجیح یہ نہیں ہونی چاہیے کہ ہم تعلیم سے کیسے ایک طالب علم کو بہتر انسان بنائیں بلکہ یہ ہو کہ ایک طالب علم کو تعلیم کا بہترین صارف کیسے بنا سکتے ہیں۔ جو اس کے لیے منفعت بخش ہو۔ اس تجویز سے تعلیم ایک منفعت بخش تجارت بن گئی

---

[1] اسلامی دنیا میں سیاست بھی جلب زر کا ذریعہ ہے اس وجہ سے کھاتے پیتے گھرانے کے بچے اس میدان میں قسمت آزمائی کرتے ہیں۔

ہے۔ اب اس تجارت میں بیرونی سرمایہ کاری ہو گی۔ امریکہ، برطانیہ اور دیگر ممالک ترقی پذیر ممالک میں مدرسے، کالج اور یونیورسٹیاں قائم کریں گے۔ اونچے گھرانوں کے بچے بیرونی ممالک کی تعلیمی اداروں میں بطور صارف (خریدار) داخلہ لیں گے۔ اس طرح بیرونی ممالک ایک تو ملک کی دولت لوٹیں گے دوم بچوں کی خودداری اور عزت نفس خریدیں گے۔ دل و دماغ کو غلامی کی زنجیروں میں جکڑیں گے اور بیرون ممالک میں ہی ان کی ملازمتوں کا بندوبست ہوگا جو طلباء اپنے ملک میں واپس آنا چاہیں گے ان کو بیرون ممالک کی اعلیٰ ڈگریوں کی وجہ سے اعلیٰ عہدوں پر فائز کر دیا جائے گا۔

۱۸ دسمبر ۲۰۰۰ء کو امریکہ نے عالمی تجارتی ادارے کے رکن ممالک کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ اگرچہ عوام کو تعلیم کے زیور سے آراستہ کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے لیکن باہمی تعاون سے اس اہم شعبہ میں تجارت کے اصول متعین ہونے چاہئیں اور رکن ممالک کے مابین کھلی تجارت ہو۔ اس ضمن میں امریکہ نے ان نکات کی نشان دہی کی ہے۔

سیکنڈری سے اعلیٰ تعلیم تک غیر ملکی اشتراک، رکن ممالک میں غیر ملکی یونیورسٹیاں کا قیام، مقامی اور غیر مقامی اداروں کے ساتھ غیر ملکی یونیورسٹی کا اشتراک عمل اور غیر ملکی یونیورسٹی کے لیے خصوصی ٹیکس کا عائد کرنا، ادارے کے عام معاہدے کے مطابق غیر ملکی یونیورسٹیاں چار ذرائع سے پاکستان کو تعلیم برآمد کریں گی۔

پہلا: طلباء کو اپنے ملک میں داخلہ دیں گی۔

دوسرا: سرحد پار تعلیم بذریعہ انٹرنیٹ مہیا کی جائے گی۔

تیسرا: مقامی طور پر ادارہ قائم کیا جائے گا۔

چوتھا: جڑواں پروگرام شروع ہوگا۔ جس میں طالب علم نصف تعلیم اپنے ملک میں اور باقی دوسرے ملک میں حاصل کرے گا۔

اب پاکستانی طلبہ ہزاروں کی تعداد میں امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا، کینیڈا اور فرانس جا چکے ہیں۔ یہ طالب علم خوش حال گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

اس تعلیمی پالیسی سے ملک میں طبقہ واریت بڑھے گی۔ امراء طبقہ صاحب سند ہوگا لیکن انسانیت کے زیور سے معرٰی، دوسری طرف عوام جہالت کی وادی میں سرگرداں پھرتے نظر آئیں گے۔ دیگر اسلامی ممالک سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف پاکستان کو ہی دیکھ لیجیے کہ اب ہزاروں بچے اے لیول اور او لیول کے امتحانات دے رہے ہیں۔ دوسری طرف غرباء کے بچوں کے لیے کالج نجی ہاتھوں میں دے کر علم کے دروازے بند کیے جا رہے ہیں اور اب ایک نئی صورت پیدا ہو رہی ہے جس طرح ایسٹ انڈیا کمپنی تجارت کے لباس میں ہندوستان پر انگریزوں کے غلبہ اور تسلط کا باعث بنی تھی۔ اب اسی راستے پر گامزن ہو کر امریکہ اور اس کے حواری تعلیم کے پرکشش منصوبے سے پاکستان کو نو آبادی بنا

رہے ہیں۔ ہندوستان میں انگریزوں نے اپنے تسلط کو قائم رکھنے کے لیے جاگیردارانہ نظام کیا تاکہ ان کے تعاون سے اپنے اقتدار کو طول دے سکیں۔ اب کی دفعہ تعلیم کے راستے خوش حال طبقے کے بچوں کو مہنگی تعلیم دے کر اپنا ہمنوا بنائیں گے اور ان کے ذریعے پاکستان اور دیگر ممالک کو اپنی غلامی میں لیں گے۔

پاکستان میں پرائیویٹ ادارے تعلیم کو تجارتی کاروبار کے رنگ میں چلا رہے ہیں۔ اب صاحب ثروت حضرات نے صنعت کاری کی بجائے تعلیمی ادارے کھول لیے ہیں۔ اس سے تعلیم بہت مہنگی ہوتی جا رہی ہے۔ حتیٰ کہ متوسط آدمی بھی ان اداروں میں اپنے بچے کو تعلیم نہیں دلوا سکتا۔ چند سال ہوئے ایک میٹرک میں شاہدرہ کی ایک بچی نے لاہور بورڈ میں شاندار نمبر حاصل کر کے اوّل آئی لیکن لاہور کالج برائے خواتین یا کسی اور اچھے کالج میں خود مختار ادارے ہو جانے کی وجہ سے داخلہ نہ لے سکی۔

پرائیویٹ ہاتھوں میں تعلیم جانے کی وجہ سے شرح خواندگی گرتی جائے گی اور تعلیم صرف امراء کے گھرانوں تک محدود ہو کر رہ جائے گی۔ یہ تعلیمی برائی ایک خاص منصوبہ کے تحت کی جا رہی ہے تاکہ اسلامی دنیا تعلیم کے میدان میں پیچھے رہ جائے۔ کاش اسلامی ممالک کے سربراہ سر جوڑ کر تعلیم کے مسئلہ کو حل کریں اور اجتماعی طور پر ایک ایسا منصوبہ وضع کریں۔ جس سے ہر شعبے کے ماہرین پیدا ہوں اور مسلمانوں تعلیم کے میدان میں دوسروں قوموں سے سبقت دلائیں۔ پھر اسلامی دنیا بغداد اور غرناطہ بن جائیں۔ مسلمانوں کی کھوئی ہوئی میراث واپس لائیں۔

یک جہتی کا فقدان

تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ یک جہتی اور بھائی چارہ قوموں کی ترقی میں کتنا کردار ادا کرتا ہے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے قبل عرب انتشار اور افتراق کے بھنور میں پھنسا ہوا تھا۔ قبائلی جھگڑے نسلی افتراق ان کا طرہ امتیاز تھا۔ معمولی معمولی باتوں پر کئی کئی سال لڑائی کی آگ میں جلتے رہنا اس کا نتیجہ تھا۔ عرب قوم کو ہمسایہ اقوام میں ذلت کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہ صرف ان کو یک جہتی اور اتحاد کی تعلیم دی بلکہ اتحاد اور یک جہتی کی سلک میں منسلک کر دیا۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ [1]۔ اور سب کے سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے پکڑ لو اور جدا نہ ہو جاؤ۔ اللہ نے تمہیں جو نعمت عطا فرمائی ہے اس کو یاد کرو جب تم باہم دشمن تھے تو اس نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی۔ پھر تم اس کے فضل و کرم (نعمت) سے بھائی بھائی بن گئے (اس سے قبل تمہاری یہ حالت تھی) تم آگ کے گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے پس اس نے تم کو اس سے بچایا لیکن اللہ نے تمہیں (آگ سے) بچایا۔ اس طرح تمہارے لیے اپنی نشانیاں بیان کرتا ہے تاکہ تم ہدایت پاؤ۔

[1] آل عمران ۳:۱۰۳۔

اس آیت کریم چار باتوں کا ذکر کیا۔ ایک تو مسلمانوں کو یہ تعلیم دی جا رہی ہے کہ اتحاد اور یک جہتی سے زندگی گزارو۔ پھر دوسری بات عربوں کی بعثت سے قبل کی حالت بیان کی ہے وہ تفرقہ کی آگ میں جل رہے تھے۔ تفرقہ کو شفا حفرۃ من النار کے الفاظ سے بیان کیا ہے گویا تفرقہ آگ ہے۔ جو قوموں کو بھسم کر دیتی ہے تیسری بات یہ بتائی اللہ تعالیٰ نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی معرفت ان کو تفرقہ کی آگ سے بچایا اور وہ بھائی بھائی بن گئے۔ دل کینہ باہمی نفرت اور باہمی بغض سے صاف ہو گئے۔ چہارم اس آیت کریمہ میں اسلام، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور قرآن مجید کو ایک نعمت قرار دیا ہے۔ یک جہتی اور اتحاد کی تعلیم دینے کے ساتھ تفرقہ سے بچنے کی بھی تعلیم دی۔ ارشاد الٰہی ہے۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ۔[1] اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ (جن کا حال یہ ہے) کہ ان کے پاس خدا کے کھلے نشانات (بینات) آئے اس کے بعد بھی الگ الگ ہو گئے۔

پھر فرمایا اِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ۔[2] جن لوگوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کیا (فرقہ واریت اختیار کر لی) اور گروہوں میں بٹ گئے تم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں۔ اَلْاِسْلَامُ اَحْوَجُ اِلَى الْجَمَاعَةِ[3] اسلام جماعتی نظام چاہتا ہے۔

فرمایا اَلْجَمَاعَةُ رَحْمَةٌ وَالْفِرْقَةُ عَذَابٌ[4] یعنی جماعت (یک جہتی اور اتحاد) رحمت ہے اور متفرق ہونا عذاب ہے۔

فرمایا اَلْمُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِ كَالْبُنْيَانِ يَشُدُّ بَعْضُهُ بَعْضًا ثُمَّ شَبَّكَ بَيْنَ اَصَابِعِهٖ۔[5] ایک مومن دوسرے مومن کے لیے ایسا ہے جیسا کہ دیوار کی بنیاد ایک جزء دوسرے جز کو قوت دیتا ہے پھر اپنی انگلیوں کو ملا کر مثال بتائی۔ فرمایا تَرَى الْمُؤْمِنِيْنَ فِي تَرَاحُمِهِمْ وَتَوَادِّهِمْ وَتَعَاطُفِهِمْ كَمَثَلِ الْجَسَدِ اِذَا اشْتَكٰى عُضْوٌ تَدَاعٰى لَهٗ سَائِرُ جَسَدِهٖ بِالسَّهَرِ وَالْحُمّٰى۔[6] تو مومنوں کو ایک دوسرے سے رحم اور محبت اور مہربانی میں ایسا دیکھے گا جیسا بدن میں ایک عضو بیمار ہو جائے تو سارے اعضا بخار اور بیداری میں شریک ہوں۔

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مسلمانوں میں یک جہتی اور اتحاد پیدا کرنے اور برقرار رکھنے کے لیے ایسی عبادات کی تعلیم دی جو مسلمانوں میں یک رنگی پیدا کرتی ہیں۔ باجماعت نماز، روزے، حج اور زکوٰۃ یہ تمام وہ عبادات ہیں جو مسلمانوں میں یک رنگی اور یک جہتی پیدا کرتی ہیں۔ مزید برآں ہجرت کے بعد رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اسوۂ حسنہ مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کرنا مسلمانوں کے سامنے ہے۔

---

1. ال عمران: ۱۰۴۔ 2. الانعام: ۱۶۰۔ 3. کنوز الحقائق حرف الہمزہ۔
4. کنوز الحقائق حرف الجیم۔ 5. بخاری کتاب الادب۔ 6. بخاری کتاب الادب۔

مذکورہ آیات، احادیث، اسلامی عبادات کی روح اور اسوۂ حسنہ کو اسلامی ملک اپنے سامنے رکھیں۔ پھر اپنے کردار کا جائزہ لیں اور دیکھیں وہ کہاں تک اس تعلیم پر عمل پیرا ہیں۔

اسلامی ممالک کے سربراہ ۲۲ ستمبر ۱۹۶۹ء میں بیت المقدس میں یہودیوں کے ہاتھوں مسجد اقصیٰ کو آگ لگانے کے ردعمل میں مراکش کے شہر رباط میں اکٹھے ہوئے۔ او۔ آئی۔ سی کی بنیاد رکھی تاکہ عالم اسلام کو درپیش چیلنجوں کے نمٹنے کے لیے مسلم ممالک کے سربراہان اکٹھے ہوتے رہیں۔ اب تک دس سربراہی کانفرنسیں مختلف ممالک میں منعقد ہو چکی ہیں۔ دسویں کانفرنس ۱۶ اکتوبر کو ملائیشیا میں ہوئی تمام کانفرنسوں کے ایجنڈوں پر نظر ڈالیں اور پھر کانفرنسوں کے نتائج کو سامنے رکھیں تو سوائے مایوسی کے کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ میرے نزدیک صرف دوسری کانفرنس جو ۱۹۷۴ء میں پاکستان میں لاہور شہر میں منعقد ہوئی۔ اس وقت ذوالفقار علی بھٹو وزیراعظم تھے کہ نتائج حوصلہ افزاء ہیں۔ اسی کانفرنس میں علاوہ دیگر تعمیری کاموں کے ایک اہم تعمیری کام اسلامی ممالک کا مضبوط دفاع تھا۔ مضبوط دفاع صرف ایٹمی پروگرام سے انجام پا سکتا تھا۔ اس کانفرنس کے نتیجہ میں اسلامی ممالک خصوصاً سعودی عربیہ، لیبیا اور شام کے تعاون سے عظیم راہنما ذوالفقار علی بھٹو نے ایٹمی پروگرام کا آغاز کیا۔ پروگرام کے انکشاف ہو جانے کے بعد امریکہ کے وزیر خارجہ کیسنجر نے تمام سفارتی آداب کو نظر انداز کرتے ہوئے دھمکی دی کہ تم اس پروگرام سے باز نہ آئے تو نشان عبرت بنا دیں گے۔ لیکن شیر دل راہنما نے چیلنج کو قبول کرتے ہوئے جواباً یہ تاریخی الفاظ کہے ہیں۔ میں یہ پسند کرلوں گا کہ میری لاش کو چند جرنیل ملک کی سڑکوں پر گھسیٹے پھریں لیکن میں یہ پسند نہیں کروں گا۔ تاریخ مجھے برے الفاظ سے یاد کرے۔

ایٹمی پروگرام کو عملی جامہ پہنانے کی تمام روئیداد اب تاریخ کا حصہ بن چکی ہے۔ اس کو دہرانے کی ضرورت نہیں۔ یہ ایٹمی پروگرام صرف پاکستان کے دفاع کے لیے ہی نہیں تھا بلکہ تمام اسلامی ممالک کے دفاع کی اساس تھا۔ یہی وجہ ہے اس دور کے سعودی عربیہ کے سربراہ شاہ فیصل اور لیبیا کے حکمران معمر قذافی اور شام کے صدر حافظ الاسد نے خصوصاً اس منصوبہ کو عملی جامہ پہنانے کے لیے اپنے خزانوں کے منہ کھول دیے۔ یہی منصوبہ ذوالفقار علی بھٹو اور شاہ فیصل کی شہادت کا باعث بنا اور معمر قذافی کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ اس کانفرنس کے بعد اسلامی ممالک میں یک جہتی پیدا کرنے کے لیے جو عملی اقدامات کا پروگرام مرتب کیا گیا وہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ امریکہ نے اس پروگرام کو کلی طور پر سبوتاژ کر دیا ہے اور اسلامی ممالک کی دولت ''تیل'' پر کس طرح قبضہ کیا ہے وہ بھی تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ دوسری کانفرنس کے بعد امریکہ نے جس ماہرانہ انداز میں اقدام شروع کیے وہ اب بھی جاری ہیں۔ روس کے زیر اہتمام اسلامی ریاستوں کی آزادی کے بعد وہاں کے تیل پر قابض ہونے کے لیے اسلامی ریاستوں کے مضبوط دروازے یعنی افغانستان کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور

افغانستان پر اپنی کٹھ پتلی حکومت قائم کر دی۔

عراق کے تیل کے ابلتے ہوئے چشموں پر تسلط جما لیا ہے کویت کے چشموں پر قبضہ جمانے کی کہانی تاریخ کا ایک المیہ جزو ہے۔ کثیر اسلامی ممالک امریکہ کی اقتصادی غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ ان پر بین الاقوامی اقتصادی ادارے حکومت کر رہے ہیں امریکی فوجیں کئی اسلامی ممالک کی سرزمین پر بیٹھی ہوئی ہیں۔ دوسری سربراہی کانفرنس کے بعد اسلامی ممالک کا شیرازہ بکھر چکا ہے۔ آجا کے زیر زمین جہادی قوتیں کام کر رہی ہیں اکثر اسلامی ممالک کے سربراہ کلی طور پر امریکہ کی طرف میلان رکھتے ہیں اور عوام امریکہ کے خلاف ہیں بعض ممالک کے سربراہ لبرل ازم روشن خیالی اور دہشت گردی کی مخالفت کا تمغہ سینہ پر سجا کر زیر زمین جہادی لہر کو سرد کرنے کے درپے ہیں۔ امریکہ ان کو اپنی محبت کی سند دے چکا ہے اور فون کی کال پر "ہری اپ" کا حکم صادر کرتا ہے اور وہ حکمران "سر" کہہ کر سر تسلیم خم کر دیتا ہے۔ اے مسلمانو! اسلامی ممالک کی ابتری حالت، تفرقے اور انتشار کا کیا رونا روؤں جو کچھ ہو رہا ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ امریکی صدر صلیبی جنگ کا آغاز کر رہا ہے لیکن اسلامی ممالک بجائے اپنی سرحدوں کو مضبوط کرنے اور باہمی شیرازہ بندی کرنے کی طرف توجہ دینے کے صلیبی جنگ میں امریکہ کے ہم نوا اور قدم بقدم ساتھ چل رہے ہیں۔ یہاں تک کہ ہوائی اڈے بھی حوالے کر دیئے ہیں۔

اقتصادی مسئلہ

اسلامی دنیا قدرتی وسائل سے مالا مال ہے۔ اس دور میں سب سے اہم دولت "تیل" ہے۔ تمام دنیا کی اس دولت کو ترازو کے ایک پلڑے میں رکھ دیں اور اسلامی دنیا کی اس دولت "تیل" کو دوسرے پلڑے میں تو اسلامی دنیا کا پلڑا کہیں بھاری ہوگا۔ دنیا بھر میں پٹرولیم کے ذخائر کا ۷۰٪ حصہ مسلم ممالک کے پاس ہے۔ اس دولت کے علاوہ کون سا قدرتی وسیلہ ہے جو اسلامی ممالک کو اللہ تعالیٰ نے نہ دیا ہو۔ مثلاً پٹ سن میں ۹۲٪ گوند میں ۸۹٪ قدرتی ربڑ میں ۷۳٪ کپاس میں ۳۶٪ ٹن میں ۵۲٪ فاسفیٹ میں ۳۳٪ گرم مصالحہ جات میں ۲۸٪ امت مسلمہ کے پاس ہے۔ مجموعی طور پر دنیا بھر کے وسائل اور معدنیات کے ۳۵٪ حصے مسلم ممالک کے پاس ہیں۔ اس کے باوجود اسلامی ممالک کو اقتصادی مسئلہ درپیش ہے اور اسلامی کانفرنس کی تنظیم کے ممالک تین کھرب ۸۳ ارب ڈالر کے مقروض ہیں۔ اس کے بھی کئی وجوہ ہیں۔ سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ اسلامی دنیا کی یہ دولت غیروں کے ہاتھ میں ہے اور وہی اس دولت سے فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اسی دولت کے ذریعہ یورپ کے کارخانے چل رہے ہیں اگر یہ دولت (تیل) یورپ کی طرف جانا بند ہو جائے تو یورپ کے تمام کارخانوں کی چمنیوں سے دھواں نکلنا بند ہو جائے گا۔ کتنی بدقسمتی ہے۔ یہ دولت مسلمان کی ہے لیکن فائدہ یورپ اٹھا رہا ہے خصوصاً

امریکہ جب تک اسلامی ممالک خدا کی دی ہوئی اس نعمت کو واگزار نہیں کر لیتے اس وقت تک اسلامی ممالک کو اقتصادی مسئلہ درپیش رہے گا۔

دوسری وجہ خود کفالت کے فقدان کی ہے۔ اکثر اسلامی ممالک سے اپنی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے قرضے لیتے ہیں۔ وہ قرضے نہیں دراصل وہ غلامی کی زنجیریں ہیں۔ کسی ایک ملک کی مثال نہیں ملے گی جس نے ان اداروں سے اپنی حالت کو بہتر بنانے کے لیے قرض لیا ہو پھر اس کی حالت بہتر ہوئی ہو۔ اس کے برعکس اس کی حالت زیادہ ہی ابتر ہوئی ہے۔ قدیم زمانے کے غلام بنانے کے طور طریقے بدل چکے ہیں۔ اس دور کا غلام بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ کسی ملک کی اقتصادیات اپنے ہاتھ میں لے لو۔ وہ ملک خود بخود غلام بن جائے گا۔ امریکہ نے یہی حربہ اختیار کیا ہے ایک تو اسلامی دنیا کے تیل پر براہ راست قابض ہے جو ملک اس کی غلامی سے رہ گئے ہیں ان کو اقتصادی غلامی میں جکڑ لیا ہے۔ کسی ملک کی غلامی کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ امریکہ کا صدر اقتصادی غلام ملک کے سربراہ کو فون کرتا ہے ہوائی اڈے درکار ہیں۔ اڈے دے دیئے جاتے ہیں اور بندرگاہیں بھی اس کے زیر تسلط آ جاتی ہیں۔

معاشی مسئلہ درپیش ہونے کی تیسری وجہ ٹیکنالوجی اور ماہرین کی کمی ہے۔ ٹیکنالوجی اور ماہرین کی دست یابی صرف علم سے ہوتی ہے۔ جو ملک علم کی روشنی سے محروم ہے وہاں ٹیکنالوجی اور ماہرین کہاں سے آئیں گے۔ جب تک اسلامی ممالک تعلیم کو سستا نہیں کرتے اس وقت تک نہ ٹیکنالوجی میسر آئے گی اور نہ ماہرین پیدا ہوں گے۔

معاشی مسئلہ کی چوتھی وجہ یہ ہے کہ نئے عالمی رجحانات بدل چکے ہیں۔ تمام دنیا ایک گاؤں کی شکل اختیار کر چکی ہے۔ اس لیے ترقی یافتہ ممالک نے اس قسم کی منصوبہ بندی کی ہے کہ ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک ان معاشی منصوبہ کی وجہ سے مقابلہ نہ کر سکیں اور ترقی یافتہ ممالک کی پیداوار کی منڈیاں ہی بنی رہیں۔ اسلامی ممالک کے سربراہوں کی اہم ذمہ داری ہے کہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں تاکہ ترقی یافتہ ممالک کے ان معاشی منصوبوں کا توڑ سوچیں۔ اگر بروقت مقابلہ کرنے کا ٹھوس منصوبہ نہ بنایا گیا تو پھر اسلامی ممالک صرف خام مال ہی پیدا کر کے برآمد کر سکیں گے اور مہنگے داموں اپنے ہی خام مال سے بنی ہوئی چیزیں خرید کریں گے۔ میں پاکستان کی صنعت کو سامنے رکھ کر یہ کہہ سکتا ہوں کہ بجلی کا مہنگا ہونا ٹیکسوں کی بھرمار ماہرین کی کمی اعلیٰ اور جدید ٹیکنالوجی کا فقدان اور مزدوروں کا استحصال صنعت پر برے اثرات مرتب کر رہا ہے۔ جس کا احساس باہر کے ماہرین نے بھی کر لیا ہے۔ ایک ممتاز ماہر اقتصادیات اور آکسفورڈ یونیورسٹی میں ڈیولپمنٹ اکنامکس کے ماہر پروفیسر ڈاکٹر نجے لال نے ایشیائی بنک اور وزارت خزانہ کے اشتراک سے منعقد کیے گئے ایک سیمینار میں "Industry in Pakistan

"facing to challanges of international competitiveness" کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا۔ مقالہ میں جو پاکستانی صنعت کے بحران سے متعلق دلائل دیے پاکستان کے گورنر اسٹیٹ بنک ڈاکٹر عشرت حسین نے بھی اس بات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ "اس میں شک نہیں کہ کسی بھی اقتصادیات کے تجارتی عمل میں مقابلہ کی سکت کو بڑی اہمیت حاصل ہے جس کے حصول کے لیے مستحکم اور مضبوط میکرو اکنامی اور ٹریڈ پالیسی کا ہونا، تمام اقتصادی عوامل کو آزادانہ ماحول دستیاب ہو۔ سرمائے کی آسانی ہو۔ انفرا اسٹرکچر کی سہولتیں آسان اور با کفایت ہوں۔ انسانی وسائل کی مہارت ٹیکنالوجی کو وسعت دینے کی حکمت عملی مقابلہ کی سکت اور اقتصادی فروغ کے لیے لازمی ہے۔

(جنگ روزنامہ جنگ ۱۴ دسمبر ۲۰۰۳ء)

اخلاقی انحطاط

اسلامی ممالک کا ایک اہم مسئلہ اخلاقی انحطاط ہے۔ تنزل اور اخلاقی انحطاط لازم وملزوم ہیں۔ جب قومیں اخلاقی زیور سے عاری ہو جاتی ہیں۔ خواہ ترقی کی کتنی ہی بلندیوں پر ہوں وہ تنزل کی اتھاہ گہرائیوں میں گر جاتی ہیں۔ تمام مورخ اس بات پر متفق ہیں کہ قوموں کے عروج وتنزل کا دار و مدار اخلاقی اقدار کے ساتھ وابستہ ہے چنانچہ ڈاکٹر لیبان کہتا ہے۔

"ہر قوم میں انقلابات وتغیرات صرف اخلاق کے ذریعے ہوئے ہیں اور وہی ان کے مستقبل کا سنگ بنیاد رکھتے ہیں..... قومی زندگی کی بنیاد صرف اخلاق کے ستون پر قائم ہے عقل ودماغ کا حصہ ان میں بہت کم ہے..... جب کسی قوم کا شیرازہ اخلاق درہم برہم ہو جاتا ہے تو وہ مر جاتی ہے اور اخلاقی اوصاف میں اس قدر تنزل ہوتا ہے جس قدر قوم عقل اور دماغ میں ترقی کرتی ہے..... جماعت انسانی کا نظام، مذہب کی بنیاد، سلطنتوں کا معیار صرف اخلاق کی سطح پر قائم ہے عقل کو اس میں کوئی دخل نہیں..... عقلی انقلابات میں ذہانت دوسرے درجہ کا انقلاب ہے۔ اصلی سنگ بنیاد صرف اخلاق ہے لیکن وہ کارخانوں اور کتابوں کے اوراق سے نہیں ملتا بلکہ اس کی تحصیل کے لیے دفتر کے دفتر الٹنے پڑتے ہیں اور مختلف قوموں سے واقفیت حاصل کرنا ہوتی ہے۔

پھر ڈاکٹر صاحب نے اپنے دعویٰ کے ثبوت میں مختلف قوموں کی مثال پیش کی ہیں مثلاً رومن قوم اپنے تنزل وانحطاط کے زمانہ میں عقلی حیثیت سے اپنے آباء واجداد کی نسبت زیادہ طاقت ور تھی۔ چونکہ اپنی آبائی وراثت اور اقدام عزم، شجاعت، جان بازی غرض ان تمام اخلاق کو جن کے ذریعہ ان کے آباؤ اجداد نے ترقی کی راہ کھو چکی ہے۔ اس لیے بالآخر تنزل کی غار میں گر گئی۔

ہندوستان کے تیس کروڑ باشندوں کو ساٹھ ہزار انگریزوں نے محض اخلاق کی استواری کی بنا

پر غلام بنا لیا۔ حالانکہ عقلی حیثیت سے ہندوستان میں بہت سے لوگ ہیں جو انگریزوں کے دوش بدوش کھڑے ہو سکتے ہیں بلکہ بعض کو فلسفیانہ مباحث میں ان پر ترجیح دی جا سکتی ہے۔"[1]

علامہ ابن خلدون کہتا ہے۔

"قوموں کی ترقی نہ مادی طاقت کی فراوانی سے ہوتی ہے اور نہ صرف عقل اور دماغ کی ترقی سے بلکہ اس کے لیے قومی عصبیت اور اخلاق کی ضرورت ہے۔"[2]

اسلامی دنیا پر نظر دوڑائی جائے تو واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمان قومی کردار حب وطنی، شجاعت، صبر و استقلال ضبط نفس، قومی امور کے لیے اتفاق اور قومی غیرت سے عاری ہو چکے ہیں۔ مسلمانوں کی معاشرتی زندگی شرم و حیا اور عصمت و عفت سے عاری ہو گئی ہے۔ نفسا نفسی کا عالم ہے۔ طبقاتی تقسیم ہے۔ اس تقسیم کی خلیج وسیع ہوتی جا رہی ہے۔ اسلامی ریاستوں کے حکمران عیش پرستی میں پڑے ہوئے ہیں۔ جرنیل روساء جاگیردار اور ارکان سلطنت خودسر ہیں۔ اپنے اپنے مفادات کے پیچھے پاگلوں کی طرح بھاگ رہے ہیں۔ قومی اقدار میں سے ایک باہمی اخوت ہے۔ قرآن نے واضح طور پر اخوت کی عمارت کو مضبوط اور محفوظ رکھنے کے لیے اپنے دشمنوں خصوصاً یہود اور نصاریٰ کی دوستی اور بھائی چارے سے روکا ہے اور واضح حکم دیا ہے مومن مومنوں کے ساتھ ہی محبت اور اخوت کا رشتہ قائم رکھیں۔ ارشاد الٰہی ہے۔ يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰى اَوْلِيَاۗءَ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَاۗءُ بَعْضٍ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ۔[3] اے لوگو! جو ایمان لائے ہو یہودیوں اور عیسائیوں کو دوست مت بناؤ وہ ایک دوسرے کے دوست ہیں اور جو کوئی تم میں سے انھیں دوست بناتا ہے تو وہ انہی میں سے ہے اللہ ظالموں کو ہدایت نہیں کرتا۔

ذرا قرآن مجید کی مذکورہ آیت پر غور کریں۔ اس آیت کے سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں مفہوم واضح ہے کہ یہود اور نصاریٰ کے ساتھ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف ہو کر دوستی نہ کرو۔ اس کے برعکس اس سورۃ میں چند آیات آگے مسلمانوں کو یہ حکم دیا ہے۔ اِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِيْنَ يُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ۔[4] تمھارے دوست صرف اللہ اور اس کا رسول ہیں اور وہ جو ایمان لائے جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے ہیں اور وہ جھکنے والے ہیں۔ آیت ۵۱ میں یہود و نصاریٰ سے مسلمانوں کے مفاد کے خلاف دوستی سے روکا گیا ہے۔ ساتھ یہ وعید بھی سنائی ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (بے شک اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا)

1۔ انقلاب امم ۹، ۵۳، ۵۴، ۸۳۔ 2۔ مقدمہ ابن خلدون۔

3۔ المائدہ: ۵۱۔ 4۔ المائدہ: ۵۵۔

یعنی جو کسی حکومت کا سربراہ مسلمانوں کے مفاد کے خلاف یہود اور نصاریٰ سے دوستی اور بھائی چارہ کرتا ہے تو وہ ولی الشیطان ہے۔ کوئی مسلمان حکمران نصاریٰ کے ساتھ دوستی اور بھائی چارے کا رشتہ استوار کر کے یہ دعویٰ کرے کہ وہ قوم کو ترقی کی طرف لے جا رہا ہے یہ خام خیالی اور خود فریبی نہیں ہے تو کیا ہے۔ کیا عیسائی حکمرانوں کو خوش کرنے کے لیے مسلم راہنما کو پھانسی اور قتل نہیں کیا گیا۔ یہ سطور لکھنے کے دوران صدام حسین کی گرفتاری کی خبر اخبارات کی زینت بنی ہے۔ خبروں میں یہی بتایا گیا ہے کہ اس کے قریبی عزیز کی مخبری سے یہ باغیرت محب وطن عظیم قائد پکڑا گیا ہے کیا یہ واقعات قومی اقدار پر دلالت کرتے ہیں یا قوم فروشی پر اے امت مسلمہ! جس کو قرآن مجید نے خیر امت کا لقب دیا ہے۔ ہوش میں آؤ۔ اخلاقی اقدار کے زیور سے اپنے آپ کو آراستہ کرو۔ صلیبی جنگ کا آغاز کرنے والے کے خلاف بنیان مرصوص بن جاؤ۔ اسی میں تمہاری زندگی ہے اسی میں تمہاری بقا ہے۔ اسی میں تمہاری عظمت ہے۔ تمہارے رسول کی روح تمہاری غداریوں کی وجہ سے تڑپ رہی ہے۔ تم کب تک اپنے رسول کی روح کو تڑپاتے رہو گے۔ کیا تمہارا رسول دنیا میں یہی پیغام لے کر آیا تھا کہ تم ایک عیسائی حکمران کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنوں کے گلے کاٹو۔ کیا تمہیں قرآن نے بھائی بھائی ہونے کا سبق نہیں دیا۔ کیا تمہارے رسول نے مہاجرین اور انصار کے درمیان مواخات قائم کر کے تمہیں یہ ابدی پیغام نہیں سنایا کہ ایک ہو جاؤ نیک ہو جاؤ۔

قارئین کرام! مسلمانوں کے مسائل کا ایک وسیع دفتر ہے میں مذکورہ چند مسائل کی نشان دہی کرنے کے بعد اس دفتر کو بند کرتا ہوں اور مسلمان دانشوروں پر خدا اور اس کے رسول کا قرض ہے کہ اپنی تحریرات سے مسلمانوں کو بیدار کریں۔ یہود اور نصاریٰ کی دوستی سے باز رکھیں تمام ذاتی اور فروعی اختلافات اور مفادات رکھنے والے حکمرانوں کے خلاف قلمی جہاد کریں۔

باب دہم

مسلمانوں کا ماضی، حال اور مستقبل

مسلمانوں کی ترقی کا پہلا دور رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی وفات ۱۱ھ تک تھا۔ اس دور میں غزوہ بدر (۲ھ) غزوہ احد (۳ھ) غزوہ خندق (۵ھ) فتح خیبر (۷ھ) فتح مکہ (۸ھ) غزوہ حنین (۸ھ) غزوہ تبوک (۹ھ) ہوئے۔ دوسرا دور خلفاء راشدین کا ہے یہ دور ۱۱ھ سے لے کر ۴۰ھ تک ہے۔ اس دور میں پہلے حضرت ابوبکر نے منکرین زکوٰۃ، مرتدین اور جھوٹے مدعیان نبوت کا خاتمہ کیا۔ ساتھ ہی ایران اور شام کی مضبوط حکومتوں کے خلاف اپنے دفاع کو مضبوط۔ ان کی وفات (۱۳ھ) کے بعد حضرت عمرؓ خلیفہ بنے تو ایران اور شام کی ریشہ دوانیوں اور سازشوں کو ختم کرنے کے لیے جو اسلامی سلطنت کے لیے ایک چیلنج کی شکل اختیار کر گئی تھی۔ ہر ان دو عظیم سلطنتوں کے خلاف کارروائی کرنی پڑی اور کئی مشہور معرکے ہوئے۔ جن میں جنگ قادسیہ (۱۴ھ/۹۳۵ء) فتح مدائن (۱۵ھ/۶۳۶ء) معرکہ نہاوند (۲۱ھ/۶۴۲ء) فتح دمشق (۱۳ھ/۶۳۴) جنگ یرموک (۱۵ھ/۶۳۶ء) فتح بیت المقدس (۱۶ھ/۶۳۷ء) فتح مصر (۲۰ھ/۶۴۱ء) مشہور ہیں۔ حضرت عمرؓ کی وفات (۱۳ھ) کے بعد حضرت عثمانؓ خلیفہ منتخب ہوئے۔ ان کے دور میں جنگی فتوحات کے علاوہ بحری بیڑہ بنایا گیا اور اس طرح مسلمانوں کا پرچم خشکی اور سمندر پر لہرانے لگا۔ حضرت عثمانؓ کی وفات (۳۵ھ/۶۵۶ء) کے بعد حضرت علیؓ کا دور شروع ہوتا ہے۔ گو یہ دور باہمی اختلافات کا دور ہے۔ لیکن ان اختلافات میں بھی عدوان اسلام کی سازشوں کا کافی حصہ ہے۔ باہمی اختلافات کے باوجود دشمن کے مقابل پر مسلمان بنیان مرصوص تھے۔ حضرت علیؓ کی وفات (۴۰ھ/۶۶۱ء) کے بعد بنوامیہ کا دور شروع ہوا ہے۔ یہ دور (۴۱ھ/۶۶۱ء) سے لے کر مروان دوم کے دور (۱۳۲ھ/۷۵۰ء) تک ہے اس دور کے مشہور حکمران امیر معاویہ، عبدالملک بن مروان، ولید اوّل سلیمان بن عبدالملک، حضرت عمر بن عبدالعزیز تھے۔ اسی دور میں وسط ایشیا کی ریاستیں (بلخ، بخارا، طبرستان اور فرغانہ وغیرہ) فتح سندھ (۹۲ھ/۷۱۲ء) فتح سپین (۹۲ھ/۷۱۲ء) ہوئی۔ بنوامیہ کے دور میں صرف جنگی فتوحات ہی نہیں ہوئیں بلکہ علمی ترقی بھی ہوئی۔ تفسیر، تدوین حدیث، فقہ اور سائنس اور ہیومینٹی علوم کی بنیاد پڑی۔

۱۳۲ھ/۷۵۰ء کے بعد عباسی دور شروع ہوتا ہے یہ دور سقوط بغداد (۶۵۶ھ/۱۲۵۸ء) تک

رہا۔ اس دور میں بھی تاریخ ساز حکمران ہو گزرے ہیں۔ ان میں مشہور ابوالعباس سفاح (۱۳۲ھ تا ۱۳۶ھ/۷۴۹ء تا ۷۵۴ء) ابوجعفر منصور (۱۳۶ھ تا ۱۵۸ھ/ ۷۵۴ء تا ۷۷۵ء) مہدی (۱۵۸ھ تا ۱۶۹ھ/۷۷۵ء تا ۷۸۵ء) ہارون (۱۷۰ھ تا ۱۹۳ھ/ ۷۸۶ء تا ۸۰۹ء) امین الرشید (۱۹۳ھ تا ۱۹۸ھ/۸۰۹ء تا ۸۱۳ء) مامون الرشید (۱۹۸ھ تا ۲۱۸ھ/ ۸۱۳ء تا ۸۳۳ء) مشہور ہیں۔ اس دور کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ فتوحات کے علاوہ علم کی ہر شاخ نے خوب ترقی کی اور بڑے بڑے عالم محدث مفسر مورخ سائنس دان، مورخ جغرافیہ دان اور فقہاء ہو گزرے ہیں۔ اگر یہ کہا جائے۔ یہ دور علم کی روشنی کا دور تھا۔ بجا ہوگا۔ اسی دور میں ہر علم کی شعاعیں پھوٹیں جن سے اکناف عالم روشن ہو گیا۔ موجودہ دور کی علمی ترقی کی بنیاد عہد بنو عباس ہے۔

بنو امیہ کے دور کے زوال کے بعد بنو امیہ نے اندلس میں اموی حکومت قائم کر لی جو ۴۲۲ھ تک قائم رہی۔ اندلس میں اموی حکومت کی بنیاد عبدالرحمٰن الداخل رکھی۔ اس خاندان کے پندرہ حکمران ہوئے ہیں جن کے نام یہ ہیں۔ عبدالرحمٰن الداخل۔ ہشام اول، حکم اول، عبدالرحمٰن دوم، محمد، منذر عبداللہ، عبدالرحمٰن الناصر، حکم دوم، ہشام دوم، محمد مہدی، سلیمان مستعین، عبدالرحمٰن مستظہر، سلیمان مستکفی، ہشام معتمد۔

کوئی چار سو سال تک اس خاندان کی حکومت رہی۔ اس خاندان کے دور حکومت میں اندلس نے ہر رنگ میں ترقی کی۔ اس دور کی ترقی پر آج بھی مسلمان فخر کرتے ہیں۔ یورپ میں علمی ترقی اس دور کی مرہون منت ہے اور تمام مورخین اس بات کا اقرار کرتے ہیں۔ یورپ سے طلباء اندلس کی یونیورسٹیوں میں حصول علم کے لیے علم سے مستفیض ہو کر اپنے اوطان ہو گئے۔ پھر انہی طلباء نے اپنے اپنے ملک میں علم کی مشعل جلائی۔ اندلس میں مسلمانوں کی جلائی ہوئی مشعل آج تمام یورپ کو روشن کر رہی ہے۔ مسلمانوں کے علوم پر ہی یورپ نے اپنی تحقیقات کی بنیاد رکھی۔ گویا مسلمان ہی آج کے مروجہ علوم کے بانی مبانی ہیں۔

اندلس میں بنو امیہ کے خاندان کے بعد اندلس پر یوسف بن تاشفین کے خاندان نے ۵۴۲ھ تک حکومت کی۔ یہ یوسف بن تاشفین کے خاندان کی حکومت کمزور ہوئی تو پھر افریقہ کے ایک نئے خاندان موحدین کا اثر بڑھنا شروع ہوا۔ ۵۴۵ھ میں پورے ملک پر ان کا قبضہ ہو گیا جو ۶۲۸ھ تک برابر قائم رہا۔ اس خاندان میں عبدالمومن، یوسف بن عبدالمومن، یعقوب المنصور، محمد الناصر مشہور بادشاہ ہو گزرے ہیں۔ ان کے زمانے میں مسلمان بہت مضبوط ہو گئے۔ عیسائیوں نے کئی بار سر اٹھایا لیکن ہر بار شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ آخری معرکہ قلعہ عقاب کے پاس ۶۰۹ھ میں ہوا۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کو شکست ہوئی۔ جس کے بعد موحدین برابر کمزور ہوتے چلے گئے۔ بیس برس کے اندر ان کی طاقت ختم ہو

گئی۔ موحدین کے بعد غرناطہ میں بنی احمر کی ایک نئی سلطنت قائم ہوئی۔ یہ صرف ایک صوبے کے حاکم تھے اور انھوں نے مسلمانوں کی شان و شوکت قائم رکھی۔ ۶۳۰ھ تا ۸۹۸ھ تک مسلمانوں کا نام قائم رکھا مسلمانوں کے باہمی نااتفاقی کی وجہ سے ۸۹۸ھ میں غرناطہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہو گیا مسلمانوں کا آخری بادشاہ ابوعبداللہ اپنے خاندان کے ساتھ مراکش چلا گیا۔ یورپ کے ایک گوشہ (اندلس) سے مسلمانوں کے اقتدار کا سورج غروب ہو رہا تھا تو خوش قسمتی سے یورپ کے دوسرے گوشہ (ترقی) میں مسلمانوں کے اقتدار کا سورج طلوع ہو رہا تھا۔

اس سلطنت کا بانی عثمان تھا۔ عثمانی ترک ترکستان کے رہنے والے تھے۔ چنگیز خان کے حملوں کی وجہ سے ان کو اپنا ملک چھوڑنا پڑا۔ جب حملے ختم ہوئے تو یہ لوگ وطن واپس ہوئے تو دریائے فرات میں ان کا سردار سلیمان ڈوب گیا۔ اس کے چار بیٹے تھے۔ باپ کی وصیت کے مطابق دو وطن لوٹ آئے اور دوار طغرل اور دوندار دو ہزار اشخاص کے ساتھ ایشیا کے کوچک روانہ ہوئے۔ ملک شاہ سلجوقی کے بیٹے کیقباد کے ساتھ تاتاریوں کی لڑائی ہو رہی تھی ارطغرل نے کیقباد کی مدد کی۔ تاتاریوں کو شکست دی۔ سلطان علاء الدین نے ارطغرل کو ایک بڑی جاگیر دی۔ ارطغرل نے رومیوں کے بہت سے قلعے فتح کر لیے۔ رومیوں نے تاتاریوں کے ساتھ مل کر حملہ کیا۔ ارطغرل سلطان علاء الدین کے ساتھ جنگ میں شریک ہوا۔ رومیوں اور تاتاریوں کو شکست دی۔ علاء الدین نے وہ علاقے بھی ارطغرل کی جاگیر میں شامل کر دیے۔ ارطغرل نے قرب و جوار کے علاقوں کو فتح کیا اور اپنی جاگیر میں شامل کر لیا۔ اس طرح اس کا علاقہ بہت وسیع ہو گیا۔ ایک عثمانی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ عثمانی سلطنت کے تقریباً ۳۸ حکمران ہوئے ہیں سلطان عبدالمجید دوم آخری حکمران تھا۔ جنگ عظیم اوّل میں عثمانی ترکی نے جرمن کا ساتھ دیا۔ جرمنی کو شکست ہوئی۔ انگریزوں نے عثمانی سلطنت کے حصے بخرے کر دیے۔ آخرکار مصطفےٰ کمال نے عثمانی خاندان کی حکومت کو ختم کر دی اور سلطان عبدالمجید کو ملک سے نکال دیا گیا اور وہ سوئٹزر لینڈ میں رہائش پذیر ہو گیا۔ ریاست حیدر آباد اور بھوپال کی طرف سے بطور وظیفہ کچھ رقم مقرر کی گئی پر اس کا بسر گزر ہوتا تھا۔ ۱۹۳۱ء میں نظام حیدر آباد کے صاحبزادے شاہزادہ اعظم اور شاہزادہ معظم یورپ گئے سلطان عبدالمجید کی صاحبزادی درشاہوار اور عزیزہ نیلوفر سے ان کی شادی ہو گئی اور یہ شاہزادیاں ہندوستان آ گئیں اس طرح عثمانی ترک کے آخری سلطان کا رشتہ ہندوستان کی ریاست حیدر آباد کے حکمران خاندان کے ساتھ ہو گیا۔

مصطفےٰ کمال مستقل طور پر جمہوریہ ترکیہ کے صدر مقرر کر دیے گئے۔

اب ہم ہندوستان کی طرف آتے ہیں جہاں بے شمار خاندانوں نے حکومت کی۔

اموی خلیفہ ولید بن عبدالملک کے دور خلافت ۹۳ھ/ ۷۱۱ء میں محمد بن قاسم کو راجہ داہر کے قزاقوں کی سرکوبی کے لیے سندھ پر حملہ آور ہونا پڑا۔ اس وقت سے لے کر معتصم عباسی کی خلافت کے زمانہ تک خلیفہ کی طرف سے کو والی آ کر سندھ پر حکومت کرتا تھا۔ جب مرکزی حکومت کمزور ہو گئی تو سندھ اور ملتان کے حاکموں نے اپنی خود مختار ریاستیں قائم کر لیں جو ۴۰۰ھ تک قائم رہیں۔ چوتھی صدی کے آخر میں افغانستان کے شہر غزنہ میں سبکتگین نے اپنی سلطنت قائم کی۔ پنجاب کے راجہ کے ساتھ چھیڑ چھاڑ شروع ہو گئی۔ سبکتگین کے بیٹے سلطان محمود غزنوی نے بڑھ کر سندھ اور ملتان پنجاب کے حکمرانوں کو شکست دے کر ان صوبوں کو اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ پھر کاٹھیاواڑ میں سومناتھ شہر میں ایک مشہور مندر تھا پر حملہ آور ہوا اور بت کو توڑا۔ مال غنیمت لے کر واپس آ گیا سلطان محمود نے ہندوستان پر سترہ حملے کیے ہر حملہ میں کوئی نہ کوئی شہر زیر کرتا۔ لیکن اس نے اپنی سلطنت کی حدود سندھ، ملتان اور پنجاب تک محدود رکھیں اس کا صدر مقام لاہور تھا۔ غزنوی خاندان کی حکومت ۵۸۲ھ تک قائم رہی تقریباً بارہ حکمران ہوئے خسرو ملک آخری حکمران تھا۔

غزنوی خاندان کے بعد ہندوستان میں غوری خاندان کی حکومت کا سکہ جاری ہوا سلطان شہاب الدین ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ ۵۸۸ھ/۱۱۹۳ء میں دہلی اجمیر اور قنوج کے راجوں کو ذلت آمیز شکست دے کر گنگا کے کنارے سے لے کر پشاور تک ایک اسلامی سلطنت قائم کر لی۔ شہاب الدین خود تو راجوں کو زیر کر کے ہندوستان میں نہ رہا لیکن اپنے ایک غلام قطب الدین کو اپنا نائب مقرر کیا۔ یہی وہ حکمران ہے جس کی قبر انارکلی سے متصل ایک گلی میں واقع ہے جو اس کی عظمت کا اظہار کر رہی ہے۔ یہ سلطنت سات سو برس تک قائم رہی اور تاریخ میں سلطنت غلاماں کے نام سے مشہور ہے۔ یہ صرف اسلام کو ہی فخر حاصل ہے کہ مسلمان غلام بھی حکمران بنے۔ حکمران غلاماں میں سے سلطان شمس الدین التمش، سلطان ناصر الدین محمود سلطان بلبن مشہور ہو گزرے ہیں۔ بلبن کے بعد کیقباد تخت پر بیٹھا لیکن نااہلی کی وجہ سے تین برس کے بعد خلجی خاندان کے ایک امیر جلال الدین نے ۶۹۷ھ/۱۲۹۰ء میں سلطنت پر قبضہ کر لیا۔ اس طرح ہندوستان میں اسلامی حکومت ایک خاندان سے دوسرے خاندان میں منتقل ہو گئی۔ جلال الدین کے بعد اس کا بھتیجا علاء الدین خلجی حکمران بنا۔ بیس برس تک حکومت کی اس کے زمانہ میں سارا ہندوستان مسلمانوں کے زیر حکومت آ گیا۔ مسلم افواج نے بندھیا چل سے اتر کر دکن پر حملہ کیا۔ مقامی راجوں مہاراجوں کو زیر کرتے ہوئے راس کماری تک پہنچ گئی۔ علاء الدین کا دور حکومت ہندوستان کا ایک سنہری دور ہے ہر طرف امن ہے۔ خوش حالی ہے، انصاف کی حکمرانی ہے۔ علاء الدین کے بعد کوئی ایسا حکمران نہیں تھا۔ جو علاء الدین کے ورثہ کو جاری رکھتا۔ خسرو نامی حکمران

بنا۔ اس ظلم و ستم کی وجہ سے پنجاب کے صوبہ دار غازی ملک نے دہلی پر چڑھائی کی۔ خسرو مارا گیا، غازی ملک غیاث الدین تغلق کے نام سے ۷۲۱ھ/۱۳۲۰ء میں بادشاہ بنا۔ اس طرح خلجی خاندان سے تغلق خاندان میں حکومت منتقل ہوگئی۔ تغلق کے بعد حکمران نااہل تھے۔ ایک وسیع حکومت کو قائم نہ رکھ سکے۔ آخر کار تغلق خاندان سے سید خاندان میں ۱۴۱۴ء میں مسلم حکومت منتقل ہوگئی۔ پنجاب کے صوبہ دار سید خضر خان نے تخت دہلی پر قبضہ کر لیا۔ لیکن دہلی کے اردگرد اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ تمام صوبے دار اپنی اپنی جگہ خود مختار حکمران بن گئے۔ آخر کار ۱۴۵۱ء میں بہلول لودھی نے قبضہ کر لیا۔ سید خاندان سے حکومت لودھی خاندان میں منتقل ہوگئی۔ بہلول لودھی کے بعد اس کے بیٹے اسکندر لودھی نے زمام اقتدار اپنے ہاتھ میں لیا۔ باپ بیٹا دونوں باہمت اور مدبر حکمران تھے۔ انھوں نے اپنی سلطنت کو بڑھا کر بہار تک وسیع کر لیا۔ سکندر کے بعد ایک بھی لودھی خاندان کا ایسا حکمران نہ تھا جو بہلول لودھی کی میراث کو قائم رکھتا۔ سکندر کے بعد ابراہیم لودھی حکمران بنا۔ نااہل تھا۔ بابر کابل سے چل کر ہندوستان میں آیا بابر کے ساتھ صرف بارہ ہزار سپاہ تھی۔ ابراہیم کے ساتھ پانی پت کے میدان میں لڑائی ہوئی۔ ابراہیم لودھی کے ساتھ ایک لاکھ فوج تھی۔ بابر اس جگری اور حکمت عملی کے ساتھ لڑا ایک لاکھ فوج بارہ ہزار کا مقابلہ نہ کر سکی۔ ابراہیم لودھی مارا گیا اور ہندوستان پر مغلیہ خاندان قائم ہوگئی۔ تقریباً تین سو برس تک حکومت کرتے رہے۔ بابر کے بعد ہمایوں حکمران بنا لیکن کچھ ہی دن بعد شیر شاہ سوری کے مقابلہ میں شکست کھائی اور ایران بھاگ گیا۔ شیر شاہ سوری کے بعد ہمایوں پھر ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ ہندوستان کو فتح کیا۔ ہمایوں کے بعد اکبر، جہاں گیر، شاہ جہاں اور اورنگ زیب عالمگیر حکمران بنے۔ یہ حکمران باہمت، بہادر اور اصول حکمرانی سے باخبر تھے۔ سارے ہندوستان پر قابض ہو گئے۔ ہر سمت اسلامی حکمرانی کا پرچم لہرانے لگا۔ اورنگ زیب کی وفات (۱۷۰۷ھ) کے بعد اس کا بیٹا معظم بہادر شاہ اوّل کے نام سے تخت نشین ہوا۔ پانچ برس برسر اقتدار رہا۔ ۱۷۱۲ھ میں اس کا انتقال ہو گیا۔ وزراء امراء فوجی جرنیلوں کے ہاتھ میں بادشاہوں کا نصب و عزل آ گیا۔ جسے چاہا موت کے گھاٹ اتار دیا۔ مرکز کی کمزوری کی وجہ سے صوبے دار خود مختار بن بیٹھے۔ ۱۷۳۸ء میں نادر شاہ نے حملہ کیا۔ مغلوں کی رہی سہی طاقت خاک میں ملا دی۔ نادر شاہ تو لوٹ مار کر واپس کابل چلا گیا لیکن ہندوستان میں ہر سو افراتفری مچی ہوئی تھی۔ مرہٹوں، راجپوتوں، جاٹوں اور سکھوں نے اپنی اپنی حکمرانیاں قائم کر لیں تھیں۔ مرہٹے زور پکڑ رہے تھے۔ شاہ ولی اللہ شاہ کی ترغیب پر احمد شاہ ابدالی ہندوستان پر حملہ آور ہوا۔ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کو شکست دی۔ سلطنت شاہ عالم کے سپرد کر کے خود واپس چلا گیا۔ چونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کی زندگی کی روح مردہ ہو چکی تھی اس لیے مرہٹوں کا زور ٹوٹنے کے باوجود اسلامی سلطنت کو سنبھالا نہ

دے سکے۔ ادھر ہندوستان میں تجارت کے روپ میں آنے والے انگریزوں کا اثر بڑھ رہا تھا۔ مسلمانوں کی اپنی غداری کی وجہ سے پہلے سراج الدولہ کو شکست دے کر بنگال پر قبضہ کرلیا۔ پھر شاہ دہلی شاہ عالم سے بکسر کے مقام ۱۷۶۴ء میں لڑائی لڑی۔ اس لڑائی میں مسلمانوں کی طاقت خاک میں مل گئی۔ دہلی سے بنگال تک انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ ابھی ہندوستان کے بعض حصوں پر روساء اور نوابوں کی حکومت تھی لیکن مرکز دہلی انگریزوں کے قبضہ میں تھا۔ ریاستوں کے نوابوں کے ساتھ مقابلے ہوتے رہے جن میں انگریزوں کو فتح ہوتی رہی آخر کار ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حکومت کا سورج غروب ہو گیا۔

یہ ہے مختصراً مسلمانوں کے عروج و زوال کی داستان۔ اب مسلمانوں کے حال اور مستقبل کی طرف آتے ہیں۔ مسلمانوں کے حال کی مثال رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی کے آخری نصف حصے سے دی جاسکتی ہے۔ جس میں قریش کی قد آور شخصیات دائرہ اسلام میں داخل ہو چکی تھیں۔ عدوان اسلام اس کی وجہ سے جذبہ عداوت میں جل رہے تھے اور اسلام پر آخری ضرب لگانے کی تیاری کر رہے تھے۔ یہی حال اب اسلام کے دشمنوں کا ہے۔ اس وقت کرہ ارض پر ۵۷ آزاد اسلامی ممالک ہیں۔ دنیا بھر کے مسلم ممالک کا مجموعی رقبہ تقریباً ۹ کروڑ مربع میل ہے۔ کرہ ارض پر ۲۱٪ مسلمان بستے ہیں۔ کرہ ارض پر مسلمانوں کی آبادی ایک ارب ۱۵ کروڑ کے لگ بھگ ہے۔ پچھلے دو عشروں کی نسبت اس وقت مسلم ممالک میں زیادہ ابھار محسوس ہوتا ہے۔ گو وہ ابھار ابھی صرف دانشور ہی محسوس کر رہے ہیں اس ابھار کی رفتار بہت سست ہے۔ اور یہ ابھار مسلمانوں کے جذبہ جہاد کی بیداری سے ظاہر ہوا ہے۔ جس کی واضح اور روشن مثالیں عراق، افغانستان، فلسطین اور کشمیر ہیں۔ جن میں عوام استعماری طاقتوں سے اپنی مقدس زمین کو آزاد کرانے کے لیے نہتے لڑائی لڑ رہے ہیں اور اپنی جانوں کے نذرانے پیش کر رہے ہیں۔ یورپ کے تھنک ٹینک مسلمانوں کے اس جذبہ جہاد کو بڑی دقیق نظر سے محسوس کر کے اس کو اپنے لیے مستقبل میں ایک خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ یہی وجہ ہے استعماری قوتوں نے صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا ہے اور وہ اس کوشش میں ہیں کہ وہ اس جذبہ جہاد کو دہشت گردی کا رنگ دے کر کچل دیں۔ اب مسلمانوں کا جذبہ حریت ایک ایسی شکل اختیار کر چکا ہے۔ جتنا اس جذبہ کو استعماری قوتیں کچلنے کی کوشش کریں گی۔ اتنا ہی تیزی کے ساتھ یہ جذبہ ابھرے گا۔ عراق کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ میں یہ بھی عرض کرتا ہوں۔ یہ جذبہ جہاد صرف مسلمان عوام میں ہے۔ مسلمانوں کے اکثر ممالک میں برسر اقتدار طبقہ جذبہ جہاد کی لذت سے بلکل نا آشنا ہے وہ محض فرضی زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر استعماری قوتوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ کاش ان پر آسمانی حقائق کا انکشاف ہو جائے اور قرآنی تعلیم

کے پیش نظر صلیبی جنگ کا اعلان کرنے والے ممالک کا ساتھ نہ دیں۔

آج سے چودہ سو سال قبل ہجرت مدینہ کے بعد بھی ایسے لوگ پیدا ہوئے تھے جو مسلمانوں کو کمزور دیکھ کر قریش مکہ اور ان کے حلیفوں اور یہودیوں سے گٹھ جوڑ اور تعلق رکھتے تھے۔ اس خیال سے مسلمان کمزور ہیں جو قریش مکہ اور یہود سے مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ان منافق زمینی حقائق کو دیکھنے والوں کا ذکر قرآن مجید میں ان الفاظ میں آیا ہے۔ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَآئِرَةٌ فَعَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰى مَآ اَسَرُّوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ (المائدہ ۵:۵۲) پس جن کے دلوں میں بیماری ہے تو ان کو دیکھے گا کہ ان کی (دوستی) کے لیے جلدی کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہم پر کوئی گردش نہ آ جائے سو قریب ہے کہ اللہ فتح یا اپنی طرف سے کوئی امر لائے۔ پس ان باتوں پر جن کو اپنے دلوں میں چھپاتے ہیں پشیمان ہوں گے۔

اس آیت کریم میں ان منافقوں (عبداللہ بن ابی سلول اور اس کے ساتھی) کا ذکر ہے جو یہود اور کفار سے اس خوف سے تعلقات رکھتے تھے کہ مسلمان تو کفار کی طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ انھوں نے تو آخر کار مغلوب ہونا ہی ہے اس وجہ سے طاقت ور حریف سے گٹھ جوڑ اور تعلقات قائم کیوں نہ رکھے جائیں۔ بعد کے ادوار میں بھی غداروں نے محض زمینی حقائق کو سامنے رکھ کر دشمنوں کا ساتھ دیا تھا۔ دراصل یہ ان کے دل کی بیماری تھی جس کو زمینی حقائق اور عملیت پسندی کا نام دیتے تھے اب بھی بعض اسلامی ممالک کے سربراہ اس روش پر چل کر اپنی قلبی مرض کو عملیت پسندی کا نام دے کر استعماری طاقتوں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ مذکورہ آیت کا ایک ایک لفظ آج بھی اس قسم کے لوگوں پر صادق آ رہا ہے۔

قرآن مجید میں اظہار دین اللہ کا وعدہ ہے۔ ارشاد الٰہی ہے: هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ۔ اس آیت کریمہ میں اظہار دین سے مراد صرف نظری اور روحانی غلبہ مراد نہیں بلکہ سیاسی غلبہ بھی مراد ہے۔ ماضی میں مسلمانوں کے غلبے کی ایک جھلک قارئین کو سامنے پیش کر دی ہے کہ مسلمان کس طرح ربع مسکون پر حکومت کرتے رہے اور قرآن مجید کو مہجور بنانے کی وجہ سے تنزل کا شکار ہو گئے۔ پچھلی صدی میں اہل درد مسلمان علماء نے عیسائی مشنریوں کے صلیبی حملوں کو نہ صرف پسپا کیا بلکہ مسلمانوں میں ایک بیداری کی لہر بھی پیدا کی۔ ان میں سے خاص طور پر ہندوستان میں سرسید اور ان کے ساتھی، علمائے دیوبند، علمائے بریلوی، محمد علی جوہر، جمال الدین افغانی، علامہ محمد اقبال، علامہ عنایت اللہ مشرقی، مصر میں مفتی عبدہ اور ان کے تلامذہ قابل ذکر ہیں۔ صرف یہی علماء اور قائدین ہی مسلمانوں میں بیداری پیدا کرنے کے موجب نہیں ہوئے بلکہ ہر ملک میں غلامی کے سایوں میں علماء پیدا ہوئے اور مسلمانوں کو قرآن مجید کی طرف بلایا۔ اسی بیداری کی لہر نے مسلمان

ملکوں کو آزادی دلائی۔ اب وہی لہر ایک نئی شکل اختیار کرتی جا رہی ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر دور میں اس دور کے تقاضہ کے مطابق مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے آدمی پیدا کر دیتا ہے اور پیدا کیے ہیں۔ یہ دور مثیل عمر کا تقاضا کر رہا ہے کیونکہ استعماری قوتوں نے صلیبی جنگ کا اعلان کر دیا ہے ضروری ہے کوئی ہلالی جھنڈے کو بلند رکھنے کے لیے پیدا ہو۔ میں یقین سے یہ کہتا ہوں کہ صلیبی جنگ کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک مثیل عمر پیدا ہوگا۔ اس کے ہلالی پرچم کے نیچے اسلامی فوجیں جمع ہوں گی۔ وہ قائد آسمانی تائید کے ساتھ سیاسی کسر صلیب کرے گا۔ وہ جلد جلد بڑھے گا اور غلام ممالک کی رستگاری کا موجب بنے گا۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے سامنے نہ ٹھہر سکے گی۔ اس وقت ایک ہی دین ہوگا وہ اسلام ایک ہی کتاب ہوگی وہ قرآن مجید اور ایک ہی رسول ہوگا۔ وہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ وہ دور کامل طور پر اظہار دین اسلام کا ہوگا۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو آسمانی حقائق کو دیکھ کر اس آخری جنگ کی تیاری میں ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہہ سکتا مسلمانوں کی حقیقی رستگاری کے لیے وہ قائد کب آئے گا لیکن میں اندازے کے رنگ میں یہ کہہ سکتا ہوں۔ وہ قائد شام اور عراق میں پیدا ہوگا۔ کیونکہ یہی وہ علاقہ ہے جہاں استعماری قوتوں نے تباہی کی آگ روشن کی ہے۔ یہی وہ علاقہ ہے جہاں سب سے زیادہ بیداری کی لہر پیدا ہوئی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو ایک بڑی اور لمبی لڑائی کی تیاری میں مصروف ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو حضرت امام حسین کے نقش قدم پر چل کر دشمنوں کو تباہ کر رہے ہیں۔ ان کے سینوں میں جذبہ حسینی موجزن ہے اور یہ جذبہ نہ سرد ہونے والا ہے۔ یہ جذبہ ابھرے گا۔ بڑھے گا۔ پھیلے گا اور عدوان اسلام کو بھسم کر دے گا۔ میں مسلمانوں کا مستقبل روشن دیکھ رہا ہوں۔ مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں وہ وقت آنے والا ہے۔ بقول رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پتھر بھی بولے گا کہ میرے پیچھے ایک یہودی چھپا ہوا ہے۔ اس وقت یہود کے لیے کوئی جائے پناہ نہ ہوگی۔

ہماری چند بہترین کُتب



Rs. 400/-



Rs. 150/-



Rs. 150/-



Rs. 200/-



Rs. 300/-



Rs. 300/-



Rs. 100/-



Rs. 150/-



Rs. 120/-

علم و عرفان پبلشرز

34 اردو بازار لاہور۔ فون 7352332-7232336

E-Mail:ilmoirfanpublishers@hotmail.com